UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224463

UNIVERSAL
LIBRARY

دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۴۹ ویں جلد

از جنوری ۱۹۴۲ء تا جون ۱۹۴۲ء

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

مطبع معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضامین

جلد ۴۹

جنوری ۱۹۴۲ء تا جون ۱۹۴۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون	صفحہ
	شذرات	۲،۸۲،۱۶۲، ۲۴۲،۳۲۲، ۴۰۲،
	مقالات	
۱	بیدل اور تذکرۂ خوشگو	۳۵۷
۲	تیموری شاہزادیوں کا علمی ذوق	۳۳۸، ۴۳۱
۳	خاکی	۲۰۷
۴	خطبۂ صدارت انجمن جامعہ ادبیہ کانپور	۲۷
۵	خطبۂ صدارت مشاعرہ نمائش اعظم گڈھ،	۲۶۰
۶	سر اقبال مرحوم اور انکی شاعری	۵۷
۷	شریعت اسلام اور موجودہ ہندوستان مین کاشتکارونکے حقوق	۳۲۵، ۴۰۵
۸	شہری مملکت مکہ	۵، ۱۰۳
۹	قرآن اور سیرت سازی	۱۶۵
۱۰	کلمۃ اللہ	۲۴۵
۱۱	مناقب ذوالنورین رض	۴۱۴
۱۲	مولنا حمید الدین فراہی اور علم حدیث	۸۵
۱۳	ہندی ادب کا دور جدید	۴۴۱
۱۴	یاد باستان	۴۴، ۱۲۴، ۱۹۰، ۲۷۹
	تلخیص وتبصرہ	
۱	امام غزالی غیر ملکی نظر مین،	۲۲۰
۲	ایران کے مغل خانان	۱۴۵
۳	پولینڈ کے مسلمان	۲۲۵
۴	چین مین مسلمان	۴۶۰

شمار	مضمون	صفحہ
۵	خانان جغتائیہ،	۱۴۳
۶	عورت اور مرد کا نفسیاتی مطالعہ	۳۷۷
۷	فن گفتگو	۴۵۵
۸	مجلس تاریخ ہند،	۶۸
۹	مغل حکمرانوں کی بادشاہت کا تخیل،	۲۹۳
	اخبار علمیہ	۷۳، ۱۲۹، ۲۲۷، ۳۰۲، ۳۸۲، ۴۶۲
	ادبیات	
۱	بیان حقیقت	۳۰۶
۲	جذب مجذوب	۳۰۵
۳	عہد حاضر کے نوجوانان اسلام	۱۵۲

شمار	مضمون	صفحہ
	باب التقریظ والانتقاد	
۱	ابن خلدون (انگریزی)	۳۱۲
۲	تاریخ اسلام کے فیصلہ کن لمحے، (انگریزی)	۳۰۷
۳	تذکرہ نصرآبادی	۱۵۴
۴	خندان	۳۸۵
۵	رسالوں کے سالنامے اور خاص نمبر،	۲۳۰
۶	صفۃ المعمورہ علی البیرونی	۴۶۵
	مطبوعات جدیدہ	۷۶، ۱۵۰، ۲۳۷، ۳۱۶، ۳۹۸، ۴۷۵

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۴۹

جنوری ۱۹۴۲ء تا جون ۱۹۴۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	جناب آل احمد صاحب سرور لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی،	۳۸۵
۲	سید ابو سہیل بی اے علیگ	۳۰۲، ۳۷۷، ۴۶۰
۳	مولینا امین احسن اصلاحی	۸۵
۴	ڈاکٹر حفیظ سید ایم اے ڈی لٹ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی،	۵۷
۵	جناب سید حسن صاحب برنی بی اے ال ال بی علیگ ایڈوکیٹ بلند شہر	۴۶۵
۶	سید سلیمان ندوی،	۲، ۸۲، ۱۵۴، ۱۶۲، ۲۴۲، ۳۲۲، ۴۰۲
۷	سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب (علیگ) رفیق دار المصنفین،	۹۸، ۶۳، ۱۴۹، ۲۲۰، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۹۳، ۳۳۸، ۳۸۲، ۴۳۱، ۴۵۵، ۴۶۲
۸	مولانا عبد السلام ندوی	۲۷، ۲۶۰
۹	مولنا عبد الصمد صاحب رحمانی،	۳۲۵، ۴۰۵
۱۰	جناب قاضی عبد الودود صاحب بیرسٹر پٹنہ،	۳۵۷
۱۱	جناب عنایت اللہ صاحب دہلوی سابق ناظم دار الترجمہ حیدر آباد دکن،	۱۴۳، ۱۴۵

شمار	اسماے گرامی	صفحہ
۱۲	جناب غلام مصطفےٰ خاں صاحب ایم اے ایل ایل بی علیگ لکچرار کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی	۲۰۷
۱۳	جناب گوری سرن لال سری واستو صاحب ایم اے علیگ	۴۴۱
۱۴	جناب محمد ابو اللیث صاحب صدیقی ایم اے لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی،	۴۱۴
۱۵	جناب مولوی محمد ادیس صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین	۲۴۵
۱۶	ڈاکٹر محمد حمید اللہ استاذ قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ	۵، ۱۰۳
۱۷	مولانا مسعود عالم ندوی کیٹلاگر اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ،	۳۰۷، ۳۴۳
۱۸	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۶، ۱۵۶، ۲۳۰، ۲۳۷، ۳۱۶، ۳۹۶، ۴۵۰
۱۹	جناب مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی	۴۴، ۱۲۴، ۱۹۰، ۲۷۹
۲۰	ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۱۶۵

شعراء

شمار	اسماے گرامی	صفحہ
۱	مولانا قمر نعمانی سہسرامی	۳۰۶
۲	مجذوب جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب غوری،	۳۰۵
۳	جناب یحییٰ صاحب اعظمی،	۱۵۲

"جلد ۴۹" ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۴۲ء "عدد ۱"

مضامین

شذرات،	سید سلیمان ندوی،	۲ - ۴
شہری مملکتِ مکہ،	ڈاکٹر محمد حمید اللہ استاذ قانون بین الممالک جامعۂ عثمانیہ،	۵ - ۲۶
خطبۂ صدارت،	مولانا عبد السلام ندوی،	۲۷ - ۴۳
یادِ پاستان،	جناب مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی،	۴۴ - ۵۶
سر اقبال مرحوم اور انکی شاعری	ڈاکٹر حفیظ سید ایم اے ڈی لٹ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی،	۵۷ - ۶۷
مجلسِ تاریخ ہند،	"ص ع"	۶۸ - ۷۲
اخبار علمیہ،	؍؍	۷۳ - ۷۵
مطبوعات جدیدہ،	"م"	۷۶ - ۸۰

سیرۃ النبیؐ جلد ششم

تقطیع خورد

جس کا شائقین کو شدید انتظار تھا، چھپ کر شائع ہو گئی ہے،

ضخامت ۸۷۲ صفحے، قیمت قسم اول ہےؔ قسم دوم ہےؔ،

"منیجر"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

افسوس ہے کہ ۸ جنوری ۱۹۴۲ء کی شام کو سابق صدر اعظم ریاست حیدر آباد سر اکبر حیدری نے دلی میں وفات پائی، سر اکبر حیدری ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے وزیر مالیات اور پھر صدر اعظم ہونے کے سبب سے تمام اسلامی اداروں سے ایک خاص مربیانہ تعلق رکھتے تھے، اور اس بنا پر ان کا حادثۂ وفات ہم سب کے لئے غم و الم کا باعث ہوا ہے، ان کی عمر اس وقت ۷۲ برس کی تھی، مگر اس عالم میں بھی جس انہماک، مصروفیت اور بیدار مغزی سے وہ اپنے مفوضہ خدمات کو انجام دیتے تھے اس سے ان کے غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی ہونے کا ثبوت ملتا تھا اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے،

سندھ عربی زبان کے سفرِ ہند کی پہلی منزل ہے، اس لئے بیجا نہیں اگر صوبہ میں اس کے لئے سب سے پہلی عربی یونیورسٹی یا جامعہ عربیہ کا قیام عمل میں آئے، سندھ کے موجودہ ڈائرکٹر تعلیمات ماشاء اللہ عربی زبان کے فاضل بھی ہیں، اس کام کے لئے اس سے بہتر موقع اور کیا مل سکتا ہے، اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے "سندھ عربک یونیورسٹی ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک جماعت بن چکی ہے اور اسکی باقاعدہ رجسٹری ہو چکی ہے، اور سب سے پہلے ایک ٹریننگ کالج (دار المعلمین) جاری کرنے کی تجویز زیر غور ہے، ہم کو اس انجمن کے لائق کارکنوں سے جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ اس نکتہ کو خوب سمجھ لیں کہ مسلمانوں کو عربی زبان اور اس کی تعلیم اس لئے عزیز ہے کہ وہ ان کے مذہب کی خزینہ دار ہے، اس لئے

اس تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اس سے ان کو اس خزانہ کی کنجی ہاتھ آئے،

آسٹرین نومسلم محمد اسد جو مدت تک حجاز میں رہنے کے سبب عربی زبان سے واقف تھے اور انگریزی پر پہلے سے قدرت رکھتے تھے، انھوں نے ہندوستان میں آکر "اسلام اون کراس روڈ" نامی کتاب انگریزی میں لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی تھی، اسکے بعد انھوں نے صحیح بخاری کا انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا چند ہی پارے نکلے تھے کہ اس جنگ کے شروع میں وہ آسٹریا کے باشندے ہونے کے سبب نظر بند کر لئے گئے، اور اب ان کا سارا کاروبار اور پریس معطل ہے، اور ان پر مالکِ مکان کا کرایہ چڑھا ہوا ہے، ایک ہمدرد مسلمان چودھری نیاز علی صاحب (دارالاسلام پٹھان کوٹ) نے ان کا کرایہ کا قرضہ ادا کر دیا ہے، مگر پریس کے بہت سے باقی داروں کے قرضے ابھی باقی ہیں، انگریزی داں احباب سے التماس ہے کہ اسلامی ہمدردی کی خاطر ان کے ترجمہ صحیح بخاری کے جو چار حصے شائع ہو چکے ہیں، وہ ان کو خرید کر داخلِ ثواب ہوں، ان کی اصل قیمت تو ۱۲ فی حصہ اور چاروں حصوں کے دس روپیے ہیں، مگر اس وقت فی حصہ ۱۲ اور چاروں حصوں کے ۸ قیمت رکھی گئی ہے، پتہ یہ ہے، (دارالاسلام جمال پور، پٹھان کوٹ، پنجاب)

ہم نے نومبر کے شذرات میں اس زمانہ کے بعض متکلمینِ اسلام کی خدمت میں جن میں سے کسی کا نام نہیں لیا تھا، کچھ عرض کیا تھا، ان میں سے ایک صاحب نے خدا جانے کیوں اس لقب کو اپنے لئے خاص قرار دیا اور اس مخلصانہ عرض کو تعریض سمجھا اور اس کا لمبا جواب دیا، میں نے عرض کیا تھا کہ حقائقِ اسلامی کو زمانہ کے ماحول کے مطابق زمانہ کی اصطلاحات میں ادا کرنا ہمیشہ تعبیر حقائق کے بجائے تغییر حقائق کا باعث ہوا ہے، اور مثلاً اس زمانہ کی ایک عام اصطلاح "تحریک" کو لکھکر ظاہر کیا تھا

کہ جو لوگ اسلام کو ایک تحریک قرار دے کر اس کے حقائق کی تعبیر کرنا چاہتے ہیں وہ بلا ارادہ حقائق اسلام کی تغییر کے مرتکب ہو رہے ہیں، (ملخصاً)

فاضل مجیب نے اپنے جواب میں پہلے تو حسب دستور اپنے طول عبارت اور بڑے بڑے لفظوں سے مرعوب کرنا چاہا ہے، اور پھر **تجدید** اور **تجدد** کا خود ساختہ فرق ظاہر کر کے ہم کو ایک عظیم الشان نکتہ سمجھایا ہے جس کا وہ شکریہ قبول فرمائیں،

بے شبہ ان دونوں میں اتنے فرق کو تو ہم بھی اور سب عربی داں تسلیم کرینگے کہ تجدید بوزن تفعیل متعدی ہے معنی نیا کرنا، اور تجدد بوزن تفعل لازم ہے معنی نیا ہونا، اسکے علاوہ کوئی قلب حقیقت کا فرق ہم کو نہیں معلوم، مگر مدعیِ مجیب ہم کو یہ فرق بتاتے ہیں،

> تجدید اور تجدد کا اصولی فرق یہ ہے کہ تجدید ہر زمانہ میں انہی حقائق اور انہی صداقتوں کو جو روز ازل سے چلی آرہی ہیں، اپنے زمانہ کی زبان میں اپنے زمانہ کی ذہنیتوں اور ضروریات کے مطابق مرتب کر کے پیش کرتی ہے اور تجدد اپنے زمانہ کے فتنوں سے متاثر ہو کر ان حقیقتوں اور صداقتوں ہی میں ترمیم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اگر ان حضرات کے نزدیک میں تجدد کا مجرم ہوں تو براہ کرم مجھے تعین کے ساتھ بتائیں کہ کہاں میں نے دین کے جوہر میں تغیر کیا ہے،

اصل سوال کا جواب آیندہ دیا جائیگا اس وقت صرف اس قدر عرض ہے کہ "ان حضرات" کے نزدیک حضرت مجیب تجدد کے مجرم ہوں یا نہ ہوں لیکن جناب مجیب بزعم خود دعوائے **تجدید** کے مجرم تو علانیہ اپنے قلم سے ہو رہے ہیں، کیونکہ وہ اپنے مقالات فقہی، مسائل کلامی اور رسائل سیاسی کو **تجدید** گمان کرتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب ان کے یہ چند سالہ کارنامے تجدید دین ہیں تو وہ اس صدی کے مجدد بننے کے بھی مدعی بن رہے ہیں اور یہ "حضرات" یہ کہتے ہیں،

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ　　　کہ عنقا[1] را بلند است آشیانہ

[1] یعنی دعوائے تجدید،

مقالات

شہری مملکت مکہ

از ڈاکٹر محمد حمید اللہ استاذ قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ،

ہر زمانہ اور ہر ملک میں، قدیم مصر سے لے کر جدید امریکا تک، انسانی ذہنیت کی عظیم ترین ترقی، جدت پسندی اور کارگذاری شہری زندگی بسر کرنے والوں ہی میں نظر آتی رہی ہیں، جب تک لوگ چرواہوں یا کسانوں کے پیشوں پر اکتفا کرتے رہے اُس وقت تک معاشی فرائض کی تقسیم کے لئے کوئی خاص ترغیب نہیں پائی جاتی تھی اور لوگوں کی توانائیاں تمامتر غذا حاصل کرنے کی کوشش میں صرف ہوجایا کرتی تھیں، جب سے "شہر" وجود میں آیا تقسیم کار بھی ہونے لگا، معاشی بچت کے امکانات بھی پیدا ہوگئے اور یہیں سے دولت، فرصت، تعلیم، ذہنی ترقی اور علوم و فنون کی توسیع ہونے لگی[1]

اس مقالہ[2] کا منشا صرف یہ ہے کہ علمی دنیا کو ایک ایسی زرخیز زمین کی تحقیق کے لئے متوجہ کیا جائے جسے اب تک بالکل ہی نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، اسلام نے جس حیرت انگیز تیزی سے توسیع حاصل کی اور اس کے آغاز ہی میں شہری مملکت مکہ کے غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ باشندوں سے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف سوشیل سائنس تحت عنوان سٹی city (شہر) از ولیم منرو [2] مقالہ جو دسمبر ۱۹۳۷ء میں تریونڈرم میں اورنٹیل کانفرنس میں سنایا گیا،

جتنے کثیر غیر معمولی طور سے قابل مدبر پیدا ہوئے وہ ایسے حقائق ہیں جن کا کچھ نہ کچھ پس منظر ہونا ناگزیر ہے، نپولین (ناپویون) نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ عرب مسلمانوں کی بہادری کا راز غالباً اس واقعہ میں پوشیدہ تھا کہ اسلام سے پہلے ان میں بڑے طویل عرصہ سے خانہ جنگیاں ہوتی رہی تھیں، جنھوں نے ان میں بعض اوصاف پختہ کر دیئے ہوں گے،[۱] ۱۹۳۵ء میں سوربون (پیرس) میں ایک پبلک لکچر دیتے ہوئے میں نے یہ چیز واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ آغاز اسلام کے وقت پورے جزیرہ نمائے عرب میں ایک معاشی وفاق قائم ہو چکا تھا جس کا باعث وہاں کے سالانہ میلے اور وہاں کے کاروانوں کا نہایت ترقی یافتہ نظام خفارہ (بدرقہ) تھے، بہ ظاہر یہ معاشی وفاق نیز یہ واقعہ کہ پورے ملک میں ایک ہی بولی بولی جاتی تھی، ایک ہی طرح سے وہ فال دیکھا کرتے تھے، مختلف بتوں یا دیوتاؤں کو وہ مشترکہ طور سے مانتے تھے، اور بڑی حد تک ان کے رسم و رواج بھی یکساں ہی تھے، اس لئے ان چیزوں نے سیاسی اتحاد کے لئے بہت کچھ زمین ہموار کر دی، اور جب اسلام آیا تو اس نے جزیرہ نمائے عرب کے مزاج میں بڑی تیزی سے ایک مرکزیت پیدا کر دی، اب میں ایک دوسرا نظریہ اضافہ کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ شہر مکہ کے باشندوں نے اپنی شہری مملکت کے لئے ایک ترقی کناں دستور اسلام سے خاصا عرصہ قبل بنا لیا تھا جس کے ذریعہ سے ان کو اس بات کی تربیت مل چکی تھی کہ آیندہ اسلامی دور میں عربی شہنشاہیت کے نظم و نسق کو چلا سکیں، یہ شہنشاہیت بیس ہی سال کے عرصہ میں مدینہ کی چھوٹی سی شہری مملکت سے پھیلتے ہوئے رومی ایرانی اور دیگر حکومتوں پر ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تین براعظموں میں چھا گئی تھی، یورپ کے سلسلے میں یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ۲۷ھ مطابق ۶۴۷ء میں خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اسلامی فوجیں اسپین میں گھس چکی تھیں اور کئی نسلوں کے بعد طارق کے آنے اور فتح

---

[۱] ناپویون کی نوشتہ فرانسیسی "یادداشت جزیرۂ سینٹ ہیلینا جلد ۳ ص ۱۰۳،

کو مکمل کرنے تک وہیں قابض و مقیم تھیں [۱]

عرب کی شہری مملکتوں کا مطالعہ ابھی کچھ سنجیدہ طور سے شروع نہیں کیا گیا ہے، اس غرض کیلئے میں مکہ کے سوا کسی اور شہر کا بھی انتخاب کر سکتا تھا، مثلاً طائف، دومۃ الجندل، تیما، سبا، عدن، صحار وغیرہ، لیکن مکہ کے انتخاب کے ایک سے زیادہ وجوہ ہیں، مثلاً مکہ کے متعلق ہمارے معلومات دیگر شہروں کے مقابلہ میں زیادہ یقینی اور زیادہ کثیر ہیں، مکہ اسلام کا گہوارہ تھا، یہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا اور بڑے ہوئے تھے یہیں آپ کی تبلیغی زندگی کا بڑا حصہ صرف ہوا تھا، اور اولین اسلامی شہنشاہیت کی قریب قریب تمام نمایاں ہستیاں اسی شہر میں پیدا ہوئیں، اور یہیں تربیت پائی تھی، مزید براں یہی وہ شہر تھا جس پر قبضہ کے لئے تین ہمعصر شہنشاہیتوں میں رقابت چلی آرہی تھی، رومی، ایرانی اور حبشی تینوں اس پر قبضہ کے خواہشمند تھے، اگر کتاب التیجان کے مؤلف ابن ہشام کی بات پر یقین کیا جائے تو سکندر ذوالقرنین [۲] تک نے ضروری خیال کیا تھا کہ اس شہر کے معبد یعنی کعبہ کی زیارت کرے [۳]،

ابھی بیان ہوا کہ رومی، ایرانی اور حبشی تینوں سلطنتیں مکہ پر قبضہ کی خواہشمند تھیں، چنانچہ رومیوں کے سلسلہ میں یہ ایک واقعہ ہے کہ ایلیوس گالوس کے زمانہ سے نیرو کے زمانہ تک ہر رومی شہنشاہ کی یہ تمنا رہی کہ اپنا اثر و نفوذ کسی طرح مکہ تک پھیلا دے، چنانچہ اس کے لئے متعدد کوششیں عمل میں لائی جاتی رہیں [۴]، ابن قتیبہ کی بات پر اگر اعتبار کیا جائے تو قیصر روم نے

---

[۱] تاریخ طبری سلسلہ ص ۱۰۲۰ نیز دیکھئے گبن کی انگریزی تاریخ انحطاط و زوال روما جلد ۵ ص ۵۵ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس [۲] میرے خیال میں "ذوالقرنین" (یعنی دو سینگوں والا) کا لقب سکندر اعظم کو عربوں کی طرف سے دیئے جانے کا اصلی باعث یہ تھا کہ مقدونیہ والے ایک ٹوپی پہنا کرتے تھے جس پر دو سینگیں ہوتی تھیں، ان کا یہ قومی لباس اب تک باقی ہے، چنانچہ ۱۹۳۴ء میں جب یوگوسلافیا کے بادشاہ الگزنڈر کو مارسیلز میں قتل کر دیا گیا تو اس کی لاش کے نزدیک اس کے تمام شاہی زیوروں وغیرہ کیساتھ اسکی دو سینگوں والی ٹوپی بھی رکھی گئی تھی (اروم ذات القرون" کی اصطلاح نیز دیکھئے بلاذری کی فتوح البلدان طبع مصر ص ۵۱) [۳] نیز دیکھئے عینی شرح بخاری ۲۶۵ اور ازرقی کی اخبار مکہ بر موقع، [۴] لامنس فرانسیسی کتاب مکہ ہجرت سے پہلے صفحہ ۲۴۹ و ۲۴۳،

خود قصی کو مدد دی تھی کہ مکہ پر وہ قبضہ کرلے[1]، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں قصی نے خود مختاری برتنی شروع کردی اور رومی مفادات نظر انداز کرنے شروع کردیئے، چنانچہ چند نسلوں بعد جب مکہ کے عثمان بن الحویرث الاسدی نے عیسائیت قبول کی تو قیصر روم نے اسے ایک تاجِ شہریاری سے سرفراز کیا اور ایک فرمان دے کر مکہ روانہ کیا جس میں حکم تھا کہ مکہ والے اُسے اپنا بادشاہ تسلیم کریں، عثمان کے لئے بڑے اچھے مواقع حاصل تھے، کیونکہ مکہ والے غلہ اور دیگر ضروریات اور نیز اپنے تجارتی کاروانوں کے لئے مصر، فلسطین اور شام کے رومی صوبوں کے دست نگر تھے اور وہ آسانی سے فرمانِ قیصری کو نظر انداز نہیں کرسکتے تھے، لیکن عین لمحۂ آخر میں عثمان ہی کے ایک رشتہ دار نے جلسہ میں اٹھ کر اعتراض کرنا شروع کردیا اور کہا کہ مکہ کے آزاد باشندے بادشاہت اور امرائیت کی بدعتوں کو کیسے قبول کرسکتے ہیں، اور اس خیال کا خوب ہی مضحکہ اڑایا اور دم کے دم میں جلسہ کی رائے بدل گئی، عثمان بیزار ہوکر شام واپس چلا گیا اور قیصر روم نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ اپنی قلمرو مکہ والوں کے لئے بند کردی اور ان کے جو تاجر اس وقت وہاں تھے ان کو قید کرلیا[2]، (یہ واقعہ غالباً اس کے بعد پیش آیا ہوگا جب قیصر نے آنحضرت صلعم کے پردادا ہاشم کو اس بات کا منشور عطا کیا تھا کہ وہ تجارت کے لئے شام آیا کریں، نیز ایک سفارشی خط نجاشیِ حبش کے نام دیا تھا کہ وہ بھی مکہ والوں کے کاروان کو اپنے ملک میں آنے دیا کرے[3]) قیصر اس وقت اس سے زیادہ اور کچھ نہ کرسکا کیونکہ ایران سے جنگ چھڑ گئی تھی، الواحدی نے کتاب اسباب النزول[4] میں بیان کیا ہے کہ مدینہ کا ابوعامر راہب وہاں والوں کو

---

[1] معارف ابن قتیبہ طبع یورپ ص ۳۱۳ [2] الفاسی طبع یورپ ص ۱۴۴ اسہیلی کی الروض الانف ۱/۱۴۶ لامنس کی مذکورۂ بالا کتاب مکہ ص ۲۶۷، اسپرنگر کی جرمن سیرۃ وتعلیمات محمدی جلد ۱ ص ۸۹ تا ۹۰ [3] تاریخ یعقوبی ۱/۲۸۰ تاریخ طبری ص ۱۰۸۹، طبقات ابن سعد جلد ۱ حصہ اول ص ۴۳ و ۴۵، لسان العرب تحت کلمہ "ایلاف" لامنس کی مذکورہ کتاب مکہ ص ۱۲۸ وغیرہ، تفسیر طبری وغیرہ میں سورۂ ایلاف کی تشریح [4] اسباب النزول ص ۱۹۵،

یہ کہکر دھمکایا کرتا تھا کہ "میں قیصر کی فوجیں بلوالوں گا"

قریش کا رحلۃ الشتاء والصیف

کاروانی راستے

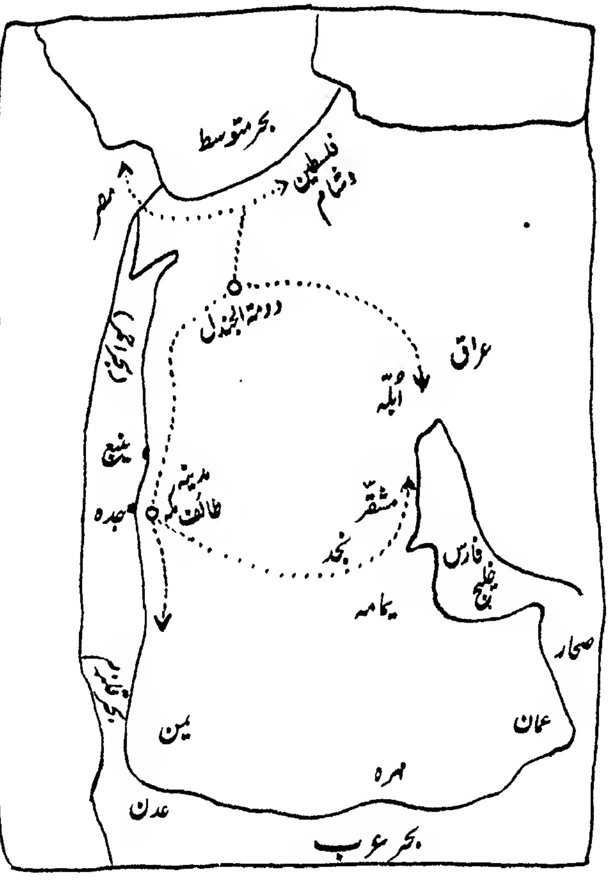

ایرانیوں کے سلسلہ میں تاریخیں بتاتی ہیں کہ یمن کی فتح کے بعد وہ خیال کرنے لگے تھے کہ مکہ خود بخود ان کے اقتدار میں آچکا ہے، چنانچہ خسرو ایران نے ایک مرتبہ گورنر یمن کے نام حکم لکھ بھیجا تھا کہ جناب رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایران جاکر شہنشاہ سے ملنے کی ہدایت کرے اور اگر رسولِ عربیؐ اس سے انکار کریں تو آپ کو گرفتار کر کے مدائن روانہ کرے[1]

حبشیوں کے سلسلہ میں یہ مشہور واقعہ ہے کہ انھوں نے مکہ پر ایک چڑھائی کی تھی[2] جس میں ابرہہ اپنے مشہور ہاتھی محمود[3] کے ساتھ کمان کر رہا تھا،

اس قسم کے بیشمار تذکرے عرب مولفین کے ہاں ملتے ہیں کہ مکہ کے اور دیگر اقطاعِ عرب کے معززین قیصرِ روم، کسرائے ایران، نجاشیِ حبش وغیرہ بیرونی حکمرانوں کے ہاں باریاب ہوا کرتے تھے، ان واقعات سے بھی اس بات کا ثبوت مل سکتا ہے کہ یہ حکمراں جزیرہ نمائے عرب کے اندرونی حصہ میں مسالمانہ ذرائع سے اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کیا کرتے تھے،

جغرافیۂ شہر جزیرہ نمائے عرب کا شمالی اور مغربی حصہ زیادہ تر بنجر اور صحرا ہے، ایک چھوٹا سا نخلستان اور چشمہ بھی ہو تو لوگوں کو وہاں آکر بس جانے کے لئے کافی ہوتا ہے اور اگر کسی تجارتی راستہ پر ایسے قدرتی انتظامات پائے جائیں تو وہاں کسی بستی کے بس جانے کے لئے اور بھی زیادہ سہولت ہوتی ہے، مکہ کاروانی راستوں پر ایک اہم اسٹیشن تھا اور کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ

---

[1] تاریخ طبری ص ۱۵۷۲ و مابعد [2] دیکھئے کسی تفسیر میں سورۂ فیل نیز فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک سنہ ۱۹۱۱ء ص ۵ تا ۱۳۶ اور اطالوی رسالہ R.S.O جلد ۹ ص ۲۷۸ و مابعد میں کونتی روسینی کے مضامین عرب میں حبشیوں کی خانہ جنگیوں کے متعلق، نیز لامنس کی کتاب مکہ ص ۲۸۰ و مابعد، [3] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۹ و مابعد، معلوم نہیں کہ حبشیوں نے محمود کا عربی نام کیوں رکھا تھا، شاید یہ لفظ MAMMOTH کا معرب ہو، جو ایک گرانڈیل قسم کے ہاتھی کو کہتے ہیں،

کے زمانہ میں یہ ایک آباد شہر تھا جہاں وہ آیا جایا کرتے تھے، عرب مؤلفین[۱] ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ اس زمانہ میں گھنے جنگل اور اچھی چراگاہیں اس وادی میں پائی جاتی تھیں جہاں مکہ بسا ہوا ہے[۲] رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جد اعلیٰ قصیٰ نے جنگل کا بڑا حصہ صاف کر دیا[۳]، تاکہ اپنے اور اپنے قبیلہ والوں کے گھروں کے لئے معبد کعبہ کے اطراف جگہ فراہم کی جائے، بعد کے زمانوں کے متعلق بھی ہمیں اسی طرح کے ثبوت ملتے ہیں[۴]، خود آج بھی بو اہیر کی رباط مکہ معظمہ میں اتنی شاندار ہے کہ وہ وادی غیر ذی زرع[۵] کے کسی مکان کی جگہ بمبئی کو ملیبار ہل کے کسی قصر سے مشابہ ہے، مکہ تجارت کے لئے شام، یمن اور طائف و نجد جانے والے کاروانوں کا جنکشن تھا اور چشمۂ زمزم کے قریب آباد ہوا تھا، اور ہر طرف بلند اور ناقابلِ تسخیر پہاڑیوں نے اُسے جنگی نقطۂ نظر سے بھی محفوظ بنا دیا تھا، اس کی ابتدائی تاریخ بہت دھندلی ہے، وہاں کی سیاسی زندگی سے آیندہ باب میں بحث ہوگی، جس مقام پر اور جس طور سے شہر بسا تھا اس کی کچھ تفصیلیں یہاں بیان کی جاتی ہیں،

قدیم یونانی شہروں کے دو حصے ہوتے تھے "پولس" اور "استو" یعنی بلند اور پست حصہائے شہر، نامعلوم زمانہ سے مکہ بھی دو حصوں میں بٹا ہوا ہے؛ معلات اور مسفلہ - اور یہ تقسیم آج تک پائی جاتی ہے، کسی قدیم تر زمانہ میں ان دونوں حصوں کا نام بکہ اور مکہ رہا ہوگا، چنانچہ ازرقی[۶] نے اپنی تاریخ مکہ میں بیان کیا ہے کہ بکہ وہ مقام ہے جہاں معبد تعمیر ہوا ہے اور مکہ پوری بستی کا نام ہے، قرآن مجید

---

[۱] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۴۰ نیز کتاب الاغانی ۱۳/۱۰۸ [۲] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰، تاریخ طبری ص ۱۰۹۹، قطب الدین کی الاعلام باعلام بلد اللہ الحرام ص ۴۳ [۳] جرہمی دور کے لئے دیکھئے ازرقی کی اخبار مکہ ص ۴۷ [۴] قرآن مجید ۱۴/۳۷ میں مکہ کے جائے وقوع کو یہ نام دیا گیا ہے، کیونکہ وہاں کوئی زراعت نہیں ہوتی، اگرچہ حالیہ زمانوں میں نہر زبیدہ کے باعث شہر میں سرسبزی نظر آنے لگی ہے اور سعودی دور میں باغات بھی ترقی کرنے لگے ہیں [۵] اخبار مکہ ص ۱۹۶ سطر ۱۲ "بکۃ موضع البیت ومکۃ القریۃ"۔

نقشہ شہر مکہ

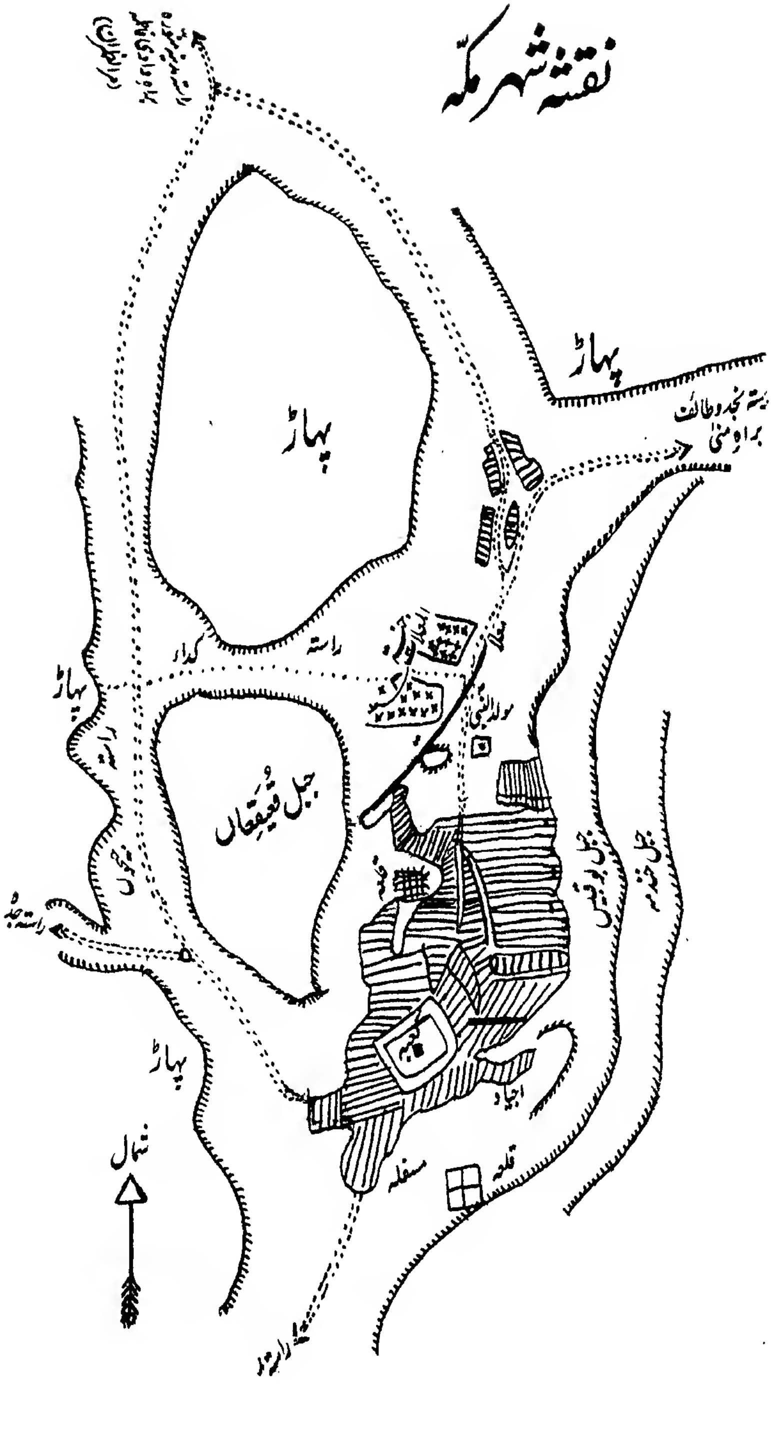
پہاڑ
پہاڑ
راستہ نجد و طائف براہ منیٰ
پہاڑ
راستہ کدا
معلا
مولد النبی
جبل قیقعان
جبل ابو قبیس
جبل خندمہ
راستہ جدہ
پہاڑ
کعبہ
اجیاد
شمال
مسفلہ
قلعہ

ہیں بھی اس کی تائید ہوتی نظر آتی ہے، چنانچہ ایک آیت میں ہے، "وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لئے (بغرض عبادت) بنایا گیا وہ وہ ہے جو بکہ میں ہے"[1] اور ایک دوسری آیت میں ہے، "یہ وہی تھا جس نے ان کو تم پر حملہ کرنے سے اور تم کو ان پر حملہ کرنے سے وادی مکہ میں روک دیا تھا"[2] مکتین[3] (دو مکے) کی اصطلاح، قریتین[4] (دو شہر) کے معنوں میں ابن ہشام نے استعمال کی ہے جس سے مکہ اور طائف کی دو ہمشیر بستیاں مراد لی گئی ہیں، اس سے بھی اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے،

ظاہر ہے کہ معززین محلات میں رہتے تھے اور شہر کی عبادت گاہ اور قبرستان بھی وہیں آباد تھے، تاریخ ہمیں یقین دلاتی ہے[5] کہ جب قصی نے مکہ پر قبضہ کیا تو اپنے تمام رشتہ داروں کو ظواہر یعنی مضافات شہر سے بطحا یعنی مرکز شہر میں منتقل کر دیا تھا اور عبادت گاہ یعنی کعبہ کے سامنے ہی دار البلد تعمیر کیا جس کا نام دار الندوہ یعنی مشورہ گاہ رکھا گیا،[6] مکہ کی عبادت گاہ (یعنی کعبہ) دیوتاؤں کا ایک آماجگاہ (دیوستھان) (PANTHEON) بن گیا تھا جہاں (۳۶۰)[7] بت تھے جو مختلف قبائل[8] کے معبودوں کی نمایندگی کرتے تھے، لات اور عزیٰ[9] اصل میں علی الترتیب طائف اور نخلہ کے لوگوں کی دیویاں تھیں اور کعبہ کے احاطہ میں بھی ان کے مثنی (DUPLICATES) پائے جاتے تھے اور مکہ والوں کے نزدیک بھی ان دیویوں کا بڑا احترام تھا،[10]

لہ قرآن مجید ۳/۹۶ ۲ے ایضاً ۴۸/۲۴ ۳ے سیرۃ ابن ہشام ص ۱۲۱ و ۹۱۰ ۴ے قرآن مجید ۳۱/۴۳ نیز کامل المبرد ص ۲۹۱، بلاذری کی کتاب (انساب الاشراف، بحوالہ لامنس) صفحہ ۳۴ و ۳۷ ۵ے سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰ ۶ے قطب الدین کی کتاب مذکورہ ص ۴۴ ۷ے ازرقی کی اخبار مکہ ص ۷۴ تا ۷۸، ابو نعیم کی المنتقی مخطوطہ بزم ادب حیدرآباد دکن ورق نمبر ۲۰ تا نمبر ۱۲۰۶ ۸ے دیورنژے کی فرانسیسی کتاب عرب ص ۱۰۱ عمود اول ۹ے یہ بت بہت چھوٹے ہوں گے، چنانچہ تاریخ طبری ص ۱۳۹۵، اور کتاب الاغانی ۱۴/۱۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ احد کے دن ابو سفیان ان کو اٹھائے لئے جا رہا تھا ۱۰ے سیرۃ ابن ہشام ص ۵۵ کلبی کی کتاب الاصنام بر موقع،

یونانی شہروں ہی کیطرح[1] مکہ کے اطراف بھی ایک ماتحت سرزمین تھی جسے حرم کہتے تھے اور جو تخمیناً سوا سو مربع میل پر مشتمل تھی[2]، اسلام نے حدودِ حرم میں مزید توسیع کردی اور شہر کی وہ سرحدیں قرار دیں جو اب "میقات" کہلاتی ہیں اور جہاں سے حاجیوں کو اپنا معمولی لباس اتار کر احرام پہننا پڑتا ہے،

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس زمانہ میں مکہ میں کوئی بازی گاہ، گھوڑدوڑ کا میدان، کسی مہم پر روانہ ہونے کے لئے فوج کا اجتماع گاہ اور محصورہ و محفوظ چراگاہیں (حمی) تھیں یا نہیں، مدینہ وغیرہ دوسرے شہروں کی حد تک البتہ ان چیزوں کا کافی پتہ چلتا ہے، مکہ کے ایک محلہ کا نام اُجیاد ہے جس کے معنی اچھی نسل کے گھوڑوں کے ہیں، اگرچہ یاقوت وغیرہ اس کی وجہ تسمیہ کچھ اور بتاتے ہیں لیکن ممکن ہے کہ اس کو گھوڑدوڑ سے بھی کچھ تعلق رہا ہو،

پروفیسر ہیالیڈے نے یونانی شہری مملکتوں پر اپنے دلچسپ مضمون میں لکھا ہے کہ

"جب وہ پُرآشوب دور ختم ہوگیا جس میں ترکِ وطن کے عظیم الشان سلسلے جاری تھے تو بجائے اس کے کہ جنگ ایک عادتی حالت سمجھی جائے، ہمہ گیر امن کا دور دورہ ہوگیا اور خانہ بدوشی کی جگہ بستیوں میں توطن اختیار کیا جانے لگا،

لیکن یہ شہر کس طرح وجود میں آئے؟ قدیم ترین بستیاں بے شبہ گاؤں میں ہوئی ہونگی...... بہرحال عام طور پر چند دیہات کے مجموعہ نے اس چیز

---

[1] فلیپسن کی انگریزی کتاب "قدیم یونان اور روما میں بین الممالک قانون اور رواج" جلد ۱ ص۲۵، وارڈ فاؤلر کی انگریزی کتاب "شہری مملکت" بر موقع، ہیالیڈے کی ہسٹری آف دی ورلڈ شائع کردہ ہیامرٹن، باب یونانی شہری مملکتیں صفحہ ۱۱۰ [2] حدود حرم کا جو ذکر ازرقی ص ۳۰ تا ۶۱، اور احمد بن محمد الحضراوی کی العقد الثمین فی فضائل البلد الامین (مطبوعہ قاہرہ ۱۲۹۰ھ) ص ۱۳ میں ہے، اس سے یہ اندازہ کیا گیا،

کو مناسب پایا ہوگا کہ کسی پہاڑ یا خود میدان میں اچھی طرح مدافعت کئے جانے کے قابل مقام کو قلعہ بنا کر مستحکم کرے تاکہ اگر کسی موسمِ گرما کی لوٹ کے لئے نکلی ہوئی ہمسایوں کی ٹکڑی ان پر لوٹ پڑے تو اپنے بیوی بچوں اور جانوروں کو وہاں حفاظت کے لئے بھیج سکیں . . . . . اس قلعہ میں دیوتا کا مندر اور بادشاہ کا محل بھی عموماً ہوا کرتے تھے، اس کے بعد ایک نیا رجحان یہ پیدا ہوا کہ عوام اپنے دیہات کو چھوڑ کر پناہ لینے کیلئے شہر کے قریب رہنے لگیں اور وہاں سے روزانہ اپنی کھیتیوں کو جانے لگیں، معززین کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ بادشاہ کے آس پاس اور حکومت کے مرکز میں رہیں، اس طریقہ سے بلند حصۂ شہر یا قلعہ کے اطراف ایک پست حصۂ شہر آباد ہونے لگا، اور رفتہ رفتہ پست حصۂ شہر کے اطراف ایک شہر پناہ یا فصیل بھی تعمیر ہونے لگی۔[۱]

قریب قریب یہی صورتِ حال حجاز کی بھی تھی،

مکہ جس مقام پر آباد ہے وہاں ایک گہری وادی ہے، جس کے چاروں طرف اونچے اور ناقابلِ عبور پہاڑ ہیں، شہر میں صرف ایک شاہراہ ہے جو ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف نکل جاتی ہے، ذیلی راہیں شہر میں آنے جانے کے لئے صرف دو ہیں[۲] یہاں کے باشندوں کو اس بات کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ کوئی فصیل بھی تعمیر کریں، اس کے باوجود ہمیں قطب الدین کی تاریخ مکہ میں حسب ذیل ذکر ملتا ہے:

قدیم زمانوں میں مکہ میں بھی شہر پناہ کی دیواریں پائی جاتی تھیں، چنانچہ معلّات کے رُخ جبل عبداللہ بن عمر اور اس کے سامنے کے پہاڑ کے مابین ایک وسیع دیوار پائی جاتی تھی، اس میں ایک دروازہ تھا جس پر لوہے کے پتر جڑے ہوئے تھے، یہ ہندوستان

---

[۱] ہسٹری آف دی ورلڈ ملٹن[۲] مرآۃ الحرمین ۱/۱۸۷ نیز دیکھئے کوئی نقشۂ شہر مکہ،

کے ایک بادشاہ نے امیر مکہ کے پاس بطور تحفہ روانہ کیا تھا۔۔۔۔۔ ایک اور دیوار مسفلہ کے رخ میں بھی درب الیمن نامی محلہ میں تعمیر کی گئی تھی۔۔۔۔ تقی الفاسی نے بیان کیا ہے کہ "معلاۃ میں مذکورۂ بالا دیوار کے علاوہ ایک اور دیوار بھی تھی۔۔۔۔۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ مکہ کی یہ دیواریں کب تعمیر ہوئی تھیں نہ یہ کہ ان کو کس نے تعمیر کیا تھا اور نہ یہ بھی کہ ان کی مرمت کس نے کی تھی" میں نے بعض تاریخوں میں دیکھا ہے کہ عباسی خلیفہ المقتدر کے زمانہ میں ایک دیوار پائی جاتی تھی۔[1]

یہ دیواریں غالباً اسلام سے پہلے کی انہی بھدی دیواروں کی جگہ نئے سرے سے تعمیر کی گئی ہونگی وادی مکہ میں سب سے کشادہ اور مسطح مقام شروع ہی سے قومی عبادت گاہ کے لئے محفوظ رہا، عرب مولفین[2] ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ اس وادی کے پرانے باشندے اتنے وہمی تھے کہ بیت اللہ (کعبہ) کے قریب اپنے رہنے کے لئے کوئی عمارت تعمیر کرنی روا نہیں رکھتے تھے، مکانات انھوں نے مضافات شہر میں بنوائے اور کعبہ کے قریب صرف خیمے لگائے جاتے تھے، مورخین کا یہ بھی بیان ہے کہ وہ پہلا شخص جس نے عبادت گاہ کے اطراف گھر تعمیر کئے وہ قصی تھا، اس جدت یا بدعت پر عوام کو آمادہ کرنے کے لئے اس نے یہ استدلال کیا کہ

"اگر تم عبادت گاہ کے اطراف رہنے لگو تو لوگ تم سے ڈرا کریں گے اور لوٹ مار کے لئے تم پر حملہ کرنے سے باز آجائیں گے"

یہ کہہ کر قصیٰ نے سب سے پہلے خود ہی اپنے لئے مکان تعمیر کیا، جس میں قومی مشورہ گاہ یعنی دارالندوۃ بھی تھا، یہ کعبہ کے شمالی رخ تعمیر ہوا۔۔۔۔۔ اور کہتے ہیں کہ وہ اس جگہ تھا جہاں آجکل حنفی مصلیٰ

---

[1] قطب الدین کی کتاب مذکورۂ بالا ص، [2] تاریخ طبری ص ۱۰۹۰، نیز قطب الدین کی کتاب مذکورہ ص ۴۴،

بنا ہوا ہے[1]، مکہ کی اس عبادت گاہ کے باقی تین طرف جو زمین تھی وہ قصیّ نے قریشی قبائل میں بانٹ دی جہاں انھوں نے اپنے رہنے کے گھر تعمیر کر لئے[2]،

سیاسی نظام | مکہ پر خزاعیوں کی حکومت تھی، قصیّ نے ان کے سردار کی بیٹی سے شادی کی اور جب وہ مرگیا تو قصیّ سرداری کی وراثت کا دعویدار بن گیا، قصی کا تعلق قبیلۂ قضاعہ سے تھا، چنانچہ اس خانہ جنگی میں قبیلۂ قضاعہ نے قصیّ کی مدد کی، اور اگر ابن قتیبہ کی بات پر یقین کیا جائے تو خود قیصر روم[3] نے بھی قصیّ کو مدد دی، جس کا منشاء بظاہر یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے عرب کے اندر اپنے اثرات بڑھائے اور ہندوستان سے خشکی کی راہ ہونے والی تجارت کے گذرگاہ کو اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لے،

سرداری حاصل کرنے کے بعد قصیّ[4] کو وہاں متعدد سیاسی ادارے موجود ملے ہوں گے مثلاً معبدِ کعبہ کی تولیت کا عہدہ وغیرہ، کوئی تعجب نہیں جو اس ذہین شخص نے خود بھی چند نئے ادارے قائم کئے ہوں تاکہ اپنے اقتدار کو محفوظ و مستحکم کرے، لیکن یہ معلوم کرنا مشکل ہوگا کہ قصی کے زمانہ میں جن دس[5] سرکاری عہدوں کا مکہ میں پتہ چلتا ہے، ان میں سے کتنے قصی کے قائم کردہ تھے اور کتنے قدیم ادارے ہی تھے، شہر میں ایک دارالندوہ[6] بنانا اور رفادہ[7] کے نام

---

[1] قطب الدین کی کتاب مذکورہ ص ۴۳ [2] ایضاً [3] معارف ابن قتیبہ ص ۳۱۴ (مطبوعۂ یورپ)
[4] قصیّ کے حالات کے لئے دیکھئے مارٹن ہارٹ مان کا مضمون جرمن رسالہ اشوریات Z. F. Ass YRIOLOGIE) جلد ۲ ص ۴۳ تا ۴۹ [5] ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/۴۵ تا ۴۶، اور زبیر بن بکار کی انساب قریش مخطوطہ استنبول جس کا حوالہ لامنس نے اپنی فرانسیسی کتاب مجلس سہ گانہ (FRIU-MVIRAT) ص ۱۴ میں دیا ہے [6] ابن ہشام ص ۸۰، ۸۳ طبری ص ۱۰۹۹ ابن سعد جلد اول حصہ اول ص ۴۹، اور اخبار مکہ مطبوعۂ یورپ مولفہ ازرقی ص ۶۵ [7] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۳ تاریخ طبری ص ۱۰۹۹ طبقات ابن سعد جلد حصہ اول ص ۴۱ جغرافیہ

سے ایک سالانہ محصول باشندگانِ شہر پر عائد کرنا صراحت کے ساتھ قصی کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ نسی، اجازہ، اور افاضہ کے ادارے قدیم خانوادوں ہی کے ہاتھ میں رہنے دیئے گئے تھے[1] بہرحال، عام طور پر قصی کے ہاتھ میں چھ عہدوں[2] کا ہونا بیان کیا جاتا ہے، یہی عہدے اہم ترین تھے اور آمدنی کا ذریعہ بھی اُن ہی سے تھا۔

ابن عبدربہ[3] اور دیگر مولفین بیان کرتے ہیں کہ مکہ میں دس ہی سرکاری عہدے تھے جن کو دس قبائل کے سردار موروثی طور سے انجام دیا کرتے تھے، ممکن ہے کہ یہ عہدے ابتدا میں دس ہی رہے ہوں، جیسا کہ وینیس اور پالمیرا میں تھا، چنانچہ شابو[4] کے حوالے سے لامنس[5] نے بیان کیا ہے کہ

دس ارکان کی ایک مجلس ہوتی تھی جو دس بڑے خانوادوں کے سرداروں پر مشتمل ہوتی تھی، کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پالمیرا میں اس طرح کی ایک مجلس موجود اور کارفرما تھی جس کے علاوہ ایک مجلس عام یا سینیٹ بھی تھی جس کا اپنا صدر اور اپنا معتمد ہوا کرتا تھا، مجلس دہگانہ اور سینیٹ قانون بناتے، قوانین مالی کے نفاذ کی نگرانی کرتے اور ضرورت پر سزاؤں کے احکام دیتے، . . . .

جس کے بعد لامنس نے بیان کیا ہے کہ

"یہ لاحاصل کوشش ہوگی کہ اس کے مماثل کسی ادارے کی تلاش ہم مکہ کے نظام میں کریں"

حقیقت میں ہمیں دس سے بہت زیادہ اداروں کا پتہ چلتا ہے جن کی تفصیل عرب مولفوں کی کتابوں کی ورق گردانی پر معلوم ہو سکتی ہے، خود ابن عبدربہ نے اگرچہ صراحت سے بیان کیا ہے کہ مکہ میں سردار دس ہی تھے، لیکن خود اسی مؤلف نے سترہ عہدوں کے نام گنائے ہیں اور بعض

---

[1] تاریخ طبری ص ۱۱۲۴، سیرۃ ابن ہشام ص ۷۶، ۷۷، ۸۰، [2] ازرقی ص ۶۶ (امورستہ) [3] العقد الفرید ۲/۴۶ تا ۴۷ [4] شابو (CHABOT) کی فرانسیسی کتاب پالمیرا کے کتبوں کا انتخاب ص ۲۲ وغیرہ [5] لامنس کی کتاب مکہ ص ۶۹

سرداروں کو ایک سے زیادہ عہدوں پر مامور بتایا ہے۔ ان سترہ عہدوں پر ہم موجودہ مواد سے چار پانچ اور عہدوں کا بڑی آسانی سے اضافہ کر سکتے ہیں، چنانچہ ان کی ایک فہرست یہ ہے:-

(۱) ندوہ (۲) مشورہ (۳) قیادہ (۴) سدانہ (۵) حجابہ (۶) سقایہ (۷) عمارۃ البیت (۸) افاضہ (۹) اجازہ (۱۰) نسئی (۱۱) قبہ (۱۲) اعنۃ (۱۳) رفادہ (۱۴) اموال محجرہ (۱۵) ایسار (۱۶) اشناق (۱۷) حکومہ (۱۸) سفارہ (۱۹) عقاب (۲۰) لواء (۲۱) حلوان النفر،

مجلس دہگانہ کے الجھے ہوئے مسئلہ کو نظر انداز کر کے میں چاہتا ہوں کہ شہری مملکت مکہ کے دستور کی ساخت اور کارکردگی کو اپنے طور پر واضح کردوں،

چنانچہ اولاً آبادی یا شہریوں کو "جماعۃ"[۱] کا نام دیا جاتا تھا، یہ لفظ جناب رسالت مآب صلعم نے بھی برقرار رکھا اور اس سے مراد آپ کے زمانہ میں آپ کے متبعین کی پوری جماعت ہوتی تھی جو باقی دنیا سے ممتاز ایک وحدت تھی اور بحرین کے حکمران کے نام جو مکتوب نبویؐ گیا،[۲] اس میں بھی اسے دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس "جماعت" میں شریک ہو جائے۔ "ملت"[۳] کا لفظ سیاسی سے زیادہ مذہبی مفہوم رکھتا تھا، قرآن مجید میں "قوم"[۴] کا لفظ ایک وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے، اور اس میں نہ صرف عام رائے دہندگان شہر بلکہ ایک حد تک جملہ ساکنین ملک شامل معلوم ہوتے ہیں، جن لوگوں کو حق رائے حاصل ہوتا تھا اور وہ شورائے عمومی میں حصہ لینے کے مجاز ہوتے تھے اُن کو قرآن میں ہمیشہ "ملأ"[۵] کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اور یہ "ملأ" کی "تراضی" یعنی رضامندی ہی ہوتی تھی جس کے مطابق مقامی حکمراں فیصلہ کرتا، چنانچہ قرآن مجید میں بھی لفظ تراضی استعمال

---

[۱] مغازی واقدی صہ ۵۹ سطر ۳ ۵۲ طبقات ابن سعد جلد ۲ حصہ اول ص ۲۷، حمید اللہ کی فرانسیسی کتاب "اسلامی سیاست خارجہ بہ عہد نبویؐ وخلافت راشدہ" ص ۴۸، نیز الوثائق السیاسیہ برموقع

[۳] دیکھئے قرآن مجید ۲/۱۳۰، ۳/۹۵، ۴/۱۲۵ وغیرہ [۴] قرآن مجید ۶/۶۶ و ۱۰۹ و ۱۲۷، ۱۱/۲۷ و ۳۸، ۲۳/۲۴ و ۳۳ وغیرہ

[۵] قرآن مجید ۲/۲۴۶، ۳۸/۶،

نقشہ مسجد حرم کعبہ

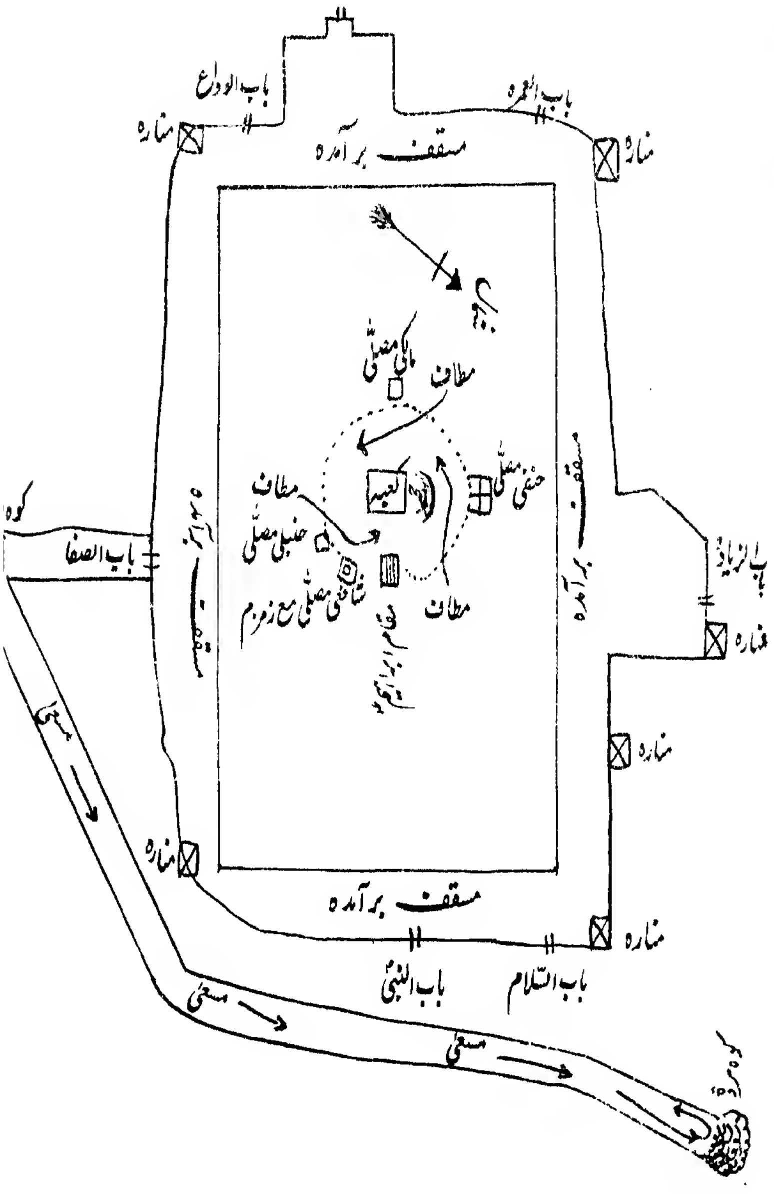

ہوا ہے[1]،

قرآن مجید میں جہاں کہیں فرعون کی "ملأ" کا ذکر ہے اس سے بنی اسرائیل خارج نظر آتے ہیں جن کو کوئی شہری حقوق حاصل نہ تھے، حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں جو عزیز مصر تھا اور حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں جو ملکۂ سبا تھی ان کے ہاں بھی قرآن مجید[2] کے مطابق جو مجلس شوریٰ تھی اس کا نام "ملأ" ہی تھا، اس مجلس میں" اولو قوۃ" یا اہل حل وعقد ہی ہوا کرتے تھے، اور اگر کوئی چیز نامناسب پیش آتی تو یہ مداخلت بھی کیا کرتے[3]، پالمیرا میں جو مجلس شوریٰ تھی اس کے متعلق بھی ایسا ہی مواد ملتا ہے[4]،

مکہ میں جو دارالندوہ تھا اس میں صرف معمر اہل مکہ شریک ہو سکتے تھے، چنانچہ ازرقی[5] اور ابن دُرید[6] نے وضاحت سے بیان کیا ہے کہ دارالندوہ کے اجلاس میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے تھے جن کی عمر کم از کم چالیس سال کی ہو، صرف حکمران شہر قصی کے بیٹوں کو یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ عمر کی اس شرط سے مستثنیٰ تھے[7]، غالبًا اسی حق رائے کی عمر چہل سالگی ہی کی طرف اشارہ ہے، جو قرآن مجید نے "حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً[8]" کے الفاظ میں بیان کیا ہے، یہ قصی کے زمانہ کا ذکر تھا، بعد کے زمانوں میں مختلف نرمیاں برتی جاتی نظر آتی ہیں، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابوجہل[9] کو تیس ہی سال کی عمر میں اس کی عمدہ رائے (الجود رأیہ) کے باعث دارالندوہ کے اجلاس میں شریک کیا جاتا تھا اور حکیم بن حزام[10] کو تو بیس یا پندرہ ہی سال کی عمر میں یہ عزت حاصل ہو گئی تھی، یونان کے شہر اسپارٹا میں تو مجلس

---

[1] قرآن مجید ۲/۲۳۳، ۴/۲۹ [2] قرآن مجید ۱۲/۴۳، ۲۷/۲۹ و ۳۲ [3] الفاسی کی اخبار مکہ ص ۱۰۹ [4] لامنس کی کتاب مکہ ص ۹، [5] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۶۴، ۶۵، ۶۵ ۴ [6] کتاب الاشتقاق ص ۹۷ [7] ازرقی ص ۶۴، ۶۵، ۶۵ ۴ [8] قرآن مجید ۴۶/۱۵ [9] ابن دُرید کی کتاب الاشتقاق ص ۹۷ سطر (۶) [10] ابن عساکر کی تاریخ دمشق جلد (۴) ص ۴۱۹ سطر (۲)

شوریٰ واقعی مجلس معمرین تھی، چنانچہ ساٹھ سال[۱] سے کم عمر کا کوئی شخص وہاں کی مقامی مجلس شوریٰ (GEROUSIA) میں شریک ہی نہیں ہو سکتا تھا[۲]،

قصیٰ سے پہلے مکہ والے یا تو کسی کھلے مقام پر مشورے کے لئے جمع ہوا کرتے ہوں گے یا اپنے سردار کے خیمے میں، اس غرض کے لئے ایک مستقل عمارت بنانا قصیٰ کے لئے مقدر ہو چکا تھا، قصیٰ ہی نے اسے دار الندوہ نام دیا تھا، اور جناب رسالت مآب صلعم کے ملک الشعرا حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس نام کی یاد اپنے اشعار میں باقی رکھی ہے[۳] یہ مشورہ گاہ کعبہ کے شمال میں تعمیر ہوئی تھی، لیکن زمانۂ اسلام میں اُسے منہدم کر کے کعبہ کے اطراف جو مسجد حرم بنی اس کی توسیع کے کام میں لایا گیا، یہ ظاہر ہے کہ اس مجلس کا انعقاد معینہ اوقات پر نہیں ہوتا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً جب بھی ضرورت پیش آئے ہوتا[۴]،

اسی دار الندوہ میں مشورے ہوا کرتے، جنگوں کا اعلان کیا جاتا یا مدافعتی تدبیروں پر بحث و غور ہوتا[۵] یہیں شادیاں بھی رچائی جاتیں[۶] اور تجارتی معاہدے طے ہوتے[۷]، بیرونی مہمان آتے تو ان کی ضیافت بھی یہیں ہوتی[۸] نیگری کے قدیم باشندوں کی طرح زمانۂ قبل اسلام کے مکہ والے بھی ایک رسم کرتے جو لڑکی کے سن بلوغ کو پہنچنے پر انجام دی جاتی اور اسے ایک نئی اور پوری قمیص (درع) پہنائی جاتی اور وہ بے نقاب آتی اور بے نقاب ہی جاتی، گھر پہنچنے

---

[۱] اس کے مماثل ہندوستانی کہاوت "ساٹھا پاٹھا" کی طرف توجہ منعطف کرائی جا سکتی ہے [۲] پلوٹارک کی سوانحعمریاں دیکھئے لائیکرگس کے حالات، نیز وارڈ فاؤلر کی انگریزی کتاب "شہری مملکت" ص ۱۷ تعلیق نمبر ۲ [۳] دیوان حسان بن ثابت مطبوعہ یورپ نظم نمبر ۱۴۵ و ۱۸۳ [۴] کتاب الاشتقاق مؤلفہ ابن درید ص ۹۰ [۵] چنانچہ مثال کے طور پر ہجرت سے قبل رسول کریم صلعم پر قاتلانہ حملہ کرنے کی بحث و پیچ بھی یہیں ہوئی تھی [۶] لامنس کی کتاب مکہ ص ۲۰ [۷] مغازی واقدی شائع کردہ فون کریمر ص ۲۳ [۸] کتاب نیگری مؤلفہ حمید اللہ شائع کردہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن،

کے بعد اس پر پابندیاں عائد ہوجاتیں، اس رسم کا منشا یہ تھا کہ لڑکی کے قابلِ نکاح ہونے کا اعلان کیا جائے اور خواہشمند آگاہ ہو کر رونمائی کے لئے آسکیں، یہ رسم بھی دارالندوہ ہی میں انجام پاتی[۱]۔

دارالندوہ شہر مکہ کا مرکزی دارالبلد تھا اس کے علاوہ شہر میں جتنے محلے یعنی قبائلی آبادیاں تھیں اتنے ہی مجالسِ محلہ بھی تھے ان کو "نادی" کہا جاتا تھا[۲] جیسا کہ شہر مدینہ میں محلہ وار مجالس کو سقیفہ یعنی مسقف سائبان کا نام دیا گیا تھا، نادی اور دارالندوہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں چنانچہ مشہور محدث و لغت نویس ابوعبید[۳] نے نادی اور ندوہ دونوں کا مادہ "ندا" ہونا بتایا ہے، قرآن مجید نے لفظ نادی کو حیاتِ جاوید عطا کردی ہے اور فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ[۴] اور وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ[۵] دو مرتبہ اس کا ذکر آیا ہے اور ماضی مضارع کے صیغے بھی ان کے علاوہ مستعمل ہوئے ہیں[۶]، ان نادیوں یا قبائلی مجالسِ محلہ میں اجنبیوں کو معاہدے کے ذریعہ سے مولا یعنی فردِ خاندان بنانے کی رسم بھی انجام دی جاتی تھی[۷]، اور کسی فردِ خاندان کو بے راہ روی وغیرہ پر جات باہر ("طرد" یا "خلع") کرنے کا اعلان بھی وہیں کیا جاتا تھا[۸]، محلہ والے اور بعض وقت دیگر محلوں کے دوست بھی چاندنی راتوں میں یہاں جمع ہو کر مسامرہ یعنی شبانہ قصہ گوئی کیا کرتے تھے[۹]، تجارتی معاملات اور کاروانوں کی آمد و روانگی بھی ان ہی قبائلی نادیوں سے ہوا کرتی تھی،

اتھنس (اثینا) کے متعلق جاوٹ (JOWETT) نے اپنی کتاب THUCYDIDES[۱۰]

۱؎ سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰ ۲؎ تفصیلات کے لئے دیکھئے لامنس کی کتاب مکہ ص ۸۸ و مابعد ۳؎ غریب الحدیث ورق نمبر ۱۹۱ الف (بحوالہ مکہ مولفہ لامنس ص ۷۰) ۴؎ قرآن مجید $\frac{96}{17}$ ۵؎ قرآن مجید $\frac{29}{29}$ ۶؎ قرآن مجید میں نادی، نادوا، نادیتم، نادینا، نادت، ینادی، ینادون، نودی، تنادوا، نداء، ندیا، منادی، تناد کے لفظ بھی بار بار آئے ہیں ۷؎ سیرۃ ابن ہشام ص ۲۴۳ و ۲۴۶، کتاب الاغانی $\frac{14}{99}$ ۸؎ اغانی $\frac{8}{52}$ و $\frac{3}{53}$ ۹؎ ازرقی کی اخبار مکہ ص ۲۷۶، اغانی $\frac{13}{112}$ اور لامنس کی کتاب مکہ ص ۸۵ و مابعد تعلیق ۲ ۱۰؎ دیکھئے جلد اول ص ۱۰۴ (بحوالہ وار ذ فاؤلر ص ۴۸ تا ۴۹)

میں لکھا ہے کہ ۔

> قرقروب (CERCROPS) اور ابتدائی بادشاہوں کے زمانہ میں حتی کہ تیسیوس (THESEUS) کے زمانہ تک شہر اثینا مختلف محلوں میں منقسم تھا جن میں سے ہر ایک کے اپنے مجالسِ محلہ اور مجسٹریٹ ہوا کرتے تھے، بجز اس کے کہ کوئی خطرہ درپیش ہو پورے شہر کی آبادی کا اجلاس جو بادشاہ کی صدارت میں ہوتا، نہیں ہوتا تھا، بلکہ یہ لوگ اپنے معاملات کا انتظام اپنے مجالسِ محلہ ہی میں آپس کے مشورہ سے طے کر لیا کرتے تھے،

مکہ میں نقیب کا عہدہ بھی پایا جاتا تھا جسے منادی اور مؤذّن کہتے تھے ۔ (مؤذن اپنے ان ابتدائی معنوں میں اب تک شامی بدویوں میں مستعمل ہے[1]) جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ مجالس کے انعقاد کا ڈھنڈورا پیٹے[2] ہر قبیلہ کے سردار کے پاس اس کے اپنے خصوصی ایک یا زائد منادی بھی ہوا کرتے تھے[3]، یہ منادی نہ صرف غیر معمولی انعقادِ مجالس کی اطلاع مشتہر کرتے تھے بلکہ کسی تقریب یا دعوت میں دعوتیں پہنچانا اور کسی فردِ خاندان کے جات باہر کئے جانے کی اطلاع اور محلوں میں بھی کرنا اُن ہی سے متعلق تھا، غیر معمولی صورتوں میں منادی کے علاوہ دیگر عام لوگ بلکہ اجنبی اشخاص بھی مجالسِ بلدیہ کے انعقاد کی اطلاع کے مجاز تھے، ایسی صورتوں میں اجنبی لوگ اپنے تمام کپڑے اتار دیتے اور کسی اونچے مقام پر بالکل برہنہ ہو کر دہائی دیا کرتے، عربی داں "النذیر العریان" کی اصطلاح سے اچھی طرح باخبر ہیں،

---

[1] دیکھئے لامنس کی کتاب مکہ ص ۱۶۰ تعلیق ۳ [2] ابو عبید کی کتاب الاموال ف۵۵۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم سنہ ۹ھ تک بھی ایسا ہی ہوتا تھا [3] تاریخ یعقوبی جلد (۱) ص ۲۸۱ سطر ۱۴ نیز ص ۲۹۰ و ۲۹۲، لامنس کی کتاب مکہ ص ۶۴ و ۶۵، اسی مؤلف کی فرانسیسی کتاب "گہوارۂ اسلام" جلد ا ص ۲۲۹ کتاب الاغانی جلد ا ص ۶۵ سطر ۵، ابن درید کی کتاب الاشتقاق ص ۹۴، مفضلیات مطبوعہ یورپ ۲/۲ ،

مورخین کے بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قصی پورے شہر کا ایک واقعی مطلق العنان اور با اقتدار بادشاہ تھا جس کا ہر لفظ قانون کا حکم رکھتا تھا[1]، بعد کی نسلوں نے شکر گذاری اور احسان مندی کے ساتھ اس کی یاد باقی رکھی اور اسے مجمع[2] کا خطاب[3] عطا کر دیا تھا، کیونکہ اسی نے جملہ قریشی قبائل کو متحد کر کے شہر میں انھیں دیگر آبادی میں ایک اعزازی حیثیت عطا کر دی تھی، قصی کی وفات کے بعد ایک اعیانیت قائم ہو گئی کیونکہ خود قصی نے مختلف انتظامی عہدے اپنے مختلف بیٹوں میں بانٹ دیئے تھے[4]، اور غالباً مشہور مجلس دہگانہ[5] کا آغاز اسی طور سے ہوتا ہے جو زمانۂ اسلام تک باقی نظر آتی ہے، اس سے ہمیں انکار نہیں کہ قصی کو مطلق العنان اختیارات حاصل رہے ہونگے اور اس کا کوئی حریف و مدمقابل نہ ہوگا، کیونکہ اس نے اپنی قوم کے لئے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے، لیکن بعد کے زمانوں میں سید الناس[6] وغیرہ کے القاب سے کہیں ہم یہ نہ خیال کریں کہ مکہ میں بھی مثلاً وینیس کی طرح کوئی دوجے (DOGE یا قائد و سردار) ہوا کرتا تھا، شہر مکہ کے عہدوں میں ایک قیادہ[7] بھی بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کا منشا کیا تھا پوری طرح معلوم نہیں ہوتا، ولہوزن بھی اپنے عالمانہ اور دلچسپ مقالہ .... (یعنی ایک سیاسی اجتماعیت بغیر سرداری کے) EIMGEN EIN WESEN OHNE CBRIGKE-IT میں اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ شہر مکہ میں کوئی فردی حکومت نہ تھی، اس میں شک نہیں کہ عرب کے مختلف حصوں میں فردیت یا بادشاہت کی طرف رغبت پیدا ہو چلی تھی، چنانچہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عثمان بن الحویرث نے مکہ میں بادشاہ بننے کی کوشش کی تھی، مدینہ میں عبد اللہ بن

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۴۴ [2] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰، تاریخ طبری ص ۱۰۹۵ [3] مسعودی کی التنبیہ والاشراف ص ۲۰۳ [4] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید جلد ۲ ص ۴۵ اور مسعودی کی مروج الذہب $\frac{3}{20،19}$، $\frac{42}{121}$ [5] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۴۶، لامنس کی کتاب مکہ ص ۶۹ [6] ازرقی ص ۴۴ [7] روض الانف $\frac{1}{149}$،

اُبی بن سلول کے لئے تو تاجِ شہریاری[1] کی تیاری تک کاریگروں کے سپرد ہوچکی تھی کہ اتنے میں جناب رسالت مآب صلعم کی ہجرت کا واقعہ پیش آیا اور پھر اس کے ساتھیوں کے لئے اس کا موقع نہ رہا کہ کسی کو بادشاہ بنانے کی تجویز کرسکیں، اسپرنگر کو یقین تھا کہ "یہ لوگ یعنی عرب کے بدوی اپنی بدویانہ زندگی کے باوجود فردیت یعنی بادشاہت کی طرف میلان رکھنے لگ گئے تھے[2]"

(باقی)

ك (لِيُتَوِّجُوهُ) صحیح بخاری ۷۹/۴، تاریخ طبری ص ۱۵۱۱ و مابعد، سیرۃ ابن ہشام ص ۴۲۰، نیز قرآن مجید ۶۳/۸ کی تشریح کسی تفسیر میں ك۲ اسپرنگر کی جرمن سیرۃ وتعلیمات محمدیہ ۱/۲۴۹

ارض القرآن

حصۂ اوّل

عرب کا قدیم جغرافیہ عاد، ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے، جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی، اسرائیلی لٹریچر اور موجودہ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے تائید وتصدیق ثابت کی ہے، ضخامت ۴۲۴ صفحے، قیمت :- ۴/ عہ

ارض القرآن حصۂ دوم

قرآن مجید کے اندر جن قوموں کا ذکر ہے، ان میں سے مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب بنو اسماعیل، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، بنو قیدار، انصار اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب پر تفصیلی مباحث، قیمت : عہ ۱۲/ ضخامت ۲۴۰ صفحے،

"منیجر"

خطبۂ صدارت

انجمن جامعۂ ادبیّہ کان پور

از مولٰنا عبدالسّلام صاحب ندوی

مولٰنا عبدالسّلام صاحب ندوی نے کان پور کی ادبی انجمن جامعہ ادبیہ کے سالانہ جلسہ کے شعبۂ نثر میں یہ خطبۂ صدارت پڑھا تھا، اردو زبان میں نظم کے رموز و نکات پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن نثر پر بہت کم توجہ کی گئی ہے، اس خطبہ میں اس حیثیت سے نثر پر نظر ڈالی گئی ہیں اور اس میں نثر کے متعلق بعض نئی اور مفید باتیں ہیں، اس لئے اس کو ناظرین معارف کے لئے پیش کیا جاتا ہے، "م"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہ الکریم

حضرات!! میں آپ لوگوں کا تہ دل سے شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھ کو اس ادبی جلسہ کی صدارت کا اعزاز عطا فرما کر اردو زبان کی ایک اہم صنف کے متعلق ایک ایسے شہر میں اظہار خیال کا موقع دیا ہے جو اس قسم کے علمی اور ادبی مباحث کے لئے نہایت موزون ہے۔

حضرات! ظاہر بینوں کے لئے تو آپ کا شہر کان پور صرف تجارتی گرم بازاری کی ایک منڈی ہے، لیکن اہل نظر کے نزدیک وہ نہایت قدیم زمانہ سے علم و فن کا ایک بڑا مرکز بالخصوص شرقی علوم و فنون کی ترقی و نشو و نما کا بہت بڑا گہوارہ رہ چکا ہے، مدرسہ فیض عام اسی شہر

کا ایک مشہور مدرسہ تھا جس کا فیض ہندوستان کے گوشہ گوشہ کو پہنچا، مدرسہ جامع العلوم نے اسی شہر میں ہندوستان کے دور دراز حصوں کے طلبہ کی جمعیت خاطر کا سامان بہم پہنچایا اور انھوں نے اس شہر کے ارباب خیر کی فیاضیوں سے فائدہ اٹھا کر نہایت سکون و اطمینان کیساتھ تحصیل علم کی، علمی اور مذہبی حیثیت کے ساتھ ادبی حیثیت سے بھی اس شہر کو نمایاں امتیاز حاصل رہا ہے، لکھنؤ کی قربت کی وجہ سے یہاں شیخ ناسخ ہی کے زمانہ سے شعر و شاعری کا چرچا پھیلا، اور اب تک یہاں کے لطیف الخیال اور خوش مذاق لوگ اس بادۂ کہن کے نشہ میں مخمور نظر آتے ہیں، اس وقت اردو زبان اور اردو علم ادب کی خدمت کا جو ولولہ یہاں کے لوگوں میں پایا جاتا ہے وہ اسی قدیم زمانہ کی یادگار ہے، جدید دور میں اردو زبان کی خدمت و اشاعت کا جو عام ذوق اور جو عام جذبہ پیدا ہوا، اس میں بھی اس شہر نے نمایاں حصہ لیا، منشی دیا نرائن نگم نے اپنے رسالہ زمانہ کے ذریعہ سے اردو زبان، اردو لٹریچر اور اردو علم ادب کی جو پائدار خدمت انجام دی ہے، وہ اہل ادب کے لئے ناقابل فراموش احسان ہے، منشی رحمت اللہ رعد مرحوم نے اپنے مطبع کے ذریعہ سے دور جدید کے برگزیدہ لٹریچر کی جس قدر اشاعت کی، وہ اس شہر کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہے، الفاروق، الکلام، سوانح مولانا روم، اور البرامکہ جیسی اہم کتابیں اسی مطبع نے ایسی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ چھاپ کر شائع کیں کہ اندھوں کے دلوں میں بھی اردو زبان کی کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا،

اس شہر کی علمی و ادبی خدمات کی یہ چند مثالیں ہیں جنھوں نے تمام ہندوستان کو اپنا زیر بار احسان بنا لیا ہے، لیکن اس عام احسان کے ساتھ میں خاص طور پر اس شہر کا اس لئے اور بھی ممنون ہوں کہ میں نے عربی کی ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی اور شعر و سخن اور

علم ادب کا ذوق اسی شہر میں پیدا ہوا، جس کا نشہ اب تک میرے سر میں ہے، شعر الہند جو میری ناچیز ادبی خدمات میں شمار کی جاتی ہے اس کا اصلی مواد مجھکو اسی شہر سے حاصل ہوا، اور میرے بزرگ دوست مولانا فضل الحسن حسرت موہانی نے اپنے کتب خانہ کی وہ تمام نادر کتابیں جو اس کتاب کی تصنیف کے لئے ضروری تھیں، مجھ پر وقف کردیں، انھی احسانات کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے میں نے صدارت کی یہ خدمت قبول کی ہے، ورنہ اس کا مقصد حصول اعزاز نہیں ہے، کیونکہ میں اپنی عدمِ اہلیت کی وجہ سے کسی اعزاز کا مستحق نہیں ہوں، البتہ ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے علم و ادب کی خدمت کو اپنا فخر سمجھتا ہوں، اور میں خوش ہوں کہ آپ نے مجھ کو اپنے خدمت گذاروں کی صفِ اولیں میں کھڑا ہونے کا پُر فخر منصب عطا فرمایا،

حضرات! آپنے اس جلسہ میں مجھکو علم ادب کی جس صنف کے متعلق اظہارِ خیال کا موقع دیا ہے اس پر ابتک اردو زبان میں بہت کم لکھا گیا ہے، نظم کے متعلق تو اردو زبان میں تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے کافی ادبی سرمایہ موجود ہے، لیکن نثر کے ترکیبی اجزاء کے متعلق ابتک اردو میں کوئی مستند لٹریچر موجود نہیں، حالانکہ اگر نثر کے حسن و قبح اور عیب و ہنر سے علمی اصول کے مطابق بحث کی جائے تو عربی علم ادب کی کتابوں میں اس کا اس قدر کافی مواد موجود ہے کہ اس پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے، لیکن میں اس موقع پر اپنی مختصر تقریر کو کتاب یا رسالہ بنانا نہیں چاہتا، البتہ نثر کے متعلق اصولاً چند ادبی نکات بیان کرنا چاہتا ہوں،

(۱) حضرات! اس سلسلہ میں سب سے پہلی تمہیدی بحث یہ ہے کہ نظم و نثر کی ادبی اور افادی حیثیت کیا ہے؟ اور اس حیثیت سے ان دونوں میں کس صنف کو ترجیح حاصل ہے؟ عام دستور تو یہ ہے کہ جو شخص جس موضوع پر کچھ لکھتا یا بولتا ہے خواہ مخواہ اس کے بہت سے فضائل و مناقب بیان کرتا ہے، لیکن بحمد اللہ کہ مجھے اس قسم کی سخن سازی کی ضرورت نہیں ہے

کیونکہ خود اہلِ ادب نے نثر کو ادبی حیثیت سے نظم پر ترجیح دی ہے اور دلیل یہ قائم کی ہے کہ نظم میں وزن اور قافیہ کی پابندی کی وجہ سے شاعر کو بعض غیر ضروری الفاظ بڑھانے پڑتے ہیں، جن کو اصطلاح میں حشو کہتے ہیں، مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنا پڑتا ہے جس کا نام تعقید ہے، بعض اوقات فصیح الفاظ کے بجائے سبک اور غیر فصیح الفاظ بھی ضرورتِ شعری کی وجہ سے استعمال کرنے پڑتے ہیں، اور وزن وقافیہ کی ان پابندیوں کا اثر معانی ومطالب پر یہ پڑتا ہے کہ نظم میں معانی ومطالب الفاظ کے تابع ہو جاتے ہیں، حالانکہ اصولاً الفاظ کو معانی ومطالب کا تابع ہونا چاہئے، لیکن نثر میں اس قسم کے لفظی تصرفات کی ضرورت نہیں واقع ہوتی، اس لئے نثر میں الفاظ معانی ومطالب کے تابع ہوتے ہیں جو اصل مقصود ہیں، اس دلیل کی تائید میں اہلِ ادب نے اس قسم کی بہت سی مثالیں جمع کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جب کبھی نثر کو نظم کے قالب میں ڈھالا گیا ہے تو بہت سے غیر ضروری الفاظ بڑھ گئے ہیں، اس کے بخلاف جب کسی نظم کو نثر کے قالب میں ڈھالا گیا ہے تو غیر ضروری الفاظ چھٹ گئے ہیں، اور قدرتی طور پر کلام میں ایجاز واختصار پیدا ہوگیا ہے اور عبارت اس سانچے میں ڈھل کر بالکل سڈول ہوگئی ہے،

ادبی حیثیت کے ساتھ افادی حیثیت سے بھی نثر کو نظم پر ترجیح حاصل ہے، کیونکہ نظم میں زیادہ تر ہجو وبدگوئی، عشق ومحبت، تملق وچاپلوسی اور شراب وکباب وغیرہ کے مضامین بیباکانہ طور پر بیان کئے جاتے ہیں جو اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے قابلِ اجتناب ہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی پیغمبر آج تک شاعر نہیں ہوا، بالخصوص خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں شاعری کو رسول اللہ صلعم کی شانِ رسالت کے منافی قرار دیا اور ارشاد فرمایا

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ، یہ قرآن شاعر کا کلام نہیں،

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهٗ ، ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شعر کی تعلیم نہیں دی (کیونکہ وہ ان کی شانِ رسالت) کے لئے موزوں و سزاوار نہ تھی ؛

خود اہلِ عرب بھی جن کے یہاں شاعری ایک بڑی طاقت سمجھی جاتی تھی، انہی غیر سنجیدہ مضامین کی بنا پر شاعری کو متانت اور وقار کے مخالف سمجھتے تھے، چنانچہ عرب کے مشہور شاعر امرء القیس نے جو ایک بادشاہ کا لڑکا تھا جب اپنی بزمِ شراب میں ایک رندانہ شعر پڑھا تو اس کے باپ نے اس کو قتل کر دینا چاہا، نابغہ جعدی جو عرب کا ایک ممتاز شاعر ہے، پہلے اپنے قبیلہ کا سردار تھا، لیکن جب شعر کہنے لگا تو اس کی سیادت و قیادت کا خاتمہ ہوگیا،

اس کے بخلاف نثر زیادہ تر اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی اور مذہبی مضامین پر مشتمل ہوتی ہے اور اس نے اس کا پایہ اس قدر بلند کر دیا ہے کہ وہ ایک پیغمبر کا معجزہ بن سکتی ہے، نظم نے ساحرانہ طاقت تو بے شبہہ حاصل کر لی ہے، لیکن اس کو معجزانہ طاقت کبھی نصیب نہیں ہوئی،

(۲) نظم و نثر کے باہمی موازنہ اور نثر کے ترجیحی وجوہ بیان کرنے کے بعد ایک اہم ادبی بلکہ ادبی سے زیادہ علمی اور فلسفیانہ بحث یہ ہے کہ نثر کس کو کہتے ہیں؟ اور نثر کی ادبیانہ تعریف کیا ہے؟ عام طور پر کلام انسانی کی تقسیم دو صنفوں میں کی گئی ہے، یعنی نظم و نثر، اس کے علاوہ بہ ظاہر کلام کی کوئی تیسری قسم نہیں ہے، لیکن بعض دقیق النظر لوگوں نے کلام کی ایک ایسی قسم کی طرف اشارہ کیا ہے جو نظم و نثر دونوں سے الگ ہے اور میں اسی اشارہ کی توضیح کرنا چاہتا ہوں،

پروفیسر محی الدین قادری نے اپنی کتاب روحِ تنقید میں دو شخصوں کا جو غالباً ادب

ہونے کے ساتھ فلسفی بھی تھے، ایک مختصر سا مکالمہ نقل کیا ہے، ان میں ایک سوال کرتا ہے،

"تو سوائے نظم اور نثر کے کوئی تیسری صورت ہے ہی نہیں ؟

دوسرا جواب دیتا ہے،

"جی ہاں جو چیز نظم نہیں وہ نثر ہے جو نثر نہیں وہ نظم ہے،

پہلا پھر پوچھتا ہے،

اچھا آدمی جو بولتا ہے وہ کیا چیز ہے ؟

دوسرا نہایت متانت کے ساتھ کہتا ہے،

نثر

اب پہلا طنز آمیز تعجب سے سوال کرتا ہے،

ہائیں جب میں اپنے آدمی سے کہتا ہوں ذرا سلیپر لانا اور میرا کنٹوپ دیدینا، تو کیا یہ نثر ہوئی ؟

دوسرا پھر اسی متانت سے جواب دیتا ہے،

جی ہاں !

پہلا پھر تعجب بلکہ تمسخر سے کہتا ہے،

ارے میاں سچ کہو یہ جو میں کچھ اوپر چالیس برس سے بولتا آیا ہوں یہ سب نثر تھی اور مجھے کانوں کان خبر نہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ہر منظوم کلام شعر نہیں، اسی طرح ہر غیر منظوم کلام نثر نہیں، کیونکہ کلام منثور کے لئے صرف غیر منظوم ہونا کافی نہیں بلکہ اہل ادب کے نزدیک اس کے لئے اور بھی بہت سے اجزا کی ضرورت ہے، چنانچہ ابو ہلال عسکری نے کتاب الصناعتین

لکھا ہے،" مقرر اور انشا پرداز کا کامل ترین وصف یہ ہے کہ وہ شاعر ہو، اسی طرح شاعر کا کامل ترین وصف یہ ہے کہ وہ خطیب ہو" یعنی مقرر، انشا پرداز، اور شاعر سب کا راگ ایک ہی ہے، صرف ساز بدلا ہوا ہے، کیونکہ ادیبانہ نثر اگرچہ نظم نہیں ہے لیکن شاعری کے تمام اجزار مثلاً سلاست، روانی، برجستگی، توازن، تشبیہ و استعارہ، صنائع و بدائع وغیرہ سب کے سب اس کا لازمی جزو ہیں، اور ادیبانہ نثر کی بہترین کتابوں میں یہ اجزار نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، آسمانی کتابوں بالخصوص قرآن مجید میں یہ شاعرانہ اجزا اس کثرت سے موجود ہیں، کہ دور جدید کے بعض ادیب اس کو نثر کی کتاب ہی نہیں سمجھتے، لیکن اسی کے ساتھ اس کو نظم کی کتاب بھی نہیں تسلیم کرتے، بلکہ ان کے نزدیک قرآن مجید نہ نثر ہے نہ نظم بلکہ صرف قرآن ہے، جس طرح انگور کہ نہ سیب ہے نہ انار، بلکہ صرف انگور ہے، اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح اعلیٰ درجہ کی ادیبانہ عبارت حدِّ اعجاز کو پہنچکر نظم و نثر دونوں سے مختلف ہوجاتی ہے، اسی طرح ادنیٰ درجہ کا کلام بھی جس میں ہماری روزمرہ کی بول چال شامل ہے، شاعرانہ خصوصیات سے معرّا ہوکر نظم و نثر سے بالکل الگ ہوجاتا ہے، انسانی کلام میں گلستان نثر کی اعلیٰ ترین کتاب ہے اور اس میں بھی شاعری کے یہ تمام اجزار یہاں تک کہ اس دور کی مبغوض ترین چیز یعنی مقفّیٰ عبارتیں بھی بے ساختگی کے ساتھ موجود ہیں اور یہی مشترکہ شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر نظم و نثر بظاہر متحد ہوگئی ہیں، چنانچہ روحِ تنقید میں لکھا ہے کہ

> یہ ایک عام خیال ہے کہ نثر اور نظم اپنی خصوصیات اور ترتیب ظاہری کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں، لیکن جب ان کے امتیازی مادہ کی تحقیق کرنے بیٹھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ نثر اور نظم کو مختلف النوع کہدینا زبانی تو آسان ہے لیکن

اس کو ثابت کر دکھانا دشوار ہے، موجودہ زمانہ میں تو نظم اور نثر میں بہت کم اختلاف باقی رہ گیا ہے، ایک طرف تو غیر مقفی یا نظم عاری لکھی جاتی ہے، اور دوسری طرف نثری شاعری کے عنوان سے مضمون آرائی ہوتی ہے، جن کے مطالعہ کے بعد ہم تھوڑی دیر کے لئے متحیر سے ہو جاتے ہیں کہ کس چیز کو مابہ الامتیاز قرار دیں"

لیکن واقعہ یہ ہے کہ باوجود اس شاعرانہ اشتراک کے نثر و نظم دونوں باہم مختلف ہیں، اور دونوں میں نمایاں مابہ الامتیاز موجود ہے، جہاں تک لفظی حیثیت سے شاعرانہ عناصر کا تعلق ہے نظم و نثر دونوں میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے، لیکن معنوی حیثیت سے نثر نظم سے بالکل مختلف ہے، نظم میں جو مضامین بیان کئے جاتے ہیں، وہ اور ہیں اور نثر جن مضامین پر مشتمل ہوتی ہے وہ اور ہیں، عشق و محبت کے مضامین، رندی و سرمستی کے خیالات، بوالہوسی و حسن پرستی کے جذبات، غرض اس کے غیر اخلاقی مضامین زیادہ تر نظم کا معنوی عنصر ہیں، بعد کو اگرچہ نظم میں ہر قسم کے اخلاقی، فلسفیانہ اور صوفیانہ مضامین بھی شامل ہو گئے، لیکن یہ امتزاج اس وقت ہوا جب نثر کی کتابوں نے ان مضامین کو شعراء سے روشناس کیا، اس کے برخلاف نثر میں جو مضامین بیان کئے جاتے ہیں، وہ زیادہ تر اخلاقی، معاشرتی، تمدنی اور مذہبی حیثیت رکھتے ہیں، رشد و ہدایت، تبلیغ و دعوت، زہد و قناعت، تعاون و تناصر، محبت و ہمدردی، اطاعت و فرمانبرداری، اعزہ پروری و صلۂ رحمی، غرض اس قسم کے ہزاروں پاکیزہ خیالات کی اشاعت صرف نثر ہی کے ذریعہ سے کی جاتی ہے، عرب کی شاعری بہت سے رذائلِ اخلاق کا مجموعہ تھی، لیکن وہی عرب جب خطبہ دینے کھڑے ہوتے تھے، تو ان کے خطبات یکسر اخلاقی، قومی اور ملکی خیالات

وجذبات سے لبریز ہوتے تھے، قرآن مجید انہی خطبات کے انداز پر نازل ہوا ہے، کیونکہ وہ اوّل سے آخر تک اصلاحی، اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، اور مذہبی مضامین کا پاکیزہ مجموعہ ہے اور یہ تمام مضامین شاعرانہ اسلوبِ عبارت میں بیان کئے گئے ہیں، اور انہی شاعرانہ اسلوب کی بنا پر اہل عرب قرآن مجید کو شعر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہتے تھے، لیکن خداوند تعالیٰ نے ان کو اس غلطی پر متنبہ کیا کہ نہ تو قرآن مجید شعر ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاعر ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں وہ شعر و شاعری کے مضامین سے بالکل مختلف ہیں،

اب اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نثر نام ہے غیر منظوم شاعرانہ طرز بیان کا، جس کے ذریعہ سے اصلاحی، اخلاقی، معاشرتی، مذہبی اور تمدنی مسائل بیان کئے جائیں ور اس ادبیانہ نثر کا ما فوق الفطرۃ نمونہ تو قرآن مجید ہے اور انسانی کلام میں مثلاً شیخ سعدی کی گلستان ہے، اور اس تعریف کے رو سے ہماری روزمرہ کی خط و کتابت، عدالتوں کے رضی دعوے اور جواب دعوے، مدعی اور مدعا علیہ کی شہادتیں، حکام کے فیصلے، وکیلوں کی بسـ ـرعین غـ ـرض دفتری کاروبار کے تمام کاغذات، خواہ وہ ہندی زبان میں ہوں یا ردو زبان میں نظم و نثر دونوں سے الگ ہیں، جن میں ادب و انشا کا کوئی جزو شامل نہیں ر نظم و ترتیب کے لحاظ سے جیسا کہ شیخ عبد القاہر جرجانی نے دلائل الاعجاز میں لکھا ہے، اس م کے کلام میں کوئی ادبیانہ اور شاعرانہ حسن نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف الفاظ کا ایک مجموعہ ہوتے ہیں، لیکن ادبیانہ نثر میں اسی شاعرانہ حسن سے دلفریبی پیدا ہوتی ہے، اس لئے اس نثری زبان کے متعلق ہندوستان کی دو قوموں میں جو افسوسناک نزاع قائم ہے، وہ ایک اسی یا قومی اور ملکی نزاع ہے، ادبی نزاع نہیں، اس لئے ادبی حیثیت سے ان دونوں

قوموں میں کوئی جھگڑا نہیں ہے، اس لئے اگر سیاسیات سے الگ ہو کر صرف ادبی اصول پر ادبی انجمنیں قائم کی جائیں جیسا کہ آپ کی یہ انجمن ہے تو وہ ہندو مسلم اتحاد کا ایک عمدہ ذریعہ ہو سکتی ہے، میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ ہماری زبان میں منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت، جغرافیہ اور اقلیدس وغیرہ پر جو کتابیں لکھی یا ترجمہ کی جاتی ہیں، وہ بھی نثر کی کتابیں نہیں ہیں، بلکہ یہ علمی کتابیں ہیں، جو ہماری زبان کو علوم و فنون سے تو بے شبہ مالامال کر رہی ہیں، لیکن ہماری زبان کے ادبی حسن و جمال میں ان سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا،

ان تصریحات کے بعد آپ مجھ سے بجا طور پر یہ سوال کر سکتے ہیں، کہ اس عظیم الشان ذخیرہ کے حذف کر دینے کے بعد اردو نثر کی ترقی کے لئے اور کون سا میدان رہ جاتا ہے، اس لئے میں اجمالی طور پر وہ موضوع متعین کر دیتا ہوں، جن میں ایک نثار یا ایک ادیب اور ایک انشا پرداز کا قلم اپنے جوہر دکھا سکتا ہے،

(۱) میرے خیال میں نثر کا ایک اہم موضوع تصوّف و اخلاق ہے، کیونکہ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین اکثر لطیف تشبیہات و استعارات، قصص و حکایات اور نقل و روایات کے ضمن میں واضح اور شگفتہ الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض اخلاقی کتابیں مثلاً انوار سہیلی اور اخلاق محسنی وغیرہ ادبی حیثیت سے فارسی کے قدیم نصابِ تعلیم میں داخل تھیں، عباسی دور میں عبداللہ بن المقفع نے ایک اخلاقی کتاب کلیلہ و دمنہ کا جو ترجمہ عربی زبان میں کیا ہے وہ ادبی حیثیت سے اس کا بہترین کارنامہ سمجھا جاتا ہے، موجودہ دور میں مولانا اشرف علی صاحب کا اصلاحی، اخلاقی اور صوفیانہ لٹریچر اردو زبان میں نثر کا نہایت پاکیزہ مستند، صحیح اور اس کے ساتھ دلچسپ نمونہ ہے، اس لئے وہ صرف ایک صوفی منش عالم ہی نہیں ہیں، بلکہ اردو علم ادب کے بڑے خدمت گذار بھی ہیں،

(۲) نثر کا دوسرا اہم مظہر تاریخ و سیر کی کتابیں ہیں، اور اس سلسلہ میں مولانا شبلی مرحوم نے جو قابلِ قدر کتابیں اپنی یادگار میں چھوڑی ہیں، وہ اردو زبان میں نثر کا قابلِ تقلید نمونہ ہیں،

(۳) نثر کا ایک پُر جوش مظہر سیاست ہے اور دنیا میں جس قدر بڑے بڑے سیاست داں پیدا ہوئے ہیں، وہ صرف سیاسی آدمی نہ تھے، بلکہ بہت بڑے ادیب اور انشا پرداز بھی تھے، مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کا شمار بہترین ادیبوں میں کیا جا سکتا ہے، اور یہ لوگ اگرچہ جو کچھ لکھتے ہیں انگریزی میں لکھتے ہیں، تاہم اردو زبان میں ان کی تصنیفات یا مضامین کے جو ترجمے ہوتے ہیں وہ اردو علم ادب میں نثر کا بہترین نمونہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، خود اردو لکھنے والوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کا طرز تحریر اردو زبان کا ایک غیر فانی معجزہ ہے، جس کی تقلید ناممکن ہے، اور جن لوگوں نے اس کی تقلید کی ان کا وہی حشر ہوا جو مسیلمۂ کذاب کا ہوا،

(۴) عام تذکروں، سطحی تاریخوں اور خیالی مضامین میں بھی نثر کی شگفتگی ظاہر ہو سکتی ہے، اور اس حیثیت سے اردو زبان کے انشا پردازوں میں مولنا محمد حسین آزاد کا کوئی جواب نہیں، لیکن ایک دوسرے بزرگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی ہیں، جن کا معجزہ یہ ہے کہ انھوں نے سنجیدہ مضامین میں بھی اسی طرز انشا کی شگفتگی اور تر و تازگی کو قائم رکھا ہے،

(۵) تنقیدی لٹریچر بھی نثر کا ایک بڑا میدان ہے، اور اس میدان میں مولانا حالی کا نام سب سے مقدم اور سب سے نمایاں ہے اور مولانا شبلی کی بعض ادبی کتابیں بھی اس سلسلہ کی بہترین کڑی ہیں،

(۶) مذہبی، اخلاقی، اصلاحی اور تعلیمی لٹریچر بھی نثر کے لئے بہت زیادہ موزوں ہے، اور ادبی حیثیت سے ان کا بہترین نمونہ سر سید نے قائم کیا ہے، انھوں نے بہت سے مکالمے

اور فلسفیانہ مضامین کو بھی نثر سے روشناس کیا ہے،

(۷) جدید فلسفہ میں بعض نفسیاتی اور اجتماعی مباحث میں بھی نثاری اور انشا پردازی کے جوہر دکھائے جاسکتے ہیں، اور اس سلسلہ میں مولنا عبد الماجد دریا بادی نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ نہایت قابلِ قدر ہیں،

(۸) ناول اور افسانے سب سے زیادہ نثر کے لئے موزوں ہیں، اور محض اس بنا پر ان کی ادبی قدر و قیمت کو گھٹانا کہ اخلاق پر ان کا اچھا اثر نہیں پڑتا صحیح نہیں ہے، اولاً تو اس موقع پر ادبی بحث ہے، اخلاقی گفتگو نہیں، دوسرے خود یہ مسئلہ بحث طلب ہے کہ اس خیال کی کوئی اصلیت بھی ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو علمی اور فلسفیانہ حیثیت سے اس کے مخالف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ناول یا افسانوں سے اخلاقی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، یا خود اخلاقی خرابیاں ناول اور افسانوں کے پیدا کرنے کا سبب ہیں، اور شاعری بالخصوص غزل کے متعلق بھی یہی بحث پیدا ہوتی ہے، بہرحال ادبی حیثیت سے ناول اور افسانے نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہیں، اور حکیم محمد علی کے ناولوں سے زیادہ شگفتہ اور رنگین نثر کا نمونہ اردو میں موجود نہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسرے ناولسٹوں اور افسانہ نگاروں کی خدمات قابلِ قدر نہیں، اس موقع پر صرف بہترین مثال دینا ہے، تمام ادیبوں اور انشا پردازوں کی فہرست مرتب کرنا مقصود نہیں ہے،

(۹) نثر کا ایک نہایت دلچسپ مظہر ادیبانہ یا ظریفانہ خط و کتابت ہے، اور اس حیثیت سے مرزا غالب کے خطوط نثر کا بہترین مرقع ہیں، اس وقت مختلف لوگوں کے مکاتیب کے جو مجموعے شائع کئے گئے ہیں وہ ایک بڑی ادبی خدمت ہیں، بالخصوص مولنا شبلی کے مکاتیب کا پایہ نہ صرف ادبی حیثیت سے بلکہ علمی حیثیت سے بھی نہایت بلند ہے،

(۱۰) نثر کا ایک بڑا وسیع میدان خطبے اور تقریریں ہیں، اور اہل عرب کی نثر انہی خطبات تک محدود تھی، بعد کو خلفاء و سلاطین اور دوسرے سیاسی لوگوں کے خطبات نثر کا بہترین نمونہ قرار دیئے گئے، اور عربی علم ادب کی کتابوں میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کئے گئے جو عربی نثر کی بنیاد قرار پائے، ایک ادیب کا قول ہے کہ "انشاپردازی کو خطابت ہی کے قالب میں ڈھالا گیا ہے اور انشاپرداز لوگ خطیبوں ہی کے راستہ پر چلے ہیں" اس لئے اردو زبان میں جو پرجوش اور فصیح و بلیغ خطبات موجود ہیں ان کو جمع کرنا اور ان پر نثر کی بنیاد ڈالنا ایک بڑی ادبی خدمت ہے، اور سرسید، نواب محسن الملک، مولانا نذیر احمد، مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریریں اس میدان میں ہماری رہنمائی کرسکتی ہیں۔

ان تمام اقسام کے بعد ایک دلچسپ بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ اخباروں کے اڈیٹر ادیبوں اور انشاپردازوں کے زمرہ میں شامل ہیں یا نہیں؟ مدت ہوئی میں نے کسی عربی رسالہ میں اس موضوع پر ایک مستقل مضمون پڑھا تھا، جس میں موافق و مخالف دونوں پہلو اختیار کئے گئے تھے، سردست فریقین کے دلائل یاد نہیں، البتہ اتنا یاد آتا ہے کہ نتیجہ میں اخبار نویسوں کو ادیبوں اور انشاپردازوں کے گروہ میں شامل کیا گیا تھا، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اخبار کا وہ حصہ جو خبروں اور تاروں سے تعلق رکھتا ہے، وہ توسرے سے نظم و نثر کسی صنف میں بھی داخل نہیں، اس لئے اگر کوئی اخبار نویس اس قسم کی خبروں کے جمع کردینے سے اپنے آپ کو ادیب اور انشاپرداز سمجھتا ہے تو وہ حماقت میں مبتلا ہے، البتہ اخباروں میں جو سیاسی، تمدنی، تبلیغی، تعلیمی اور مذہبی مضامین لکھے جاتے ہیں ان کی بنا پر ایک اخبار نویس ادیبوں کی صف میں کھڑا ہوسکتا ہے، موجودہ دور میں اس حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ظفر علی خاں، پنجاب کے مہر و سالک اور یوپی کے اخبار مدینہ کے بعض اڈیٹروں نے اخبار نویسی کا معیار بہت بلند کردیا ہے،

(۳) نثر کے بعد خود نثار کی ذات ہمارے سامنے آتی ہے، یعنی یہ کہ خود ادیب اور انشا پرداز کو کن اوصاف کا جامع ہونا چاہئے، عربی علم ادب کی کتابوں میں اس کے ایک ایک جزئیہ پر بحثیں کی گئی ہیں، مثلاً ادیب کا قلم کیسا ہونا چاہئے؟ کاغذ کیسا ہونا چاہئے؟ روشنائی کیسی ہونی چاہئے؟ اس کا خط کیسا ہونا چاہئے؟ اور بعض اوقات ان سے اہم نتائج بھی نکلتے ہیں، جو لوگ اخبار یا رسالہ نکالتے ہیں، وہ بدخط مضمون نگاروں کے اس ادبی نقص سے بیحد پریشان ہوتے ہیں، لیکن ان اوصاف میں سب سے اہم وصف یہ ہے کہ ادیب کو نہایت وسیع النظر اور ہر علم و فن کا ماہر ہونا چاہئے، صاحب مثل السائر نے لکھا ہو کہ ایک انشا پرداز کو ہر علم اور ہر فن سے تعلق رکھنا چاہئے، یہاں تک کہ اس کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ عورتوں کے حلقۂ ماتم میں کیا کہہ کر رویا جاتا ہے، مشاطہ جب دلہن کو سنوارتی ہے، تو کون سے فقرے بولتی ہے؟ بازار میں پکار پکار کر سودا بیچنے والے کیا کہتے ہیں؟ ایک ادیب یا ایک انشا پرداز ان طریقوں سے جو سرمایۂ معلومات فراہم کرتا ہے وہ اس کا گم شدہ مال ہوتا ہے جس کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ حکمت کی بات ایک مسلمان کا گم شدہ مال ہے جب وہ اس کو مل جاتا ہے تو وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہو جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اہل حکمت حکمت کی بات ایسے لوگوں سے بھی سیکھ سکتے ہیں، جو خود حکیم نہیں ہوتے، بقول سعدی "ادب از کہ آموختی، گفت از بے ادباں"۔ اسی طرح ایک انشا پرداز، انشا پردازی کے نکتے ان لوگوں سے بھی سیکھ سکتا ہے، جو خود انشا پرداز نہیں ہوتے، عربیت کے ایک بہت بڑے امام قصہ گویوں اور شعبدہ بازوں کے حلقہ میں جا جا کر شریک ہوتے تھے، اس پر لوگوں نے ان کو سخت ملامت کی کہ آپ اتنے بڑے امام ہو کر اس قسم کی ذلیل صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں، انھوں نے کہا کہ میں اس لئے شریک ہوتا ہوں کہ ان لوگوں کی ہذیان سرائی میں بھی بعض ایسے لطیف انشا پردازانہ

فقرے شامل ہوتے ہیں، جو ہمارے وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتے، صاحب مثل السائر نے اس قسم کے بہت سے انشا پردازانہ فقرے جمع کئے ہیں، جن سے اس نے اپنی تحریروں میں آب و رنگ پیدا کیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے کہ ایک عورت جس کا پہلوٹی کا لڑکا مرگیا تھا یہ کہہ کر رو رہی تھی کہ میرے رنج و غم کا کیا ٹھکانا یہ پہلی اشرفی تھی جو میری جیب میں پڑی تھی' میں نے اس فقرہ کو یاد کرلیا اور جب میرے ایک دوست کا پہلوٹی کا لڑکا مرگیا تو میں نے تعزیت نامہ میں کسی قدر تغیر کے ساتھ اس فقرہ کو شامل کرلیا،

اس نے ایک خاص عنوان یہ قائم کیا ہے کہ انشا پردازی سیکھنے کے کیا کیا طریقے ہیں؟ اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ بہت سے نادر مضامین بازاری اور پیشہ ور لوگوں کے ذہن میں بھی آسکتے ہیں، البتہ وہ ان کو مناسب الفاظ میں ادا نہیں کرسکتے، بغداد میں چند معمولی آدمی رمضان میں محلوں میں گھوم گھوم کر سحری کھانے کے لئے موزوں الفاظ میں جو شعر کے مثل ہوتے ہیں لوگوں کو جگاتے ہیں، میں نے اس قسم کے فقرے سنے تو وہ نہایت نادر معانی پر مشتمل تھے، البتہ جن الفاظ میں وہ ادا کئے گئے تھے وہ ان کے لئے موزوں نہ تھے، جاحظ نے لکھا ہے کہ مضامین تو بازاروں میں پڑے ہوئے ملتے ہیں، البتہ موزوں الفاظ میں ان کا ادا کرنا ایک ادیب یا شاعر کا اصلی کام ہے،

بہرحال وسعت نظر اور جامعیت، ایک انشا پرداز کا اصلی وصف ہے، شعر تو ہر شخص کہہ سکتا ہے، لیکن نثر صرف علما ہی لکھ سکتے ہیں، موجودہ دور کے انشا پردازوں میں اس حیثیت سے مولانا شبلی کا کوئی حریف نہیں، اس وقت دوسرے مصنف اور مضمون نگار بھی اس وصف میں ترقی کر رہے ہیں، لیکن اصلی شاہراہ مولانا شبلی ہی نے قائم کی ہے اور دوسرے لوگ انہی کی تقلید کر رہے ہیں، اس وقت جن علما نے تصنیف و تالیف کا مشغلہ

اختیار کیا ہے وہ اس وصف کے لحاظ سے جدید تعلیم یافتہ گروہ سے گوے سبقت لے گئے ہیں، اگر جدید تعلیم یافتہ گروہ ان کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو انگریزی زبان کے علاوہ فرنچ اور جرمن زبان بھی سیکھنی چاہئیے، حال میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے ایک عمدہ کتاب ایران بعہد ساسانیان شائع ہوئی ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال پروفیسر اورنیٹل کالج لاہور نے فرنچ زبان سے اردو میں کیا ہے جو جدید گروہ کے لئے شمعِ راہ ہو سکتی ہے؛

اس سے پہلے بھی دو عمدہ کتابیں یعنی تمدن عرب اور تمدن ہند کا ترجمہ فرنچ زبان سے کیا جا چکا ہے، بعض کتابیں مثلاً روح الاجتماع اور انقلاب الامم اگرچہ عربی زبان سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں، لیکن خود ان کے عربی ترجمے فرنچ زبان سے کئے گئے ہیں، انگریزی سے بھی بعض عمدہ کتابیں مثلاً تاریخ اخلاق یورپ اور معرکۂ مذہب وسائنس اردو میں نقل و ترجمہ کے ذریعہ سے آئی ہیں، میرے خیال میں جدید تعلیم یافتہ گروہ جو عربی اور فارسی نہیں جانتا اگر انگریزی زبان کی بہترین کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا شروع کرے تو ہمارے ادبی ذخیرہ میں بڑا قیمتی اضافہ ہو سکتا ہے، غلطی سے ترجمہ کے کام کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، اور اس کو ایک حقیر علمی یا ادبی خدمت سمجھا جاتا ہے، حالانکہ علمی اور ادبی حیثیت سے دو ہی کام سب سے زیادہ مشکل اور سب سے زیادہ اہم ہیں، ایک تو بچوں کو سبق پڑھانا اور دوسرے ترجمہ کرنا، اس لئے جو لوگ ترجمہ کو اوریجنل تصنیفات سے کم رتبہ سمجھتے ہیں، وہ دماغی عجب و خود بینی میں مبتلا ہیں، مسلمانوں میں علم و فن کی ابتدا اور اشاعت یونانی کتابوں کے ترجموں ہی سے ہوئی ہے۔

سب سے اخیر میں ایک اہم بحث یہ ہے کہ اس وقت اردو زبان میں تصنیفات و تالیفات کا جو ذخیرہ پیدا ہو رہا ہے، اس کی ادبی، علمی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی قدر و قیمت کیا ہے، اور اس وقت ہمارے ادیبوں اور انشا پردازوں کا رجحان کس طرف ہے؟

یک طویل بحث ہے، جس کی گنجایش اس مختصر تقریر میں نہیں ہے، اس لئے میں اس کو نظر انداز کرتا ہوں، البتہ لفظی اور معنوی حیثیت سے میں نے ادب کا جو معیار قائم کردیا ہے، اس کے مطابق ہر شخص خود اپنی فہم و بصیرت سے موجودہ سرمایۂ علم و ادب کا جائزہ لے سکتا ہے،

اب میں اپنی ناچیز تقریر کو ختم کرتا ہوں اور آپ لوگوں کا شکر گذار ہوں کہ آپنے میرے نامانوس خیالات کو نہایت متانت، سنجیدگی اور دلچسپی کے ساتھ سنا، لیکن میری یہ شکر گذاری آپ کی پسندیدگی ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ اگر آپ نے میرے ان خیالات کو ناپسند بھی کیا ہے، تب بھی میں آپ کا شکر گذار ہوں، کیونکہ اس سے بہر حال ایک مخالف ادبی معیار قائم ہوگا، اور ہر انصاف پسند شخص دونوں معیاروں کا موازنہ کرکے ایک معتدل معیار قائم کرسکے گا،

وھذا آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

تصحیح

گذشتہ مہینہ کے معارف ص ۷، ۴ سطر ۹ میں کتابت کی غلطی سے یہ عبارت چھپ گئی ہے "اور اللہ تعالیٰ نے بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں مثلاً توحید رسالت اور آخرت وغیرہ پر یقین دلانے کے لئے قسم کھائی ہے"۔
صحیح عبارت یہ ہے "اور اللہ تعالیٰ نے بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں کی قسم کھائی ہے، اور جن چیزوں مثلاً توحید رسالت اور آخرت وغیرہ پر یقین دلانے کے لئے قسم کھائی ہے"۔

یادِ پاستاں

از

جناب مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی

اگست کے ایک شذرہ نے مئی کے معارف پر توجہ دلائی اور مئی کے پرچہ نے چند قابلِ تلاش تاریخوں کی طرف (صفحات ۳۹۲ و ۳۹۳) بخشی خواجہ نظام الدین احمد کی تصانیف اور حالات کچھ اس عاجز ہیچ مداں نے بھی پڑھے تھے، کبھی ایک مستقل و مکمل، فاضلانہ تحریر ایک بدایونی محقق ونقاد کی بھی دیکھی تھی، میرا ذہن اُس عالمانہ و واقف کارانہ اور جامع الجہات مقالہ سے بھی خالی نہیں، جو محترمی سید احمد اللہ قادری صاحب حیدرآبادی کے خامۂ مشکیں رقم سے ۱۹۳۱ء میں نکلا تھا اور سالِ مذکور کے اگست کے معارف میں بصیرت افروز ہوا، اس میں معلومات کے اصل ذرائع یعنی فارسی تاریخوں کے اقتباسات و انتخابات بھی موجود ہیں، حوالہ کی کتابیں بھی وہی ہیں جو ہمارے واجب الادب ڈاکٹر بنی پرشاد نے نقل فرمائی ہیں، ایک دو ناموں میں خفیف سا فرق ہے، ہو سکا تو فاضل ڈاکٹر کے انگریزی آرٹیکل اور ان دونوں تاریخی مقالوں پر یکجائی نظر ڈال کر کسی وقت تفصیل سے عرض کروں گا، سردست ع

این رشتہ بہ انگشت نہ پیچم کہ دراز است

بالفعل چند تاریخوں کے بارہ میں گذارش کرنا چاہتا ہوں،

(۱) تاریخ محمدی، نمبر ۱۶۔ ڈاکٹر صاحب کی قیاس کردہ یا متخیلہ و مظنونہ تاریخ محمد بہادر خانی

کا مجھے علم نہیں، کم از کم اس وقت یاد نہیں، ایک نام کی کتابیں متعدد ہوتی ہیں، اس لئے اگر یہ کتاب تاریخ محمدی وہی ہے جو میں سمجھ رہا ہوں تو وہ نایاب نہیں، کمیاب کہہ سکتے ہیں، اس کا ایک قلمی نسخہ معظمی سید محمود علی رضوی صاحب رئیس چھپرا مئو کے یہاں موجود ہے، ڈوڈیڑھ سو برس پہلے یہی نسخہ مولانا مفتی محمد ولی اللہ فرخ آبادی کی ملک تھا، مفتی صاحب نے اس کو اپنے عظیم المنزلت کثیرالمنفعت مدرسہ فخر المرابع وربیع المفاخر کے لئے وقف فرما دیا تھا، چالیس پینتالیس سال ہوئے، نامور مستشرق اور ہندوستان کے عہد اسلامی کے کامیاب مورخ و مصنف ولیم آئروین (WILLIAM IRVINE) کی فرمایش و درخواست سے میرے زیرِ اہتمام اس کی نقل کرا کے انگلستان بھیجی گئی تھی، ریو کی فہرست میری نگاہوں سے دور ہے، نہ کوئی اور لمبی چوڑی فہرست میرے پاس ہے جس سے وثوق کے ساتھ کچھ کہہ سکوں، ممکن ہے کہ آئروین صاحب کے دیگر علمی خزائن و مخطوطات و متروکات کے ساتھ یہ نقل بھی برٹش میوزیم میں پہنچ گئی ہو، یا ان کی دختر نیک اختر مارگریٹ ایل آئروین صاحبہ (MARGARET.L. IRVINE) کے پاس محفوظ ہو جو خود بھی صاحبِ تصنیف ہیں اور ستھرا علمی ذوق رکھتی ہیں،

یہ ضخیم و جسیم کتاب دو جلدوں میں ہے، پہلی ہی جلد جہازی تقطیع کے ۱۲۳۴ صفحات پر آئی ہے اور پھر بھی آخر میں کچھ چھوٹا ہوا ہے، جس کا سراغ "ترک" کے عدم ارتباط اور عبارت کے منقطع رہ جانے سے چلتا ہے، مصنفِ علام نے اپنا نام "احقر العباد ذرہ ناچیز فقیر نہاد محمد بن رستم بن قباد احسن اللہ مآلہ و مآلہما فی المعاد" بتایا ہے، اس کے آگے بالکل خاموش ہے، نہ اپنے موطن و مسکن کا نام لیتا ہے نہ مشرب و مذہب کا ذکر کرتا ہے، وہ ہم ایسا قوم پرست یا ملک کو بدنام کرنے والا یا متعصب دیندار معلوم نہیں ہوتا ہر شیعہ اور شیعۂ امامیہ کا نام احترام کے ساتھ لیتا ہے، صرف ابن علقمی ایسے "رافضی" سے جلا ہوا ہے، ابوالرضا بن کرپال الہندی یا رتن بن ہنادیو بن باسدیو

(متوفی ۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۶ء) ایسے عمر رسیدہ بزرگوار سے بھی کوئی عقیدت نہیں رکھتا، مورخانہ انداز سے اہل حدیث کے اقوال کا حوالہ دیتا ہوا گذر جاتا ہے[۵]۔

---

[۵] آئین اکبری (جلد سوم، صفحہ ۱۶۸) میں شیخ بابا رتن پسر نصر ترمذی، ابوالرضا کنیت کے حالات بہ قدر ضرورت تفصیل سے لکھے ہیں، بابا کا دعویٰ تھا کہ وہ بہ زمانۂ جاہلیت ترندہ میں پیدا ہوئے، حجاز شریف گئے، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، دنیا بھر میں گھوم کر پھر ہندوستان آگئے، بہت سے لوگ ان کے دعوں اور باتوں کو مانتے ہیں، مگر ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اُن کی درازی عمر کے متعلق ان کے اقوال کو باور نہیں کرتا، (۷۰۰ھ م ۱۳۰۱ء) میں ترندہ میں وفات پائی، وہیں مدفون ہیں، شیخ ابن حجر عسقلانی، مجدالدین فیروزآبادی، شیخ علاء الدولہ سمنانی، خواجہ محمد پارسا وغیرہم ان کی بزرگی وکرامت کے قائل ہیں،

قاضی نوراللہ شوستری مجالس المومنین (صفحہ ۳۰۹) میں بابا کا نام بڑے ادب سے لیتے اور بکمال تعظیم وتکریم سے ذکر کرتے ہیں، بقول قاضی صاحب، ابوالرضا شیعی مذہب تھے، فضائل اہل بیت اور مدح شیعیان میں اکثر احادیث ان سے مروی ہیں، فضیلتِ روایات یہ کہ بلا واسطہ رسول مقبول صلعم سے پہنچی تھیں، ساتھ ہی تنبیہًا ارشاد فرماتے ہیں کہ "علمائے اہلسنت وجماعت خصوصًا حشویہ اربابِ حدیث ایشاں مانند ذہبی کہ نحاسی نحس رواندود ومتعصب مردود بودہ در ابوالرضا مذکور قدح موفور نمودہ اند، تا آنکہ ذہبی در کتاب میزان نامستقیم خود غایت تعصب بکار بردہ واو را کذاب ودجال شمردہ"۔ (شیعہ حشویہ سے کم درجہ کے محدثین کو مراد لیتے ہیں (مقالات شبلی صفحہ ۱۲ اول نوٹ)

نواب صدیق حسن خاں تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار میں لکھتے ہیں کہ شیخ رضی الدین لالا بھی ابوالرضا رتن کا ملنا اور اس سلسلہ میں بعض مشائخ کے اقوال نقل کرتے ہیں، مگر رتن ہندی کا عمر دراز پانا اور صحبت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے مشرف ہونا محض جھوٹ بکنا ہے، اہل حدیث کو بھی اس سے انکار ہے، وہ اس کو وضاع (بات گڑھنے والا) کذاب (نہایت جھوٹا) دجّال (بڑا دروغگو) بتاتے ہیں، اور یہی سچی بات ہے، انکار سے مراد صحبت نبیؐ سے انکار ہے نہ کہ اس کے وجود سے، کیونکہ صاحب قاموس

مؤلف اپنے باپ دادا کے نام سے عجمی النسل معلوم ہوتا ہے، لیکن اس نے صرف گیارہ صفحے رائج الوقت سادہ و رواں فارسی میں سیاہ کئے ہیں، باقی پوری کتاب عربی میں ہے، کچھ اپنی انشا ہے، کچھ منقولات غیر اور تلخیصات ہیں، ترتیب باعتبار سنین رکھی گئی ہے، ہر صدی، ہر قرن، ہر برس کے عمائد، ممتاز علماء و فضلاء، مشائخ کبار، صوفیہ صافیہ، بزرگان ملت و سلاسل، مشاہیر شعراء اور جملہ اہل فنون و ہنر کو ان کے سال وفات کی رعایت سے درج کیا ہے، اور جو کچھ لکھا ہے اس میں ایجاز و اختصار ملحوظ رکھا ہے، فرماتے ہیں،

تاریخ جہاں کہ قصۂ خورد و کلاں — درج است درو چہ شیراں چہ یلاں

در ہر ورقش بخواں کہ فی عام کذا — قدمات فلاں بن فلاں بن فلاں

مؤلف نے ان تاریخی کتابوں کی فہرست بھی دے دی ہے جن سے اس تاریخ محمدی کی تالیف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶) شیخ مجدالدین فیروزآبادی اس کو اپنی آنکھ سے دیکھنا بیان کرتے ہیں، ن۔ صوفی، رضی الدین علی لالاوی، متوفی ۶۴۲ھ، مدفون غزنی۔

تقریباً یہی کیفیت سرباتک بادشاہ ہند کی بھی ہے، ایسے ہی اختلافات ہیں، اصابہ فی تمیز اسماء الصحابہ میں جو علم رجال میں انہی حافظ احمد بن حجر عسقلانی کی مستند وضخیم تالیف ہے، نیز کتاب الذیل میں اسحاق بن ابراہیم طوسی جن کی عمر ستانوے سال کی تھی، اور اس سرباتک کی ملاقات و گفتگو کا حال مرقوم ہے، مگر اہل تحقیق عموماً اور مسبوق الذکر امام ذہبی خصوصاً جو رجالی بھی ہیں، محدث بھی، عظیم الشان مورخ و مصنف بھی، اپنی تجرید میں ان کی دیا یوں کہئے کہ) سرباتک کی باتوں کو "کذب واضح" سے تعبیر فرماتے ہیں (حیات جلیل حصہ دوم ص۱۵۱)

مسٹر بیل (W. T. BEALE) (ڈکشنری صفحہ ۱۱) دولت شاہ کی روایت اور بابا رتن کا چودہ سو برس کی عمر پانا اور تیرھویں صدی مسیحی کے آغاز میں فوت ہونا نقل کرتے ہیں، زبدۃ الکلام فی مشاہیر الاسلام کے شیعہ مؤلف نے اور بھی ناطرفدارانہ و بے نیازانہ روش اختیار کی ہے، فرماتے ہیں کہ رتن ہندی محدث کی عمر بعض نے چھ سو سال اور بعض نے ۷۰۰ سال لکھی ہے، مسلمان ہوگیا تھا، (ص۶۶)

وترتیب میں مددلی تھی، ان کا شمار ساٹھ سے متجاوز ہے، وجہ تسمیہ ... "جامع ایں اوراقِ پریشان نیز بہ اسم سامی حضرت خیرالانامی سعادتِ تسمی وارد، ایں کتاب والاانتساب را بدیں مناسبت تاریخ محمدی نام نہادہ شد"

مرنے والوں کے نام گنانے اور مختصر حالات بتا دینے کے سوا بعض بعض سنین (برسوں) کے ذیل میں اس سال کے اہم وضروری واقعات وحوادث بھی درج کر دیئے ہیں، مؤلف کی وسعتِ نظر اور کتاب کی جامعیت کی شہادت کے لئے اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ اس میں ہندو امرا اور راجاؤں کے سالہاے ممات وحالاتِ حیات اسی طرح ملتے ہیں جیسے مسلمانوں کے، بیٹے یا جانشین کا بیان کرتے وقت باپ یا پیش رو کے تذکرہ (مندرجۂ کتاب ہذا بحوالۂ سنہ) کا حوالہ دیتے جانا ناگزیر سمجھا گیا ہے،

بعض تاریخ نویس اس تاریخ محمدی کے مصنف کو صرف مرزا محمد کے نام سے یاد کرتے ہیں، محمد رستم اپنی کتاب سے قدیم ترکسی تاریخ محمدی کا نام نہیں لیتا، قیاس چاہتا ہے کہ یہی تاریخ محمدی ہوگی جس کا حوالہ طبقات اکبری (مشہور بہ تاریخ نظامی) میں دیا گیا ہے،

(۲) تاریخ نمبر ۲ کا نام صفحہ ۳۹۲ پر وقائع بابری اور صفحہ ۳۹۴ پر واقعات بابری لکھا ہے، حقیقت خدا جانے یا اس کتاب کے لکھنے والے جانیں، میرے نزدیک لغوی حیثیت سے دونوں میں کوئی فرق نہیں، تاریخوں کے نام کے ساتھ وقائع اور واقعات دونوں کا استعمال وانضمام دیکھا جاتا ہے، دونوں کے معنی بھی قریبًا یکساں ہیں، وقائع بمعنی حوادث واحوال، لڑائیوں کی خبریں، روداد ہیں، یہ "دقعۃ" بمعنی فتنہ وقتل کی جمع ہے، واقعہ کی جمع واقعات ہے، واقعۂ جنگ حادثہ، سختی وغیرہ کو کہتے ہیں، ایک معنی خواب بھی ہے،

باقی حال۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ واقعاتِ بابری سے مراد تزکِ بابری

ہے، (بابر کے خود نوشت سوانح) تزک کو بابر نے ترکی زبان اور خط طغرا میں لکھا تھا، اس کی
است بیانی، کتاب کی سلاست، زبان، عبارت کی روانی، فصاحت و لطافت، نکتہ رس دقیقہ
ناس ارباب علم سے خراجِ تحسین لیتی رہی ہے، مسٹر بیل کا یہی ایک جملہ کیا کم وقیع و وزن دار ہے[5]

BABAR WROTE HIS OWN LIFE WITH SUCH ELEGANCE AND TRUTH THAT THE PERFORMANCE IS UNIVERSALLY ADMIRED.

نواب صدر یار جنگ بہادر نے اس اظہار خیال کو دو لفظوں میں یوں ادا کیا ہے کہ "تمام
عالم نے اس کتاب کی تعریف کی ہے (تذکرۂ بابر، صفحہ ۸۰)

اسی تزک کا اصل ترکی چغتائی[6] سے انگریزی میں ترجمہ دو فاضل مشرق نواز انگریزوں مسٹر
لیڈن (JOHN LEYDEN) اور ارسکن (WILLIAM ERSKINE) کے قلم سے ہو کر مدت
ہوئی شائع ہوا تھا، (بیل کی ڈکشنری صفحہ ۶۲) ۹۹۸ھ (۱۵۹۰ء) میں اکبر کے حکم سے فارسی کا ترجمہ
مرزا عبدالرحیم خانخاناں نے کیا تھا[7]، یادش بخیر، میری طالب علمی کے زمانہ میں اسی واقعات بابری کا

---

۵ اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری، صفحہ ۶۲ ۶ چغتائی یا جغتائی اب تک ملک فرغانہ کی زبان ہے، بیابانوں
صحراؤں، دیہات اور شہروں میں اس کا یکساں دور دورہ ہے، یہ چغتائی خاں پسر چنگیز خاں سے منسوب ہے،
جس کی نسل کوہ الغ تاغ تک پھیلی ہوئی ہے (میموائرس آف بابر، مصححہ سر لوکاس کنگ، ۱۹۲۱ء،
صفحہ ۲) ترکی اور مغلی دو جدا جدا زبانیں ان اطراف میں تھیں، چغتائی ترکوں کو کبھی گوارا نہ ہوا کہ ان کی زبان
مغلی کہدی جائے، میجر ڈیوی (MAJOR DAVY) جیسے وسیع النظر زبان آشنا نے دونوں
کو خلط ملط کر دینے میں غلطی کی ہے، تیمور کی وفات سے بابر تک کا زمانہ ترکی لٹریچر کے واسطے عہد زرین سمجھا جاتا
ہے (ایضاً صفحہ ۲) آجکل ایران اور میدان جنگ کی خبروں اور تاروں میں جس چیز کا نام آتا ہے وہ جغتائی پہاڑ
کا سلسلہ ہے، جس کے قریب سبزوار وغیرہ مقامات واقع ہیں۔ ۷ واقعات کا ترجمہ ۹۹۸ھ میں ہوا، طبقات اکبری
اس کے دو سال بعد یعنی ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۳ء) میں تصنیف ہوئی، قیاس کہتا ہے کہ یہی ترجمہ بخشی صاحب کے پیش نظر تھا جو
خانخاناں کے خواجہ تاش اور اسی صوبۂ گجرات کے بخشی تھے جس کا گورنر خانخاناں تھا۔

ایک نہایت پُر تکلف نسخہ آگرہ کالج کی لائبریری میں موجود تھا، جو ۱۸۵۳ء یعنی آنریبل جیمس ٹامسن (JAMES THOMASON) لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے انتقال تک ان کا مملوکہ رہا تھا، اس کے سرورق پر شہاب الدین شاہ جہاں کی یادداشت بہ اضافہ "صاحب قرآن ثانی" تحریر تھی[1]، اس کے بعض الفاظ سے خالی الذہن قاریوں کو یہ غلط خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ شاہجہاں نے یہ پوری نقل اصل کتاب سے خود کی ہے، حالانکہ جس معمولی بلکہ بھدے طرز میں یہ یادداشت تھی وہ متن (اصل کتاب) کی منشیانہ پختہ نگارش و قلم کاری سے کلیۃً مختلف اور جدا تھی، اور بداہتہ اس نظریہ کی تردید کرتی تھی،

نصف صدی سے زیادہ زمانہ گذرا لیکن واقعات بابری کے اُس نادر نسخہ کی شکل وہیئت اب تک میری آنکھوں میں پھر رہی ہے، کاغذ نہایت خوش رنگ، خوشنما، چمکتا ہوا، دیدہ زیب خطاطی کا عجیب و غریب نمونہ، بغایت نظر فریب، قرآن پاک کی آیات سنہرے حروف میں لکھی ہیں، باقی کتاب مجلی روشن سیاہی اور خونابہ فشاں شنجرف سے تحریر ہے، اس میں کم و بیش پوری تقطیع کی پچاس تصویریں، پرانی انگریزی طرز کی صناعی سے کچھ کچھ مانند و مماثل تھیں، لیکن ان تصویروں اور ان سے ملتی جلتی افرنگی تصویروں میں زمین و آسمان کا فرق تھا، جس کا اعتراف خود بالغ نظر اور واقف فن انگریز کرتے تھے[2]، ان میں رزم و بزم دونوں کی اعلیٰ شان اور دستکاری کی انتہائی نزاکت و برتری

---

[1] صاحب قران ثانی، شاہجہان اول کا لقب تھا، اس کی ولادت بسب تخریج اہل نجوم زہرہ و مشتری کے قران دیگا ہونے کے وقت ہوئی تھی، صاحبقران اول امیر تیمور تھا [2] مسٹر ای بی ہیول رقم طراز ہیں کہ "یورپ کی تصویریں برکشی سی معلوم ہوتی ہیں، کیونکہ اہل یورپ صرف حسن مادی کے شیدا تھے، ہندوستانی صورت کشی حقیقی کیفیات اور ملکوتی جذبات کی ترجمان ہوتی ہے" (انڈین اسکلپ ٹرس اینڈ پینٹنگز صفحہ ۸۰۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب از مہا مہوپادھیاے گوری شنکر ہیرا چند اوجھا، مترجمہ منشی پریم چند، صفحہ ۳۴۲)

دارمخی، ترکستان میں بابر کی ابتدائی لشکرکشیاں اور معرکے، تاتاریوں اور ازبکوں سے مقابلے
رکے محاصرے، پانی پت میں ابراہیم لودی سے جنگ وپیکار، اس کی شکست، گریز و تعاقب، نیز طرح
رح سے دربار و جلوس کا اہتمام و احتشام، بزمِ نشاط کا فوری انعقاد، ہنگامی انتظامات، رفقائے برہنہ
شیر، جوانانِ تیغ بہ کف کی بر سرِ جنگ مے گساریاں، بادہ نوشیاں، بالآخر توبہ و انابت کی توفیق،
رکا مناجات کے لئے ہاتھ اٹھانا، جام و صہبا کو خیرباد کہنا، خم و سبو کو چور چور کر دینا، بادۂ ناب کو جوئے
آب کی طرح بہا دینا یا سرکہ بنا لینا، اور اس کی بدولت سنگ رام سنگھ رانائے چتور پر فتح پانا، غرض
کونسا منظر تھا جو ان تصاویر سے نگاہ کے سامنے نہیں آجاتا تھا، خود بابر کی بھی شبیہ تھی، بالکل ہو بہو
اور مو بہ مو، اصل کے مطابق، بیضوی چہرہ، چھوٹی چھوٹی کالی کالی مونچھیں، نوکیلی نیچی داڑھی، وسط
ایشیا اور ہندوستان کے جانور، وہاں کی عمارات، تاتاریوں اور اہلِ ہند کی وضع و قطع، زرق و برق لباس
م و رواج، اسلحۂ جنگ، آتش باریاں، خود زرہ اور اور ہتھیار، سواروں کی آن بان، گھوڑوں
شان اور ٹھاٹھ، تمام باتیں اور کیفیتیں، عیش و طرب کی ہوں یا پیکار و نبرد کی، کمال راست بازی
ت پژوہی کے ساتھ لفظاً و معنیً، اوراقِ کتاب پر جلوہ افروز پائی جاتی تھیں، تصویروں نے ان
جان ڈال دی تھی، کونسی چیز تھی جس پر لکھنے والے کی نگاہِ تیز رس نہیں پہنچی یا جس کو قلم اور موقلم
چھوڑ دیا ہو، ترکمانوں کی چھتری چھتری مختصر داڑھیاں اور بھینگی آنکھیں بھی ان کی زد سے بچ نہ سکیں،
ن شناس دیدہ ور انگریزوں نے اس نادر چیز کو بیش بہا یا خود انہی کی زبان میں PRICE
LESS) "بے بہا" لکھا ہے، اکبرآباد کی یادگار ہائے پاستان اور سلاطینِ مغل کے علمی و ادبی
رنامیوں میں یہ منتخب ترین ولاجواب شمار کی جاتی تھی، اور یہ رائے بالکل حق بہ جانب تھی، مسٹر
ن (E.A. DUNCAN) اور مسٹر کین (KEENE) نے آگرہ ہینڈ بک میں ایک
نقل باب ضمیمہ الف کے عنوان سے اس کے نذر کیا تھا، پھر وہ کونسا جہاں گرد سیاح تھا جو

جو اکبر آباد آتا ہو اور اس نادر ترین شے کی زیارت سے مشرف نہ ہو جاتا ہو،

استدراک، وہی نام کا مسئلہ، ہندوستان زاانوگی نژاد مسٹر بیل بھی واقعات بابری بتاتے (ڈکشنری صفحہ ۸) اور آئین اکبری کے ترجمۂ انگریزی (جلد اول، صفحہ ۳۳۴) کا حوالہ دیتے ہیں، ابو الفضل علامی کی عبارت یہ ہے،

واقعات حضرت گیتی ستانی کہ دستور العمل کار آگہی ست، میرزا خانخانان از ترکی بہ فرس آورد (جلد اول، صفحہ ۷۶)

ملا قاسم ہندو شاہ نے بھی واقعات بتایا ہے (فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۱۱، نولکشوری) مگر ایک دوسرے موقع پر سلسلۂ کلام میں یہ بھی کہہ گیا ہے کہ "وقائع سلطنت خود را در ترکی بہ نوعے نوشتہ کہ فصحا قبول دارند" .... یہاں پر وقائع اور واقعات کا فرق اور دونوں میں فرق کرنے کی ضرورت ظاہر ہے،

خان آرزو نے بھی تذکرۂ مجمع النفائس میں "بایسنغر کے ذکر میں واقعات بابری کا نام لیا ہے، جس سے آرزو نے استفادہ کیا تھا،

اپنے عنفوانِ شباب میں ایک ہونہار طالب علم نے جو اب دین و دنیا، دولت و امارت علم و فضل کے جامع ہیں، جو فخرِ قوم مخدوم ملت ہیں، جو مولانا الحاج محمد حبیب الرحمن خاں شیروانی کے نامِ نامی اور نواب صدر یار جنگ بہادر کے خطاب گرامی سے عالمگیر شہرت رکھتے ہیں، واقعات اکبری کی نقل اسی کالج والے نسخہ سے حاصل کی تھی، اور جو امید ہے کہ حبیب گنج کی بے مثل لائبریری میں ہنوز محفوظ ہوگی، تذکرۂ بابر لکھتے وقت یہ نقل بھی پیشِ نظر تھی، صرف یہی نام واقعات بابری اس میں بھی ملتا ہے، (تذکرہ صفحات ۱ و ۶۱ و ۷۳ و ۷۷)

موجودہ دور کے قابل و کثیر التصانیف مورخ مولوی سید احمد مارہروی اسی کی نسبت

فرماتے ہیں کہ واقعات بابری کا یہ قلمی باتصاویر نسخہ نہایت نایاب و بیش بہا ہے (مرقع اکبرآباد، صفحہ ۱۳۶، مطبوعہ آگرہ ۱۳۴۹ھ) اسی سلسلہ میں اصل ترکی توزک کا (صفحہ ۲۱۰) پر حوالہ دیتے ہیں،

وقائع۔ صرف منشی دوارکا پرشاد افق نے ترجمۂ راجستھانِ ٹاڈ میں بابر کی توبہ و استغفار کے سلسلہ میں وقائع بابری نام لیا ہے (اشاعت پنجم، صفحہ ۵۶۹)

مدت سے ہمارے ملک اور ہماری انشاء پر نظم و شعر کے بادل بہت گھرے چھائے ہوئے ہیں، ان کے پھٹنے اور چھٹنے میں زمانہ کا ہاتھ بے کار ثابت ہوا ہے، جس بابرکت سرزمین نے اقبال و ٹیگور سے معنی آفریں اور رجز خواں پیدا کئے ہوں، قوم کو چونکا دینے والے، دلوں کو ہلا دینے والے انسان جس خاکِ پاک سے اٹھے ہوں، بے شبہہ وہ تمام فخر و مباہات کی مستحق و مجاز ہے، مگر شکوہ یہ ہے کہ ہمارے تذکرہ نویس بلکہ بعض اوقات دعویدارانِ تاریخ نگاری بھی سخن سرائی اور اشعار خوانی کی رو میں اور سب کچھ بھول جاتے ہیں، میں دیکھتا ہوں کہ اس میدان میں جو پہلوان آتا ہے وہ خم ٹھونک کر شہنشاہِ بابر کی فقط ثنا خوانی اور لفاظانہ مدح گوئی کرتا، اس کے چار چھ شعر فارسی کے پڑھ کر چلا جاتا ہے، پھر آگے خاموشی ہی خاموشی رہ جاتی ہے، اس کی انشا پردازی، زورِ قلم، قوتِ تحریر کا اعتراف و تحسین، ایسے معاملات، بیرونی سیاحوں، غیر اقوام کے تمیز دار لکھنے والوں کے لئے اٹھا رکھتا ہے، میر حسین دوست سنبھلی صاحب تذکرہ حسینی (صفحہ ۲۳) اسکو ایک جامع سند بھی دیتا ہے کہ "محمد بابر قلندر بادشاہ در شجاعت و عدالت و سخاوت و فصاحت گوے از سلاطین زماں ربودہ"۔ مگر "تزک" یا "واقعات" کا نام لے کر گناہ گار بننا گوارا نہیں کرتا، راجہ درگا پرشاد نے گلستانِ ہند (دفتر سوم، صفحہ ۲۱۳) میں یہی گریز ملحوظ رکھا ہے،

بخلاف ان بزرگوں کے، یورپ کا ہر نظر باز، ایشیا اور اہل ایشیا سے نفرت نہ کرنے والا بابر کی تحریرات ہی کی بہ غایت مدحت و ثنا کرتا ہے، کرنیل ٹاڈ اپنی تاریخ کی جلد دوم (صفحہ ۶۱ مطبوعہ ۱۸۹۴ء)

میں فرماتے ہیں کہ "بابر۔۔۔۔ کی خود نوشت سوانحمری عجیب کارآمد و قیمتی چیز ہے ۔۔۔"

اسی تاریخ ٹاڈ کے فاضل مرتب کنندگان نے اس تزک کی تعریف میں ورق کے ورق سیاہ کئے ہیں اور صفحہ ۲۵۴ پر اس کے بارہ میں ایک بڑا زوردار نوٹ اور اپنا خیال بلند قلمبند کیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ "میموائرس آف بابر کے لئے ادب و انشا کی دنیا مسٹر ارسکن کی کمال احسان مند و منت پذیر رہے گی، یہ ایک بے مثل کتاب ہے، قطعاً اوریجنل، بالکل نو ایجاد، نادر قدر و قیمت کی چیز، اس کی طویل و مفید تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات اس قطعۂ زمین سے تعلق رکھتی ہیں جو ربع مسکوں کا دلچسپ ترین حصہ ہے "

تزک کے فرانسیسی مترجم پاویل دی کورٹیل (POWELL DE COURTEILLE) نے اسکی مقبولیت اور عام پسند ہونے کی یہی دلیل کافی سمجھی ہے کہ اس کے تین ترجمے فارسی میں ہو چکے ہیں (میموائرس آف بابر از لائیڈن ولوکاس کنگ، تمہید انگریزی)

لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۹۱۶ء میں مدارس برطانیہ کے رشید ترین متعلمین سے شہنشاہِ بابر پر مضامین لکھائے اور متعدد انعامات عطا فرمائے تھے، ان ہونہار طلبہ نے جس محنت و توجہ اور تحقیق و تدقیق سے کام لیا اور جو کچھ لکھا وہ ان کی بالغ نظری پر شاہد ہے، اور سوسائٹی کے رسالہ کے صفحات (صفحہ ۶۹۱ سے ۷۰۶ تک) ان کی روداد سے مالامال ہیں، بابر کی صفاتِ ذاتی کا ذکر، اس کی تحریر کی تحسین، عبارت کا اختصار اور روانی، قلم کا زور، ہر چیز پر ہر ایک لکھنے والے نے نگاہ ڈالی ہے، توزک کا ایک نادر مخطوطہ برٹش میوزیم میں موجود ہے، یہ عہد اکبری کا ہے اور اس کا ذخیرۂ تصاویر بھی اسی زمانہ کا تیار کیا ہوا ہے، ہر مضمون نگار نے اس سلسلہ کی ہر ایک تصویر کو جدا جدا غور و توجہ سے دیکھا اور ہر ایک پر تبصرہ کیا ہے، یہ تصاویر حد درجہ خوبصورت، اور بہ غایت پسندیدہ و دل فریب ہیں، لین پول (LANE POOLE) نے ترجمہ تزک کی تمہید میں

ان کی پوری ستایش کی ہے، بابر کا فرزند دلبند کو نصیحتیں کرنا، طرز تحریر سکھانا، اس کے قلم کی ہر جنبش بجائے خود سبق آموز ہے، میرا مقصود ان ہدایات و ارشادات سے ہے جو باوجود تمام دشت نوردیوں اور نبرد آزمائیوں کے بابر نے مرزا کامراں کے لئے لکھی تھیں، مذہب اور اخلاق کا سبق دینے کے لئے مثنوی مبین اور مذاقِ سخن چمکانے یا پیدا کرنے کے لئے رسالہ "والدیہ" منظوم خاص طور پر شہرت و امتیاز رکھتے ہیں،

ہل من مزید! ایک تیسرے نام سے فارسی کی یہی کتاب میرے مطالعہ میں آرہی ہے، یہ نسخہ چترا پرکھا پریس کا مطبوعہ محرم ۱۳۰۸ھ مطابق اگست ۱۸۹۰ء کا ہے، اس کے طابع فارسی کتابوں کے مشہور ناشر مرزا محمد شیرازی ملک الکتاب ہیں، مرحوم نے سرورق پر اس کو بابرنامہ موسوم بہ توزک بابری و فتوحات بابری لکھا ہے، بابرنامہ میں نے انگریزی تبصروں، بالخصوص سر لوکاس کنگ (SIR LUCAS KING) وغیرہ کی تحریرات میں بیشتر دیکھا ہے، یہ صاحب ڈبلن یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے پروفیسر اور ہندوستان کی تواریخ پر لکچرار اور کبھی ہمارے ملک کی سول سروس کے رکن تھے، انگریزی ترجمہ کی نظرثانی و اشاعتِ جدید میں بھی ممدوح کا ہاتھ تھا، مختصر یہ کہ عصر حاضر میں وہ "بابریات" کے سب سے بڑے ماہر اور باخبر مانے جاتے ہیں،

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ باوصف تلاش بلیغ یہ کتاب دستیاب نہیں ہوتی تھی، بہ مشکل پتہ چلا کہ عالی جاہ مہاامومایا دیا راجہ سانول داس جی بہادر ممبر کونسل راج اودے پور کے کتبخانہ میں موجود ہے، وہاں سے حاصل کر کے اس کے چھاپنے کی تدبیر کی، افسوس ہے کہ باوجود سعی بسیار پوری تصحیح نہ ہوسکی، اول تو ایک ہی نسخہ ملا، پھر اس میں ترکی الفاظ کی بھرمار، اغلاط کا رہ جانا محض مجبوری سے تھا، مرزا صاحب آگاہ فرماتے ہیں کہ "یہ وہی ترجمہ ہے جو اکبر بادشاہ کے زمانۂ سلطنت

میں خانخاناں بیرام خاں نے خانیاً عن التحریف والتغیر ترکی سے فارسی میں کیا تھا، اور تجارب الملوک نام رکھا تھا، مقبول ہیچ مداں عرض کرے گا کہ اس کے تمام اغلاط نحوی و معنوی وقتِ طباعت ادنیٰ توجہ سے رفع ہو سکتے تھے، بیٹے یعنی عبدالرحیم خاں کے بجائے اس کے باپ بیرام خاں کے ساتھ اس ترجمہ کا انتساب صریحاً ظلم اور مسلماً غلط ہے، اور خاتمہ نویس (خود مرزا) کی بے احتیاطی، کمی توجہ بلکہ (سوءِ ادب نہ ہو تو کہوں گا کہ) ناواقفیت و قصورِ اطلاع پر مبنی ہے،

کتاب ہر ایک کے لئے سہل الفہم نہیں ہے، اصلاً عبارت آسان و شیریں ہے، لیکن نامانوس اصطلاحات، بیگانہ ناموں اور غریب و اجنبی الفاظ نے پیچیدہ و دشوار تر بنا دیا ہے، قدم قدم پر انگریزی ترجمے اور اس کے نفیس و فائدہ بخش ذخیرۂ حواشی اور یادداشتوں کی طرف استدراکاً رجوع کرنا پڑتا ہے،

وقائع کہنے والے دوست سُن لیں کہ خان خاناں نے ہر سال کے تحت جو حوادث و سوانح درج کئے ہیں، اکثر و بیشتر ان کا عنوان "وقائع سنہ فلاں" قائم کیا ہے،

ڈیڑھ صفحہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ موسیو کوریٹل نے توزک بابری کے (بلا تفصیل و تسمیہ) تین فارسی ترجمے بتائے ہیں، مسٹر آئروین صرف دو لکھتے ہیں (جرنل رائل سوسائٹی، جولائی سنہ ۱۹۱۰ء صفحہ ۷۹۸) مسٹر کوزنیس (COUSENS) واقعات بابری یعنی زیر بحث ترجمہ کے سوا ایک اور یعنی پاینده حسن کا بھی نام لیتے ہیں (جرنل مذکور، سنہ ۱۹۱۱ء صفحہ ۷۶) یہ عاجز اس کی دستیابی سے قاصر ہے،

(باقی)

سر اقبال مرحوم اور انکی شاعری

از

ڈاکٹر حفیظ سید ایم اے ڈی لٹ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی

سر اقبال مرحوم کو جو ذہن و ذکا اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور تحصیل علم کے لئے جو ذرائع اون کو حاصل تھے، وہ موجودہ دور کے کم شعراء کو نصیب ہوئے ہون گے، یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے سے پہلے ہی انھون نے شمس العلماء میر حسن کے فیض تلمذ سے فارسی زبان مین عبور حاصل کر لیا تھا، اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کی تعلیم کے زمانہ مین انھون نے انگریزی ادب فلسفہ اور اقتصادیات کا گہرا مطالعہ کیا، اور ایم اے ہونے کے بعد ہی اسی کالج مین انگریزی ادب اور فلسفہ کے پروفیسر ہو گئے، اور کئی سال تک اسی عہدہ پر رہے، اس زمانہ میں انھیں اپنا مطالعہ کرنے کا پورا موقع ملا، اس کے بعد ستمبر ۱۹۰۵ء مین کیمبرج گئے، یہان وسعت نظر مین اور ترقی ہوئی، اور یورپ کے قیام کے زمانہ مین انھون نے مغربی تہذیب و معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا، اور تاریخ اسلام و فلسفۂ اسلام کے غامض مسائل پر غور و فکر کی نظر ڈالی، اس سے ان کے دل مین یہ اعتقاد راسخ ہو گیا، کہ اصل زندگی روحانی ہی، اور اسی مین انسانی فلاح مضمر ہے، اور روحانی زندگی کا صحیح اعتدال اسلام مین ہے، اس لئے اس کو مغربی ملکون مین پہنچانے کی ضرورت محسوس ہوئی یہی ان کی پیامی شاعری کا سب سے پہلا محرک ہے،

اقبال ولایت کی واپسی کے قبل ہی سے طبع آزمائی کرتے تھے، اس زمانہ مین بھی انکی

شاعری زیادہ تر اجتہادی اور کچھ رسمی شان لئے ہوئی تھی، لیکن رسمی شاعری بھی حسن وعشق کے فرسودہ خیالات تک محدود نہ تھی، اس مین بھی مذہبی عنصر موجود تھا، اس کے بعد وہ جتنا آگے بڑھتے گئے، یہ عنصر زیادہ نمایان ہوتا گیا، تا آنکہ ان کی شاعری سراسر تعلیم وپیام بن گئی، مسلمانون کے ملی جذبات کو بیدار کرنے مین ان کی شاعری کو بڑا دخل ہے، خصوصًا نئی پود اور جدید تعلیم یافتہ گروہ کی مسموم مغربیت کے لئے تو اوس نے تریاق کا کام کیا،

علامہ اقبال کی شاعری کی وسعت نے ہماری تمام دینی قومی اور ملی ضرورتون کو اپنے دامن مین سمیٹ لیا تھا، وہ ہندو مسلم اتحاد کے دل سے حامی تھے، اور ایک زمانہ تک اوس کے پرجوش مبلغ رہے، جس پر ادن کا ابتدائی کلام شاہد ہے، جب ان کے خیالات مین اور زیادہ وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی، اور انسانی برادری کا اور وسیع نظر سے انھون نے مطالعہ کیا، تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام بنی نوعِ انسان ایک ہی سمندر کے قطرے ہین، اور قومیت و وطنیت اور رنگ وخون کی تقسیم کے باوجود سب انسانیت کے ایک ہی رشتہ مین منسلک ہین، ان کو اس ہستیِ علی الاطلاق پر کامل اعتقاد تھا، جو ساری مخلوق کی خالق اور سب سے بلند و برتر ہے، وہ ایک سچے مسلمان کی طرح اسکی رضا اور اسکی مخلوق کی خدمت کو دین وایمان سمجھتے تھے، یہی عقیدہ انکی شاعری کی روح ہے، اور انھی خیالات ومقاصد کے وہ ترجمان تھے، انھون نے کبھی فرمایشی نظم نہین لکھی، اور نہ کبھی کسی کی مدح سرائی سے اپنی شاعری کو آلودہ کیا،

ان کے تمام خیالات وکلام پر ان کے ذاتی فلسفۂ حیات کا رنگ چڑھا ہوا ہے، جس کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر قائم ہی، انسان کی عظمت وشرافت پر ان کو یقینِ کامل تھا، اسی لئے انفرادیت اور ہستی کی تکمیل ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے، ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ فرد کی طرح قوم کو بھی اپنی انفرادی خصوصیات کا تحفظ اور انکی نگہداشت کرنی چاہئے، کسی قوم کی کورانہ تقلید سے

اپنی خصوصیات کو ہرگز ضائع نہ کرنا چاہئے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ڈاکٹر اقبال قومی و نسلی امتیازات قائم کرتے تھے، بلکہ اس لئے کہ ایک قوم دوسری قوم کی کورانہ تقلید سے اپنے جوہر کھو دیتی ہے، ورنہ قوموں کے اتحاد کے بارہ میں تو ان کی تعلیم یہ ہے کہ اپنے نسلی امتیازات مٹا کر تمام انسان ایک الٰہی مرکز پر جمع ہو جائیں،

ڈاکٹر اقبال میں وہ تمام اوصاف جمع تھے جو ایک حقیقی شاعر کے لئے ضروری ہیں، ان کو فطرت کی جانب سے حساس دل اور مفکر دماغ عطا ہوا تھا، اور ان کا مقام رسمی شاعری سے بہت اونچا تھا، ان کی شاعری فکر و تاثیر کا نتیجہ تھی، واقعات و حوادث اور حالات و مقامات ان کے شاعرانہ جذبات کو ابھارتے تھے، قرطبہ اور اسپین کی سیر اور نپولین اور حکیم سنائی کی قبر کی زیارت نے ان کے دل میں، ماضی کے واقعات کی یاد تازہ اور ان کے پُرسوز جذبات کو برانگیختہ کیا، اس اثر کے تحت میں انھوں نے جو نظمیں کہی ہیں وہ اس اثر کی پوری ترجمان ہیں، وہ الفاظ کے بھی صناع تھے اور ان سے عجیب کیف و ترنم پیدا کرتے تھے، یہ ان کا اعجاز تھا کہ چند اشعار میں ایسے عمیق خیالات بھر دیتے تھے کہ جن کی تفصیل کے لئے دفتر چاہئیے،

عقائد میں ان کے خیالات نہایت ٹھیٹھ اور راسخ تھے، عہد حاضر کے مغربی تمدن اور اس کے مذہب سیاست اور معاشرت کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا، اور اس کے متعلق ایک مستقل رائے رکھتے تھے، توحید باری اور روحانی زندگی کی حقانیت و صداقت پر کامل ایمان تھا، ان کے عقیدہ میں چشم ظاہر بیں سے پنہاں اور عقل و فہم سے ماوراء ایک ذاتِ بحت ہے جو کل کائنات میں جاری و ساری ہے، یہی ذاتِ بحت سارے وجود کا سرچشمہ ہے، اس لئے اس کی طرف رجوع اور انابت ہمارا فرض ہے، ان کے ان خیالات کے متعلق ان کی بعض نظمیں نقل کی جاتی ہیں،

خداوند تعالیٰ | اقبال نے قرطبہ کی مسجد میں ایک نظم دعا کے عنوان سے کہی تھی، اس سے ان کے

جوشِ ایمان اور توحید پرستی کا اندازہ ہوتا ہے،

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو

تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے مرے سینہ میں آتشِ اللہ ہُو

تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تو ہی مری آرزو تو ہی مری جستجو

انسان کی صلاحیت وقابلیت اقبال کو انسان کی غیر محدود صلاحیت و قابلیت پر کامل یقین تھا، وہ اس کو خلیفۃ اللہ فی الارض تصور کرتے تھے، وہ اس کی روحانی عظمت کو ثابت کرتے ہیں، اُسے شاندار مستقبل کی امید دلاتے ہیں، جس تارکِ خودی کو اپنی صلاحیتوں کا احساس نہیں، اسے وہ زمرۂ انسانیت سے خارج سمجھتے تھے، وہ ہمیشہ انسان کو حسنِ عمل اور عالی حوصلگی کی ترغیب دلاتے ہیں کہ وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہو، اور اپنی ہستی کو حقیر و ذلیل نہ سمجھے ان کے نزدیک اگر انسان کا عقیدہ پختہ، عزم راسخ اور ہمت بلند ہو تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا وہ خاک کا ذرّہ نہیں جسے ہوا کے جھونکے ادھر اودھر اڑائے پھرتے ہیں، جب تک وہ اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہے وہ پست ہے، جوں ہی اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی، وہ خلافتِ الٰہی کا اہل ہوگیا، اس کا مستقبل اور اس کی تعمیر خود اس کے اختیار میں ہے، انسان کو ذلیل و خوار کرنے والی چیز مادہ پرستی ہے، اگر وہ خلیفۃ اللہ بننا چاہتا ہے تو اسے "یقین محکم" "عمل پیہم" اور "محبت فاتح عالم" پر عمل پیرا ہونا چاہئے، ذیل کے اشعار اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں:-

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

تو اے اسیر مکاں لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پہ اسرار شہنشاہی

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

خودی اقبال کا سارا زور "خودی" پر ہے، لیکن اس کو ایسے مبہم معنوں میں استعمال کیا ہے کہ لوگوں نے اس کی مختلف تعبیریں کی ہیں، اور اس کے مختلف معنی پہنائے ہیں، راقم نے جو کچھ سمجھا ہے اس کو ذیل میں پیش کرتا ہے،

تصوّف کی رو سے انسان کو دو طرح کی خودی بخشی گئی ہے جس کو تصوف کی اصطلاح میں بالترتیب " انانیت شخصی" اور انانیت حقیقی" کہتے ہیں، اول الذکر سے مراد جسم حواس خمسہ اور دل و دماغ" ہے اور جو چیز مستقل ناقابل تغیر اور غیر فانی ہے وہ انانیت حقیقی ہے، اور اس میں لاتعداد صلاحیتیں مخفی ہیں، بعض اوقات خودی کا لفظ خود بینی خود پرستی اور خود نمائی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ اوصاف انسان کے شایان شان نہیں، اس لئے اقبال نے خودی کو ان معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ اس سے ان کی مراد انسانیت انفرادیت ہے، جو فرد واحد کو دوسرے افراد سے ممتاز کرتی ہے، اس شخص کو جسے اپنی ذاتی انفرا

احساس ہے اسے انفرادیت کی نگہداشت اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے، اور دوسروں کی تقلید جامدسے بچکر خود مستقل بالذات اپنا وجود قائم کرنا چاہیے،

چونکہ افراد ہی سے قوم بنتی ہے اس لئے جب افراد اپنے اوصاف کی نگہداشت کریں گے تو قوم کی نگہداشت خود بخود ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ نے انسان میں خاص خاص اوصاف ودیعت کئے ہیں، اس لئے اس کا فرض ہے کہ ان کو کام میں لائے اور اپنا مقصدِ حیات پورا کرے،

روح انسانی جو ناقابل تغیر اور غیر فانی ہے انانیت شخصی سے جو تغیر پذیر اور فانی چیزوں سے عبارت ہے بالاتر اور شریف تر ہے جس میں لامحدود ترقیوں کی استعداد ودیعت کی گئی ہے، یہی وہ انانیت اور خودی ہے جس کو سمجھنے پہچاننے اور برتنے پر علامہ مرحوم نے زور دیا ہے اور بار بار اس کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے، اس غیر فانی انانیت کو ریاضت نفس کشی، ترکِ خواہش اور ذکر و فکر کے ذریعہ تربیت دے کر ترقی کے معیار پر پہنچایا جا سکتا ہے، اگر انسان کو اپنی حقیقی عقلی جلوۂ المخلوقات اور روحانیت کا احساس ہو جائے تو وہ دنیا اور آخرت کی ہر بھلائی کو حاصل کر سکتا ہے، اشرف ہونے کی حیثیت سے انسان کو جو اہمیت حاصل ہے اسے اس طرح بیان کیا ہے،

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے ‏ جہاں ہے تیرے لئے تو جہاں کے لئے

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا ‏ خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے ‏ نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ ‏ تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ‏ تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

بے ذوق نمود زندگی موت ‏ تعمیر خودی میں ہے خدائی

رائی زورِ خودی سے پربت ‏ پربت ضعفِ خودی سے رائی

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی ۔ شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ

اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق سے محبت

اقبال کا دل نوعِ انسانی کی محبت کا خزینہ ہے اور وہ ہر انسان سے اسی جذبۂ محبت کی توقع کرتے ہیں،

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے ۔ میں اسکا بندہ بنوں گا جسکو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

اس ہمہ گیر اخوت میں فرقہ پرستی کی گنجایش نہیں، عشقِ مخلوق عشقِ خالق ہی کا پرتو ہوتا ہے، اس جذبہ سے جغرافی اور قومی حدود و قیود ٹوٹ جاتے ہیں اور ہر قوم و ملک کا آدمی اپنا ہی کنبہ نظر آتا ہے،

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی ۔ گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

آزادی اور جدت تخیل

جرأت و آزادی اقبال کی شاعری کا نمایاں وصف ہے، وہ ہر خیال کو آزادی اور بے باکی سے ظاہر کرتے ہیں، وہ خود کہتے ہیں،

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق ۔ نہ بندۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اقبال کے سوا موجودہ دور کے کسی شاعر کے کلام میں یہ صداقت نہیں ملتی، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ مومن کامل بھی تھے اور فلسفی بھی،

جن لوگوں کو اقبال سے ذاتی واقفیت ہے انھیں اسکے ماننے میں تامل نہ ہوگا کہ اقبال نے نہ صرف اپنے حکیمانہ خیالات کے اظہار میں بے باکی سے کام لیا بلکہ وہ خود بھی ان پر عامل تھے، بڑے بڑے لوگوں سے جن میں والیانِ ریاست بھی تھے ان کے تعلقات تھے لیکن انھوں نے کبھی کسی کی مدح سے اپنی بلند شاعری کو داغدار نہیں کیا، وہ ایک آزاد، قانع اور مستغنی درویش تھے، خود کہتے ہیں،

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی ۔ کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

اقبال اور تہذیب جدید | اقبال تہذیب جدید کی پیداوار تھے، اور ایک زمانہ تک یورپ میں رہے اس کے علوم و فنون کا مطالعہ کیا، یورپ کے مختلف حصوں کی سیاحت کی، اس اعتبار سے ان کو تہذیب جدید کا فرزند ہونا چاہئے تھا، لیکن یہ حیرت انگیز امر ہے کہ اس تہذیب کی ظاہری نظر فریبی نے انکی آنکھوں کو خیرہ نہیں کیا تھا، بلکہ وہ اس کے سب سے بڑے ناقد تھے اور اس کی مادہ پرستی اور فریب سیاست کو انسانیت کے لئے ہلاکت تصور کرتے تھے، اس کا سبب ان کا فلسفۂ خودی ہے کہ ہر فرد اور قوم کو اپنی انفرادی ہستی برقرار رکھنی چاہئے اور دوسری قوموں کے سحر سے مسحور ہو کر اپنی ہستی نہ کھو دینی چاہئے، مشرقی قوموں کو مغرب کی مادہ پرستی سے بچانا ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ مشرقیوں کے لئے درس بصیرت ہے، اس تہذیب کی رگ پر انھوں نے خوب خوب نشترزنی کی ہے،

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی	کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے	کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی	جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ	سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا	دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک

اخوت اور مساوات اسلام | اسلام نے جس اخوت و مساوات کی تعلیم دی اور آنحضرت صلعم نے جس کی عملی بنیاد قائم کی وہ دنیا کا عظیم الشان معجزہ ہے، اس اخوت کی بنیاد، دین و اخلاص اور محبت و رواداری پر قائم تھی، اسی مساوات کا کرشمہ تھا کہ انصار نے اپنی آدھی ملکیت مہاجرین میں تقسیم کر دی تھی، اور ایک حبشی غلام ایک قریشی سردار کا ہمسر ہو گیا تھا، کیونکہ اسلام میں فضیلت کا معیار وجاہت کے بجائے تقویٰ تھا، اسلام نے خون اور رنگ اور قومیت اور جنسیت کے قابلِ نفرت

امتیاز کو فنا کر دیا تھا، آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ "بنی نوع انسان اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے جو شخص اس کے کنبہ کی خدمت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے عزیز رکھتا ہے" ظہور اسلام سے پہلے انسان کی عزت کا معیار خاندانی و موروثی امتیازات اور دولت و ثروت تھی، اسلام نے ایسے ناقص معیار کو مٹا کر تقوی کو معیار قرار دیا، اس بلند معیار نے سارے دنیاوی امتیازات باطل کر دیئے اور مسلمانوں میں بے نظیر مساوات قائم ہو گئی اور آقا و غلام اور مالک و مملوک ایک صف میں آ گئے

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز   قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز   نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے   تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

جو کرے گا امتیازِ رنگ و بو مٹ جائیگا   ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی   اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاکِ رہ گذر

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں   غلامی ہے اسیرِ امتیازِ رنگ و بو رہنا
شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی   سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے   کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم   جہاد زندگانی میں ہیں مردوں کی یہ شمشیریں

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی   نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ   مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

قومیت | سفر یورپ سے قبل اقبال قومیت کے حامی تھے جس کا اثر انکی ابتدائی دور کی شاعری میں موجود ہے، ترانۂ ہندی اسی سلسلہ کی مشہور نظم ہے، پہلے ان کا خیال تھا کہ تعمیر و ترقی کے لئے قومیت ضروری چیز ہے اور ہندوستانیوں کو مذہبی اختلاف سے قطع نظر کر کے باہم مل کر قومیت

کی تعمیر کرنی چاہیئے، ان کا مشہور شعر ہے،

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اس قسم کے اور اشعار بھی ان کے یہاں ملتے ہیں،

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

لیکن اسلام کے گہرے مطالعہ اور یورپ کے قیام اور اس کی سیاست پر غور و فکر نے ان کے سامنے یہ حقیقت ظاہر کی کہ قومیت و وطنیت کا تخیل محض نسلی تعصب پر مبنی ہے، اور اسلامی اخوت کی ہمہ گیر اور وسیع تعلیم کے مقابلہ میں بہت محدود ہے، بلکہ اس نے مخلوقِ خدا کو قومیتوں میں اس طرح بانٹ رکھا ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کی دشمن ہے، اس انکشافِ حقیقت کے بعد انھوں نے قومیت و وطنیت کے متعصبانہ اور محدود تصور کو چھوڑ کر بنی نوعِ انسان کی اخوت کے ہمہ گیر تصور کو اپنا مسلک بنایا، چنانچہ فرماتے ہیں،

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبال کی شہرت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ اس سے باہر جہاں مشرقی تہذیب و تمدن کا احترام کیا جاتا ہے پھیلی ہوئی ہے اور ان کی شاعرانہ عظمت و فلسفیانہ برتری کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا ہے، خلقِ خدا سے جتنی ان کو محبت ہے اور اسلام کی تعلیمات کی جس جوش و صداقت کے ساتھ وہ تبلیغ و ترجمانی کرتے ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں، ان کا فارسی اور اردو کلام دونوں ان کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت ہے، قوموں اور ملتوں کی حیات کی تفسیر اور فلسفہ

و تصوف کے حقائق کو غزل کی نرم و نازک زبان میں ادا کرنا ان کا خاص حصہ ہے، دقیق مسائل کی ترجمانی کے باوجود وہ شاعرانہ لطافتوں کو نظر انداز نہیں ہونے دیتے ہیں، اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو ایسی سلجھی ہوئی اور دلکش زبان میں ادا کرتے ہیں کہ ذوقِ سلیم وجد کرنے لگتا ہے، معنوی اعتبار سے ان کے کلام پر غالب اور مولانا روم کا زیادہ اثر ہے، شکوہ الفاظ میں سودا کا زور بیان اور کہیں کہیں میر کے درد کا اثر پایا جاتا ہے، وہ الفاظ کے تناسب بندش کی چستی سے کلام میں نہایت لطیف موسیقیت پیدا کر دیتے ہیں،

شاعری کے اصول و قواعد کے اعتبار سے بھی ان کا کلام پختہ ہے، وہ عروض و قوافی اور زبان کے قواعد کی پابندی کرتے ہیں، لیکن دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کی کورانہ تقلید نہیں کرتے بلکہ ایک اجتہادی شان ہے،

اقبال کی شاعری چونکہ حکیمانہ ہے اس لئے کہیں کہیں اس کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن اگر انکے فلسفۂ حیات اور ان کے پیام کی نوعیت اور مقصد کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو کلام کے سمجھنے میں کوئی اشکال نہیں ہوتا وہ خود کہتے ہیں،

ہوں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا　　　کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں

سیرۃ النبی جلد ششم

تقطیع خورد جس کا شائقین کو بڑا انتظار تھا چھپ گئی ہی

یہ اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہی، اس میں پہلے اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہی، اور پھر اسلامی واخلاقی تعلیمات اور فضائل ورذائل، اور اسلامی آداب کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہی اور دکھایا گیا ہی کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے بھی رسول اسلام علیہ اسلام کا پایہ کتنا اونچا ہے،

ضخم ۲۸۷ صفحے، قیمت قسم اول عہ، قسم دوم عہ

"مینجر"

تلخیص و تبصرہ

مجلس تاریخ ہند

انڈین ہسٹری کانگریس (مجلس تاریخ ہند) کا پانچواں سالانہ اجلاس حیدرآباد دکن میں راؤصاحب سری نواس اچاری (انا ملائی یونیورسٹی) کے زیر صدارت منعقد ہوا، اجلاس مختلف شعبوں میں تقسیم تھا، جن کی صدارت علیحدہ علیحدہ مختلف یونیورسٹیوں کے ہندو پارسی اور انگریز پروفیسروں نے کی، تاریخ دکن کا ایک خاص شعبہ تھا، اس کی صدارت نواب علی یاور جنگ بہادر نے کی، اسلامی ہند کی تاریخ سے متعلق مسلم اور غیر مسلم ارباب قلم نے متعدد مقالے پیش کئے جن میں سے بعض کی تلخیص ذیل میں درج ہے،

میمن سنگھ کے ایک ہندو اہل قلم نے "چودھویں صدی عیسوی میں دربار دہلی کی ایک جھلک" پر ایک مقالہ پڑھا جس میں یہ بتایا کہ اس عہد کے سلاطین دہلی کو نئے شہروں کے آباد کرنے کا خاص ذوق پیدا ہو گیا تھا جس کا مظاہرہ پرانی دہلی، کیلوگھری، سری، تغلق آباد اور جہاں پناہ کے کھنڈرات اب بھی کر رہے ہیں، سلطان فیروز نے فیروزآباد آباد کیا، جس کی شوکت کے لئے آٹھ نئی مسجدیں تعمیر کی گئیں، شاہی محل بہت وسیع تھا جس میں دربار کے لئے تین بڑے بڑے کمرے تھے، (۱) محل چوبینہ اسس میں بادشاہ تخلیہ میں بیٹھ کر سیاسی معاملات پر گفتگو

کرتا تھا (۲) محلِ انگور، یہ گویا مغلوں کے عہد کے دیوانِ خاص کی طرح تھا (۳) محلِ میانگی یا محلِ بار عام، یہ گویا دیوانِ عام تھا، دربار میں نشست و برخاست، لباس اور امراء اور معزز عہدیداروں کی آمد و رفت کے خاص خاص آداب اور ضابطے تھے جن کی پابندی سختی سے کی جاتی تھی، عیدین میں دربار کو آراستہ و پیراستہ کیا جاتا تھا، شب برات میں آتشبازی کے تماشے دکھائے جاتے تھے، کشتیاں روشن کر کے جمنا کی لہروں میں چھوڑ دی جاتی تھیں، بعض اوقات ان کشتیوں میں مقابلہ کی دوڑ ہوتی تھی،

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ایک لکچرار نے "سلاطین دہلی کے ابتدائی دور میں شاہی مجالس" پر ایک مضمون لکھ کر پیش کیا، اس مضمون میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس عہد کی مرکزی حکومت کا طرز زیادہ تر ایرانی اور رومی ریاستوں کے قوانین پر مشتمل تھا، بادشاہِ وقت ریاست کا اصلی اور قطعی حاکم ہوتا تھا، لیکن رسم و رواج کے مطابق اہم سیاسی مسائل پر گفت و شنید کے لئے منتخب عہدیداروں کی ایک مجلس خاص بھی منعقد ہوا کرتی تھی، یہ مجلس کسی قانون اور ضابطہ کے ماتحت نہیں ہوتی تھی، لیکن بادشاہ کی مطلق العنانی پر اخلاقی دباؤ رکھتی تھی، اس مجلسِ خاص کے علاوہ ایک مجلسِ خلوت بھی طلب کی جاتی تھی جس میں بادشاہ کے مخصوص قابلِ اعتماد عہدیدار شریک ہوتے تھے، بادشاہ تفریح اور تفننِ طبع کے لئے ایک مجلسِ عیش بھی منعقد کرتا تھا جس میں اس کے ہم مذاق درباری مدعو ہوتے تھے، جو بادشاہ کی تفریح کا سامان بہم پہنچاتے تھے، مگر ان کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں ہوتی تھی، ایک مجلسِ عام بھی ہوا کرتی تھی جس میں بادشاہ ملک کے نظم و نسق کے متعلق مشورے کیا کرتا تھا، دربار کا انعقاد اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا تھا، حجاب کا ایک گروہ دربار کے ساتھ منسلک رہتا تھا، جو درباری آداب و مراسم کی نگرانی کرتا تھا، سجدہ، نذر، اور نثار (یعنی سونے چاندی کا نچھاور) آداب کے ضروری اجزاء تھے، امیر حاجب یا حاجب خاص

حکومت کا نہایت معزز اور اہم عہدہ تھا، نذر کے آداب و مراسم کے لئے شحنۂ بارگاہ مقرر کیا جاتا تھا،

رام پور ہاٹ (بنگال) کے ایک مسلم مضمون نگار نے محمد بن تغلق کے عہد کے واقعات کے سنین پر بحث کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس عہد کے واقعات کی سنہ وار ترتیب کے لئے احمد بن یحییٰ کی تاریخ مبارک شاہی کے بجائے عصامی کی فتوح السلاطین زیادہ معتبر اور مستند ہے، عصامی کی ترتیب کی تصدیق اس عہد کے سکوں سے بھی ہوتی ہے،

اندور کے ایک ہندو اہل قلم نے اپنے ایک مضمون میں یہ بتایا کہ ازمنۂ وسطیٰ میں چیتنیا کی مذہبی تعلیم کی ترویج سے مسلمان بھی متاثر ہوئے، اور بعض مسلمانوں نے ویشنو عقائد قبول کئے، اور اپنی عقیدتمندی میں رادھا اور کرشن پر مذہبی گیت بھی لکھے، جو اب بھی علمی اور روحانی حیثیت سے قابل قدر ہیں، مقالہ نگار نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ چیتنیا کی ویشنو تحریک محض ہندو اور مسلمان کے ثقافتی امتزاج کی ایک محمود کوشش تھی، اور ویشنو تحریک کے مسلمان مقلدوں کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندو اور مسلمان روحانی طور پر مل سکتے ہیں (؟؟؟)

بھاگلپور کے ایک ہندو مضمون نگار نے سلطنتِ مغلیہ میں عیسائیوں کی حیثیت کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے آج کے آقاؤں نے اس کے کل کے آقاؤں سے کس طرح ارتباط پیدا کرکے رفتہ رفتہ یہاں کی پوری ملکیت حاصل کرلی، اس سلسلہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں عیسائیوں کے آنے کا کیا مقصد تھا، اور یہاں انھوں نے کیا کیا پیشے اختیار کئے، مغلوں میں کس طرح مذہبی تبلیغ شروع کی، کن کن ذرائع سے زمین خریدنے، گرجا بنانے، جلوس نکالنے، اور مذہبی امور کی نمایش کرنے کے حقوق حاصل کئے، یہانتک کہ آخری مغل بادشاہوں کے زمانہ میں ان کا پورا تسلط ہوگیا، اس مقالہ میں غیر مسلمانوں کے ساتھ مسلمان حکمرانوں کا جو رویہ رہا ہے اس پر مذہبی نقطۂ نظر سے بھی بحث کی گئی ہے،

لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک بنگالی اہل قلم نے ایک مقالہ میں اسمتھ، فرگسن، کین اور ہیول کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ اکبر کے مقبرہ کی تعمیر کا آغاز اکبر ہی کے ہاتھوں سے ہو گیا تھا، مقالہ نگار نے تزکِ جہانگیری اور مقبرہ کے کتبہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ مقبرہ جہانگیر کے پہلے سالِ جلوس میں بننا شروع ہوا، اور اس کے ساتویں سال ختم ہوا،

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ایک دوسرے لکچرار نے یونیورسٹی لائبریری کے "مخزن افغانی" کے دو قلمی نسخوں پر مقالہ لکھ کر یہ بتایا ہے کہ مخزن افغانی اور تاریخ خان جہانی دونوں ایک ہی چیزیں ہیں، اور ایلیٹ کے اس بیان کی کہ "تاریخ خان جہانی اور مخزن افغانی گو ایک ہیں مگر مخزن افغانی پہلے لکھی گئی اور اس پر نظرِ ثانی کرکے تاریخ خان جہانی نام رکھا گیا" تردید کی ہے، کیونکہ دونوں نسخوں میں کسی لفظ اور عبارت کا کوئی اختلاف نہیں پایا ہے، اس مقالہ میں تاریخ مذکور کے مؤلف نعمت اللہ کے سوانحِ حیات کے متعلق بھی بعض معلومات فراہم کئے گئے ہیں مقالہ نگار کے خیال کے مطابق اس کتاب کا اہم حصہ ساتواں باب ہے جس میں جہانگیر کے پہلے چھ سال کی حکومت کی تفصیل ہے،

لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک دوسرے مضمون نگار نے وسط ایشیا میں شاہجہاں کی پالیسی پر بحث کرکے یہ دکھایا ہے کہ شاہجہاں کی وسط ایشیائی پالیسی جارحانہ نہیں بلکہ محض مدافعانہ تھی، وہ وسط ایشیا کی حکومتوں کا سیاسی توازن برابر رکھنا چاہتا تھا تاکہ اس سے ہندوستان بیرونی حملوں سے محفوظ رہے، اس میں شاہجہاں کی جنگی مہم تو ناکام رہی لیکن اس کی سیاسی پالیسی کامیاب رہی،

دہلی یونیورسٹی کے ایک مسلمان اہلِ نظر نے فرقۂ روشنیہ پر ایک مقالہ پیش کیا جس میں اس فرقہ کے عروج و زوال پر تبصرہ کیا گیا ہے، اس فرقہ کی بنیاد میاں بایزید انصاری نے ڈالی جو ۹۳۱ھ میں جالندھر میں پیدا ہوا، اور تیس سال کی عمر میں مہدویت بلکہ ایک طرح کی نبوت کا

دعویٰ کیا، مقالہ نگار کا خیال ہے کہ اس کی تعلیم اعلیٰ نہ ہو سکی تھی، اس لئے اس کے فلسفیانہ نظریوں میں تعلیم کی کمی اور ذہن کی سراسیمگی نمایاں ہے، اس فرقہ کو اپنے مخالفین کو قتل کر دینے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا، اکبر نے اس گروہ کی مخالفت کی، اور اس سے جنگ کرتا رہا، اس فرقہ نے بھی مغلوں کی حکومت سے معاندانہ رویہ اختیار کیا، بایزید انصاری نے اپنی تعلیم کی کمی کے باوجود عربی، فارسی، ہندی اور پشتو میں کتابیں لکھیں، حال نامہ اس کی سوانح عمری اور مقصود المومنین میں اس کے عقائد کی تشریح ہے،

پٹنہ کالج کے ایک مسلمان مقالہ نگار نے اٹھارہویں صدی کے ابتدائی دور میں بہار کے تاریخی حالات لکھ کر بعض ایسے صوبہ داروں کے نام پیش کئے ہیں جو عام تاریخوں میں نظرانداز کر دیئے گئے ہیں، اس میں حسین علی خاں بارہہ، غیرت خاں بارہہ، میر جملہ، سربلند خاں، خان زمان، امتیاز خاں، مرحمت خاں اور مؤخر الذکر کے تین بھائیوں کے حالات خاص طور پر لکھے گئے ہیں،

تاریخ دکن کے شعبہ میں حسب ذیل مضامین پیش کئے گئے :-

"مجاہد شاہ بہمنی اور وجیانگر، عہد بہمنی میں تعلیمی حالات، سلطنت گولکنڈہ میں صنعت و تجارت، عبداللہ قطب شاہ کا ایک مکتوب شاہ عباس ثانی کے نام، صلابت خاں دوم، شاہ جی کا ایک خط بیجاپور کے وزیر کے نام، ناصر جنگ دہلی کیوں طلب کیا گیا؟ تسری گونڈا کی جنگ، حیدرآباد کا دفتر دیوانی و مال، شہر اورنگ آباد کی تاریخ،

"ص ع"

چینی مسلمان

ایک دردمند صاحب قلم چینی مسلمان نے چین کے مسلمانوں کے مذہبی، اخلاقی، تمدنی، سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی حالات ہندوستانی زبان میں لکھے ہیں، ضخامت ۲۴۲ صفحے، قیمت :- ۱۲/

اخبار علمیہ

کائنات کا معمّا

کیلی فورنیا میں ایک دوربین تیار کی جارہی ہے جس میں دور کی چیزوں کے دیکھنے کی اتنی غیر معمولی قوت ہے کہ زمین سے چاند کی مسافت بظاہر پچیس میل معلوم ہوگی، ہیئت کی اس عجیب وغریب ایجاد سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہونگی، علماے ہیئت کی راے ہے کہ ہیئت ونجوم کے سلسلہ کی ایجادوں نے سائنس کی پرانی تحقیقات پر کامل یقین پیدا کرنے کے بجاے بہت سے نئے مسائل پیدا کردیئے ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سائنس اپنی غیر معمولی ترقی کے باوجود انکشافات کے لحاظ سے ابھی بالکل ابتدائی منزل میں ہے، سنہ ۱۹۳۰ء میں سیارہ پلوٹان (PLUTO) کے انکشاف سے سائنس کی بہت سی پرانی تحقیقات غلط ثابت ہوگئیں مثلاً آفتاب کا طول وعرض جتنا سائنس کے محققوں نے بتایا تھا اس سے دوگنا ثابت ہوا، اور نظام شمسی میں متعدد دنیائیں ہیں جن میں سے بعض ابھی معلوم نہیں ہوسکی ہیں، یہ تحقیق بھی غلط ثابت ہوئی کہ سیارے آفتاب سے ٹوٹ کر وجود میں آئے،

علم ہیئت کا یہ ایک دلچسپ مسئلہ ہے کہ سیاروں میں کس قسم کی آبادی ہے؟ وہاں زندگانی کا وجود ہے یا نہیں؟ اب تک ماہرین سائنس کا خیال تھا کہ مریخ میں اتنی حرارت ہے کہ وہاں زندگی کا کوئی سوال نہیں، لیکن نئی تحقیقات سے ظاہر ہوا کہ اس کی حرارت ایسی نہیں

کہ اس میں زندگی کا وجود ممکن ہے، مذکورہ بالا نئی دوربین سے سیاروں کی آبادی دیکھنے کی کوشش کی جائے گی، اس سے پہلے دوربینوں سے زہرہ کو دیکھنے کی کوشش کی گئی، مگر زہرہ پر بادلوں کی تہ اتنی گہری اور موٹی تھی کہ پہلی دوربینوں سے کامیابی نہ ہو سکی، جدید دوربین سے آفتاب کا بھی گہرا مطالعہ کیا جائیگا، سائنس کے بعض ماہرین کی رائے ہے کہ آفتاب کا قرص روز بروز تیزی سے جل رہا ہے، یہاں تک کہ ایک روز جل کر بالکل خاک ہو جائے گا اور دنیا اس کی روشنی سے محروم ہو جائے گی، سائنس کے فضلار کا خیال ہے کہ آفتاب سے ایک سکنڈ میں چالیس لاکھ ٹن قوت صرف ہوتی ہے، جس میں سے صرف ۱۶۰ ٹن کی قوت کی روشنی دنیا میں پہنچتی ہے، مگر اب نجوم و ہیئت کے ماہرین مشاہدہ کرکے بتاتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ آفتاب کا قرص روز بروز چھوٹا اور کمزور ہوتا جا رہا ہے، لیکن اس کی قوت اتنی زیادہ ہے کہ اس کا دسواں حصہ ایک کرور کھرب سال میں صرف ہو سکے گا،

علم ہیئت میں شہاب ثاقب اب تک ایک پریشان کن معما ہے، علمائے ہیئت کا بیان ہے کہ شہابی اجزار روزانہ بہ کثرت زمین پر آتے رہتے ہیں، لیکن اب تک یہ صحیح طور پر نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ اجزا کہاں سے اور کس طرح آتے ہیں، صرف یہ گمان کیا جاتا ہے کہ ستارے پھیل کر جب ٹوٹ جاتے ہیں تو ان کے اجزار زمین پر گر جاتے ہیں، ان میں سے بعض اجزار کا طول و عرض حیرت انگیز ہوتا ہے، اریزونا میں ایک باطیہ (CRATE) ٹوٹ کر گرا تھا، جس کا قطر ایک میل تھا، اس سے بھی بڑا شہاب سائبریا میں گرا جس سے کئی میل تک جنگل خاک سیاہ ہو گئے۔

ہیئت کے ماہرین کو اب تک دو اور باتوں کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا ہے، ایک یہ کہ کائنات میں تخلیق کا خاتمہ کس منزل پر ہوگا، دوسری یہ کہ فضا میں خلا ہے یا مادہ کائنات کی

نامعلوم چیزوں سے پردہ اٹھ سکتا ہے، آئنسٹائن کے نظریئے بھی اس کے متعلق خاطر خواہ معلومات فراہم نہ کر سکے، اسی سلسلہ میں کائنات کی اصل اور ابتداء کو بھی معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، جو سائنس اور ہیئت کے عالموں کے لئے معما ہے، اور محققین اب یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ سائنس اپنی ساری ترقیوں کے باوجود کائنات کے خالق کے اسرار و رموز کو معلوم کرنے سے قاصر رہیگی،

بڑے آدمیوں کی بعض دلچسپ باتیں

اسٹیٹسمین کے ایک مقالہ نگار کا بیان ہے کہ جرمنی کا مشہور شاعر شیلر اسی وقت اشعار موزوں کر سکتا تھا جب اس کے پاؤں برف کے تودے پر رکھے ہوتے تھے اور وہ سڑے ہوئے سیب کی بو سونگھتا رہتا تھا، یورپ کا مشہور ماہر موسیقی بیتھوون اپنی موسیقی کا کمال اسی وقت دکھاتا تھا جب اس کے سر پر برف کا پانی مسلسل ڈالا جاتا تھا، پروشیا کے فریڈرک اعظم کو لباس میں دوسرا کوٹ بدلنے سے بڑی نفرت تھی، اپنی پوری زندگی میں اس نے شاید دو یا تین کوٹ تبدیل کئے، طامس ڈی کوئنسی کے بھائی کو چھت کے اندرونی حصہ پر مکھی کی طرح چلنے کا جنون تھا، انگریزی زبان کے مشہور لغت نویس سموئیل جانسن جب ٹہلنے کیلئے باہر نکلتا تھا تو راستہ میں مکانات کے احاطہ کے جتنے آہنی کٹہرے ملتے تھے ان کی ہر سلاخ کو چھڑی سے چھونے کی کوشش کرتا، اگر اتفاقاً کوئی سلاخ چھوٹ جاتی تو پلٹ کر اس کو چھو لیتا، فرانس کا ایک شاعر اور سیاسی صحافت نگار جب باہر نکلتا تو ایک بڑی زندہ مچھلی لٹکائے رہتا تھا، جب لوگ اعتراض کرتے تو جواب دیتا کہ جب کتے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں، تو مچھلی کیوں نہیں رکھی جا سکتی، سر آئزک نیوٹن جب کوئی چیز خریدتا تو ریزگاریوں کو بار بار گنتا، پھر بھی اس کو تشفی نہیں ہوتی، حالانکہ وہ ریاضی کا عدیم المثال عالم تھا، مشہور انگریز سپہ سالار لارڈ رابرٹ بلی کو دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوتا تھا، حالانکہ وہ اپنی شجاعت کے سلسلہ میں وکٹوریہ کراس حاصل کر چکا تھا،

"ص ع"

مطبوعات جدیدہ

تذکرۂ بے نظیر: مؤلفہ سید عبدالوہاب قزوینی دولت آبادی، تقطیع بڑی ضخامت ۱۵۷ صفحے، کاغذ بہتر، ٹائپ روشن، قیمت معلوم نہیں، پتہ:۔ کتابستان الہ آباد،

سید عبدالوہاب قزوینی دولت آبادی آزاد بلگرامی کے تلمیذ رشید اور بارہویں صدی ہجری کے ناقد سخنوروں میں تھے، ان کا تذکرہ بے نظیر فارسی شعراء کے مستند تذکروں میں ہے اس میں بارہویں صدی کے ڈیڑھ سو ایرانی اور فارسی گو ہندوستانی شعراء کے مختصر حالات ان کے کلام پر تبصرہ اور اس کا نمونہ ہے، یہ تمام شعراء مؤلف کے قریب العہد اور بعض معاصر بھی ہیں، تذکرہ کی تالیف میں سرو آزاد، تذکرۃ الشعراء علی حزیں، حیات الشعراء محمد علی خاں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، مؤلف بلند پایہ ناقد اور سخن سنج تھے، اس لئے یہ تذکرہ تاریخی اور تنقیدی دونوں حیثیتوں سے قابل قدر ہے، جناب منظور علی صاحب نے اس نایاب اور قابل قدر تذکرہ کی تصحیح و ترتیب اور الہ آباد یونیورسٹی نے اسے شائع کرکے ایک مفید علمی خدمت انجام دی ہے، اس کی اشاعت سے شائقین کو ایک مستند تذکرہ سے استفادہ کا موقع مل گیا،

عہد نبوی کے میدان جنگ: ڈاکٹر محمد حمید اللہ استاذ قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ، تقطیع بڑی، ضخامت ۴۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت: ۸/ پتہ: حبیب کمپنی کسل منڈی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن،

اسلام کے دور اول کی تاریخ پر نئے فنون کی روشنی میں بحث و تبصرہ لائق مؤلف کا

خاص موضوع ہے، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اس پر ان کے مضامین نکلتے رہتے ہیں، اس کتاب میں انھوں نے جنگی نقطۂ نظر سے بدر، احد، خندق، فتح مکہ اور حنین و طائف کے غزوات پر بحث کی ہے، اس میں ان لڑائیوں کے اسباب، فریقین کی جنگی تیاریوں جنگ کے حالات، میدانِ جنگ کا نقشہ، طریقۂ جنگ اور اس کے نتائج کی تفصیل ہے، لائق مؤلف نے ان لڑائیوں کے محلِ وقوع کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے اس لئے اس کتاب میں کتابی معلومات کے علاوہ اور بہت سے ایسے مفید معلومات ہیں جو محض کتابوں سے نہیں حاصل ہو سکتے تھے، ہر غزوہ کے متعلق نقشے اور فوٹو بھی دیدیئے ہیں، جس سے حالات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اردو میں اس نقطۂ نظر سے غزوات پر یہ بحث نئی چیز ہے،

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش (حصہ سوم) مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۷۶ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مع محصولڈاک ۱۲؍ پتہ:- دفتر ترجمان القرآن، لاہور،

ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاست سے متعلق مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے قلم سے جو مضامین نکلے ہیں، ان کے دو مجموعے پہلے شائع ہو چکے ہیں، یہ تیسرا مجموعہ ہے، پہلے دونوں میں سیاسی جدوجہد میں مسلمانوں کے اشتراک کے ساتھ ہندوستان میں ان کے مستقل سیاسی وجود اور ان کی انفرادیت کے متعلق مولانا کے خیالات تھے، اس مجموعہ میں مشترکہ سیاسی نظام سے الگ خالص اسلامی نظام کے قیام اور مسلمانوں کی مستقل تعمیر و تشکیل کی دعوت ہے، اسکے متعلق مولانا کا نقطۂ نظر اور ان کے تمام خیالات اس مجموعہ میں مل جاتے ہیں،

مرقعِ فطرت، مؤلفہ ڈاکٹر پریم ناتھ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۸۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲؍ پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ، دہلی،

اس کتاب میں دنیا کی آفرینش، کواکب کی پیدائش، ان کے نظام جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان کے ارتقا کی داستان بیان کیگئی ہے، مذہب کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کے باب میں مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے وہ انسان کے دور جہالت تک کی حد تک تو صحیح ہے لیکن الہامی مذاہب کو عقل انسانی کے ارتقاء کا نتیجہ قرار دینا درست نہیں، خصوصاً اس سلسلہ میں اسلام کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں بعض باتیں نہ صرف غلط بلکہ لغو مضحکہ انگیز اور اسلام سے مؤلف کی ناواقفیت کا ثبوت ہیں، مثلاً اسلام میں بت پرستی اور دیوتا کے آثار کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ "ہر سال لاکھوں مسلمان دور دراز سے سفر کر کے مکہ کے کالے پتھر (حجر اسود) کی پوجا کرنے جاتے ہیں یا "اسلام میں دو دیوتا ہیں، ایک نیک دیوتا جس کی پوجا ہوتی ہے، اور دوسرا بد دیوتا جسے شیطان کہا جاتا ہے" اس قبیل کے بعض اور خرافات بھی ہیں، یہ دونوں مثالیں اسلام کے متعلق مؤلف کے معلومات کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہیں، مؤلف تو ایک حد تک معذور ہیں کہ وہ ایسے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بعد ان کا ذہن و دماغ دیوی دیوتا اور بت پرستی کے تخیل سے خالی ہو ہی نہیں سکتا، ان سے زیادہ قابلِ ستایش مکتبہ جامعہ ہے جس نے اپنے یہاں ایسی مہمل کتاب کو جگہ دی،

سلطان احمد شاہ بہمنی، از مولوی ظہیر الدین صاحب ایم اے عثمانیہ، تقطیع بڑی، ضخامت ۷۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت: عہر پتہ: معتمد مجلس طیلسانیین جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن،

جامعہ عثمانیہ کے ایم اے اور ایم ایس سی کے امتحانوں میں طلبہ سے زیر امتحان موضوع پر مقالے لکھائے جاتے ہیں، ان میں سے مفید مقالوں کو مجلسِ طیلسانیین عام افادہ کی غرض سے شائع کرتی ہے، سلطان احمد شاہ بہمنی بھی اسی سلسلہ کا ایک مفید مقالہ ہے، سلطان مذکور

اپنے اوصاف و خصوصیات اور کارناموں کے اعتبار سے خاندان بہمنی کا نہایت ممتاز فرمانروا اور اس کا عہد بہمنی سلطنت کا دور زریں تھا، اس مقالہ میں سلطان کے سوانح و سیرت اور اس کے سیاسی، انتظامی، تمدنی اور علمی کارناموں کی تفصیل اور اس پر نقد و تبصرہ ہے۔

برجیس طلعت: مصنفہ بلقیس ضیا، صاحبہ تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۹ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت اوسط، قیمت :- عہ؍ پتہ - مصنفہ ۲۰ - کیننگ روڈ، الہ آباد سے ملیگی،

مصنفہ اودھ کے ایک معزز خانوادہ کی تعلیم یافتہ خاتون ہیں، اس ناول میں انھوں نے لکھنؤ کے قدیم تمدن، اس کی عظمت و شان، شرفاے اودھ کی تہذیب و معاشرت، قدیم و جدید تمدن کی ملی جلی ہوئی گنگا جمنی نفاستوں اور نزاکتوں کا نقشہ پیش کیا ہے، واقعات مبالغہ سے پاک اور روزانہ کی زندگی سے متعلق ہیں، اس لئے خیالی افسانویت کے بجاے واقعیت کا پہلو نمایاں ہے، معاشرت میں تعلیم و تہذیب اور دولت و امارت کے ساتھ مذہب و اخلاق اور مشرقی خصوصیات کی نہایت معتدل آمیزش ہے، ناول کی ہیروئن برجیس طلعت کا کیرکٹر شریف اور بلند گھرانوں کی تعلیم یافتہ خواتین کا مثالی نمونہ اور اس کا ثبوت ہے کہ صالح اور صحیح تعلیم و تربیت سے عورتوں کے جوہر اور چمک جاتے ہیں اور وہ جہاں قدم رکھتی ہیں اپنی روشنی سے اجالا پھیلا دیتی ہیں، یہ ناول اونچے مسلمان گھرانوں کی اجلی اور ستھری معاشرت کا نقشہ، ایک تعلیم یافتہ مگر عالی ظرف اور دیندار خاتون، ایک وفاشعار اور سلیقہ مند بیوی، ایک سعادتمند اور سگھڑ بہو اور ایک شفیق اور ہوشمند ماں کی سرگذشت ہے، اس سے آجکل کی تعلیم یافتہ خواتین بہت کچھ سبق حاصل کر سکتی ہیں، زبان میں لکھنؤ کے روزمرہ کا لطف اور مذاق میں اودھ کے بے فکرے نوجوانوں کی شوخی اور بے باکی نمایاں ہے، مؤلفہ نے وقت کے بعض نیم مذہبی و مشرقی مسائل کے سلجھانے کی بھی کوشش کی ہے،

کلّیات سلطان قلی قطب شاہ

مرتبہ ڈاکٹر محی الدین صاحب زور قادری، تقطیع بڑی، ضخامت ایک ہزار صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت: مجلد ۱۵ روپیہ، پتہ :- سب رس کتاب گھر، خیرت آباد حیدر آباد دکن،

دکن کے قطب شاہی سلاطین میں سلطان محمد قلی قطب شاہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے ساتھ دکھنی زبان کا قادر الکلام شاعر بھی تھا اور اس میں اسکا پورا کلیات موجود ہے لیکن ایک عرصہ تک کلیات کے متعلق مختلف قسم کے شکوک و شبہات رہے لیکن رفتہ رفتہ جب اس کے مختلف نسخوں کا پتہ چلتا گیا تو یہ شبہات دور ہوتے گئے اور یہ ثابت ہوگیا کہ کلیات محمد قلی قطب شاہ کا ہے اور دکھنی زبان میں ہے، جناب محی الدین زور قادری نے مختلف قلمی نسخوں سے مقابلہ کرکے یہ صحیح اور جامع کلیات مرتب کیا ہے، کلیات کے شروع میں ساڑھے تین سو صفحوں کا مبسوط تبصرہ ہے جس میں سلطان کے تفصیلی حالات ہیں، یہ مقدمہ کتابی صورت میں الگ بھی چھپ چکا ہے اور مئی ۱۹۴۱ء کے معارف میں اس پر ریویو ہوچکا ہے، اصل کلیات تین حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ میں مختلف نظمیں ہیں، دوسرے میں غزلیں اور تیسرے میں قصیدے اور رباعیاں وغیرہ، ان کی مجموعی تعداد سات سو صفحوں کے قریب ہے، کلّیات کی زبان بہت قدیم ہے، آج اسکے بہت سے الفاظ اور محاوروں کا سمجھنا بھی مشکل ہے، فاضل مرتب نے جابجا بین السطور میں ان الفاظ کے معنی اور تشریح لکھ دی ہے لیکن غالباً اس میں انھوں نے دکھنی زبان کے متعلق اپنے علم کا لحاظ رکھا ہے کیونکہ ایسے سیکڑوں الفاظ انھوں نے چھوڑ دیئے ہیں جنکو دکھنی زبان سے واقفیت نہ رکھنے والے بالکل نہیں سمجھ سکتے، یہ کلیات عام مذاق کی چیز نہیں، آثار قدیمہ کے طور پر صرف ارباب فن اس کے قدرداں ہوسکتے ہیں، تاہم اس سے یہ بڑا فائدہ حاصل ہوا کہ دکھنی زبان کا ایک قیمتی ادبی سرمایہ جو اردو زبان کی ایک اہم کڑی ہے محفوظ ہوگیا،

"م"

جلد ۴۹ ماہ محرم الحرام ۱۳۶۲ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۳ء عدد ۲

مضامین

شذرات،	سید سلیمان ندوی	۸۲-۸۴
مولنا حمید الدین فراہی اور علم حدیث،	مولنا امین احسن اصلاحی،	۸۵-۱۰۲
شہری مملکت مکہ،	جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ،	۱۰۳-۱۲۳
یاد پاستاں،	جناب مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی،	۱۲۴-۱۴۲
خانانِ چغتائیہ،	جناب عنایت اللہ صاحب دہلوی، سابق ناظم دار الترجمہ حیدرآباد دکن،	۱۴۳-۱۴۴
ایران کے مغل خانان،	" " "	۱۴۵-۱۴۸
اخبار علمیہ،	"ص ع"	۱۴۹-۱۵۱
عہد حاضر کے نوجوانان اسلام،	جناب یحییٰ صاحب اعظمی،	۱۵۲-۱۵۳
تذکرۂ نصرآبادی،	"س"	۱۵۴-۱۵۶
مطبوعات جدیدہ،	"م"	۱۵۷-۱۶۰

سیرۃ النبی جلد ششم تقطیع خورد

چھپکر شائع ہوگئی ہے، ضخامت ۸۰۲ صفحے، قیمت: قسم اول عہ، قسم دوم صہ "منیجر"

شذرات

اس زمانہ کے متعدد "متکلمین اسلام" میں سے ایک متکلم اسلام سے گذارش کی گئی تھی کہ وہ اسلامی حقائق کی تعبیر مصطلحاتِ زمانہ سے کرکے حقیقت کی تغییر نہ کریں، اس پر انھوں نے تجدید اور تجدد کی بحث نکالی، اور اپنے کارنامہ کو تجدد کے بجائے **تجدید** کا لقب دینا پسند کیا ہے، اور فرمایا کہ تجدید میں مصطلحاتِ زمانہ کی تعبیر سے چارہ نہیں، مثلاً اعتراض تھا کہ اسلام کو دین اور مذہب کہنے کے بجائے "تحریک" کیوں کہا جائے، جواب ملا کہ دین اور مذہب کے فرسودہ لفظ اس زمانہ میں اپنی اہمیت کھو چکے ہیں اور اپنے لئے مخصوص معنی پیدا کرچکے ہیں اس لئے ایک نئی لفظ تحریک سے اسلام کی تعبیر کرنے میں اسلام کا پورا نظامِ زندگی سامنے آجاتا ہے،

سوال یہ ہے کہ اس پورے نظام کے لئے جس کو اسلام چاہتا ہے، اسلام نے خود کوئی لفظ وضع کیا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں کیا ہے تو یہ جدت (یعنی تجدد) آپ بھی نہیں کرسکتے، کہ یہ "تجدید" نہیں "تبدیع" ہوگی، اور اگر کیا ہے، اور اس کے مفہوم میں اتنی صدیوں میں تنگی اور تغیر نے راہ پالی ہے تو لفظ بدلنے کے بجائے آپ اس غلط فہمی کو کیوں دور نہیں فرماتے، کیا عجب کہ اسی دلیل سے آگے چل کر صلوٰۃ و صوم و زکوٰۃ و حج کی جگہ بھی نئے مصطلحاتِ زمانہ گھڑنے کی ضرورت پیش آجائے،

غالباً موصوف کی نظر اس گوشہ پر نہیں پڑی کہ کسی لفظ کے مفہوم کی تعیین ایک دن میں نہیں ہو جاتی، سالہا سال کے استعمال کے بعد لفظ اپنے معنی کی وسعت کی تحدید کرتا ہے، اور اس زمانہ میں اس کے ساتھ خاص ذہنی تصورات لازمہ قائم ہوجاتے ہیں، جو اس سے الگ نہیں ہوسکتے،

مثلاً یہی لفظ "تحریک" جو پہلے ہماری زبان میں صرف نزلہ کے لئے بولا جاتا تھا، جیسے آجکل مجھے نزلہ کی تحریک ہے، پھر مجلسی اصطلاح میں کسی تجویز کے پہلے پیش کرنے کو تحریک کہنے لگے، جیسے میں تحریک کرتا ہوں کہ ...... اب یہ لفظ انگریزی موومنٹ (movement) کا ترجمہ ہے، اسکے معنی یہ ہیں کہ "کوئی ذہنی تجویز یا اسکیم جس کو ایک شخص نے یا چند شخصوں نے مل کر سوچا ہو، اور اس کو پورے جوش و خروش کے ساتھ کامیاب بنانے کے لئے جد و جہد کیجائے" اب فرمائیے کہ کیا اسلام ایک ذہنی تجویز یا اسکیم ہے جسکو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار حرا میں بیٹھکر سوچا ہو، یا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وغیرہ نے مل کر سوچ کر طے کیا ہو، اور ملک میں اسکو کامیاب بنانے کیلئے جد و جہد کی ہو، (نعوذ باللہ)

اصل میں عیسائیوں نے اسلام کے ساتھ اس لفظ "موومنٹ" کا استعمال کیا، بدیں معنی کہ نعوذ باللہ یہ محمد (صلعم) کی سوچی ہوئی، اور ذہن سے نکالی ہوئی اسکیم تھی جس کو انھوں نے اپنے پر جوش رفقاء کے ساتھ مل کر کامیاب کیا، ممکن ہے کہ ہمارے متکلم آج اس لفظ کو اپنے ایک خاص مقصد کیلئے استعمال کریں اور اس کے استعمال پر اس وقت مسامحت برتی جائے لیکن کیا یہ ڈر نہیں کہ ناواقف نوجوان مسلمان آئندہ اسلام کو واقعی اسی قسم کی ایک ذہنی اسکیم نہ سمجھ لیں جیسا عیسائی مصنفین سمجھانا چاہتے ہیں، اب دینِ اسلام کے لئے اس لفظِ تحریک کا استعمال ہمارے متکلم اسلام بتائیں کہ تجدد ہے، یا تجدید ہے،

ابھی خان بہادر ذکاء اللہ صاحب کے جواب میں ہمارے متکلم نے کہا ہے کہ خلافت راشدہ "پارٹی اسٹیٹ" تھی، اور اسی اصول پر پارٹی کا لیڈر حکومت کا خلیفہ بن گیا، (مسلمان لاہور ۸ فروری ۴۲ء) یہ کس کو معلوم تھا کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا انتخاب آج کی نازی فیسسٹ بلشویک یوپین پارٹیز کے اصول پر تیرہ سو برس پہلے ہو چکا تھا، پھر وہ پارٹیاں کون تھیں اور لیڈر کون تھے، فرض کیجئے حضرت ابوبکرؓ کا آغاز عہد ہے اسوقت کون کون پارٹیاں تھیں جنمیں ایک پارٹی کامیاب ہوکر یا قوت پاکر برسرِ عروج آگئی تھی کیا وہ کفار، منافقین، یہود اور مسلمان تھے، کیا بنو امیہ، بنو ہاشم اور بنو حنیفہ تھے، یا مہاجرین و انصار دونو مسلمان فتح کر یا کوئی اور مقصود آپ کا ہے، ان میں سے ہر مقصو

صحت وصواب سے خالی ہو، آخر ہمارے فاضل متکلم حقائق اسلام کو مصطلحات زمانہ کے قالب میں ڈھالنے کی مسلسل کوشش کیوں فرمارہے ہیں، کیا یہی تجدید ہے؟ پھر پارٹی لیڈر کا تخیل اسلامی ہے یا فرنگی،

ہر زمانہ کے مجدد کا اصلی کام یہ ہو کہ وہ مسلمانوں کو علم (عقائد) اور عمل (فقہ) کی صحیح صورت کی جس پر جہالت کے پردے پڑ گئے ہوں تلقین کرے اور جہالت کے ان توبرتو پردوں کو اپنے علم وعمل سے چاک کردے، لیکن اس صدی کے مجدد کا اعلان یہ ہے:-

اب کہ میری حیثیت اس جماعت کے امیر کی ہوگئی ہے، میرے لئے یہ صاف کردینا ضروری ہو کہ فقہ وکلام کے مسائل میں جو کچھ میں نے پہلے لکھا ہو یا اور جو کچھ آیندہ لکھوں گا یا کہوں گا اس کی حیثیت امیر جماعت اسلامی کے فیصلہ کی نہ ہوگی، بلکہ میری ذاتی رائے کی ہوگی، میں نہ تو یہ چاہتا ہوں کہ ان مسائل میں اپنی رائے کو جماعت کے دوسرے اہل علم وتحقیق پر مسلط کردوں، اور نہ اسی کو پسند کرتا ہوں کہ جماعت کی طرف سے مجھ پر ایسی پابندی عائد ہو کہ مجھ سے علمی تحقیق اور اظہار رائے کی آزادی سلب ہوجائے، ارکان جماعت کو میں خداوند برتر کا واسطہ دے کر ہدایت کرتا ہوں کہ کوئی شخص فقہی وکلامی مسائل میں میرے اقوال کو دوسروں کے سامنے حجت کے طور پر پیش نہ کرے ۔"

اب سوال یہ ہے کہ ہمارے مجدد کی شان تجدید کا ظہور نہ عقائد رائجہ کی تصحیح میں ہوگا، نہ اعمال فاسدہ کی اصلاح میں، تو پھر اس امیر کی پیروی کس چیز میں ہوگی، یہ یاد رہے کہ سیاسیات بھی فقہ سے باہر نہیں، اور یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عقائد وفقہ میں امام ومجدد کی دو رائیں ہوتی ہیں، ایک ذاتی رائے اور ایک امام کی حیثیت سے، ایک کی تقلید مسلمانوں کے لئے ضروری، اور دوسری کی نہیں،

مقالات

مولانا حمید الدین فراہیؒ اور علم حدیث

از

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

رسالہ طلوعِ اسلام (دہلی) نے اپنی دسمبر ۱۹۴۱ء کی اشاعت مین، ایک مضمون بعنوان "شاہ ولی اللہ اور قرآن وحدیث" شائع کیا ہے، اس مضمون مین ایک جگہ ضمناً مولانا حمید الدین فراہیؒ کا بھی ذکر آیا ہے، مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی ایک روایت اور رسالہ البیان (امرتسر) کے شائع کئے ہوئے بعض اقتباسات کی بنا پر اس مین مولانا مرحوم کی طرف علمِ حدیث کے متعلق بعض ایسی باتین منسوب کی گئی ہین، جن سے سخت غلط فہمی پھیل سکتی ہے، یہ فتنہ دراصل رسالہ البیان (امرتسر) نے اٹھایا تھا، اور دلیل مین مولٰنا عبید اللہ صاحب کی روایت کے علاوہ، مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کی کتاب فاتحۂ نظام القرآن سے بعض غلط سلط اقتباسات پیش کئے تھے، یہ مضمون ہماری نظر سے گذر چکا تھا لیکن ہم نے اس کی تردید کچھ ضروری نہین سمجھی، کہ اس کا مسلک اور مبلغِ علم، اہلِ علم کو اچھی طرح معلوم ہے، لوگ خود غث وسمین مین امتیاز کر لین گے، نیز مولانا کا مسلک و مذہب بھی اب لوگون سے مخفی نہین رہا ہے، لیکن وہی فتنۂ البیان کے حوالہ سے طلوعِ اسلام کی دسمبر کی اشاعت مین موجود ہے، اور اس رسالہ نے اوس کو کچھ مزید آب ورنگ دے کر چمکانے کی کوشش کی ہے، مسلک و مشرب کے اعتبار سے

یہ رسالہ بھی البیان ہی کی تہ سے تعلق رکھتا ہے، اور اراجیف کی اشاعت مین شاید چند قدم اس سے بھی آگے ہے، اس لئے اسکی تردید بھی چندان ضروری نہین تھی لیکن زمانہ فتنہ کا ہے، لوگ کسی چیز کے نقل و روایت کرنے اور اس کے باور کرنے مین اسلامی اصول اخلاق کی ذمہ داریون سے بالکل بے پروا ہوگئے ہین، نہ نقل و روایت کرنے والے آخرت کی باز پرس کا خیال کرتے، اور نہ ان کو قبول کرنے والے کسی ذمہ داری اور خدا ترسی کا احساس کرتے، اس وجہ سے جی ڈرتا ہے کہ مبادا یہ فتنہ برگ و بار پیدا کرے اور جس سہل انگاری کے ساتھ طلوعِ اسلام نے اس کو اپنے صفحات مین نقل کر لیا ہے اسی بے پروائی کے ساتھ بعض لوگ اس کو باور کرنا شروع کر دین، نتیجہ یہ ہوگا کہ جو لوگ مولانا سے اچھی طرح واقف نہین ہین، وہ ان سے بدگمان ہون گے، اور جو ان کے خیالات و تحقیقات کی عزت کرتے ہین، وہ حدیث کے متعلق سوءِ ظن مین مبتلا ہون گے، اور ان مین سے کوئی بات بھی اپنے نتائج کے اعتبار سے اچھی نہین ہے، اور دوسری تو انتہائی محرومی و بدقسمتی ہے، اللہ تعالیٰ اس سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے،

طلوعِ اسلام نے رسالہ البیان کے پیش کئے ہوئے اقتباسات "شکریہ" کے ساتھ اپنے صفحات مین درج کئے ہین، مگر ہم کو ان دونون رسالون سے بعض شکایتین ہین :-

۱- مولانا مرحوم نے مقدمۂ نظام القرآن مین حدیث پر جو کچھ لکھا ہے، اس کا تعلق محض روایاتِ تفسیر سے ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کتاب مین وہ اسی حیثیت سے حدیث پر بحث کر سکتے تھے، یہ بات ان کے بیانات سے بالکل صاف تھی لیکن البیان اور طلوعِ اسلام نے اس کو پورے ذخیرۂ حدیث پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے، جو راستی اور دیانتداری کے بالکل خلاف ہے،

۲- البیان نے جو اقتباسات دیئے ہین، وہ بیشتر بالکل مسخ اور غلط ہین، یہ غلطی اگر عربی سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، تو اسکی جسارت قابلِ افسوس ہے، کہ اوس نے ایک ایسے کام مین ہاتھ ڈالا جسکی

اہلیت اس مین موجود نہین تھی، اور ایک ایسی معصیت کا ارتکاب کیا جو افترا بلا علم کے تحت آتی ہے، جس پر سخت وعید ہے، اور اگر جان بوجھکر ترجمہ غلط کیا گیا ہے، اور عبارت مسخ کی گئی ہے، تو یہ کھلی ہوئی تحریف ہے، اور ایک متقی عالم دین کے کلام مین تحریف کرکے غلط فہمیان پھیلانا کسی حالت مین اللہ کی نظرون مین کوئی محمود فعل نہین ہوسکتا، اور اس کام مین طلوعِ اسلام کا تعاون کھلا ہوا تعاون علی الاثم والعدوان ہے، البیان نے الذی تولی کبرہ کے جریمہ کا ارتکاب کیا ہے، اور طلوعِ اسلام نے تلقونہ بالسنتکم و تقولون بافواھکم مالیس لکم بہ علم و تحسبونہ ھینًا وھو عند اللہ عظیم (نور) کا بارِ گران بے دھڑک اپنے سر پر اٹھا لیا ہے،

۳- حدیث و آثار کے متعلق مولانا کا مسلک نہایت واضح اور غیر مشتبہ لفظون مین کتاب کی انہی فصلون کے اندر موجود ہے، جن سے ناقص اور غلط اقتباسات دیئے گئے ہین، لیکن اس کو نظر انداز کردیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے متعلق مولانا کا مسلک پیش کرنا ان حضرات کے مدنظر نہین تھا، یا تو مولانا کی نسبت غلط فہمی پھیلانا مقصود تھا، یا اُن کو آڑ بنا کر حدیث سے لوگون کو بدگمان کرنا،

۴- مختلف مقامات سے مختلف ٹکڑے خبر کو اس کے مبتدا سے اور کلام کو اس کے سیاق سے چھین کر ایک سلسلہ میں اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کہ پڑھنے والے کو یہ گمان ہو کہ یہ مقدمہ نظام القرآن کی کسی فصل کا ترجمہ ہے، البیان نے اتنا کرم کیا تھا کہ صفحات کے حوالے دیدیئے تھے، جن سے ان کے اقتضاب کا خیال ہوسکتا تھا، لیکن طلوعِ اسلام نے تنبیہ کے یہ نشانات بھی ہدم کردیئے کہ پڑھنے والا سمجھے کہ یہ ساری باتین ایک ہی سانس میں کہی گئی ہین، اور ایک ہی سیاق سے وابستہ ہین، ظاہر ہے کہ یہ نیکی محض اس لئے کی گئی ہے، کہ مولانا کو بھی کسی طرح انکارِ حدیث کے اس فتنہ مین گھسیٹ لایا جائے، جو ان حضرات نے آج برپا کر رکھا ہے؛

ان دوستون کی ان عنایات نے ہم کو مجبور کیا، کہ جو اقتباسات مولانا کی طرف منسوب کئے

گئے ہیں، ان کی اصل حقیقت اور ان کے سیاق و سباق کو واضح کر دیں تاکہ ان کی وجہ سے اگر کسی کو مولانا کی نسبت یا حدیث کے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی ہو تو وہ رفع ہو جائے، اور اگر یہ حضرات بھی کسی غلط فہمی کی وجہ سے اس ورطۂ ہلاکت میں کود رہے ہیں، تو وہ بھی اپنی اصلاح کر لیں اور اگر ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر اپنی راہ میں یہ کانٹے بو رہے ہیں، تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔

ان لوگوں نے پہلا فقرہ یہ پیش کیا ہے:-

"یاد رہے کہ احادیث کی اکثریت ضعیف اور قلیت صحیح ہے"۔

اس فقرہ کو جو شخص بھی پڑھے گا وہ اس کا مطلب یہی سمجھے گا کہ مولینا یہ حکم پورے ذخیرۂ حدیث پر لگا رہے ہیں، البیان نے اس پر ص ۲ کا حوالہ دیا ہے، مگر اس صفحہ میں کوئی عبارت اس مضمون کی نہیں ہے، البتہ ص ۷ پر مولانا نے تفسیر ابن جریر طبری پر یہ تنقید کی ہے،

وقد اسس تفسیرہ بعض العلماء	بعض علماء نے تفسیر کی بنا روایات پر رکھی
علی الاحادیث کابن جریر الطبری	ہے، مثلاً ابن جریر طبری رح جن کی تفسیر
الذی حکموا علیٰ تفسیرہ انہ	کی نسبت لوگوں نے یہ کہا ہے کہ اسکے مثل
لم یصنف مثلہ ولکن الاحادیث	کوئی اور تفسیر نہیں لکھی گئی، لیکن اس
فیہ اکثرھا ضعاف والمرفوع	میں اکثر حدیثیں ضعیف ہیں، اور مرفوع
فیہ قلیل وانما جمع فیہ اقوال	احادیث کا حصہ اس میں تھوڑا ہے،
اھل التاویل مع کثرۃ الاختلاف	انھوں نے تو دراصل اہلِ تاویل[1] کے
فیما بینھا "	اقوال تمام اختلافات کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں

یہی ولکن الاحادیث فیہ اکثرھا ضعاف والمرفوع فیہ قلیل کا فقرہ ہے، جس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے

[1] اس زمانہ میں آیات کی تفسیر کے لئے تاویل ہی کی اصطلاح تھی،

کہا یا در ہے کہ احادیث کی اکثریت ضعیف اور اقلیت صحیح ہے" لیکن یہ کن احادیث کی نسبت مولنا لکھ رہے ہیں، کل احادیث پر یہ حکم لگا رہے ہیں، یا تفسیر ابن جریر کی روایات پر؟ اس بات کو گم کرنے کے لئے ایک طرف تو جملہ کو سیاق سے علحدہ کیا گیا، اور پھر اس میں سے فیہ کا ترجمہ غائب کر دیا گیا تاکہ یہ تفسیر ابن جریر کے ساتھ مخصوص نہ رہے، بلکہ ایک عام بات ہو جائے، اور پھر اس کو اس ثبوت میں پیش کیا گیا ہے، کہ مولنا حمید الدین پورے دفتر حدیث کو بے اعتباری کی نظر سے دیکھتے تھے، کیسا شدید ظلم ہے، جو مولانا پر کیا گیا ہے، اور اپنی عاقبت سے کتنے بے پروا ہیں وہ لوگ، جو بے خطر اس طرح کی تہمتیں تراشتے اور ان کو قبول کرتے ہیں،

اب دوسرا فقرہ ملاحظہ ہو :-

"حدیث، اجماع اور صحف اولی یہ تینوں ظن وشبہہ سے خالی نہیں"

البیان نے اس اقتباس پر ص ۱۰ کا حوالہ ثبت کیا ہے، میں نے یہ صفحہ اور اس کے ساتھ اس کے آگے پیچھے کے صفحات بار بار غور سے پڑھے لیکن مجھ کو کوئی فقرہ ایسا نہیں ملا جس کا ترجمہ یہ ہوسکتا ہو، البتہ تفسیر کے فرعی ماخذوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے یہ الفاظ لکھے ہیں :-

واما ما هو كالتبع والفرع فلك	باقی فرع کی حیثیت سے تین ہیں (۱) علمائے
ثلاثة :- ما تلقته علماء الامة	امت نے جن احادیث نبویہ کو پایا ہے (۲)
من الاحاديث النبوية وما ثبت	قوموں کے وہ ثابت شدہ احوال جن پر امت
واجتمعت الامة عليه من احوال	نے اتفاق کیا ہے (۳) گذشتہ انبیائ کے
الامم وما استحفظ من الكتب	صحیفوں میں سے جو کچھ محفوظ ہے، اگر احادیث،
المنزلة على الانبياء، ولولا تطرق	تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن وشبہہ نے
الظن والشبهة الى الاحاديث	راہ نہ پائی ہوتی، تو ہم ان کو فرع کے

والتاریخ والکتب المنزلۃ من قبل درجہ میں نہ رکھتے،

لما جعلناها کالفرع،

یہان مولانا نے بے شبہہ یہ لکھا ہے، کہ احادیث مین ظن و شبہہ کو دخل ہے، اور یہ ایک ایسی بات ہے جس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو، اور اسی کے لئے اصول اور اسناد اور رجال کے فنون مدون ہوئے ہین، غرض اسی بنا پر مولانا احادیث کو قرآن پاک کے برابر نہین، بلکہ اس کے تحت مین ان کو تابع کا درجہ دیتے ہین، اور یہ یاد رہے کہ یہ تفسیری روایات کے متعلق بیان ہے، جیسا کہ سیاق و سباق سے واضح ہے، لیکن البیان نے معلوم نہین کس لفظ کا ترجمہ "اجماع" کر دیا ہے، مذکورۂ بالا عبارت میں مولانا نے ثبت فما واجتمعت الامۃ علیہ من احوال الامم کے الفاظ جو لکھے ہین، اس کا ترجمہ صرف وہی ہو سکتا ہے، جو ہم نے کیا ہے، یعنی "قومون کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات"، اس سے مراد اجماع نہین ہو سکتا، اور اگر اجماع مراد ہوتا، تو وہ اس کے لئے معلوم و معروف اصطلاح چھوڑ کر یہ ٹیڑھی اور غلط تعبیر کیون اختیار کرتے، اور پھر اس کو ایک ہی سطر کے بعد "التاریخ" کے لفظ سے کیون ادا کرتے، الفاظ کی ایسی صراحت اور قرائن کی اتنی وضاحت کے بعد بھی اگر البیان کے اڈیٹر صاحب اس عبارت کا مطلب نہ سمجھ سکے، تو وہ آخر عربی عبارات کا ترجمہ کرنے کی جرأت کیون کرتے ہین! اور اگر انھون نے بالقصد یہ تحریف فرمائی ہے تو للہ وہ دوسرون پر نہیں اپنے حال پر رحم کرین،

آگے کتاب کے مذکورہ صفحہ سے مزید اقتباس ان لفظوں مین نقل کیا گیا ہے،

"مین نے بعض روایتین دیکھی ہین، جو آیتون کو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہین، اور ان کے نظام کو پارہ پارہ کر دیتی ہین، (اس کے بعد "الا ان تاول" کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے، یعنی الا آنکہ ان کی تاویل کیجائے- اصلاحی) ان لوگون پر تعجب ہے جو آیت کی تاویل تو کر لیتے ہین لیکن روایت کی تاویل کا حوصلہ نہیں رکھتے .... تعجب پر تعجب ہے ان لوگون پر

جو ایسی روایتیں تسلیم کرلیتے ہیں جو نص قرآن پر بھی ہاتھ صاف کر دیتی ہیں، مثلاً کذب ابراہیم علیہ السلام اور نبی اکرم کا نطق قرآن بغیر وحی کے"۔

ہر چند کہ یہ اقتباس بھی اسقام ترجمہ سے پاک نہیں ہے، بالخصوص مصنف کی شرافت لہجہ تو اس کے اندر سے یک قلم غائب ہے، لیکن فحوائے کلام کی حد تک غنیمت ہے، کہ اس میں کوئی تصرف نہیں کیا گیا ہے لیکن یہ بھی تفسیری روایات سے متعلق ہے، تاہم اس کے بعد کا فقرہ جو حدیث و آثار کے متعلق مصنف کے مسلک کو واضح لفظوں میں ظاہر کرنے والا تھا، اس کو اڑا دیا گیا ہے، مولانا نے اس کے بعد لکھا ہے:-

فینبغی لنا ان لا نأخذ منها الا ما یکون	پس ہم کو صرف وہ روایتیں قبول کرنی
مؤیداً للقرآن وتصدیقاً لما فیه	چاہئیں، جو قرآن کی تصدیق و تائید کریں،
کما ان الآثار المنقولة عن ابن عباسؓ	مثلاً وہ آثار جو حضرت ابن عباسؓ سے
اقرب الاقوال من نظم القرآن	منقول ہیں، وہ بالعموم نظم قرآن سے بہت اقرب ہیں، پس ہم ان کی طرف تبعاً اشارہ کریں گے
فنشیر الیه کالتبع،	

اس سے واضح ہے کہ احادیث صحیحہ و مرفوعہ تو درکنار مولانا آثار صحابہ کو بھی اس درجہ اہمیت دیتے تھے،

اس کے بعد یہ فقرہ نقل کیا گیا ہے :-

"ایسی روایتوں کے تسلیم کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے، جو اگرچہ اصول روایت پر پوری نہ اتریں، لیکن درایت کی کسوٹی پر کھری ثابت ہوں"۔

یہ اقتباس بھی غلط فہمی پھیلانے والا ہے، اس سے بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے، کہ مولنا احادیث کے رد و قبول کے لئے کوئی عام اصول بیان کر رہے ہیں، حالانکہ صورت معاملہ یہ نہیں ہے بلکہ مولنا اسرائیلیات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

اسی طرح اہلِ کتاب کی جو روایات ہمارے یہاں پھیلی ہوئی ہیں، ان کے مقابل میں خود اہلِ کتاب کی تاریخ قابلِ ترجیح ہے، کیونکہ مفسرین نے یہ روایتیں بالعموم عوام کی زبانی لی ہیں، جو بنی اسرائیل، اور ان کے انبیاء کی تاریخ سے بہت کم واقف تھے، پس بہتر ہے، کہ ان کی معتبر کتابوں کو ہم ماخذ بنائیں، اور ان کو تبع کی حیثیت سے پیش کریں، اور جہاں کہیں وہ قرآن سے مختلف ہوں وہاں ان کو چھوڑ دیں، کیونکہ یہ قطعی معلوم ہے، کہ ان کی کتابوں میں شہادت کو چھپایا گیا ہے، نیز ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے انتم اعلم ام الله تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اس طرح کے اخفاء و تحریف کی نہایت واضح مثال حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کے واقعہ میں موجود ہے، پس لازماً جو کچھ قرآن میں ہے، ہم اسی کو اصل قرار دیں گے، اس اصول میں کسی کے لئے شک و شبہہ کی گنجایش نہیں ہے، ہم مسلمان آسمانی کتابوں میں کسی قسم کی تفریق جائز نہیں سمجھتے، ہمارے نزدیک قرآن انہی میں سے ایک ہے، البتہ جب روایت میں اختلاف ہوگا، تو ہم کو صحتِ روایت کے لئے اہتمام کرنا پڑے گا، اور اس وقت ہم مجبوراً اسی روایت کو ترجیح دیں گے، جو سب سے زیادہ صحیح اور معتبر ثابت ہو، ہاں اگر باہم کوئی اختلاف نہ ہو، تو ہم درایت کی کسوٹی پر جانچ کر ان کتابوں سے بھی لے سکتے ہیں، جن کا ازروے روایت کوئی وزن نہیں ہے، مثلاً ہم زبور میں سے اس چیز کو لیں گے جن کی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے، الیٰ آخرہ،

(فاتحہ نظام القرآن ص ۱۰ و ۱۱)

اس پوری عبارت کو پڑھ جائیے، اور خط کشیدہ فقرہ کو غور سے ملاحظہ فرمائیے، یہی فقرہ البیان اور طلوعِ اسلام کے اقتباس کا ماخذ ہے، اولاً تو دیکھئے ترجمہ میں کتنا ناجائز تصرف کیا گیا ہے، ثانیاً

یہ فقرہ سیاق سے الگ کر لیئے جانے کی وجہ سے مصنف کے منشا کے کس قدر خلاف ہو گیا ہے، طلوع اسلام وغیرہ یہ دکھانا چاہتے ہین کہ مولانا روایات کے رد و قبول کے لیئے یہ ایک عام ضابطہ بیان کر رہے ہین، حالانکہ ان کا کہنا صرف یہ ہے، کہ جہان قرآن اور صحف سابقہ مین باہم اگر کوئی اختلاف نہ ہو، تو ہر چند صحفِ سابقہ کا ازروے روایت کوئی وزن نہین ہے لیکن درایت کی کسوٹی پر جانچ کر اُن کتابون سے بھی ہم لے سکتے ہین، مگر ان حضرات نے کہان کی بات کہان پہنچا دی!

اس کے بعد یہ اقتباس درج کیا گیا ہے:-

"حدیث اور تواتر قرآن کو نہیں منسوخ کر سکتے،...... ہم اس عقیدہ سے خدا کی پناہ چاہتے ہین، کہ رسول خدا کے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے،......... ایسا خیال یقیناً راویون کا وہم و خطا ہے"۔

مولانا نے یہ بات جن الفاظ اور جن دلائل کے ساتھ کہی ہے، مین اس کو اصل کتاب سے ترجمہ کر دیتا ہون،

"اسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے، کہ خبر، اگرچہ متواتر ہو قرآن کو منسوخ نہین کر سکتی اس کی یا تو تاویل کرین گے، یا اس مین توقف کرین گے، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور عام اہل حدیث، حدیث کو قرآن کے لئے ناسخ نہین مانتے، اگرچہ حدیث متواتر ہو، جب یہ ائمہ جو حدیث کے لئے صاحب البیت کی حیثیت رکھتے ہین، اس بات کے قائل نہیں ہوئے، تو اس باب مین ہم فقہاء و متکلمین کی رائے کو کوئی وزن نہین دیتے! اللہ تعالیٰ ہم کو اس بات سے پناہ مین رکھے، کہ ہم اس بات کے قائل ہون، کہ رسول اللہ کے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے، اس طرح کے مواقع مین تمام تر راویون کے وہم اور ان کی غلطی کو دخل ہو اور فریقین کے دلائل پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہو کہ حق کیا ہو"۔

اخیر مین مقدمہ، کے اقتباسات نقل کئے گئے ہین، ہم اس مقدمہ کی اصل بحث کا صحیح ترجمہ یہان درج کرتے ہین،

"مین لکھ چکا ہون کہ جب قرآن اور احادیث مین اختلاف ہو تو اس وقت حکم قرآن ہوگا، یہان اس کی توضیح کرنا چاہتا ہون، مین بعض لوگون کے طعن سے ڈرتا تھا لیکن حدیث کے معاملہ مین ان کے غلو کا یہ حال ہو کہ وہ کہتے ہین حدیث انا نحنُ نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون کے تحت داخل ہو، انھون نے اپنے اس قول کے نتائج پر نہین غور کیا، اس لئے وقت آگیا ہے، کہ مین سچائی کا علم بلند کرون، اور کچھ پروا نہ کرون

ولو قطعوا راسی لدیہ واوصالی

اکثر اہل حدیث کے دلون مین یہ بات جمی ہوئی ہے، کہ بخاری اور مسلم نے جو روایت کی ہو اس مین شک کی گنجایش نہین ہے، ہم یہان بعض مثالین پیش کرتے ہین، تاکہ تمھین معلوم ہوسکے کہ اللہ تعالیٰ نے علماء کو رب ٹھہرانے پر تشنیع فرمائی ہے، پس ہم اس پر ایمان نہین لاسکتے، جو انھون نے بغیر غور و فکر کے سمجھا ہے"۔

اس کے بعد مولانا نے بعض تناقض و متعارض روایات متعلق تفسیر مثال مین پیش کی ہین، لیکن ان پر بحث نہین کرسکے ہین، بحث کی جگہ بیاض چھوڑ دی ہے لیکن ان کا مدعا واضح ہے، وہ ان لوگون کے خیال کے مخالف ہین، جو حدیث کو "ذکر منزل" کا درجہ دین، یا اس کے لئے اس حفاظت و صیانت کے مدعی ہون جس کا ذکر "انا لہ لحافظون" مین کیا گیا ہے، یہ چیز صرف قرآن کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی محقق ایک لمحہ کے لئے بھی حدیث کو اس کے تحت داخل نہین سمجھتا، اس دعوے کے نتائج بلاشبہہ نہایت خطرناک ہین،

دوسری بات یہ ہو کہ مولنا ان لوگون کے خیال سے بھی اتفاق نہین رکھتے، جو بخاری

ومسلم کی تمام مرویات کو ظن سے بالاتر سمجھتے ہین، اور یہ بات مولانا نے کوئی نئی اور عجیب نہین کہی ہے، حافظ ابن حجر اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی ان کتابون کو ظن سے بالاتر نہین سمجھتے، ظن سے بالاتر تو سمائے دنیا کے نیچے صرف ایک ہی کتاب ہے، ہم کو تعجب ہے کہ ان دوستون نے اس بات کو اس قدر اہمیت کیون دی، حنفیہ عموماً ان تمام اقوال مین جن کا تعلق حادثۂ عامہ سے ہے، خبر احاد کو قابلِ حجت نہین سمجھتے، آخر ایسا کیون ہے! اگر خبر احاد مین احتمال اور ظن کی گنجایش نہین ہے، تو حنفیہ ایسا کیون کرتے ہین ؟ بہرحال یہ کوئی ایسی بات نہین ہے جو پہلی مرتبہ کہی گئی ہو اور جس کو اس اہتمام سے شائع کرنے کی ضرورت ہو، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہین ہے، کہ اگر بخاری ومسلم ظن سے بالاتر نہین ہین تو رد کر دینے کے قابل ہین، جن لوگون نے یہ نتیجہ نکالا ہے، انھون نے پہلی غلطی سے ہزار درجہ بڑھکر غلطی کی ہے، اور افسوس ہے کہ یہ لوگ بھی اپنی اس غلطی کے نتائج سے بے خبر ہین،

مولانا کا صحیح مسلک یہان تک ہم نے ان اقتباسات سے بحث کی ہے، جو البیان اور طلوعِ اسلام نے پیش کئے تھے، اب ہم اسی کتاب (فاتحہ نظام القرآن) سے کچھ اقتباسات پیش کرتے ہین، جن سے احادیث وآثار کے متعلق مولانا کا صحیح مسلک معلوم ہوگا،

مولانا اتقان سے یہ عبارت صـ۱ مین نقل کرتے ہین :-

"اگر قرآن سے تفسیر نہ ہو سکے تو سنتِ رسول کی طرف رجوع کرے، کیونکہ سنت قرآن کی شارح اور مفسر ہے، امام شافعیؒ کا قول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے، سب قرآن سے ماخوذ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ، اس کے علاوہ اور بھی آیتین ہین، خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، مجھے قرآن دیا گیا ہے، اور اسی کے مانند

ایک اور چیز بھی اسی کے ساتھ یعنی سنت، لیکن اگر سنت سے تفسیر نہ ہو سکے تو صحابہ کے اقوال کی طرف رجوع کرے، انھوں نے چونکہ تمام قرائن وحالات کا بوقتِ نزول مشاہدہ کیا ہے، نیز فہم کامل، علم صحیح اور عمل صالح سے مشرف ہیں، اس لئے وہ تفسیر کے سب سے بڑے جاننے والے ہو سکتے ہیں"۔

اس کے بعد خود اپنے طریقہ کا ذکر کرتے ہیں، اور مذکورۂ بالا مذہب کی حرف بحرف تائید کرتے ہیں:۔

اس سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی، کہ پہلی چیز، جو قرآن کی تفسیر میں مرجع کا کام دیکتی ہے، خود قرآن ہی، اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا فہم ہو، پس مین اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرتا ہون، کہ مجھے سب سے زیادہ محبوب وہی تفسیر ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہو"۔

پھر آگے چل کر احادیثِ صحیحہ اور قرآن کے توافق کے متعلق اپنا یقین ان لفظون مین ظاہر کرتے ہین :۔

"مین یقین رکھتا ہون کہ صحیح احادیث اور قرآن مین کوئی تعارض نہین ہے، تاہم مین روایات کو بطور اصل نہین، بلکہ بطور تائید کے پیش کیا کرتا ہون، پہلے آیت کی تاویل مماثل آیات سے کرتا ہون، اس کے بعد تبعاً احادیثِ صحیحہ کا ذکر کرتا ہون، تاکہ ان منکرین کو معارضہ کی راہ نہ ملے، جنھون نے قرآن کو پسِ پشت ڈال دیا ہو"۔

"آثارِ صحابہ کی نسبت مولانا فرماتے ہین :۔

"مثلاً جو آثار حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہین، وہ بالعموم نظم قرآن سے بہت اقرب ہین، پس اس طرح کی روایات کی طرف ہم تبعاً اشارہ کرین گے"۔

آج انکارِ حدیث کے فتنہ نے صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، قربانی سب کے انکار کی راہ کھول دی ہے۔
مولانا تفسیر کے لسانی ماخذ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"اسی طرح تمام اصطلاحاتِ شرعیہ مثلاً نماز، زکوٰۃ، جہاد، روزہ، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسکِ حج وغیرہ اور اُن سے جو اعمال متعلق ہیں، تواتر و توارث کے ساتھ، سلف سے لیکر خلف تک سب محفوظ رہے، اس میں جو معمولی جزئی اختلافات ہیں، وہ بالکل ناقابلِ لحاظ ہیں، شیر کے معنی سب کو معلوم ہیں، اگرچہ مختلف ممالک کے شیروں کی شکلوں اور صورتوں میں کچھ نہ کچھ اختلافات ہیں، پس جو نماز مطلوب ہے، وہ وہی نماز ہے، جو مسلمان پڑھتے ہیں، ہرچند کہ اس کی ہیئت میں بعض جزئی اختلافات ہیں، جو لوگ اس طرح کی چیزوں میں زیادہ کرید سے کام لیتے ہیں، وہ اس دینِ قیم کے مزاج سے بالکل ناآشنا ہیں جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے۔" (ص ۱۲)

جس کتاب میں یہ فقرے بھی موجود ہیں، اور انہی فصلوں کے اندر جن سے البیان وغیرہ نے اقتباسات لئے ہیں، اس کے مصنف کے مسلک کی نسبت کیا اشتباہ باقی رہ جاتا ہے؟!

یہاں یہ امر بھی ذہن میں رکھنا چاہئے، کہ مولنا نے مقدمۂ تفسیر نظام القرآن میں اصولِ تفسیر سے بحث کی ہے، اور حدیث پر جہاں جہاں گفتگو کی ہے، اس کا تعلق روایاتِ تفسیر سے ہے، حدیث پر بحیثیت حدیث کے اس رسالہ میں گفتگو کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں تھا، یہ چیز مولانا کے موضوع کے حدود سے باہر تھی، اور روایاتِ تفسیر کے متعلق اہلِ علم کا یہ فیصلہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے، کہ سنن و احکام کی روایات اور تفسیر کی روایات میں بڑا فرق ہے، تفسیر کی روایات کا درجہ بہت نیچے ہے، علامہ سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں،

لطلب التفسیر مآخذ کثیرۃ امہاتھا   تفسیر کے بہت سے ماخذ ہیں، ان میں سے

اربعة الاول النقل عن النبی صلی	چار اصل ہین، اوّل احادیث جو نبی صلی اللہ
اللہ علیہ وسلم وھذا ھو الطراز	علیہ وسلم سے نقل ہین، اور یہی سب سے نمایان
المعلم ولکن یجب الحذر من	ہین، لیکن ان مین ضیف اور موضوع سے
الضعیف منه والموضوع فانه	حذر واجب ہے، کیونکہ ضعیف و موضوع
کثیر ولھذا قال احمد ثلاثة	بہت ہین، اسی وجہ سے احمد بن حنبل کا
کتب لا اصل لھا المغازی والملاحم	قول ہے کہ تین قسم کی کتابون کی کوئی
والتفسیر، (۲۱۱ ج ۲)	اصل نہیں، مغازی، ملاحم اور تفسیر،

پس اس باب مین مولانا نے جو بات کہی ہے وہ وہی ہے، جو ہمیشہ علماے حدیث نے کہی، کوئی نئی اور عجیب بات نہیں ہے،

مولانا کی دوسری کتابین جو شائع ہو چکی ہین، وہ بھی لوگون کے سامنے ہین، اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے ساتھ مولانا کا معاملہ سوءظن اور انکار کا نہین ہے، بلکہ اہل تحقیق کے عام طریقہ کے مطابق تنقید تاویل، ترجیح تطبیق اور حُسن ظن کا ہے، البتہ قرآن کی روشنی مین انھون نے ان اصولون کے برتنے مین کسی قدر وسعت سے کام لیا ہی، تاہم یہ قطعی ہے، کہ جب تک وہ روایات کو اپنے ساتھ نہ لے لین، یا اُن سے زیادہ طاقتور چیزون سے ان کو اپنی راہ سے ہٹا نہ دین، اس وقت تک ایک قدم آگے نہیں بڑھاتے، البتہ بنیاد روایات پر وہ نہیں قائم کرتے، اس کے شدت کے ساتھ مخالف تھے، مولانا کی تمام مولفات ہمارے اس دعوی کی تصدیق کرتی ہین۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی روایت آخیر مین چند لفظ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی اس روایت کی نسبت بھی کہون گا جس کو طلوعِ اسلام وغیرہ نے بہت شہرت دی ہے، حیرت ہی کہ جو لوگ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی روایت اس جزم ویقین کے ساتھ مانتے ہین، وہ حدیث کے ماننے

سے کیون اعراض کرتے ہین !

مولانا سندھی ایک ذہین آدمی ہین، ذہین لوگ بیوقوفون کی بہت کم پروا کرتے ہین، اور اکثر ایسی باتین کہہ گذرتے ہین، جو "متشابہات" کی نوعیت کی ہوتی ہین، جن سے تیسرے درجہ کی عقلین فتنہ مین پڑتی ہین، اور ارباب زیغ ان کو لے اڑتے ہین، اور بات کا بتنگڑ بناتے ہین،

مولانا سندھی اور مولانا حمید الدین کے درمیان حدیث کے ماننے اور نہ ماننے کا جو جھگڑا تھا، اس کی بنا تو یہ ہرگز نہین ہو سکتی، کہ خدانخواستہ مولنا حمید الدین سارے دفتر حدیث کو ناقابل اعتبار قرار دیتے تھے، اگر یہ صورت ہوتی، تو مولانا موطا کو کیون مانتے، درانحالیکہ اہل تحقیق کے نزدیک صحاح ستہ اسی کی شرح کی حیثیت رکھتی ہین، اور اس ایک کا ماننا بہتون کے ماننے کو مستلزم ہے، نیز بخاری و مسلم کی نسبت مولانا کی راے اوپر گذر چکی ہے، کہ وہ ان کو اس حیثیت سے نہین مانتے، کہ وہ شک سے بالاتر ہین، اور ظاہر ہے، کہ اس حیثیت سے بخاری و مسلم کو نہ ماننا ایک بالکل دوسری چیز ہے،

اصل یہ ہے کہ اس باب مین مولانا کا ایک خاص زاویۂ نگاہ تھا، وہ تمام تر زور سنت اور تعامل صحابہ پر دیتے تھے، خبر احاد کی بنا پر غلو و افراط اور فرقہ آرائی کو پسند نہین کرتے تھے، ان کا خیال یہ تھا کہ فرقون مین خبر احاد مین غلو کی وجہ سے جھگڑے اور مناقشے پیدا ہوئے، چنانچہ مقدمۂ نظام القرآن ہی کے تیسرے مقدمہ مین فرماتے ہین :-

"پس جب ایسے الفاظ مصطلحہ کا معاملہ پیش آئے جن کی پوری حد اور تصویر قرآن مین بیان نہ ہوئی ہو، (مثلاً صوم، صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ وغیرہ) تو اخبار احاد پر جامد نہین ہونا چاہیئے، ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا، کہ شک مین پڑوگے، دوسرون کے اعمال کو غلط ٹھہراؤگے، ان سے جھگڑوگے، اور تمھارے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جو اس جھگڑے کا فیصلہ

کر سکے، ایسی صورتوں میں راہ عمل یہ ہے کہ جتنے حصہ پر امت متفق ہے، اتنے پر
قناعت کرو، اور جن چیزوں کے بارہ میں کوئی نص صریح اور متفق علیہ عمل یا تور موجود
نہیں ہے، ان میں اپنے دوسرے بھائیوں کا تخطیہ نہ کرو"۔

اس سے خبر احاد کے بارہ میں مولانا کا اصلی رجحان بالکل واضح ہو جاتا ہے، اور جب انکا رجحان یہ تھا تو ان کے نزدیک موطا کی محبوبیت وارجحیت دوسری کتب حدیث کے مقابل میں بالکل فطری بات تھی، موطا اولاً تو باعتبار حقیقت فقہ کی کتاب ہے، اس کا تعلق بیشتر اعمال و احکام عملی سے ہے، پھر اس کی بنیاد احادیث نبویہ کے علاوہ حضرت عمرؓ کے قضایا، حضرت ابن عمرؓ کے فتاوی اور عمل، نیز مدینہ کے دوسرے صحابہ و فقہاء کے فتاوی پر ہے، پھر حضرت عمرؓ کے قضایا کی حیثیت یہ ہے کہ وہ صحابہ کے مجمع علیہ قضایا ہو سکتے ہیں مدینہ کے دوسرے صحابہ اور فقہا کے فتاوی میں بھی ایک اجتماعی حیثیت کا منظنہ ہے، نیز امام مالک رضؓ عمل اہل مدینہ کو خبر احاد پر ترجیح دیتے ہیں، یہ ساری ہی باتیں مولانا کو اپیل کرنے والی تھیں، ان اسباب سے وہ موطا کو سب پر ترجیح دیتے تھے کہ اس کی بنیاد سنت اور تعامل صحابہ پر تھی، اور اخبار احاد کے افراط و غلو کو جیسا کہ اوپر گذرا، پسند نہیں کرتے تھے، خبر احاد کے معاملہ میں حنفیہ کا طریقہ یہ ہے، کہ عموماً ایسے حالات میں جن کا تعلق عموم بلوی سے ہو خبر احاد کو نہیں مانتے، مالکیہ بھی عمل اہل مدینہ کو اس پر ترجیح دیتے ہیں، مولانا بھی در سنت اور تعامل صحابہ پر تھے

پس مولانا عبید اللہ اور مولانا حمید الدین میں متنازعہ فیہ معاملہ درحقیقت خبر احاد کا تھا، اور یہ جھگڑا یوں طے ہو گیا کہ مولانا سندھی نے جونہی موطا کا نام لیا، مولانا نے فرمایا "ہم اس کو مانتے ہیں" اور ظاہر ہے کہ جہاں تک سنت اور تعامل صحابہ کا تعلق ہے، اس میں اختلاف و نزاع کی کہاں گنجایش ہے،

یہ قضیہ ہے جس کو مولانا سندھی نے "حدیث کے ماننے اور نہ ماننے" سے تعبیر کیا ہے، ذہین

لوگون کو ان کے اس فقرہ سے کوئی غلط فہمی نہین ہوسکتی، لیکن عام لوگون کی فہم سے یہ بات بالاتر ہے،
یہان تک لکھ چکا تھا کہ مجھے اپنے خیال کی تائید مین مولانا کے اپنے قلم کی ایک تحریر
بھی مل گئی، شاہ صاحب کی شرحِ موطا کا جو نسخہ مولانا کے زیر مطالعہ رہا ہے، اس پر اپنی عادت
کے مطابق مولانا نے جگہ جگہ حواشی لکھے ہین، شاہ صاحب نے دیباچۂ کتاب مین سنت و حدیث
مین جو فرق بیان کیا ہے اس پر مولنا پنسل سے حاشیہ مین لکھتے ہین،

"فرق درمیان سنت و حدیث نہ چنانست کہ مؤلف رحمہ اللہ بیان فرمود،
در کتاب موطا امام مالک در اکثر جاہا گفتہ والسنۃ عندنا کذا و مرادش آنست کہ عمل علمای
مدینہ چنانست و این را بر احاد خبر ترجیح میداد چرا کہ سنت سلف متصل است تا
پیغمبر صلعم و متواتر است و احاد خبر محتمل صدق و کذب و خطا و فہم و تبدیل در
اداے خبرست و طریق امام مالک و ابو حنیفہ اعتماد بر سنت است کہ
زمان تابعین را دریافتہ بودند بعد ازان سنت خود تغیر یافت و اعتماد علما بر اخبار و روایات باقی ماند"

مولانا کے قلم کی یہ سطرین سارے راز سے پردہ اٹھا دیتی ہین، وہ امام مالک کے
قول "والسنۃ عندنا کذا" کا مطلب سمجھاتے ہین، کہ اس سے مراد علماے مدینہ کا عمل ہے،"
اور پھر اس کے خبرِ احاد پر ترجیح دینے کی وجہ بیان کرتے ہین، کہ "سنت سلف متصل است
تا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم و متواتر است" پھر اس کے مقابل مین خبر احاد کے ضعف کی وجہ
بیان کرتے ہین کہ "احاد خبر محتمل صدق و کذب و خطا و فہم و تبدیل در اداے خبر است" پھر
امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے فقہ کی بنیاد کا ذکر کرتے ہین، کہ "و طریق امام مالک و ابو حنیفہ اعتما
بر سنت ست کہ زمان تابعین را دریافتہ بودند" پھر بعد کی تبدیلی حالت پر افسوس کرتے ہین کہ
"بعد ازان سنت خود تغیر یافت و اعتماد علما بر اخبار و روایات باقی ماند" اس ساری تفصیل

کے سمجھ لینے کے بعد کون گمان کر سکتا ہے، کہ مولانا "سنت سلف" کے مخالف ہو سکتے ہیں، البتہ خبر احاد کے باب مین انھون نے جو رائے ظاہر کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے افراط و غلو کو پسند نہین کرتے تھے، اور اس بارہ مین امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے طریق کو پسند کرتے تھے، پس یہی چیز تھی، جس کے بارہ مین اُن سے اور مولانا سندھی سے "لڑائی رہتی تھی" ورنہ مولانا جیسا "لکیر کا فقیر"، سنت اور عمل صحابہ پر گفتگو کا کب روادار ہو سکتا ہے، درانحالیکہ ان کے نزدیک "سنت سلف متصل است تا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم و متواتر است" اور اگر مولانا سنت پر خدا نخواستہ معترض ہوتے تو خود مولانا سندھی ان کو کب بخشنے والے تھے!

ان سطرون کی رہنمائی سے مولانا کی نسبت میرے سامنے ایک بات بالکل پہلی مرتبہ آئی، مولانا ایک محقق اور مجتہد عالم تھے، تاہم ان پر حنفیت کا رنگ غالب تھا، اور بعض مرتبہ حنفیت کی حمایت مین ایسی تقریر کر دیتے، کہ اس مین غلو کی بو محسوس ہوتی، مین اس پر کبھی کبھی اعتراض کرتا، لیکن وہ دلائل سے قائل کر دیتے، مین اپنی فہم کے مطابق اس کی مختلف توجیہین کرتا، لیکن کوئی بات دل مین جمتی نہین تھی، کبھی اوس کو مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی صحبت و شاگردی کا نتیجہ قرار دیتا، کبھی یہ خیال کرتا کہ فقہ حنفی کی عقلیت سے متاثر ہین لیکن مذکورۂ بالا سطرون سے اصل حقیقت روشنی مین آئی کہ "طریق امام مالک و امام ابو حنیفہ اعتنا بہ سنت است کہ از تابعین را دریافتہ بودند" چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ مین تصریح کی ہے، کہ امام مالک و امام ابو حنیفہ زیادہ تر آثار پر بنا رکھتے تھے، امام شافعی پہلے شخص ہین، جنھون نے ان کے مقابلہ مین احادیث کی روایتی حیثیت پر سب سے زیادہ زور دیا (باب اسباب اختلاف مذاہب الفقہاء) اسی لئے انکی فقہ امام مالک اور امام ابو حنیفہ کی فقہ سے بہت زیادہ مختلف ہے اور امام مالک اور امام ابو حنیفہ مین باہم بکثرت اتفاق و اشتراک ہے، ان تشریحات کے بعد امید ہے کہ کسی کو مولنا کی نسبت یا علم حدیث کی نسبت کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی تو وہ رفع ہو جائیگی،

شہری مملکت مکہ

از

جناب ڈاکٹر حمید اللہ استاذ قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ

(۲)

مذہبی نظام اس قدیم زمانہ میں جب ہر شخص اپنی آپ حفاظت کرنے پر مجبور ہوا کرتا تھا کسی ملک کا سب سے اہم کشوری انتظام وہاں کے معبد کا انتظام ہوا کرتا تھا، سدانہ، حجابہ، سقایہ اور عمارۃ البیت اسی سے متعلق تھے، ان کے علاوہ اَیسار اور اَزلام کے چرچے بھی ہم سنتے ہیں، جن سے ڈیلفی وغیرہ کے یونانی مندرون کی دیوبانی oracles کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اسی طرح وہان ایسے بھی افراد پائے جاتے تھے جو مافوق الفطرت طاقتون کے مالک ہونے کا زعم کرتے تھے، جیسے عائف، کاہن، عرّاف، خرّیت، منجم، بلکہ خود ان لوگون کی بھی خاصی تعداد جو شاعر کہلاتے تھے، اور ان لوگون کی مزعومہ قابلیتون سے وقت بوقت زود یقین اہل ملک فائدہ اٹھایا کرتے تھے، وہان کے لوگون کا ہاتف پر بھی اعتقاد تھا جو ایک نظر نہ آنے والے مگر آواز سے باتین سنانے والے کا نام تھا، بھینٹ بھی چڑھائی جایا کرتی تھی، جسے قربان کا نام دیا گیا تھا، ملک کے دیگر عام اوہام کا تفصیلی ذکر شاید یہان غیر ضروری ہوگا،

سدانہ سے مراد معبد کی رکھوالی اور حجابہ سے مراد معبد کی دربانی ہوتی تھی، اور دروازے کی چابی پاس ہونے سے جس کو چاہے معبد کے اندر جانے دیا جاسکتا تھا، اور اس سلسلہ مین دربان

کو خاصی آمدنی بھی ہو جاتی تھی، یہ ایک مشہور واقعہ ہو کہ قصی نے کعبہ کی دربانی کا عہدہ ایک مشک بھر شراب کے عوض خرید کر لیا تھا[۵۱] اور یہ بھی ایک مشہور واقعہ ہے، کہ کس طرح جناب رسالت مآب صلعم نے فتح مکہ کے بعد دروازۂ کعبہ کی چابی وہان کے قدیم موروثی دربان ہی کو واپس کر دینی مناسب خیال فرمائی تھی[۵۲] یہ اب تک اسی خاندان مین چلی آرہی ہے، اور سعودی دور نے بھی تبدیلی نہ کی،

سقایہ سے مراد کعبے کی زیارت کے لئے حج یا عمرے کے زمانہ مین آنے والون کو پانی پلانا، اور عمارۃ البیت سے مراد حرم کعبہ کا عام انتظام کرنا تھا، ان دونون چیزون کا ذکر قرآن مجید مین بھی آیا ہے[۵۳] حجاج کو پانی پلانا مکہ مین بھی ایک منفعت بخش فریضہ ہوگا، کیونکہ وہان پانی کی عام قلت ہے، اور زمزم کے کنوین کا مقدس پانی ہر حاجی کو بھی درکار رہتا ہوگا، پالمیرا مین ایک مماثل فریضے کی انجام دہی سے سالانہ آٹھ سو طلائی اشرفیون کی معقول آمدنی ہو جایا کرتی تھی[۵۴] غالباً مکہ کے باشندے خود اس سلسلہ مین کوئی فیس ادا کرنے سے مستثنیٰ رہتے ہون گے، ابن عبدربہ نے بیان کیا ہے، کہ عمارۃ البیت کا مقصد یہ ہوتا تھا، کہ افسر متعلقہ وقت بوقت حرم کعبہ مین گھوم پھر کر نگرانی کیا کرے، اور دیکھے کہ کوئی شخص جھگڑے، گالی گلوج، یا بلند شور اور پکار سے اس کے تقدس کو توڑ تو نہین رہا ہے، اور یہ کہ ایک زمانہ مین یہ فریضہ جناب رسالت مآب صلعم کے چچا حضرت عباسؓ انجام دیا کرتے تھے[۵۵]

مجھے معلوم نہین کہ اسلام سے پہلے جو حج ہوا کرتا تھا، وہ بھی اتنے ہی ارکان و مراسم پر مشتمل ہوا کرتا تھا جتنا اب ہے، یا یہ کہ اس کی بعض چیزین زمانۂ اسلام کا اضافہ ہین، اور وہ چیزین اسلام سے پہلے حج سے الگ ایک مستقل حیثیت رکھتی ہون، اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے، کہ قرآن مجید

---

۵۱ تاریخ طبری ص ۱۰۹۴، ۵۲ دیکھئے سیرۃ نبوی کی کسی بھی کتاب مین فتح مکہ کے حالات ۵۳ قرآن مجید ۹/۱۹، ۵۴ پالمیرا کے کتبون پر شابو کی فرانسیسی کتاب ص ۳۰ بحوالہ مکہ مولفہ لامنس ۵۵ العقد الفرید ۳/۲

ین طوافِ کعبہ اور صفا و مروہ کے درمیان سعی دونون کے لئے ایک ہی لفظ تطوّف یعنی طواف استعمال کیا گیا ہے، (چنانچہ صفا و مروہ کے سلسلہ مین یطوف بھما وارد ہوا ہے[۵۱] تو طوافِ کعبہ کیلئے لیطوّفوا بالبیت العتیق کے الفاظ آئے ہین[۵۲]) اس کے باوجود صفا و مروہ کا طواف نہین کیا جاتا بلکہ ان کے مابین سات مرتبہ آنا جانا پڑتا ہے، یہ چیز بھی قابلِ ذکر ہے، کہ صفا و مروہ کے سلسلہ مین قرآن مجید نے لا جناح علیہ ان یطوف بھما یعنی کوئی حرج نہین، کہ ان دونون کا طواف کیا جائے" کے الفاظ استعمال کئے ہین، شاید پہلے انکا بھی طواف ہوا کرتا تھا جس طرح کہ کعبہ کا، لیکن اب قرآن مجید کے اس حکم کی تعمیل سنت نبوی کی روشنی مین طواف کی جگہ سعی سے کیجاتی ہے، حج کے سلسلہ مین افاضہ اجازہ بھی[۵۳] دو عہدے تھے، اور ان کو یہ اہمیت حاصل تھی، کہ عہدہ داران متعلقہ اور ان کے قبیلہ والے سب سے پہلے روانہ ہو سکتے تھے، جب کہ بھیڑ بھاڑ کم ہوتی تھی، لیکن مجھے نسی کے عہدے پر زیادہ تفصیل سے کچھ عرض کرنا چاہئے[۵۴]،

اسلام سے پہلے مکہ والون کا تمدن جس قدر افتادہ حالت مین تھا، اس کے باوجود انھین

---

۵۱ قرآن مجید ۲/۱۵۸، ۵۲ قرآن مجید ۲۲/۲۹، ۵۳ سیرۃ ابن ہشام ص ۷۰، ومابعد ۵۴ نسی یعنی قمری مہینون کو کبیسہ کر کے شمسی بنانا عہد نبوی کی تاریخ پر جو اہم علی اثرات ڈالتا ہے، اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے اُردو معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس دوم کی روداد مین میرا انگریزی مضمون" اسلام کے سیاسی تعلقات ایران مین" اس موضوع پر عام معلومات کے لئے دیکھئے محمود آفندی کا (جو بعد مین محمود پاشا فلکی کے نام سے مشہور ہوئے) تحقیقی مقالہ فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک ۱۸۵۸ء ص ۱۰۹ تا ۹۲ بعنوان "عربی کیلنڈر پر ایک یادداشت"، یہ مقالہ عربی مین بھی چھپا ہے، موبرگ کا جرمن زبان مین جامعہ لونڈ واقع سویڈن مین چھپا ہوا مقالہ بعنوان" نسی اسلامی روایت مین" حوالون اور اس موضوع پر شائع شدہ مقالون اور کتابون کی تفصیل کے لئے مفید ہے،

شمسی اور قمری سالوں کا فرق محسوس ہو چکا تھا، چنانچہ ایک سرسری اندازے کے مطابق وہ ہر تیسرے سال ایک تیرہواں مہینہ بھی قائم کر لیا کرتے تھے، جو محرم اور صفر کے مابین ہوا کرتا تھا، کبیسہ بنانے کا یہ کام مختلف مراسم کے ساتھ انجام پاتا تھا، اور اس کا اعلان جس افسر کے فرائض مین داخل تھا، وہ قبیلہ بنی فقیم سے تعلق رکھا کرتا، اور قلمس[1] یا قلنبس[2] کہلاتا تھا، شاید یہ لفظ Calendarer (یعنی کیلنڈر والا) کا بگڑا ہوا ہے،

کبیسہ بنانے کے سلسلہ مین ہمین اشہر حرم یعنی حرام اور مقدس مہینوں کا بھی کچھ ذکر کرنا چاہئے، دنیا کے دیگر ممالک کی طرح معبد کعبہ کی زیارت کے لئے جو مذہبی حج ہر سال ایک معینہ زمانہ مین کیا جاتا، وہ ساتھ ہی ایک تجارتی میلہ کی بھی حیثیت اختیار کر لیتا، کیونکہ کچھ تو حج کے لئے آنے والے نوواردون کی ضروریاتِ خورونوش کے لئے درآمد کی بھی ضرورت ہوتی اور فروخت گاہون کی بھی، اور خود نووارد حجاج بھی اپنے ساتھ تجارتی سامان لے کر حج کے ساتھ خانگی کاروبار بھی انجام دے لیتے، قرآن مجید نے بھی اس قدیم طرز عمل کو جاری رہنے دیا، بلکہ اسکی حوصلہ افزائی بھی کی، اور قرار دیا کہ لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم[3] یعنی کوئی حرج نہین، کہ تم اپنے رب کا فضل حاصل کرنے کی کوشش کرو، اور تجارتی کاروبار کے نفع کو خدا کا فضل قرار دیا، اس طرح ہر سال جو میلہ لگا کرتا اس سے میلہ لگنے کے مقام کے سردار کو جملہ تجارتی درآمد کا عُشر یعنی دسوان حصہ محصول درآمد مین مل کر خوب آمدنی ہو جایا کرتی تھی، اس لئے وہ ہر ممکنہ ذریعہ سے اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ بیرنی لوگون کو زیادہ سے زیادہ تعداد مین آنے کی بڑی سے بڑی ترغیب ہو، بدرقہ یا خفارہ کا نہایت

---

[1] عام طور سے قلمس اس شخص کا لقب سمجھا جاتا ہے جس نے عرب مین کبیسہ سال رائج کیا، لیکن محمد بن حبیب نے کتاب المحبر (مخطوطہ برٹش میوزیم) مین قلامسہ بصیغہ جمع بھی استعمال کیا ہے [2] یہ قلمس کا مترادف ہے دیکھئے لسان العرب تحت کلمہ قلمس [3] قرآن مجید ۲: ۱۹۸،

منظم اور ترقی یافتہ ادارہ بھی جس میں قریش مکہ کو کافی دخل تھا اس بارہ میں خاصا مددگار ثابت ہوتا تھا، حرام مہینوں کا ادارہ بھی اسی غرض کیلئے وجود میں آیا تھا، کہ اس زمانہ میں لوٹ مار کو مذہبی نقطۂ نظر سے ممنوع قرار دینے کے باعث اجنبیوں اور تاجروں کو اس میلہ میں آنے کی ترغیب ہو، امن کا سب سے طویل زمانہ جو تاریخ نے محفوظ کر رکھا ہے، وہ حج کعبہ کے سلسلے میں مسلسل تین مہینوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا[۵۱]، دیگر معبدوں کے حج نسبتہً کم مدت تک امن و امان قائم کرا سکتے تھے، اس سے لامنس[۵۲] اور اس کے ہم خیالوں کے مسلسل اور پُر اصرار انکار کے باوجود یہ بات صاف طور پر ثابت ہو جاتی ہے، کہ حج کعبہ کو کس طرح غیر معمولی اور امتیازی اہمیت حاصل تھی، اور وہاں نہ صرف پورے جزیرہ نمائے عرب بلکہ شام اور مصر تک[۵۳] سے حجاج آیا کرتے تھے، ضمناً یہ بھی بیان کر دیا جا سکتا ہے، کہ قریش کے چند ممتاز خاندانوں کو مسلسل آٹھ مہینوں تک "اشہر حرم" حاصل رہتے تھے، اور تاریخ نے اس کو بسل کے نام سے یاد رکھا ہے[۵۴]، غالباً یہ خانوادے طویل تجارتی سفر کے لئے قافلے لایا اور لیجایا کرتے ہوں گے، اور جن علاقوں سے گذرتے تھے وہاں والوں کا سامان بھی کوئی معاوضہ اور کمیشن لئے بغیر کاروبار تجارت کے لئے لایا اور لیجایا کرتے ہوں گے، جس کے باعث اہل قبائل بھی ان کے چھیڑنے سے باز رہتے ہوں گے، کمیشن کے بغیر قریش کا بعض قبائل کے سامان تجارت کو لانا اور لیجانا ایک تاریخی واقعہ ہے[۵۵]، بہرحال ان تمام چیزوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملک میں امن و مسالمت کی جانب ایک بیّن رجحان پایا جاتا تھا، نہ کہ ہر شخص کا باقی تمام دنیا سے اپنے کو برسرپیکار خیال کرنا،

---

[۵۱] دیکھئے قرآن مجید پ ۹ ع ۲ کی تشریح کسی تفسیر وغیرہ میں [۵۲] دیکھئے لامنس کا مضمون "مکہ کا فوجی نظام" فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک ۱۹۱۶ء [۵۳] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۱۰۷، سیرۃ ابن ہشام ص ۲۸۲، طبقات ابن سعد ۱/۱ ص ۱۴۵ [۵۴] سیرۃ ابن ہشام ص ۶۶، قاموس فیروز آبادی تحت کلمہ "بسل" [۵۵] طبقات ابن سعد ...

یہ واقعی ایک بدبختی کی بات تھی، گو عمداً اس کا ارادہ نہین کیا گیا ہوگا، کہ ہر تیسرے سال جب قلمس حج کے مہینہ ذی الحجہ مین اعلان کرتا تھا کہ آیندہ مہینہ محرم الحرام نہین ہوگا، بلکہ ایک معمولی اور غیر حرام مہینہ ہوگا جس کے دوران مین بدویون کے لئے لوٹ مار سے باز رہنے کی کوئی پابندی نہین ہوگی، اس طرح تین حرام مہینون کا تسلسل ٹوٹ جاتا، اور نتیجۃً ان لوگون کو دشواریان پیش آتین جو جلد رخصت ہونا چاہتے،

مکہ والے تین مسلسل اور چوتھے ایک علحدہ مہینہ کو مقدس تسلیم کرتے تھے، چنانچہ ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم عرفات کے حج اکبر کے لئے[۱] اور رجب حج اصغر یا عمرے[۲] کے زمانہ مین جب کہ لوگ کعبہ کی زیارت کو آتے، قریشی اثر سے ان مقدس مہینون کا قریب قریب پورے عرب میں احترام کیا جاتا، دیگر مقامات کے حج اور میلہ کے سلسلہ مین بھی حرام مہینے ہوتے تھے، اور اسی لئے جناب رسالت مآب صلعم کے خطبۂ حجۃ الوداع میں "رجب مضر" کا محاورہ برتا گیا ہے[۳] تاکہ اس کو "رجب ربیعہ" سے ممتاز کیا جائے، یہ غیر قریشی حرام مہینے نسبتہً کم سختی سے ملحوظ رکھے جاتے تھے، جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا قریشی حرام مہینون کو عام طور پر ملحوظ رکھا جاتا تھا بجز اس کے کہ طے اور خثعم کے دو عرب المثل لیٹرے قبائل اس حرمت و امتناع کی پرواہ نہیں کرتے تھے[۴] عام عربون کے برخلاف یہ دونون قبیلے چونکہ عیسائیت بڑی حد تک قبول کر چکے تھے، اس لئے بڑی اوہام و ردلجات کی وہ پروا نہین

---

[۱] جناب رسالت مآب صلعم نے یمن کے گورنر عمرو بن حزم کو جو ہدایت نامہ دیا تھا (متن کے لئے دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ص ۹۶۱ نیز قرآن مجید ۹/۳ کی تشریح تفسیر طبری مین) اس مین حج اصغر اور حج اکبر کی تشریح کی گئی ہے [۲] ایضاً [۳] خطبہ حجۃ الوداع کے لئے دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ص ۹۶۸ تا ۹۷۰، تاریخ طبری ص ۱۷۵۳، تا ۱۷۵۵ تاریخ یعقوبی ۲/۱۲۲ تا ۱۲۳ جاحظ کی البیان والتبیین ۲/۲۴ تا ۲۵ ابن عبد ربہ کی العقد الفرید باب خطبات وغیرہ [۴] تاریخ یعقوبی ۱/۳۱۳ و ۳۱۴ تا ۳۱۴، مرزوقی کی الازمنہ والامکنہ ۲/۱۶۶،

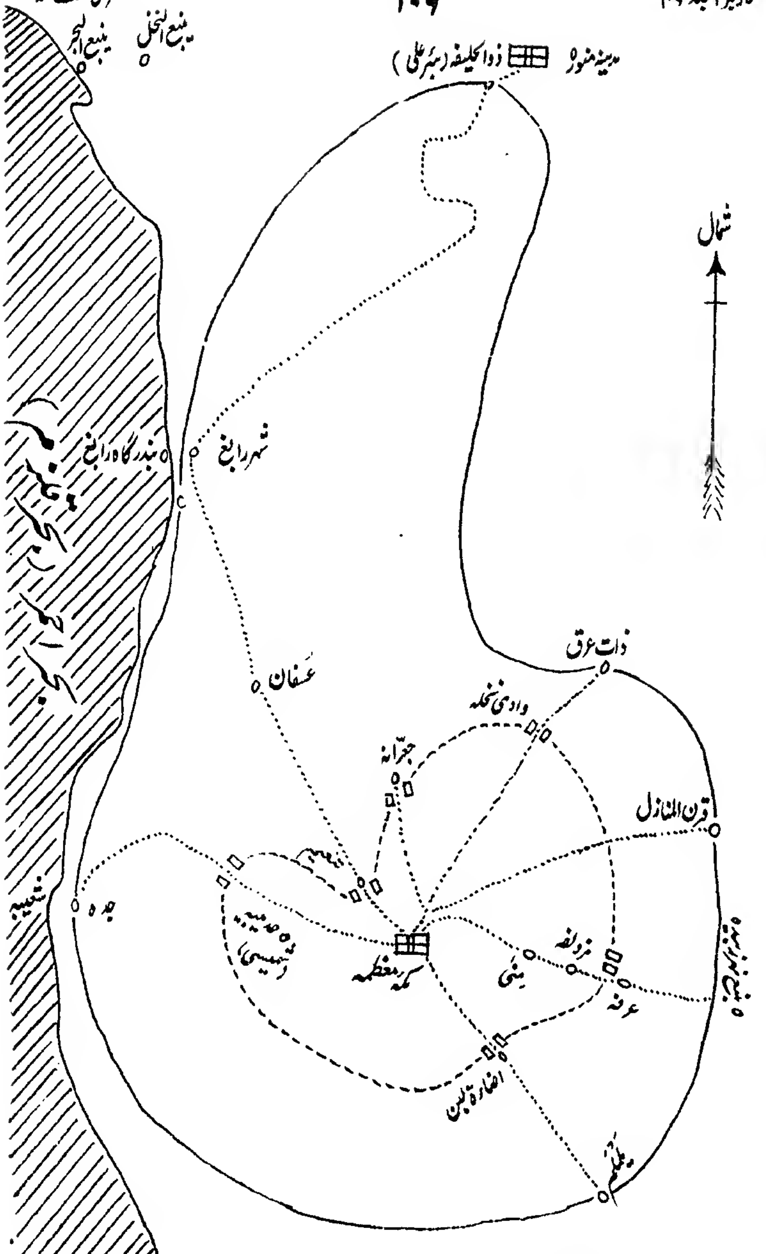

نقشهٔ حدود حرم مکه

حدود میقات احرام	——
حدود حرم مکه	- - - -
سڑک	......
اعلام یعنی ستونهای سر حرم	▭▭

کرتے ہون گے لیکن عیسائیت اورلوٹ مار کا میل کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، قریشی مہینون کا احترام بے شبہ اسلئے تھا، کہ قریشی کا روبار اور تجارتی تعلقات بہت پھیلے ہوئے تھے، اور ان کی حلیفیون کا جال بھی خوب وسیع تھا، اس سلسلہ مین محمد بن حبیب کی کتاب المحبر کا ایک اقتباس دلچسپی کا باعث ہوگا :-

"ہرتاجر جو یمن یا حجاز سے (شمالی عرب کے میلے دومۃ الجندل کو) جانا چاہتا، تو وہ جب تک مضری قبائل کی سرزمین سے گزرتا رہتا تو قریشی بدرقے حاصل کرتا، کیونکہ کوئی مُضری قبیلہ نہ تو کسی قریشی تاجر کو ستاتا اور نہ کسی مُضریون کے حلیف کو، چنانچہ قبیلۂ کلب والے کسی ایسے شخص کو نہیں ٹوکتے، کیونکہ وہ قبیلۂ بنی الجشم کے حلیف تھے، اسی طرح قبیلۂ طے والے بھی ان کو نہیں ستاتے، کیونکہ ان کی بنی اسد والون سے حلیفی تھی"۔

یہ چیز دوبارہ یاد دلائی جا سکتی ہے، کہ طے اور خثعم[۱] والے عرب کے حرام مہینون کی پروا نہین کرتے تھے، مگر قریشیون کو اس حلیفی کے باعث سال بھر ہی ان سے امن رہتا، محمد بن حبیب نے مزید برآن بیان کیا ہے :-

"اگر مسافر بنی عمرو بن مرثد کا خفارہ حاصل کر لیتے، تو اس پورے علاقہ مین جہان قبائل ربیعہ بستے تھے، انھین حفاظت حاصل تھی،...... اگر بحرین کے سوق مشقر جانا ہوتا تو قریشی خفارہ ہی حاصل کیا جاتا،........ اگر جنوبی عرب کے سوق صرہ کو جانا ہوتا تو بنی محارب کا بدرقہ حاصل کیا جاتا،....... حضرموت کے سوق رابیہ کو جانے کیلئے

---

[۱] کوئی حیرت نہ ہو کہ ایک خثعمی ہی نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی تھی، کہ ابرہہ نے اصحاب الفیل کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کرنی چاہی تو یہ اس کی رہنمائی کرے، دیکھئے ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۲/۴۸،

قریش قبیلۂ بنی آکل المرار کا خفارہ حاصل کرتے، اور دیگر لوگ کندہ کے آلِ مسروق کا اس طرح ان دونون ہی قبائل کو عزت حاصل تھی، لیکن قریشی سرپرستی کے باعث آکل المرار کو اپنے حریفون پر فوقیت حاصل ہو گئی [۵۱]...... عکاظ عرب کا سب سے بڑا میلہ ہوا کرتا تھا اور وہان قریش، ہوازن، غطفان، عضل، ودیش، حیا، مصطلق، احابیش اور دیگر قبائل آیا کرتے تھے [۵۲]۔

اگرچہ قبہ یعنی منڈپ یا شامیانہ اور اعنّہ یعنی گھوڑے کی لگامون کے ادارون کا منشا، عرب مولفون [۵۳] نے یہ بیان کیا ہے کہ اوّل الذکر کا مطلب ایک ڈیرہ لگا کر کسی عام قومی ضرورت کے لئے چندہ جمع کرنا ہوتا، اور آخر الذکر سے مراد سوارہ فوج کی افسری ہوتا، لیکن غالباً لامنس [۵۴] کا خیال درست ہے، کہ اصل میں قبہ سے مطلب وہ شامیانہ ہوتا ہو گا، جو جنگ یا عید کے موقع پر قابلِ حمل ونقل بتون کے اوپر سایہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا، اور اعنّہ سے مراد وہ امتیاز تھا کہ کسی بُت کو گھوڑے پر رکھکر جلوس سے لیجائین تو اس گھوڑے کی لگام پکڑے چلین،

مقدس شامیانے کا ذکر عربی ادبیات مین کچھ شاذ و نادر نہین ہے، یہ باور کرنا کافی مشکل معلوم ہوتا ہے، کہ مکی سماج جس پست اور ابتدائی حالت میں تھا، اس کے باوجود وہان سپہ سالارِ فوج اور سوارہ فوج کا افسر دو الگ الگ عہدے پائے جاتے ہون [۵۵]، سلام

---

[۵۱] اس سلسلہ مین ملاحظہ ہو Olinder کی کتاب The Kings of Kinda of the family of Akil al-Murar مطبوعہ جامعہ لونڈ واقع سویڈن ۱۹۲۷ء

[۵۲] ابن حبیب کی کتاب المحبر باب اسواق العرب مخطوطہ برٹش میوزیم [۵۳] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۲/۴۵ [۵۴] لامنس کا مضمون "بتہائے اور مذہبی جلوس زمانۂ جاہلیت کے عربون مین" جو اس کی فرانسیسی کتاب "مغربی عرب" مین بھی چھپا ہے [۵۵] بہرحال یونان کے شہر اثینہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہان دس سالاران فوج ہین ہر ایک ایک قبیلہ کیلئے ...، اور ہر ایک اپنے قبیلہ والون کی سالاری کرتا ہے اور انکی پلٹنون کا افسر مقرر کرتا ہے، اسی طرح وہان دو سالاران رسالہ پائے جاتے ہین جن کا انتخاب تمام شہری ملکر کرتے ہیں اور جو سوار فوج کی سالاری کرتے ہین انمین سے ہر ایک کے تحت پانچ پانچ قبائل (کے سوار) ہوتے ہین" دیکھئے ارسطو کا دستور اثینہ ترجمہ انگریزی ص ۱۱۲ تا ۱۱۳،

آنے کے بعد جب زمانہ جاہلیت کی بہت سی رسمین مٹ گئیں اور چند صدی بعد جو مؤلف پیدا ہوئے انھین ان چیزون کا کوئی علم نہ ہوسکا تو ذہانت سے کام لیکر انھون نے اکثر قدیم اصطلاحات کا منشاء ان کے لغوی معنون کو سامنے رکھکر واضح کرنے کی کوشش کی، اور چونکہ انھین ان اصطلاحات کا پس منظر معلوم نہ تھا، اس لئے بعض وقت وہ غلطی بھی کرجاتے تھے، بہرحال ہمارے مؤلف بیان کرتے ہین کہ أعنّة کا عہدہ زمانۂ جاہلیت مین خالد بن الولید کو وراثت مین ملا تھا، یہ استنباط غالبًا اس واقعہ کی بناء پر ہے کہ احد کی لڑائی مین خالد بن الولید ہی نے مکہ والون کے رسالہ کی قیادت کی تھی[1] لیکن احد کو چھوڑ کر بدر یا خندق یا کسی اور لڑائی مین قریش کے ساتھ گھوڑے کبھی اتنی تعداد مین نہ تھے، کہ ان کا ذکر کیا جاسکے، عرب مین گھوڑے عام طور پر ایک تعیش ہی کی چیز سمجھے جاسکتے ہین، یون بھی قبہ اور اعنّة دونون عہدے عرب مؤلفین کے بیان کے مطابق ہمیشہ ایک ہی شخص کو حاصل ہوا کرتے تھے[2]، اور ظاہر ہے کہ کسی شخص کا افسرِ رسالہ اور افسرِ خیمہ دونون ہونا کوئی ایسا ضروری امر نہین، کیونکہ یہ چیزین لازم و ملزوم نہین ہین،

نظام مالیہ کسی مملکت کے نظم و نسق مین مالیہ کی اہمیت قدیم ہی سے رہی ہے، ذہانت کے پتلے قُصی[3] نے کہتے ہین کہ مکہ والون پر ایک سالانہ محصول لگانے کا بہت اچھا بہانہ ڈھونڈھ لیا تھا کہ حج کے زمانہ مین جو غریب حجاج آئین، اُن کی خبر گیری اور "بلدیہ" کی طرف سے حجاج کی عام "ضیعہ" یعنی ضیافت جس کا عرب کے دیگر حصون مین بھی وہان کے سردارون کی طرف سے عام رواج تھا،

---

[1] حقیقت مین دائین جانب کے رسالہ کی قیادت خالد بن الولید نے کی تھی اور بائین جانب کے رسالہ کی عکرمہ بن ابی جہل نے، دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ص ۵۶۱ [2] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۲/۴۸ [3] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۳، تاریخ طبری ص ۱۰۹۹، طبقات ابن سعد ۱/ ص ۴۱، جغرافیہ یاقوت تحت کلمہ مکہ،

مصارف[51] مین سب مل کر حصہ لین، جو بچت ہوتی ہوگی، اس سے یقیناً سردار کا خزانہ معمور ہوتا جاتا ہوگا، قصی کا یہ عہدہ خاندانِ نوفل[52] مین متوارث ہونے لگا تھا، اور شاید بی بی خدیجہ کی ضرب المثل دولت بھی اسی خاندانی اندوختہ کا نتیجہ ہوگی، یعقوبی[53] نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ قصی نے جب بعض بدعتین اختیار کین، اور حرمِ کعبہ کے قریب رہنے کے لئے عمارتین تعمیر کرلین، تو باہر سے آنے والے حجاج کی ناراضی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اس نے بلدی ضیافت کی تجویز پیش کی تھی، بہرحال جب یہ رواج پڑ گیا، تو قصی اور اوس کے جانشین اس سے فائدہ اٹھاتے رہے، یہ محصول رفادہ کہلاتا تھا،

قصی کو مالِ لاوارث کا بھی مستحق تسلیم کر لیا گیا تھا، اور جو اجنبی مکہ میں لاوارث مرجاتے اُن کا مال قصی ہی کو مل جاتا،[54] شہری مملکتون اور خاص کر مکہ کے زمانہ مین جو عُشر یا محصول درآمد لیا جاتا وہ بھی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھا، کہتے ہیں کہ مکہ مین زمانہ ماقبل تاریخ کے عمالقہ[55] بھی عُشر لیا کرتے تھے، جرہم اور قطورا کے دو قبیلون نے مکہ مین مشترکہ یا وفاقی حکومت قائم کی تو بھی انھون نے شہر کے دو حصے کرکے آپس مین بانٹ لئے تھے، اور جس حصہ سے جو تاجر آتا، اُس کا عُشر اسی حصہ والے قبیلہ کو حاصل ہوتا،[56] قصی کے زمانہ مین اس تقسیم کی ضرورت نہ تھی، اور پورے شہر کا وہ اکیلا سردار تھا،[57] ظاہر ہے کہ خود شہر مکہ کے باشندے محصولِ درآمد سے مستثنیٰ تھے،[58] محصولِ درآمد لینے کا یہ رواج عام طور پر عرب کے دوسرے شہرون مین بھی نظر آتا ہے، اور وہ عموماً سامان کی

---

[51] محمد بن حبیب کی کتاب المحبّر باب اسواق العرب مرزوقی کی الازمنہ والامکنہ ۲/۱۶۲ تا ۱۶۶ [52] ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/۳۵ [53] تاریخ یعقوبی ۱/۲۰۵ تا ۲۰۶ [54] بلاذری کی انساب الاشراف بحوالہ مکہ مؤلفہ لامنس ص ۳۴ [55] دیکھئے منائح الکرم بحوالہ مرآۃ الحرمین ۱/۴۵ [56] سیرۃ ابن ہشام ص ۲/۲، ازرقی کی اخبار مکہ ص ۴۷، کتاب الاغانی ۱۳/۱۰۸ [57] طبقات ابن سعد ۱ ص ۳۹ [58] ایضاً

مالیت کا ۱/۱۰ ہوا کرتا تھا[۵۱] ایک مرتبہ مکہ مین سامان بلا محصول درآمد کرنے کا ایک دلچسپ واقعہ ازرقی نے بیان کیا ہی[۵۲]، کہ جب ایک مرتبہ کعبہ مین آتشزدگی ہوئی، اور پھر طغیانی نے اس کو بالکل منہدم کر دیا تو مکہ والون نے شعیبہ (جدہ) کی بندرگاہ پر طوفان مین آکر ٹوٹنے والے ایک جہاز کو خرید لیا تھا، اور جہازیون کو اجازت دی تھی کہ اپنا بچا کھچا مال مکہ لاکر بیچین، اور اون سے کوئی عُشر نہ لیا جائے،

قومی معبد پر جو چڑھاوے ہوتے، ان کی حفاظت کے لئے بھی ظاہر ہے کہ ایک افسر کی ضرورت ہوتی[۵۳]، چنانچہ یہ عہدہ جو اموال محجرۃ کہلاتا تھا، موروثی طور پر قبیلۂ بنی سہم مین چلا آتا تھا،

آمدنی کا ایک اور ذریعہ جو اجتماعی نہین بلکہ انفرادی تھا، یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی اجنبی شخص کعبہ کی زیارت کو آتا، تو اُسے یا تو کسی مکہ والے کا لباس حاصل کرکے اس مین طواف کرنا پڑتا، ورنہ اپنے غیر مقدس اور گناہ آلودہ لباس کی جگہ کامل برہنگی کی حالت میں یہ رسم انجام دینی پڑتی، چاہے مرد ہو کہ عورت[۵۴] اور ظاہر ہے کہ مکہ والے اپنا لباس مفت نہیں دیا کرتے تھے، مکہ والون نے بیرونی حجاج کے قیام وطعام کے لئے بھی مصارف دہندہ مہمانون کا طریقہ رائج کر لیا تھا، اور ان کے مہمان انھین کپڑون کا جوڑا قربانی کا جانور یا کوئی اور چیز اس کے معاوضہ مین دیتے تو اُسے حریم[۵۵] کا نام دیا جاتا تھا،

نظام عدل گستری | مجلس حکومت (یا مجلس شورائے عمومی) اور عدالت مین باہم فرق کرنیکی

---

[۵۱] محمد بن حبیب اور مرزوقی کی مذکورۂ بالا کتابون مین باب اسواق العرب [۵۲] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۱۰۶ تا [۵۳] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۲/۴۴ [۵۴] قرآن مجید ۷/۳۱ کی تشریح کسی تفسیر مین خاص کر تفسیر طبری ۸/۱۴۷ [۵۵] ابن دُرید کی کتاب الاشتقاق ص ۷۱ تا ۷۲،

ضرورت ہی، آخرالذکر کا مقصد صرف جرائم کی ذمہ داری اور دعوون مین حقوق کا تعین ہوا کرتا تھا اور بس، دیگر ممالک کی طرح عرب مین بھی پنچایت اور حکومت دونون کے لئے ایک ہی لفظ پایا جاتا تھا چنانچہ لفظ حکم کے معنی حکومت کرنے اور مقدمہ کا فیصلہ کرنے دونون کے ہین[1]، ہر قبیلہ کا سردار اس کا پنچ بھی ہوا کرتا تھا[2] لیکن بین القبائل جھگڑون مین بہرحال اس کی ضرورت ہوتی تھی کہ کسی دو قبیلون کے لئے اجنبی ثالث سے رجوع کرین چنانچہ مختلف معبدون کی دیوبانی یا مشہور پنچون کے پاس لوگ اپنے مقدمے پیش کرتے، عرب مین کاہن، ہاتف، عائف، ازلام اور ایسار[3] کے جو تذکرے ملتے ہین، اُن سے ہمین ڈیلفی وغیرہ یونانی مندرون کی دیوبانی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے قصی کے بعد پورے شہر مکہ کے لئے کوئی واحد حاکم عدالت نہین ہوسکا، جس کا باعث مختلف قبائل کی رقابتین اور جھگڑے تھے، انہی کے سبب سے وہ مشہور رضاکارون کی جماعت قائم ہوئی جس کا نام حِلف الفضول تھا، اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہر اُس مظلوم کی مدد کیجائے، جو شہر مکہ کے حدود مین پایا جائے، چاہے وہ وہین کا باشندہ ہو یا کوئی اجنبی[4]، یہ ممکن تھا کہ حلف الفضول کا ادارہ ترقی کرکے ایک مستقل نظام کی حیثیت اختیار کرلیتا، لیکن جلد ہی اسلام کا زمانہ آگیا جس کے باعث یہ ادارہ غیر ضروری ہوگیا، کیونکہ اسلامی حکومت نے ایک نہایت منظم مرکزی نظام عدالت قائم کردیا، اور خود عہد نبوی مین پورا جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی فلسطین

---

[1] تفصیلات کے لئے دیکھئے مجلہ عثمانیہ جلد (۱۱) مین مضمون "عدل گستری ابتدائے اسلام مین"، [2] دیکھئے تاریخ یعقوبی ۱/۲۰۰، [3] محمد بن حبیب نے کتاب المحبّر مین ایک پورا باب عربی دیوبانی کے طریقہ کی تفصیل پر دیا ہے،

[4] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۵ تا ۸۶، سہیلی کی الروض الانف ۱/۹۰ تا ۹۴، طبقات ابن سعد ۱/ ص ۸۲، مسند ابن حنبل ۱/۱۹۰،

اس مرکزی نظام عدالت کے تحت آچکے تھے[1]

اسی سلسلہ مین عہدہ اشناق کا ذکر کیا جا سکتا ہے، کہتے ہین، کہ یہ موروثی طور پر حضرت ابوبکرؓ کے خاندان مین چلا آرہا تھا،[2] اس کا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے[3] کہ جو کوئی کسی ایسے جرم یا قابل ضمان فعل کا ارتکاب کرے جو قابل راضی نامہ ہو تو عہدہ دار اشناق اس بات کا تعین کرتا کہ کس پر "دِ" کتنی مالی ذمہ داری عائد کیجائے اور پورا شہر اس کے تصفیہ کو مان لیتا، اور ملزم کا خاندان اس ہرجانہ کی ادائی کے لئے چندہ کرتا، یہ رواج اور مقامون پر بھی تھا، چنانچہ ہجرت کے بعد ہی شہری مملکت مدینہ کا جو تحریری دستور جناب رسالت مآب صلعم نے مرتب اور نافذ فرمایا —— اور جس کا متن ایک طویل دستاویز کی صورت مین لفظ بلفظ ہم تک پہنچا ہے[4] —— اس مین بھی اس طریقہ کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مجھے معلوم نہین کہ لامنس[5] نے یہ مضحکہ خیز رائے کس ماخذ کی بنا پر قائم کی ہے، کہ عہدہ دار اشناق وہ ہرجانہ یا خونبہا اپنی جیب سے دیا کرتا تھا،

نظام سفارت | مکہ کے کشوری نظم ونسق مین ایک آخری لیکن خاصا اہم عہدہ "سفیر و منافر" کا ہوا کرتا تھا،[6] کہتے ہین کہ یہ عہدہ موروثی طور پر بنی عدی یعنی حضرت عمرؓ کے خاندان مین چلا آرہا تھا، ابن عبدربہ نے مختصر اور جامع و مانع الفاظ مین اس کی یون تشریح کی ہے :-

"جب کبھی کوئی جنگ چھڑتی، تو وہ عمر کو اپنا سفیر مختار بنا کر بھیجتے"، اور جب کبھی کوئی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے مجلہ عثمانیہ جلد (۱۱) یا اسلامک کلچر اپریل ۱۹۳۷ء مین مضمون "عدل گستری ابتدائے اسلام مین" اول الذکر زیادہ مفصل ہے [2] ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/۴۵ [3] ایضاً [4] متن کے لئے دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ص ۳۴۱ تا ۳۴۴، ابو عبید کی کتاب الاموال ف ۵۱۸، ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ ۳/۲۲۴ تا ۲۲۶ وغیرہ اور عام تحلیل کے لئے مجلہ طیلسانین جولائی ۱۹۳۹ء مین مضمون "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور" [5] لامنس کی کتاب مکہ ص ۶۰ تا ۶۲ [6] ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/۴۵،

بیرونی قبیلہ قریش کی اولیت کو چیلنج دیتا، تو اس وقت بھی عمر ہی کو بطور "منافر" بھیجا جاتا تاکہ قریش کی طرف سے جواب دیا جائے اور اس جوابدہی میں جو کچھ کہا جاتا، اوس کو قریش مان لیتے"[1]۔

نظامِ فوج | جنگ اور فوج کے سلسلہ مین ہمارے ماخذ مختلف موروثی عہدون کا ذکر کرتے ہین ان مین سے "شامیانہ" اور "لگام" کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہین، ان کے علاوہ عقاب، لوآء اور حلوان النفر کا ذکر کیا جا سکتا ہے،

عہدہ دار عقاب کا مطلب جھنڈا لیجانے والے سے تھا، اور کہتے ہین، کہ یہ عہدہ[2] بنی امیہ مین متوارث تھا، بظاہر یہ وہ عہدہ دار تھا، جو حالت امن مین قومی جھنڈے کا متولی و نگہبان ہوا کرتا تھا، اور ضرورت کے وقت اس کو اپنی نگرانی مین لہراتا تاکہ فوجی اجتماع عمل مین آسکے، ورنہ کسی مہم اور عین معرکۂ کارزار مین علم برداری کے فرائض کسی اور کے بھی سپرد کئے جا سکتے تھے[3]،

ہمارے مؤلف[4] عقاب اور لوآء مین فرق کرتے ہین، اگرچہ دونون کے معنی جھنڈے ہی کے ہین، لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ ہر ایک ایک علحدہ قبیلہ مین موروثی طور سے چلا آتا تھا، ممکن ہے عقاب سے مراد جنگی قومی جھنڈا ہو، اور لوآء، قبائلی جھنڈا ہو، جس کا استعمال اس وقت ہوتا ہو، جب کہ قریش کے ساتھ دیگر حلیف قبائل بھی مہم مین شریک ہون،

ابن عبد ربہ نے اپنے اس تذکرہ کو ایک عجیب و غریب عہدہ پر ختم کیا ہے، جس کا بیان ہمین کسی دوسرے مؤلف کے ہان نہین ملتا :۔

"حلوان النفر (فوجی اجتماع کا معاوضہ) چونکہ (مکہ کے) عربون پر زمانۂ جاہلیت مین

---

[1] ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۵ ج۲ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً،

"کوئی منفرد بادشاہ حکمرانی نہین کرتا تھا، اس لئے جب کبھی کوئی جنگ ہوتی تو وہان والے اپنے قبائلی سرداروں مین قرعہ ڈالتے، اور کسی ایک کا انتخاب کرتے، چاہے وہ کمسن ہو یا بڑی عمر کا، چنانچہ یوم فجار کی لڑائی کے موقع پر بنی ہاشم کی باری تھی، اور قرعہ مین حضرت عباسؓ نکلے جو اس وقت بچہ تھے، چنانچہ لوگون نے ان کو ایک ڈھال پر بٹھایا اور اٹھالے گئے"[۱]۔

مگر یہ توضیح کچھ دل کو نہین لگتی، میرا خیال ہے کہ حلوان النفر سے مراد یہ فریضہ تھا کہ اگر کسی مہم کے موقع پر کوئی شہری لڑائی مین حصہ لینے سے قاصر رہتا ہو، تو اس کو اجازت تھی کہ اپنا بدل کسی اور شخص کو روانہ کرے[۲]، ممکن ہے کہ اس اجازت اور بدل کا انتخاب اور اس کا معاوضہ اور ہتھیار اور سامانِ سفر کی فراہمی کی نگرانی حلوان النفر کے عہدہ دار کے فرائض مین داخل ہو، ورنہ اجتماع کے معاوضہ اور بادشاہ اور فوج کی سپہ سالاری مین کوئی ربط نظر نہین آتا،

یہان اس بات کا موقع نہین ہے، کہ قریش کے فوجی نظام[۳] اور قانونِ جنگ و ناطرفداری کے اصول و نظائر کی تفصیل دیجائے، یہان صرف ایک سرسری اشارہ چند چیزون کی طرف کیا جاتا ہے، "مرباع" سے مراد مالِ غنیمت کا چوتھائی حصہ ہوتا تھا، جو مہم کے سردار کو ملتا، باقی تین چوتھائی عام سپاہیون مین تقسیم کر دیا جاتا، "فضول" سے مراد ناقابلِ تقسیم کسرات ہوتے تھے، "نشیطہ" سے مراد وہ مالِ غنیمت تھا، جو دشمن کی شکست اور عام لوٹ سے پہلے حاصل ہو، اور "صفی" سے مراد وہ

---

[۱] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۲/۴۴ [۲] سیرۃ ابن ہشام وغیرہ مین جنگ بدر کے سلسلہ مین ابولہب کا اپنی جگہ کسی اور کو بھیجنا اور دیگر مواقع پر دیگر نظائر کا پیش آنا مروی ہے [۳] اس نظام کی چند تفصیلون کیلئے دیکھئے مسعودی کی التنبیہ و الاشراف ص ۲۷۵ تا ۲۸۰،

منتخب چیز مثلاً کوئی تلوار وغیرہ ہوتی تھی، جو مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے مہم کا سردار اپنے لئے چن لینے کا مجاز ہوتا تھا، اور مرباع، فضول، نشیطہ اور صفی وہ امتیازات تھے جو کسی قبائلی لوٹ مار کی مہم کے قائد کو حاصل ہوتے تھے[۵۱]، راس الحجر الحتنی، القعقاع التیمی، اور زرار بن الخطاب الفہری کا ذکر ابن درید[۵۲] نے ان لوگون کی فہرست مین کیا ہے جنھین زمانۂ جاہلیت مین مرباع لینے کا حق حاصل ہوتا تھا،

یہان لامنس[۵۳] کے ان تمام دلائل کی نقل کیجانی ممکن نہیں جو اُس نے اپنے اس دلچسپ دعوی کی تائید مین پیش کئے ہین کہ مکہ والون نے حبشی غلامون اور تنخواہ یاب نوکرون کی ایک مستقل فوج قائم کر رکھی تھی، اس کے مقالے مین کافی حوالے دیئے گئے ہین، لیکن اس قابل مگر بدقسمتی سے بیحد متعصب اور غیر ہمدرد یسوعی (Jesuit) پادری کا منشا، اس پوری کاوش سے صرف یہ ثابت کرنا تھا، کہ قریش ایک نہایت بزدل قوم تھی، جو لڑائی سے جی چراتی تھی، لیکن چونکہ اس کے تجارتی مفادات بہت پھیلے ہوئے تھے، اس لئے اپنے مواصلات کی حفاظت کے لئے انھین قوت کی ضرورت تھی، اسی لئے انھون نے غلامون اور تنخواہ یاب لوگون کی ایک فوج قائمہ مکہ مین تیار کرلی تھی،

نپولین جیسے فاتح کو ابتدائی مسلمانان مکہ کی عظیم الشان فوجی فتوحات[۵۴] پر رشک آتا تھا[۵۵]، تو محض ایک متعصب یسوعی پادری کا خالد بن الولیدؓ سعد بن ابی وقاص اور ابو عبیدہؓ جیسے مکہ والون تک مین کسی بہادری کا نظر نہ آنا شپرہ چشمی کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے،

سماجی نظام　یونان والے اجنبیون کو "بار بار" یعنی بربریت پسند کہتے تھے، اور یونانی زبان

---

[۵۱] مرزوقی کی الازمنہ والامکنہ ۲۳/۳۔ [۵۲] کتاب الاشتقاق ص ۶۴، ۱۴۵، ۱۸۰، ۳۱۔ [۵۳] لامنس کا مضمون "احابیش اور مکہ کا فوجی نظام قرن ہجرت کے وقت" فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک ۱۹۱۶ء مین اسی مؤلف کی فرانسیسی کتاب مغربی عرب ص ۲۳۷ تا ۲۹۳ مین [۵۴] دیکھئے اوپر اس مضمون کی تمہید مین [۵۵] دیکھئے نپولین کی نوشتہ فرانسیسی یادداشت جزیرہ سینٹ ہیلینا ۳/۱۸۲،

ین دشمن کے لئے جو لفظ پایا جاتا ہے، اس کے لغوی معنی بھی اجنبی ہی کے ہین[۱]، اس کے برخلاف عرب اجنبیون کا ذکر کرنا چاہتے تو عجمی کی بے ضرر اصطلاح استعمال کرتے جس کے لغوی معنی ہین گونگا تاکہ اجنبیون سے اپنے آپ کو ممتاز کر لین، چنانچہ لفظ عرب کے معنی ہین فصیح اور من چلا، اس کے باوجود عرب مین بھی اور یونان مین بھی ہر جگہ اجنبی آتے رہتے، بلکہ بستے بھی رہتے،

یونان مین وہ اجنبی جو وہان آکر مقیم ہو جاتے تھے، شہریون اور غلامون کے بین بین ایک خاص طبقہ قائم کرتے تھے، ان کو اصطلاحاً میٹک MATIC کہا جاتا تھا[۲]، یہ MATIC لوگ اور ان کے خاندان ان تمام حقوق سے مستفید ہوتے تھے، جو شہریون کو حاصل تھے، البتہ انھیں نہ تو کوئی سرکاری عہدہ مل سکتا اور نہ وہ شہری انتخابات مین کوئی راے دے سکتے، اور نہ کسی اراضی کے مالک ہی ہو سکتے، ان مین سے ہر ایک کیلئے یہ ضروری ہوتا کہ کسی شہری کو اپنا سرپرست بنائین، جو ان کے چال چلن کی ذمہ داری لے، ان کو سالانہ فی کس براہ راست بارہ درہم مرد کے لئے اور چھ درہم غیر شادی شدہ عورت کیلئے محصول بھی دینا پڑتا، ان چیزون کو چھوڑ کر اور باتون مین انھیں شہریوں کی برابری حاصل ہوتی تھی، چنانچہ وہ اپنی مسکونہ شہری مملکت کی فوج مین شریک ہو کر جنگ کر سکتے تھے، اور اسکی تمام مذہبی پبلک تقریبون مین حصہ لے سکتے تھے"[۳] عرب مین جو اجنبی آکر سکونت گزین ہو جاتے، ان کو "مولا" کا نام دیا جاتا تھا، عرب اور خاص کر مکہ والون کے موالی کے ساتھ یونان کے مقابلہ مین کم سختی کا سلوک ہوتا تھا چنانچہ ان پر کوئی خصوصی محصول عائد نہین کئے جاتے تھے، اون کو اور ان کے سرپرستون کو جملہ شہری حقوق حاصل رہتے تھے، مساوات کی حد یہ تھی، کہ اجنبی اور اس کے سرپرست

---

۱ انسائیکلوپیڈیا آف سوشیل سائنس کی جلد اول کا دیباچہ نیز The Roth کا جرمن مضمون لفظ بار بار کا مفہوم اور استعمال مطبوعہ نوربرگ ۱۸۱۴ء ۲ ہیا لیڈے کی مذکورہ بالا کتاب ص ۲۷۱۱ ۳ انسائیکلوپیڈیا آف سوشیل سائنس جلد اول کا دیباچہ فصل شہری مملکت کا تسلط "

دونوں کے لئے ایک ہی لفظ مولا استعمال کیا جاتا تھا، البتہ یہ تحدید بداہتہً پائی جاتی تھی، کہ کوئی اجنبی متوطن کسی اور نئے اجنبی کو اپنا مولا بنانے کا اور اپنی سرپرستی مین لینے کا مجاز نہ تھا، اس پابندی سے قطع نظر ہر اجنبی متوطن اپنے سرپرست کے خاندان کا ایک رکن بنجاتا، اور اُوسے وہ سب حقوق حاصل رہتے جو کسی اصلی شہری کو حاصل تھے، البتہ کسی نئے اجنبی کو اپنی پناہ مین لینے سے پہلے اُسے خود اپنے سرپرست کی اجازت ضروری ہوتی[۱] اصل مین عرب یہ چاہتے تھے کہ اوروں کو اپنا لین، اور عرب بنا ڈالین[۲] اس کے برخلاف یونانیوں کو ان کے فلاسفہ نے کہہ رکھا تھا، کہ قدرت ہی کا یہ منشا رہے، کہ اجنبی یونانیون کے غلام بنین[۳] مزید بران یونان مین:

"کسی سیاسی وحدت کے ارکان مین اتحاد ابتداً اسلئے ہوتا تھا، کہ وہ ہم جد ہوتے تھے، اور ہم مذہب ہوتے تھے، وہان کا سماج برادریون مین بٹا ہوا تھا، یعنی رشتہ دار خاندانون کے گروہ الگ الگ وحدت بناتے تھے، اور یہ تمام برادریان ایک مزعومہ ہم نسبی کے باعث ایک بزرگ تر اتحاد مین شامل ہو جاتی تھین، جسے قبیلہ کہا جاتا تھا، خون کا رشتہ مذہبی رشتہ کے باعث مستحکم تر ہو جاتا تھا"[۴]

مکہ کا اندرونی نظام اس سے بہت زیادہ پیچیدہ تھا، کیونکہ وہان حسب و نسب کو غیر معمولی سماجی اہمیت حاصل تھی، ہر قبیلہ مین ہر دس دس آدمیون پر ایک "عریف" ہوا کرتا، (جس طرح رُما مین Decurion) اور کہتے ہین کہ ہر سو کا سردار قائد کہلاتا تھا، (جس کا مماثل رُما

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۵۱ ، تاریخ طبری ص ۱۲۰۳ [۲] تفصیلات کے لئے دیکھئے حمید اللہ کی فرانسیسی کتاب "اسلامی سیاست خارجہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ مین" ۱/۴۰ [۳] ارسطو کی کتاب سیاسیات ۱/۲ جس کا حوالہ لارنس نے اپنی انگریزی کتاب "قانون بین الممالک کے اصول" مین بھی دیا ہے [۴] ہیالیڈے کی مذکورہ بالا کتاب صفحہ ۱۱ تا ۹

مین [illegible] ہوسکتا ہے) وہان قبیلہ بطن، فخذ، شعب[1] وغیرہ کی شاخ درشاخ تنظیم و تقسیم پائی جاتی تھی، جن کی تفصیل عرب مولفین کے حوالہ سے وستن فیلڈ نے اپنی جرمن کتاب "جدولہاے نسب عرب کے" اشاریہ کے دیباچہ مین بھی دی ہے،

اسلام سے پہلے مکہ والون مین مذہبی وحدت نہین پائی جاتی تھی، اسی طرح وہان کوئی مقدس کتاب یعنی تحریری قانون بھی نہین پایا جاتا، جس کی تعمیل سب کرسکین، چنانچہ مکہ والون مین بُت پرست، مشرک، ایک سے زیادہ خداؤن کو ماننے والے، خداکو نہ ماننے والے، بلکہ خود لا مذہب اور دہریے بھی پائے جاتے تھے، ان کے علاوہ مجوسی، یہودی یا عیسائی مذہب بھی مختلف لوگون نے اختیار کر لیا تھا، بہرحال وہان کے عوام تمدن کے اس درجہ تک ضرور پہونچ چکے تھے، کہ ایک مشترک اور سب سے بڑے خداکو بھی مانین، جو چھوٹے چھوٹے قبائلی دیوتاؤن سے بھی بزرگ و برتر ہو، اور اوس کو وہ اللہ کے نام سے پکارتے تھے،

سیاسی شعور بھی اس حد تک ترقی کر گیا تھا کہ ہر شخص ملکی مفاد کو شخصی مفاد پر ترجیح دینا ضروری سمجھتا تھا، چنانچہ جب غیر متوقع طور پر مکہ والون کو غزوۂ بدر مین شکست ہوئی تو اوتھون نے اس قافلہ کا پورا منافع (جو عین اسی زمانہ مین شام سے ابوسفیان کی سرکردگی مین واپس آیا تھا، اور جس مین شہر مین بسنے والے تقریبًا ہر قبیلے کا سرمایہ لگا ہوا تھا) جنگی تیاریون کے چندے مین دیدینا منظور کر لیا،[2]

مکہ والے اپنے نوزائیدہ بچون کو کسی صحرا مین بدویون کے ہان بھیج دیا کرتے تھے، جہان وہ بدویون کے ہاتھون پرورش پاتے تھے، صحرا کی پاک و صاف اور سادہ زندگی مین پلتے تو

---

[1] یہ اصطلاحات جسم انسانی کے مختلف اعضاء کے بھی نام ہین، اور شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے، کہ "بنی آدم اعضای یکدیگرند"، [2] سیرۃ ابن ہشام ص ۵۵۵ طبقات ابن سعد ۲ ص ۲۵ ومابعد،

ان مین بدویون کی بہت سی خوبیان آجاتین اور شہریون کی مخلوط آبادی کی بہت سی برائیون سے وہ بچپن کی تاثر پذیر عمر مین محفوظ رہتے، خود آنحضرت صلعم نے بھی اپنی ابتدائی زندگی کے چند سال اسی طرح گذارے تھے، یہان مماثلت کے لئے ان قوانین کی یاد تازہ کرائی جا سکتی ہے، جو مثلاً لائیکرگس نے یونان کے شہر اسپارٹا مین نافذ کئے تھے، اور جو اگرچہ انتہائی وحشیانہ تھے، مگر ان کا منشا بھی نئی نسلون کی ذہنی اور جسمانی تربیت ہوتا تھا،

کہتے ہین کہ یونانی طبیعت کی امتیازی خصوصیت علم کی محبت تھی، جس طرح کہ فینیقیہ اور مصر والون کا امتیازی خاصہ دولت کی محبت تھا، (ہندوستان مین بھی لکشمی یعنی روپئے کی اب بھی باقاعدہ پوجا ہوتی ہے) اس کے برخلاف قریش یعنی باشندگان مکہ کی امتیازی خصوصیت فنون لطیفہ اور ادبیات کی محبت معلوم ہوتی ہے، غالباً یہی فن نوازی تھی، کہ عتبہ بن ربیعہ ابن عبد شمس نے مکہ مین ایک دار القواریہ (شیش محل glass palace) تعمیر کیا تھا[۱] شعر و شاعری ان کا اوڑھنا بچھونا ہو چلا تھا، چنانچہ بیت، مصرع، اسباب، اوتاد، فواصل کسی ڈیرے اور اوس کے مختلف اجزار کے بھی نام تھے، اور بیت اس کے مختلف حصون کے بھی[۲]

زندگی کا مقصد یونانی فلسفیون کی نظر مین دنیاوی آرام تھا[۳] یہان شاید ان قرآنی آیتون کا حوالہ دلچسپی سے پڑھا جائیگا جس مین اسلام سے پہلے کے عربون کا مقصد زندگی اور خود اسلامی تصوریات اس خوبی سے پیش کیا گیا ہے:

"ان مین سے چند ایسے ہین جو کہتے ہین ای ہمارے رب ہمکو اس دنیا مین بھلائی عطا کر انکو آخرت مین کوئی حصہ نہین ملیگا، لیکن ان مین سے بعض ایسے ہین جو کہتے ہین کہ ای ہمارے رب ہمکو اس دنیا مین بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت مین بھی بھلائی اور ہمکو آتش دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ انکو انکی کمائی کا حصہ ملیگا خدا حساب کتاب لینے مین بہت تیز ہے"[۴]

---

[۱] بلاذری کی فتوح البلدان مطبوعہ مصر ص ۶۳ و ۶۴، [۲] ... [۳] ارسطو کی کتاب سیاسیات ۱/۲ و ۲/۲، [۴] قرآن مجید ۲/۲۰۰ تا ۲۰۲

یادپاستان

از

جناب مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی

(۲)

تواریخ کشمیر (۳) نمبر ۲۲ و ۲۳ دونون کو ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کشمیر سے نامزد کیا ہے، لیکن مضمون کا نام نہین بتا سکے، فرماتے ہین کہ نام مذکور نہین! کہان؟ مقصود فی الذہن شاید طبقات اکبر شاہی ہو،

کشمیر پانچ چھ صدیون تک مسلمانون کے زیر حکومت رہا ہے، مسلمان بادشاہون نے وہان کے علماؤ فضلاؤ شعراء وصلحاء اور اہل کمال کی بلا امتیاز دین وملت برابر پرورش و دستگیری فرمائی ہے، اکثر علوم وفنون کی قابل قدر کارآمد تصانیف اور ترجمے ان کے زیر اثر جلوہ پیرا و دانش افروز ہوئے ہین (آئین اکبری، جلد دوم، ص ۱۰۵) انہی زندہ دل بیدار بخت ہنر پرور سلاطین کی ترغیب وتشویق سے اس ملک کی بہت سی تاریخین عربی وفارسی مین لکھی گئی تھین جن کا شمار حسب روایت بہارستان کشمیر (قلمی، صمدنیہ) پچیس چھبیس تک اوس وقت پہونچتا تھا، قصائد ومنظومات اور متفرق منشآت کا حصر واحصا کون کرسکتا ہے، اس مین موافق ومخالف دونون رنگ کا کلام ملتا ہے،

ہند کے بڑے سے بڑے مستطیع شعراء مین کتنے ایسے ملتے ہین، جو کشمیر نہین گئے، یا وہان نہین رہے اور وہان کی قدرتی رنگینیون سے متاثر ومحظوظ نہین ہوئے، ملک الشعراے شاہجہانی کلیم ہمدانی مولانا طاہر غنی، ملا علی قلی سلیم، مرزا صائب اصفہانی وغیرہم کے دیوانون کو ملاحظہ کیجئے کشمیر کے متعلق انکی

رنگین نوائیون سے لطف اوٹھائیے،

عرفی کا قصیدہ غایت شہرت سے محتاجِ اعادہ نہیں، یاد دلانے کے لئے دو تین شعر پڑھ دینا چاہتا ہون، گوش و دل کچھ دیر تو شیرین کام رہین،

مطلع:- ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید گر مرغ کباب ست کہ با بال و پر آید

کشمیر کی شادابی و نزاہت اور وہان کی آب و ہوا کی جان بخشی اور روح پروری کی توصیف مین اس سے بڑھکر کیا کہا جا سکتا ہے،

بنگر کہ ز فیضش چہ شود گوہر یکتا جاے کہ خزف گر رود آنجا گہر آید

مقطع:- می آید و می سوزد ازین رشک کہ کشمیر چون یافت کہ آید بہ کجا بر اثر آید

(قصائد عرفی نول کشوری، صفحات ۸۷ تا ۸۹)

ملک الشعراے اکبری شیخ فیضی کا طویل قصیدہ کشمیر کی تعریف مین میری تعریف سے بے نیاز ہے، وہ والہانہ صدا لگاتا ہے،

ہزار قافلۂ شوق می کند شب گیر کہ بار عیش کشاید بہ عرصۂ کشمیر[۵۱]

قاضی نور اللہ شوستری نے بھی مجالس (صفحہ ۵۱) میں کشمیر کی توصیفی رباعیان نقل کی ہین

ظفر خان کے خطاب سے مشہور، احسن اللہ نام، احسن تخلص[۵۲]، عہد شاہجہانی مین دو بار کشمیر کا گورنر رہا تھا، خوانین دربار اور مقربین شاہی سے تھا، مرزا صائب اسی سے ملنے کے لئے اصفہان سے کابل آئے تھے[۵۳]، اس نے کشمیر کی تعریف مین ایک مثنوی نظم کی تھی، محمد اعظم صاحب واقعات کشمیر

---

[۵۱] اکبرنامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۰۰ [۵۲] احسن کا یہ شعر بہت مشہور و مقبول ہے:-

زہد خشکم جنگ و سنگ بادہ را در خروش آوردہ است توبۂ من خون مینا را بجوش آوردہ است

(تذکرہ حسینی ص ۱۸۹)

[۵۳] سرو آزاد صفحہ ۹۶،

اس کو "بہت شیرین" بتاتے اور فرماتے ہین، کہ اس نے اس ملک کی توصیف مین بہت کچھ لکھا ہے[۱] مین اسکی دستیابی سے محروم رہا، صرف ایک رباعی ملی ہے، وہ بھی کشمیر کی مدح مین ہے،

جہان جوان شد و عقد بہار می بندد   بہار پاے چمن در نگار می بندد

مسافران چمن نارسیدہ در کوچ اند   شگوفہ می رود و شاخ بار می بندد (صفہ ۲۰۹)

کسی اور خوشگو سخن سنج کا بھی ایک شعر یاد ہے، جو متذکرۂ بالا کتاب مین دیکھا تھا،

خوشا کشمیر د سیرِ زعفران و چیدن گُلہا   خزان گردد بہار خلد ار بیند خزانش را (صفہ ۲۴۴)

اسی سخن شناس مورخ نے خواجہ احسن اللہ راضی، عرف فصاحت خان کی مثنوی سے یہ چند اشعار نقل فرمائے ہین :-

ندارد خلد با کشمیر نسبت   عیان است این بر ارباب بصیرت

درین گلشن ز رندان قدح نوش   کہ چون بحر ند دائم بہ سر جوش

چنان مے ہر طرف آب سبیل است   کہ دریاے کدو چون نارجیل است

چنان در شہر و کویش آب جاری است   کہ ہر یک خوردہ او جوئبار یست

درین گلشن مپرس از چہرہ سبزان   پری بار آورد باغ سلیمان

ترا و د چہرۂ سبزان بصد زیب   مفرح دار کیفیت ز ترکیب

چو مے خانہ است دائم بسکہ شاداب   بود ہر گل زمینش عالم آب

بوصف این زمین در پیش جمہور   کہ تشبیہے بود این بیت مشہور

بہشت آنجاست کازارے نباشد   کسے را با کسے کارے نباشد

ز شور انگیز چندے بہ نمک شد   ز لوح سینہ نقش عیش حک شد

---

[۱] ترجمہ واقعات کشمیر، صفحات ۲۰۸ و ۲۰۹ مطبوعہ ۱۸۴۶ء، دہلی،

عجب ہنگامۂ گردید ظاہر ز جنگِ شیعۂ و سنی و کافر

کشمیر کی خوبیوں، دلکشیوں، اور نظر فریبیوں کے ساتھ ساتھ، اخیر کے دو شعروں میں یہاں کے باشندگان کی باہمی نااتفاقیوں، ہندو مسلمان، شیعہ سنی کے جھگڑوں اور صف آرائیوں کی طرف اشارہ ہے، تفصیل آیندہ آئے گی،

واہ رے کشمیر! کسی فاقہ مست دل جلے نے اس کی مدح کے پیرایہ میں ہجو ملیح بھی کر ڈالی، اور حیرت یہ ہے کہ فرشتہ بھی اسکی ہاں میں ہاں ملاتا ہے؛

کسانے کہ آفاق گردیدہ اند | بسے سال و مہ در سفر بودہ اند
بہ تعریفِ کشمیر و کشمیریان | بہشتے پُر از دوزخے دیدہ اند

(جلد دوم، صفحہ ۴۳۴، نولکشوری)

شیخ علی حزین اصفہانی کی نزاکتِ طبع اور ناسازگاری مزاج چھپی ہوئی بات نہیں[۱]، اقلیم چہارم کی اس بہشت کو دیکھکر یا محض سُن کر اُن کا نچلا بیٹھنا دشوار تھا، کشمیر کے متعلق شیخ نے اچھا بُرا جو کچھ لکھ مارا، ان کی بشری جبلت کا تقاضا تھا اور صفحۂ ہستی پر مدتوں ثبت رہے گا اور یہ دو قطعے

---

[۱] ہند اور اہلِ ہند کی ہجو کہکر حقِ نمک ادا کرتے ہیں،

نسناس سیرتے است تمنائے مردمی | از دیولاخِ ہند کہ انسان نداشتہ است

سوادِ ہند خاطر خواہ باشد بے کمالان را | نماید خانۂ تاریک روشن چشم عریان را

مشنو فسونِ زہد کہ در تیرہ خاکِ ہند | ہر کس نیافت دولت دنیا فقیر شد

(خزانۂ عامرہ صفحات ۱۹۳ النفائیہ ۲۰۰ وسرو آزاد صفحہ ۲۲۵ وکلیات حزین صفحات ۲، ۷، ۳۵۲، ۴۴۲ بالترتیب، مزید برین ملاحظہ ہوں اشعار و رباعیات صفحات ۵۳۶، ۵۶۹، ۲۶۱، ۱۰۰، ۵۳۲، ۷۵، ۵۵، ۱۰۰، ۳۲، ۱۰۰، ۹۲۵)

کر کے اچھے، پاکیزہ دلون کو بُرا کر دینا آئینِ دانش مندی و مصلحت شناسی سے بعید ہے،

مجھے تسلیم ہے کہ بہت کم کتابین نظم کی ہون یا نثر کی، سیاحت نامے اور سوانخ شعراء کے ہون یا سلاطین و امراکے ہمکو ایسے ملتے ہین، جن مین کشمیر، فضاے کشمیر، جغرافیۂ کشمیر یا فرمانروایانِ کشمیر کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا نہ ہو، اکبر نامہ (جلد سوم، صفحات ۵۲۵ و ۵۲۶ و ۵۰۰) تاریخ فرشتہ ملا قاسم (جلد اول، صفحہ ۲۱۱) منتخب تنقیح الاخبار از راجہ کندن لال بہادر اشکی (صفحہ ۶۵) جہانگیر اور تزک جہانگیری مولینا شبلی (صفحہ ۱۰) بہارِ گلشنِ کشمیر مرتبہ پنڈت برج کشن کول و پنڈت جگموہن ناتھ رینا وغیرہ کی ورق گردانی اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے، مگر یہان ضرورت ہے تاریخون کی تفصیل کی،

زندگی کی اخیر منزل ہے ضعفِ قوا، اور غلبۂ نسیان نے مجھے معذور و ناکارہ بنا رکھا ہے تاہم اپنی دیکھی ہوئی کتابون مین سے اس وقت یا آیندہ جو یاد آتی جائین گی، کاغذ سیاہی نذر کر دون گا، ع

کفِ خاکم غبارے می نویسم

البتہ اندیشہ ہے کہ حرب وضرب کے ذیل مین کوئی مستقل چیز دستیاب نہ ہوسکے گی،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۷) بیچارے کشمیری ان کی زبان و قلم اور طنز و طعن سے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے،

ایک اور حریف میدان مین آتا ہے حیدری تبریزی نام ہے، دربار اکبری کا باریاب و باکمال شاعر ہے نغمہ سرا ہے

در کشورِ ہند شادی و غم معلوم | آن جا دل شاد و جان خرم معلوم
جائے کہ بیک روپیہ آدم نہ خرند | آدم معلوم و قدر آدم معلوم

میر غلام علی آزاد بلگرامی ان کی نسبت جواباً فرماتے ہین :-

در کابل تبان دل بہ خونخوان کند | ہم چون مغل شکایتِ ہندوستان کند

(خزانہ ص ۱۰۸)

یہ مدخالی رہے گی، اس محرومی دنایافت کی بنیاد نیز ذمہ داری مغلون کے نمک خوار پروردہ نعمت مگر بداندیش وزشت گو نکولا منوچی کی ایک روایت ہے، اور اوس روایت کو مسٹر ملک راج شرما نے ان الفاظ مین نقل کیا ہو :-

"اکبر نے حکم دیدیا، کوئی کشمیری فوج مین بھرتی نہ کیا جائے، یہ لوگ سپاہیانہ اوصاف سے مُعرّا ہین" (ہندوستان عہدِ مغلیہ مین، حصّہ اول صٰلا)

شاباش اَیار عزیز شاباش!!! اکبر ناآگاہ دل، نامردم شناس سہی، لیکن منوچی! تم نے تو دیکھا ہوگا کہ تمھارے ہی زمانہ مین اہلِ کشمیر کی زندگی کیسی تھی، ان کی باہمی پیکار و جدال، جنگ جوئی طوائف ملوک کی چڑھائیان، لڑائیان، خونریز مقابلے تمھارے علم مین ہون گے، یہ تو اہلِ ہند سے تبت والون سے کاشغر والون سے، کابل و بدخشان والون سے، سرحدی وہمسایہ ممالک کے لوگون، فوجون اور لشکرون سے ہمیشہ برسرِ نبرد رہے ہین[۱]، خود اکبر نے بھی ان سے آسانی کیسا یا جلدی سے کشمیر چھین نہین پایا تھا، دانت کھٹے ہوگئے ہون گے، کشامرہ کی بہادری و شجاعت کے کارنامے نہ اکبر کے صلون کے منتظر و محتاج ہین، نہ تمھاری ستایش و آفرین کے لئے چشم براہ "سپاہیانہ اوصاف" کا معمّہ نہ اکبر نے بُوجھا نہ تم نے، میرے اچھے منوچی! سچے منوچی! اس جلتے بُجھتے سورج کی کرنین کبھی ان ہی اوراق پر پڑین گی، تو کھل جائے گا ع

کہ باکہ باختہ نرد و در شبِ دیجور

پنڈت کلہن کی راج ترنگنی اور ان کے تلامذہ و اتباع کے اضافے جو کچھ ہین اور جیسے کچھ ہین، کسی ہوشمند بالغ نظر سے پوشیدہ نہین تاہم عام اہلِ ذوق و صاحبانِ شوق کی اطلاع و

---

[۱] ترجمہ واقعات کشمیر، صفحات ۴۸ و ۶۵، ۶۶، ۹۴ و ۱۰۸ و ۱۱۲ و ۱۱۳ و ۱۱۶ و ۱۴۴ و ۱۶۰ و ۱۸۱ و ۱۸۲ و ڈکشنری ازبیل صفحات ۲۴۴ و ۲۶۱،

آگاہی کے لئے اس تالیف اور اس کی روش تالیف یعنی تالیف کے چڑھاؤ اُتار کا مختصراً گذارش کر دینا مناسب سمجھتا ہون، اسی سے اسکے تراجم کی کیفیت و نوعیت نیز انکی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا

پنڈت جی کشمیری تھے ،ایک باکمال اختر شناس (جوتشی) چمپک برہمن کے بیٹے تھے راج ترنگنی ،راجگان کشمیر کی تاریخ سنسکرت مین لکھی ،اور بڑے اہتمام سے لکھی ،چار دفترون آٹھ بابون مین منقسم ہے چارون منظوم ہین پہلا حصہ اشلوکون مین خود موصوف کی تالیف اور تقریباً ۱۱۴۸-۴۹ء تک کے حالات مین ہے یہ راجا بھکشا یا راجہ سنگھ دیو کا عہد حکومت (۱۱۲۸ء سے ۱۱۵۹ء تک) تھا، جس کی فرمایش سے اس کتاب کی تدوین عمل مین آئی مسلمان مورخ اس کو جے سنگھ کے نام سے یاد کرتے ہین، دوسرا اس کا تتمہ ۱۴۱۲ء تک کا جون راج (جون راجا یا جین راجا) زین العابدین عرف بڈشاہ[۱] کے عہد کے ایک مورخ نے لکھا ،اسکی کتاب راجاولی عرف زینہ ترنگنی کہلاتی ہے ،اس مین ۱۱۴۹ء سے لیکر ۱۴۵۹ء تک کے حکمرانون کے حالات مندرج ہین ،بادشاہ کے حکم سے راج ترنگنی کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے لکھی تھی ،تیسرا حصہ یعنی دوسرے کا ضمیمہ سری ورا (شیر ویر) پنڈت نے جو جون راج کے شاگرد تھے ،قلمبند کیا ،یہ بھی زینہ راج

---

[۱] زین العابدین بڈشاہ یعنی بڑا بادشاہ درحقیقت بڑا بادشاہ تھا ،اوس نے علوم و فنون شریفہ کی بڑی سرپرستی کی ،فارسی زبان کو بہت کچھ سنوارا ،فروغ دیا ،کتب خانے اور مدرسے قائم کئے ،نصاب تعلیمات مرتب فرمایا ،بڑے بڑے انعامات دیکر کشمیر کے ادیبون اور عالمون سے کتابین لکھوائین سنسکرت کی بعض مشہور اور پرانی کتابون کا فارسی مین ترجمہ کرایا ،جیسے راماین مہابھارت ،برہت کتھا، بھگوت گیتا وغیرہ ،راجہ جے سنگھ (جس کے وقت تک کشمیر کی یہ تاریخ راج ترنگنی لکھی جا چکی تھی) کے عہد سے اپنے زمانہ تک کا سنسکرت مین ضمیمہ لکھوایا ،پھر اس کا ترجمہ فارسی مین کرایا ،(تاریخ کشمیر مترجمہ اشرف علی صفحات ۹۵ و ۱۰۶ و ۱۰۸ و ۱۱۰ و ۱۱۲)

ترنگنی کے نام سے مشہور ہے، یہ جز و بعہد سلطان فتح شاہ والی کشمیر ۸۹۹ھ (۱۴۹۴ء) میں لکھا گیا تھا، اس میں پانچ مسلمان بادشاہوں کا ۱۴۸۶ء تک کا ذکر ہے، کہا جاتا ہے کہ ۹۹۲ھ (۱۵۸۶ء) کے ذیل میں محمود غزنوی کا حال بھی موجود ہے، جرنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ۱۹۱۲ء نے کشمیری کتابوں کی ایک فہرست دی ہے، جو مسٹر کلاسن (G. R. M. Clauson) نے مرتب فرمائی تھی، صفحہ ۵۹۰ میں لکھا ہے کہ بھٹ ہرک (Bhatta Haraka) نے بھی کچھ اضافے فرمائے تھے، یہ سب کشمیر کی دولتِ اسلامی کی بدولت ہوا، اور ہوتا رہا ہے، ع

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

پنڈت کلہن ۱۱۵۰ء یعنی سنگھ دیو والی کشمیر کے زمانہ تک زندہ تھے، تالیف شروع کرنے سے پہلے اُس ملک کی گیارہ تاریخیں ملاحظہ فرما چکے تھے، خردمند آگاہ دل نیل منی کی شہرۂ آفاق تاریخ نیل مت پُران بھی آپ کے مطالعہ میں آچکی تھی، جو سب سے پُرانی تاریخ سمجھی جاتی ہے، کلہن مہاراج نے اپنی کتاب کو اپنے ملک کی قدیم روایاتی، اعتقادی، افسانوی تاریخ سے شروع کیا ہے، پہلا بادشاہ گونارڈ (گونند ؟) کو بتاتے ہیں، جو ان کے حساب سے ۲۴۴۰ سال قبل حضرت مسیحؑ حکمران رہا ہو گا، آخری فرمانروا انہی کے وقت کا راجہ ستیہ دیو (سہدیو ؟) عیسوی ۱۱۵۰ء کے قریب تھا (بیل کی ڈکشنری، صفحات ۱۳۹ و ۱۴۰)

یورپ کے عام مصنفین کی تقلید میں صاحبِ سیف و قلم کرنل ٹاڈ بھی اس کے مدح سنج و ثنا گستر ہیں، اس پر کوئی تنقید یا نکتہ چینی نہیں کرتے (تاریخ انگریزی، مرتبہ ولیم کروک ۱۹۲۰ء ص ۹۱) ہو سکتا ہے، کہ اپنی تاریخ کی تالیف کی مشغولی میں ان کی نظر راج ترنگنی کی مخالف تحریرات پر نہ پڑی ہو، ساتھ ہی یہ بھی رازِ طشت از بام ہے، کہ کرنیل صاحب کے زمانہ تک تاریخی باتوں اور

ہندوستان کی پرانی تاریخون کے متعلق اس قدر چھان بین ہی نہیں ہوئی تھی، جس کی مشق دورِ حاضر مین خود آنجہانی کی مبسوط و مشرح کتاب پر کی جارہی ہے، با این ہمہ ہمارے ایک مقامی پروفیسر و مورخ "راج ترنگنی کو ایک قیمتی ذریعۂ معلومات" بتاتے ہین، (عصرِ وسطیٰ کی ہندوستان کی تاریخ کی تمہید ازپنڈت ایشری پرشاد)

واجب التعظیم پنڈت نے اپنے پیشرو مورخین کو ادب و احترام مناسب کے ساتھ یاد نہین کیا،

ان کی غلطیان اور لغزشگاریان ساختہ و بے ساختہ سپرد قلم کردی ہین،

ان کا اپنے متقدمین کو ناسزا کہنا رنگ لائے بغیر نہ رہ سکا ع

بادردکشان ہرکہ درافتاد برافتاد

امپیریل گزیٹر کے فاضل و متبحر مؤلفِ اعظم نے خود ان کی کتاب کو اچھی نگاہ سے نہین دیکھا، نہ بہ آئین بہین و اسلوب زرین پیش کیا ہے، وہ اسکی قدامت و دیرینہ سالی کو تسلیم کرتے ہین، اسقدر اور کہ اگر ہندوؤن نے کبھی ایسی کوشش کی تھی، کہ تاریخِ عام کی شکل مین کوئی منظم و مدوّن ہو جائے، تو اسکی مفرد (اکیلی) مثال یہی کتاب ہو سکتی ہے، وہ مصنف کی محنت و کاوش کی داد نہین دیتے، ان کے نزدیک خارجی تاریخ کی بعض بعض مدات و اجزاء، بلکہ بہت سی بے اصل و بے سر و پا باتین جا بجا اس مین الحاق کر دی گئی ہین، بقول گزیٹر کم سے کم اس قدر توقع کیجا سکتی تھی، کہ کلہن نے خود اپنے زمانہ اور ماضی قریب کی صدیون کے حالات تو مناسب طور پر صحت و تحقیق کیساتھ قلمبند کئے ہونگے، لیکن جب انکی تالیف شریف کا جائزہ لیا جاتا ہے، اور اسکی تفصیلات کو ذرا بھی غور و توجہ سے دیکھا جاتا ہے، تو نظر ڈالتے ہی کھل جاتا ہے، کہ اُن کی حقیقت تخیل اور تصور کے سوا کچھ اور نہین، اور ابتدائی زمانون کے متعلق تو قطعاً ناقابلِ اعتبار و غیر مستند ہے، تفصیلی بحثین اور تنقیدین امپیریل گزیٹر کے اجزاے اولین و تمہیدی اور ۱۹۰۶ئہ کے رسالہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن مین

ملین گی، پنڈت صاحب کی نازک خیالیون اور رنگ آمیزیون اور تاریخ آفرینیون کا خوب مذاق اڑایا گیا ہے،

ادھر کلہن جی کا اپنے بزرگ پیشرؤں کے نقص دکھانا، عیب جوئی کرنا، اُدھر اُن کے اخلاف و پس آیندگان کا "عطاے تو بہ لقاے تو" پر عمل کر کے انہی اعتراضون اور سُقمون کو پنڈت جی کی نذر کر دینا، یا سر منڈھنا، گل کھلا کر رہا، ہندو ہسٹری نے صداے کرب و درد بلند کی، دونون کی ضد نے خاک مین ہم کو ملا دیا، محترم فضلاے یورپ عہد ہنود کی تاریخ کے سچے دل سے کبھی معتقد نہ تھے، "اسکو لیجنڈری" یا افسون و افسانہ سے زیادہ وقعت نہین دیتے تھے، گھر کے بھیدیون نے، رہا سہا بھرم اور بھی کھول دیا، کامل فن ماہرین اپنی اپنی نکتہ بینیون اور دقیقہ سنجیون کے دفترلے کر بڑھے، حق پسندی کی جگہ حرف گیری نے چھینی، سنتا ہون کہ فرنگستان مین بلبل "نائٹ انگیل" کہلاتی ہے، اس موقع پر مجھے یورپ کی نائٹ انگیل میڈیم راگوزن (Rozozin M. Ragozin) کا ایک لطیفہ بے اختیار یاد آتا ہے، جو خود موصوفہ کا طبعزاد ہو یا کسی اور ستم ظریف مشرق نواز علم دوست کا فرماتی ہین "ہند قدیم کے متعلق اگر کوئی کتاب لکھی جاے، تو آخری باب تک پہنچتے پہنچتے، پہلے باب کی نظر ثانی کی ضرورت ہو جاتی ہے، (ویدک ہند، ترجمۂ حمید، ص ۱۷۲)

قلق ہو کہ اسی مدّو جزر سے میری تاریخ قنوج کی تکمیل و اشاعت معرض التواء و انتظار مین پڑی ہوئی ہے، وسیع النظر و دور اندیش ڈاکٹر اور فلک پیما پروفیسر ہند کی تاریخ قدیم کے نام سے نئی نئی باتین روز روز نکالتے اور ہمارے حوالہ کرتے ہین، یہ موشگافیان اور روز افزون علمی ترقیان جب تک ختم یا بند نہ ہو جائین، کیونکر آگے بڑھ سکتا ہون، اس داستانِ رنگین کا خدا حافظ،

میرے ہندوکرم فرما اور قدر افزا جو میری مخلصانہ اُفتاد طبع سے واقف ہین، بُرا نہ مانین، مجھے ملامت نہ فرمائین، یہ بھی غیرون کی سُجھائی ہوئی باتین تھیں، جو بے اختیار قلم سے نکل گیین، میرے بیے ریا دوست اکیلے مجھ ہی سے نہین، بھری خدائی سے پوچھنے کا حق رکھتے ہین، کہ روے زمین پر کونسی قوم ایسی گذرتی ہے، جو کبھی میدان علم وعمل مین گام زن رہی ہو، جس نے ترقی وتمدن کی سیڑھیان تیزی سے طے کرلی ہون، تاہم اوس نے اپنی ملکی وجماعتی خصوصیات، فرسودہ روایات نفسیاتی معلومات اور خیالی تخلیقات وتحصیلات کو تاریخی حقائق اور وجدانی وعرفانی تنزیلات وتنویرات کے نام سے جلوہ افروز نہ فرمایا ہو، یہ بھی ایک عالم آشکار راز ہے، کہ عربون (مسلمانون) کی حضارت وثقافت ایک بڑی حد تک عجمیون (ایرانیون) کی تہذیب و مدنیت ورد وشنی سے مستفید ومستنیر ہے، اگر قبل از اسلام کی عربون کی تواریخ بڑی تک بنی اسرائیل کی روایات وخرافات نیز یونانی تصورات کی حامل مانی جاتی ہے، تو اس سے بھی انکار نہین کیا جاسکتا، کہ عین بعد اسلام کی تاریخ بھی عجم (محض ایران) کی تاریخون کے پرتو سے نہ بچ سکی، چنانچہ اس مین بہت سے ایرانی خرافات اور ان کا لایعنی مواد شامل ہوگیا، دورحاضر کا فاضل بلند نظر مورخ رمزی ان کی خامیون اور کوتاہیون کو تسلیم کرتا ہوا، اپنی ضخیم الحجم، شدید التحقیق، واسع المعلومات تاریخ تلفیق الاخبار وتلقیح الآثار فی وقائع قزان وبلغار وملوک التتارین عذرخواہ ہے،

لا یخفی ان ھذہ الحوادث التی	پوشیدہ نہ رہے کہ یہ حادثے جن کو ہم
نذکرھا الآن منقولۃ عن التواریخ	اس وقت بیان کر رہے ہین، اسلامی
الاسلامیۃ التی اخذت من تواریخ	تاریخون سے نقل کئے گئے ہین، اور
الفرس کما استلقاہ ولا یخفی علی	اسلامی تاریخین فارسی تاریخون سے

من لہ ادنی الملام بفن التاریخ
ان الخرافات التی فی تواریخ
الفرس لا یوجد مثل ربعہا
فی تواریخ سائر الامم
(مجلد اول صفحہ ۲۸ مطبوعہ ادنبرگ)

بنی ہین، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے، اور جس
کو فنِ تاریخ مین ذرا سا بھی دخل ہوگا،
اُس پر کچھ چھپا نہین، کہ جس قدر بیہودہ
و پریشان باتین اہلِ فارس کی تاریخون
مین ہین، تمام قومون کی تاریخون کو
ملا کر ان کا چوتھائی حصہ بھی اُن
مین نہ ہوگا،

بہر صورت یہ راج ترنگنی عہدِ وسطیٰ کا تاریخی کارنامہ سمجھی جاتی ہے، اور کسی حد تک اُن لوگون کا منہ بند کر سکتی ہے، جو اگلے ہندوؤن کی تاریخ نویسی اور مہارتِ فن کے قائل ہین، اس کے غیر زبانون کے ترجمون مین کپتان انیتھونی ٹرائر (An Thony Troyer) کا فارسی ترجمہ اچھا سمجھا جاتا ہے، (گارسان دی تاسی کا پندرہوان خطبہ صفحہ ۵۰۶ مطبوعہ ۱۹۳۵ء) انگریزی مین بھی ترجمے ہو چکے ہین، پہلے مسٹر ولسن (Wilson) نے کیا تھا ایشیاٹک ریسرچیز، جلد پانزدہم مین شائع ہوا، (تمہید تاریخ راجستھان) پھر ڈاکٹر سراوریل اسٹائین (Sir M. Aurel Stein.) اپنا ترجمہ مع اپنے مقدمہ و تشریحات ضمیمون اور انڈیکس کے ۱۹(؟) سنہ مین دو جلدون مین طبع کرایا، یہ نامور فاضل وسط ایشیا اور ترکستان کا سیاح اور جہان گرد صاحبِ نظر تھا، اور بڑے اہتمام سے ایسے علمی کام کرتا تھا،

تصحیح و ترتیب جدید کے بعد اسی راج ترنگنی کا ترجمہ شگفتہ انداز سے ٹھاکر اچھر چند نے اردو مین کیا، مکمل راج ترنگنی کے نام سے بہ آسانی مل جاتا ہے، (مطبوعہ سیوک اسٹیم پریس لاہور سنہ ۱۹۱۲ء) زینہ کا ایک انگریزی ترجمہ "کنگز آف کشمیر" کے نام سے مسٹر جے سی دت نے فرمایا تھا،

۱۸۹۸ء مین طبع ہوا، پریاگ کی مردم آفرین زمین بھی فخر کرسکتی ہے، کہ اس کے ایک زبان دان اور انشاپرداز فرزند شری رنجیت پنڈت یعنی شریمتی وجے لکشمی کے نام آور شوہر کے قلم سے اس کے ترجمے نکل چکے ہین، ایک انگریزی کا، دوسرا ہندی کا، سنتا ہون دونون اصل سنسکرت سے کئے گئے ہین،

کرنیل ٹاڈ کی تاریخ راجستھان (مترجمۂ افق صفحہ ۱۰۰) سے واضح ہوتا ہے، کہ کوئی راج ترنگنی اور بھی ہے، جس کا نام راجاؤلی[۵] کے ساتھ لیا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے، کہ یہ تاریخین پنڈت دوّیادھر اور پنڈت رگھوناتھ کی تصنیف ہین، اور راجگان ہندان کو مستند مانتے ہین، یہ مہاراجہ جے سنگھ والیِ کشمیر کے پیش نظر حوالۂ قلم ہوئی تھین (اصل تاریخ انگریزی، ص ۴۴۲)

عذر، بھاکا اور سنسکرت کے نہ جاننے سے ہیچ مدان راقم سطور (مقبول) بعض نامون کو صحیح نہین لکھ سکا، جس کا افسوس ہے، انگریزی کتابون سے بھی پوری مدد نہیں ملی، کرنیل برگز (Briggs) کو بھی ایک شکایت تھی، کہ اگلے وقتون کے مسلمان مصنفین نے ہندؤن کے نامون کو ایسا بنا بگاڑ دیا تھا کہ سمجھ مین نہین آتے تھے، (راجستھان، جلد دوم مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۲۰۱)

بازآمد لیکن اکبر کے روبرو جو راج ترنگنی پیش کی گئی تھی، وہ یقیناً سنسکرت مین نہ تھی، بے شبہہ ہندی مین تھی، ابوالفضل لکھتا ہے :-

"چون رایات ہمایون بار اول دران بستان سرای ہمیشہ بہار برافراختہ آمد، کتابے بہ ہندی زبان راج ترنگنی نام بہ پیشگاہ حضور آوردند کہ احوال چہار ہزار سالہ کشمیر از مسند نشینان باز گوید، دران دیار رسم بود کہ پاسبانان ملک چندے از فرو ہیدہ مردم[۱]

---

۵ راجاولی، یہ کتاب بھی ڈاکٹر اسٹائن کے ذخیرۂ کتب و نوادر کے ساتھ آکسفورڈ مین موجود ہے، البتہ فہرست مندرجہ صفحہ ۰۰ ... مین مصنفین کے یہ نام نہین ملتے ہین،

بہ تاریخ نویسی برگماشتہ، شہریار آگہی جوئے زبان دانان ہشیار مغز را با ترجمۂ آن باز گماشت ودر کمتر زمانے حُسن انجام گرفت، (آئین اکبری، جلد دوم صفحہ ۱۸۱)

غالباً اسی ہندی کتاب کا ترجمہ اکبر کے حکم سے فارسی مین کیا گیا تھا،

"تاریخ کشمیر کہ احوال چہار ہزار سالۂ آن دیاراست، مولینا شاہ محمد شاہ آبادی[۱] از لغت کشمیر بزبان فارس برگذارد" (آئین جلد اوّل صفحہ ۶۶)

ترجمہ کا قصہ یہین تک پہنچکر ختم نہین ہوجاتا، مولوی محمد رضی الدین بسمل بدایونی اپنی نفیس تالیف تذکرۃ الواصلین (ص ۲۰۰) مین تحریر فرماتے ہین، کہ "انتخاب تاریخ کشمیری کا کسی قدر (؟) ترجمہ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے فارسی مین کیا تھا، اس کو بعبارت سلیس مولنا عبد القادر نے دوبارہ ترجمہ کیا" یہ عہد اکبری کے نہایت راست باز، راست گو مورخ اور نامور مترجم تھے، منتخب التواریخ یعنی تاریخ بدایونی، ترجمہ اتھربن ید، ترجمہ مہابھارت (موسوم بہ رزم نامہ) ترجمۂ رامائن، انتخاب جامع رشیدی، نجات الرشید وغیرہ مولانا ہی کے رشحات قلم کے منت پذیر ہین،

پنڈت دینا ناتھ مست، کشمیری فرماتے ہین، کہ مُلّا صاحب نے جس کتاب کا ترجمہ فارسی میں کرایا گیا تھا، وہ درحقیقت راج ترنگنی کا ضمیمہ تھا، (ہماری زبان، نمبر ۱۸، جلد دوم مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۲ء) یہان اس سے بحث نہین کہ وہ کون کتاب تھی، جس سے شاہ صاحب نے ترجمہ کیا تھا، بلکہ گفتگو اس کی زبان کے متعلق ہے،

ابو الفضل علامی ہم سے زیادہ ہندی اور سنسکرت زبانون کا فرق جانتا تھا، کشمیری کا

---

[۱] مولانا کا نام نامی آئین اکبری مین "دانش اندوزان جاوید دولت" کی جدول مین اکتالیسوین نمبر پر ہے، ص ۲۶۶، جلد اوّل،

بھی اچھا لغت شناس تھا، زیادہ نہ سہی، ان زبانوں مین سے ہر ایک کا صحیح نام جاننے اور لکھنے کی تمیز تو رکھتا تھا، اور درست نویسی و راست نگاری کی کوشش کرتا تھا،

تاریخ فرشتہ (مقالہ دہم، جلد دوم، ص ۴۴۴) مین تحریر ہے کہ

کتاب مہا بھارت کہ از کتب مشہورۂ ہنداست نیز فرمود "تا ترجمہ کردند، وکتاب راج ترنگنی، کہ عبارت از تاریخ بادشاہان کشمیر است، درعہد او (سلطان زین العابدین) تصنیف شدہ، و در زبان اکبرشاہ ترجمہ مہا بھارت راکہ بہد عبارت بود، بار دیگر بعبارت فصیح برآوردند و تاریخ کشمیر رانیز بہ فارسی ترجمہ کردند"۔

اس تفصیل وصراحت سے مولوی رضی الدین کے اجمال کی تائید ہوتی ہے،

جہانگیر اپنی سرگذشت مین اسی اکبری ترجمہ کا حوالہ دیتا ہے، اور اس کتاب کو راجہ ترنگ کی تاریخ لکھتا ہے،

بات سے بات نکلتی چلی آئی، اور بڑھ گئی، میرا مقصود صرف فارسی کی تاریخہائے کشمیر پر سرسری نگاہ ڈالنا ہے، ورنہ سنسکرت مین کشمیر کے متعلق بڑا ذخیرہ تواریخ فراہم ہے، بہتون کے نام مختلف طور پر مگر اس طرز سے رکھے گئے ہین، کہ راج ترنگنی، اصل نام کے ساتھ آخر مین کوئی لفظ یا جزو لفظ لگا دیا گیا ہے، اس طرح وہ سب کی سب راج ترنگنی سے منسوب ہو رہی ہین، ۱۹۱۲ء مین رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ان کی مکمل فہرست بشمول سنسکرت کی کثیر التعداد قلمی تاریخون اور متفرق کتابون کے شائع کی تھی، یہ فہرست مسٹر جیرارڈ کلاسن نے بڑی قابلیت، احتیاط و دماغ سوزی سے مرتب فرمائی تھی، نادر و نایاب کتابون کا یہ ذخیرہ جو ڈاکٹر اسٹاین کی قوت بازو اور زر خطیر سے فراہم ہوا تھا، اس وقت آکسفورڈ کے انڈین انسٹی ٹیوٹ مین موجود ہے، کیوریٹر صاحبان اس کی نگرانی و محافظت کے ذمہ دار ہین، (جرنل بابتہ جولائی ۱۹۱۲ء)

راج ترنگنی اور اس کے تراجم سے فی الحال دستکش ہوتا ہون،

قدامتِ زمانۂ تحریر اور سعی و اہتمامِ تحقیق دونون لحاظ سے سبقت و تقدیم کا سہرا شہنشاہ بابر کے سر ہے اسلئے مجھے سب سے پہلے (۱) تزک بابری کا نام اس عنوان کے نیچے لکھنا لازم ہے، جس کے ترجمہ کی نسبت ابھی کئی صفحے سیاہ کر چکا ہون، واقعاتِ بابری سے صرف وجہ تسمیہ کو مختصراً بتا دینا کافی ہے، بابر فرماتا ہے، کہ مین نے ہندوستان کے رہنے والون سے بہت کچھ تحقیق و تفتیش کی لیکن ان گروہا گروہ انسانون مین سے ایک بھی من لگتی بات نہ بتا سکا، بتایا تو یہ کہ اس پہاڑ کو لوگ کیس کہا کرتے ہین، میرے ذہن مین بھی جم گئی، اہلِ ہند شین کو سین بولا کرتے ہین، ان کا تلفظ ایسا ہی ہے، اس شہر مین پہاڑ سمیر کہلاتا ہے، اس لئے کوہ کیسا میر اچھا خاصا کشمیر بن گیا، اور اس پہاڑ کے لوگ کسیہ کہلانے لگے؛ (بابر نامۂ فارسی، ص ۱۹۰)

سمرقندی مسافر کی بات کو نہ تو مین نے جی لگا کر سنا نہ اچھی طرح میری سمجھ مین آئی، ساڑھے چارسو برس کی بوڑھی بات، وہ بھی معمولی، عصرِ حاضر کی زمین شگاف تحقیقات اور آسمان فرسا معلومات کے مقابلہ مین اس کی کیا پرسش یا وقعت ہو سکتی ہے، مگر اس کی قدر اس بنیاد پر کرتا ہون کہ یہ ایک ایسے شخص کے دماغ اور قلم سے نکلی ہے، جس کی ساری عمر یا تو گھوڑے کی پیٹھ پر گذری تھی یا میدانِ جنگ مین، اسی حال مین تلوار بھی ہاتھ مین رہی، وہ قلم بھی، شاہی تخت سے لیکر تابوت کے تختہ تک یکسان کاٹی،

میرا دعویٰ ہے کہ (۲) ملا قاسم ہندوشاہ کی تاریخ کا دسوان مقالہ بجائے خود کشمیر کی اس جنت نظیر سرزمین کے فرمانروایانِ دادگر کی ایک مستقل و مکمل تاریخ ہے، (۳) مرزا حیدر گورگانی نے بھی ایک تاریخ کشمیر لکھی تھی، وہ بھی اس کی نظر سے گذری تھی، اور فرشتہ نے باعتراف زیر لبی اس سے استفادہ کیا تھا، مرزا حیدر ترک تھا، اور ہمایون کا قریبی رشتہ دار، پہلے

ہمایون کی طرف سے کشمیر پر چڑھائی کی، فتح کیا، وہین کا والی ہوگیا، پھر شیر شاہی ہنگامے، اور ہمایون کی جلاوطنی سے خودمختار حکمران و تاجدار بن گیا، اوس نے چھوٹے بڑے تبت، راجوری، پگلی وغیرہ پر بھی قبضہ کرکے اپنے ممالکِ محروسہ مین شامل کرلیا تھا، دس سال کشمیر اس کے زیر نگین رہا، بے شبہہ ملا قاسم اس پر ایمان لے آیا تھا، اس کے اقوال و تحریرات کی صحت پر اعتماد رکھتا تھا وہ کہتا ہے کہ مرزا حیدر دوغلات نے یہان کے حالات، لطائف و غرائب تعمیرات، پھل پھول ہر ایک چیز کو چشم دید لکھا ہے، وہ جو کچھ لکھتا ہے، عین الیقین کی حیثیت سے سپرد قلم کرتا ہے، (ص ۱۰۸) یہ سب کچھ ہے، مگر مرزا کی کتاب کا نام وہ بھی نہین لیتا، یا بتا نہین سکتا، مرزا حیدر کے سوانح جو فرشتہ نے لکھے، اس مین بھی کتاب کی اسم نویسی سے قاصر رہا،

مسٹر بیل بھی اس کتاب کی بڑی تعریف کرتے، اور لکھتے ہین، کہ یہ ایک ایسی تاریخ کشمیر کی ہے، جو سب سے زیادہ مستند و معتبر ہے، جس کی مصنف نے اپنے زمانہ کے آخر تک کی تکمیل کردی تھی، حیدر ملک کا خطاب رئیس الملک چغتائی تھا، وہ شہنشاہ جہانگیر کا مقرب، درباری، اور رکن سلطنت تھا، ۱۰۲۸ھ (۱۶۱۹ء) مین شہنشاہ کے ہمرکاب کشمیر گیا تھا" (ڈکشنری ص ۱۰۰)

واقعاتِ کشمیر یا تاریخ اعظم کے ذیل مین مرزا حیدر اور اسکی تاریخ کا پھر ذکر آئے گا،

(۴) زین حرب نامی کتاب کا ذکر کرتا ہے، جو سلطان زین العابدین بادشاہ کشمیر (مذکور الصدر) کے حالات و سوانح مین بڑی شرح و بسط کے ساتھ لکھائی گئی تھی، (صفحہ ۴۴ فرشتہ مذکور) مجھ بے خبر کو، مگر یہ خبر نہیں کہ آیا یہ کتاب اب بھی صفحۂ ہستی پر باقی ہر یا فنا کا سیلاب اُسے بھی بہا لے گیا

(۵) وہ جس سے قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس مین التقاط (یا ڈر کر کہتا ہون) استفادہ فرمایا تھا، بفضلہ یہ نسخہ میرے وطن مالوف کے کتبخانہ مین محفوظ ہے، ناقص الطرفین ہے، پُرانی دفتین (دفتی یا پٹھے) پر کسی صاحب کی یادداشت (بظاہر پُرانی) ع.بی زبان، بے تکلف نسخ خط مین تیرہوین

کہ یہ تاریخ کشمیر قاضی صاحب کے زیرِ مطالعہ رہی ہے، کتاب کی زبان وانشار شاندار عالمانہ اوبیانہ ہے، جابجا رنگین ومقفی بھی، برمحل اشعار بھی پائے جاتے ہیں، خط نستعلیق ولایتی نہایت پاکیزہ، اوراق وحواشی پر ابری، نیز زرافشان، تقطیع متوسط کتابی، اول وآخر کے اجزار غائب ہیں، اس لئے وثوق کے قابل نہ کتاب کے نام کا پتہ چلتا ہے نہ حضرت مصنف کا، نہ زمانۂ کتابت معلوم ہوسکتا ہے، ممکن ہو کہ اسکی دریافت کیلئے موجودہ صفحات سے کچھ کچھ نقل کرکے بعض قدیم کتب خانوں کو بھیجا جائے تو وہاں تلاش ومطابقت سے کچھ سراغ چل سکے، مگر اس زحمت وتصدیع کو برداشت کون کریگا؟ اور کس لئے؟ ایک صفحہ کے حاشیہ پر کسی صاحبِ ذوق نے یہ "بیت" لکھ دی ہے،

یک قطعۂ بہشت ہے روئے زمین پر کشمیر جس کی سیر کے قابل زمین ہے

دواوین اور تذکروں کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شعر بھی پُرانا ہے، پنڈت لچھمی رام دہلوی کا، جو مرزا رفیع سودا کے شاگرد اور دولتِ آصفیہ دکن کے متوسل تھے، (مجموعۂ نغز، حصہ دوم ص ۲۷)

(۶) جہانگیر کشمیر پر مفتون وشیدا تھا، اُس نے کشمیر ہی کے راستہ میں جان بھی دی، اُس کے ایما سے حیدر ملک بن حسن ملک کشمیری نے اپنے وطن کی ایک تاریخ تصنیف کی تھی، جو کسی قدیم تاریخ کی تحریریات بلکہ زیادہ تر راج ترنگنی سے ماخوذ تھی، بظاہر مرزا حیدر والی تاریخ متذکرہ نمبر ۲ سے جدا چیز معلوم ہوتی ہے، اور بہت زمانہ بعد کی، نام اور املا کے خفیف اختلاف سے مغالطہ ممکن ہے،

(۷) پنڈت نارائن کول عاجز نے عارف خان صوبہ دار کشمیر کے عہد ۱۲۱۱ھ (۱۷۹۶ء) میں بربری دھربٹ کے ضمیمہ راج ترنگنی کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا، اس تتمہ کا ذکر کرچکا ہوں،

(۸) کشمیر کی ایک مبسوط تاریخ پنڈت ٹیکا رام کول فارسی میں لکھ رہے تھے کہ پیامِ اجل آپہنچا، اُسے تکمیل نہ کرسکے،

(۹) ایک تاریخ مولانا نادری کشمیری نے لکھی تھی، جس کا حوالہ منشی محمد اعظم نے دیا ہے (صفحہ ۱۰۰ ترجمہ) یہ صاحب شعرائے عہد میں سب سے زیادہ فصیح مانے جاتے تھے، ان کا درجہ مولانا احمد کشمیری کے عین بعد تھا،

ہمارے ملک کی بدنصیبی اور علوم مشرقی و تصانیفِ قدیمہ سے محرومی تبانے آئی ہی، کہ یہ کتابیں ضائع ہو چکیں، اگر کسی پرانے شریف گھرانے میں کوئی نسخہ باقی بھی ہوگا، تو ہم محروم لارث شامت زدون کی دسترس سے باہر ہے

(۱۰) تاریخ راجہا ئے جموں کا حوالہ اور نام، چند فارسی تاریخوں کے ساتھ ملتا ہے مگر کتاب نہیں ملتی نہ اسکی تفصیلات کی اطلاع ہی، معلوم نہیں کہ آیا اس میں صرف فرمانروایانِ جموں کا احوال تھا یا حاکمانِ کشمیر کا بھی

(۱۱) ایسی ہی میری دسترس سے باہر فانی کی تاریخ بھی ہے، فانی تخلص، شیخ محمد محسن نام تھا[۱] کشمیر کے باشندے تھے، نامور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں، نامورتر شاعر مرزا طاہر غنی کشمیری کے استاد تھے، شعرار کے تذکروں میں ان کے حالات سخنورانہ کمالات کیساتھ مندرج ملتے ہیں، افسوس ہے کہ ان کے دیگر علمی وادبی کارناموں کے بارہ میں وہ تذکرے خاموش ہیں، بحالیکہ مسٹر بیل ان کو "عمدہ مصنف" بتاتے ہیں[۲]، عہدِ شاہجہانی میں صوبہ الہ آباد کی صدارت پر سالہا سال ممتاز رہے تھے اور جب شاہ جہان کے ایک مغلوب مقابل نذر محمد خان والیِ بلخ کے یہان ان کا دیوان ۱۰۵۶ھ (۱۶۴۶ء) میں پکڑا گیا، جس میں اُسکے مدحیہ قصائد بھی تھے، تو زیرِ عتاب شاہی آگئے، ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے، تھوڑا سا آزوقہ البتہ مقرر ہو گیا، انھوں نے بقیہ زندگی اپنے وطن میں گذاردی ۱۰۸۱ھ (۱۶۷۰ء) میں پیوندِ خاک ہوئے[۳]، فانی کی غیر فانی حسن پرستی اور حریف مقابل ظفرخان ناظمِ کشمیر سے چوٹیں، اور بالآخر شکست دینے کا مذکور تذکروں میں موجود ہے[۴]، مثنوی مصدر الآثار فانی کی یادگار ہے،

ظفرخان، اسکی شاعری اور کشمیر کی مدح میں مثنوی کا ذکر اوپر کر چکا ہوں،

---

[۱] ترجمہ واقعاتِ کشمیر صفحہ ۴ [۲] ڈکشنری صفحات ۲۴ و ۱۰۶ و ۱۹۴ [۳] ایضاً صفحات ۸۶ و ۴۴ و ۱۹۱،

[۴] سروِ آزاد، ص ۱۰۳ و خزانۂ عامرہ ص ۱۱۱ و تذکرہ حسینی ص ۲۷۸ و مفتاح التواریخ ص ۱۱۴ و تاریخ الہ آباد ص ۲۸۷،

تلخیص و تبصرہ

خانانِ چغتائیہ

(سنہ ۶۲۴ھ ۱۲۲۷ء سے سنہ ۷۶۰ھ ۱۳۵۸ء تک)

چنگیز خان کے تین بیٹون یعنی اوکتائی، تولی اور جوجی نے جو خانیتیں قائم کین، انکے حالات ہم لکھ چکے ہین، اب چغتائی پسر چنگیز کے حالات جو باقی تھے، وہ تحریر کرتے ہین :-

چغتائی خان کو باپ کی طرف سے وہ قبائل ملے تھے، جو ماوراالنہر مین خانہ بدوش رہتے تھے (ماوراالنہر کو یورپ والے ترانس اوکسی آنا یا بخاریہ کہتے ہین) اس مین کاشغر، بدخشان، بلخ اور غزنہ کے علاقے بھی شامل تھے، چغتائی خان نے انہی علاقون اور ملکون مین اپنی خانیتین قائم کین، آلِ چغتائی کے حالات بہت کم ضبطِ تحریر مین آئے ہین، بجز اس کے کہ کبھی کبھی ایران کی سرحد پر چڑھائی کی یا اندرون خانہ نزاعات کئے کوئی اور بات جو قابلِ ذکر ہو نہین ملتی، چغتائی خان کی اولاد کی حکومت مین اوکتائی کے خاندان سے علی اور دانشمند جو دخل انداز ہوتے ہین، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اوکتائی خان خاندان کے سردار جو مرتبہ اور اقتدار مین بڑھے ہوئے تھے، سلطنتِ چغتائیہ مین دست اندازی کرتے ہین، خاقانِ چغتائیہ کے شجرۂ انساب اور زمانہ، کہ کس نے کب کب تک حکومت کی ہشتیہ ہین، اور ذیل مین جو فہرست خانون کی ہم دیتے ہین

وہ محض امتحاناً سمجھی جائے،

خاندانِ چغتائیہ کے خانان | چغتائی ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء، قرا ہلاگو ۶۳۹ھ/۱۲۴۲ء، یی سو منگو ۶۴۵ھ/۱۲۴۷ء، قرا ہلاگو (باردیگر) ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء، اور غانہ خاتون ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء، الگوخان ۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء، مبارک شاہ ۶۶۴ھ/۱۲۶۶ء، دوا خان ۶۷۲ھ/۱۲۷۴ء، قون جک خان ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء، تالیقو ۷۰۸ھ/۱۳۰۸ء، کیبک خان ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء، ییسون بوغا ۷۰۹ھ/۱۳۱۸ء، کیبک خان (باردیگر) ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء، ایلچی گدائی خان (باردیگر) ۷۲۱ھ/۱۳۲۱ء، دوا تیمور ۷۲۱ھ/۱۳۲۱ء، طرم شیرین خان ۷۲۲ھ/۱۳۲۲ء، سنجار خان ۷۳۰-۳۴ھ/۱۳۳۰-۳۴ء، جنگی شاہی ۷۳۴ھ/۱۳۳۴ء، بوزون ۷۳۵ھ/۱۳۳۵ء، ییسون تیمور ۷۳۹ھ/۱۳۳۹ء، علی (خاندان اوکتائی سے تھا) ۷۴۱ھ/۱۳۴۰ء، محمد خان ۷۴۳ھ/۱۳۴۲ء، کازان یا کزن ۷۴۳ھ/۱۳۴۳ء، دانشمند جہ (خاندان اوکتائی سے) ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء، بویان قلی ۷۴۹ھ/۱۳۴۸ء، سلطنت میں بدنظمی شروع ہوجاتی ہے، امیر تیمور گورگان کا ملک میں عمل دخل ہوجاتا ہے۔

چغتائی خان کا خاندان

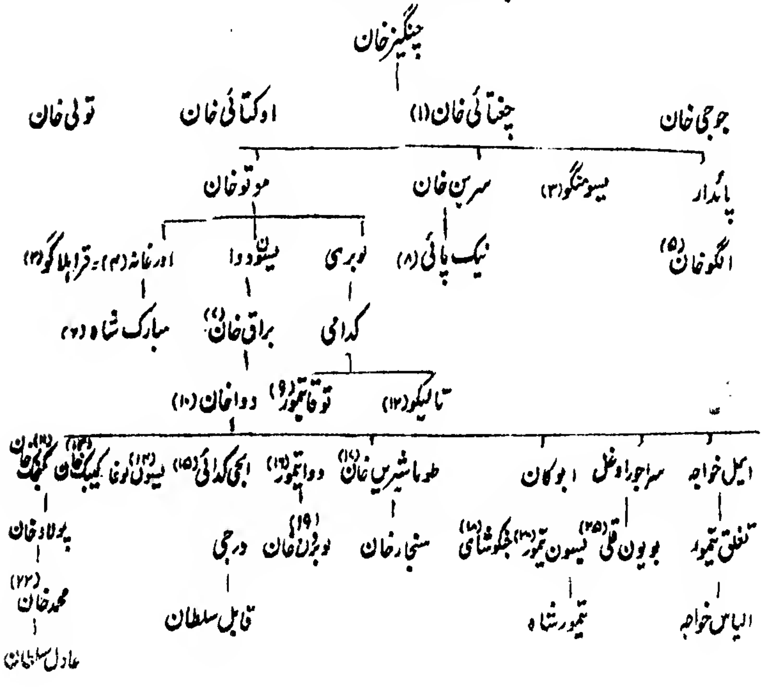

ایران کے مغل خانان

(۶۵۴ھ ۱۲۵۶ء سے ۷۵۰ھ ۱۳۲۹ء تک)

قراقورم مین منگو پسر تولی کا دور خاقانی تھا، کہ ملک ایران مین ہلاکو خان کی اولاد کو بادشاہی نصیب ہوگئی، اور اس طرح ایران مین مغلون کی سلطنت قائم ہوگئی، ایران کے ان مغل بادشاہون کو تاریخ مین ایلخان کہا جاتا ہے، (ایل خان کے معنی صوبہ کے خان کے ہین، اور یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے، کہ خاقان اعظم سے اس مین تمیز ہوسکے، ایل خان خاقان کا مطیع سمجھا جاتا تھا، گو یہ اطاعت بہت ہی خفیف ہوتی تھی) منگو خاقان نے جب ہلاکو اپنے بھائی کو ایران کا صوبہ دار بنا کر روانہ کیا، اور وہ ایران مین آیا تو اس ملک کو مطیع و محکوم کرنے مین اوسے زیادہ قباحت نہ ہوئی، وجہ یہ تھی کہ سلطان محمد علاء الدین خوارزم شاہ نے ایران کے بہترین حصون کو پہلے سے فتح کر رکھا تھا، اس کی وجہ سے ایران کی قوت بہت کچھ سلب ہوچکی تھی، چنگیز خان نے جب سلطان محمد خوارزم شاہ کو شکست دے دی، تو خوارزم مین وہان کے سرداروں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستین قائم کرلین، ہلاکو خان نے پہلے تو ان خود مختار سردارون کو محکوم و مطیع کیا، اس کے بعد وہ بغداد آیا، بغداد مین خلفائے بنی عباس کا آخری خلیفہ مستعصم باللہ سریر خلافت پر متمکن تھا، مگر پہلی سی شان و شوکت اب باقی نہ تھی، ہلاکو سے جو سب سے بڑے ظلم کا کام ہوا وہ یہ تھا، کہ اس نے اس خلیفہ کو بہت اذیت کے ساتھ ہلاک کردیا، غرض بغداد پر قبضہ کرکے جنوب کی طرف فتوحات کا سلسلہ جاری کیا، مگر ملک شام مین جب پہنچا تو مصر کے سلاطین مملوک نے اوس کے بڑھنے کو روک دیا، سلاطین مصر

ان دونون قوت وسطوت مین بہت بڑھے ہوئے تھے، انھون نے ہلاکو کو اپنے سے دور ہی رکھا، اس پر بھی ملک ایران کے تمام حصون اور ایشیاے کوچک پر پایہ سمجھئے، کہ ہندوستان کی سرحد سے لیکر بحر متوسط تک ہلاکو خان کا قبضہ ہوگیا، اب مشرق مین ہلاکو کی سلطنت چغتائی خان کی حکومت سے، شمال مین جوجی خان کی مملکت سے اور جنوب مین سلاطین مصر کے مقبوضات سے جا ملی، ان حدود کے اندر تقریبًا ایک صدی تک ہلاکو خان کی اولاد نے خود مختار بنکر حکومت کی، گو خفیف طور پر وہ خاقان چین کی اطاعت گذار رہی، بجز چند مواقع کے جبکہ جانشینی کے متعلق کوئی نزاع اٹھا، مغلون نے بڑے امن وامان کے ساتھ حکومت کی، اور تعریف کے قابل طریقون سے علوم وفنون کی ترقی مین انھون نے وہی نام پیدا کیا، جو ایلخانون سے قبل کے شاہانِ ایران نے پیدا کیا تھا،

آخر کار ہلاکو خان سے نوین ایل خان ابوسعید کے دور حکومت مین اس شاہی خاندان کو بھی وہی اسبابِ زوال پیش آئے جنھون نے اس سے پہلے خلفاے بنی عباس اور سلجوقیون کو تباہ کیا تھا، اور وہی اسبابِ زوال سلاطین مصر کو بھی پیش آکر انھیں تباہ کرین گے، وہ اسبابِ زوال کیا تھے، وزیرون امیرون سپہ سالارون کے آپس کے جھگڑے، متعصب لوگون کا دربار مین زیادہ رسوخ، غرض ان خرابیون نے حکومت کی جڑین کھوکھلی کردین، ان کے آپس کے رشک وحسد اور عداوتون نے ایلخانون کے لئے بڑے بڑے خطرے پیدا کردیئے، یہان تک کہ تختِ ایران انکے ہاتھ کا ایک کھیل بن گیا، جس کو چاہا تخت پر بٹھایا، اور جس کو چاہا معزول کیا، آج جو تخت پر بیٹھا، اوسے بیٹھتے ہی معلوم ہوا کہ تخت تو ٹوٹ کر گرنے کو ہے، دو امیر ایسے تھے جن کے گھرانون نے ایلخانون کی حکومت کو غارت کرکے چھوڑا، ان مین ایک گھرانا امیر چوپان کا تھا، جو غازان خان اور اس کے بعد کے ایلخانون کا منہ چڑھا سپہ سالار تھا، دوسرا گھرانا امیر حسین جلیر کا

تھا، یہ امیر حسین جلیر کے لقب سے پکارا جاتا تھا، ان دونوں امیروں میں یعنی امیر چوپان اور امیر حسین جلیر کا ایک ایک فرزند تھا، جس کا ایک ہی نام یعنی حسن تھا، دونوں میں تمیز کرنے کے لئے ایک کو حسن کوچک اور دوسرے کو شیخ حسن بزرگ کہتے تھے، ان دونوں کے اختیارات اتنے بڑھے کہ سب کو وہ محسوس ہونے لگے، ایلخان ابوسعید کے انتقال کے بعد اریا خان جس کا مورث اعلیٰ ہلاکو نہ تھا، بلکہ ہلاکو کا بھائی اریق بوقا تھا تخت ایران پر بٹھا دیا گیا، یہ واقعہ امیر شیخ حسن بزرگ کے باعث پیش آیا تھا، اس پر اس کے حریف حسن کوچک نے ابوسعید کی بہن ساتی بیگ یا ستی بیگ کو تخت نشین کیا، اریا خان ۱۳۳۶ء میں تخت پر بیٹھتے ہی اسی سال معزول کر دیا گیا، اور موسیٰ کو تخت نشین کیا گیا، یہ موسیٰ چھٹے ایلخان بایدو خان کی اولاد سے تھا، اب موسیٰ کو حسن بزرگ کے نامزد شخص کے لئے تخت کو خالی کرنا پڑا، اور حسن کوچک نے ستی بیگ کو تخت نشین کیا، ستی بیگ یا ساتی بیگ بہن تھی ابوسعید کی، پہلے یہ امیر چوپان کی بیوی تھی، پھر اریا خان سے اوس نے عقد نکاح کیا، اور آخر کار سلیمان سے اوس نے اپنی شادی کر لی، سلیمان نے ساتی بیگ کے کل اختیارات شاہی سلب کر لئے، اس کے بعد کچھ دنوں کے لئے نوشیروان تخت پر بیٹھا، اس کا زمانہ بدنظمی کا تھا، اور اب ہلاکو کی اولاد بھی ختم ہو چکی تھی، اب ایران کے مالک کبھی جلیر، کبھی مظفری کبھی سربداری ہوئے حتیٰ کہ امیر تیمور گورگان کا زمانہ آیا اور اوس نے ان سب کو یکلخت معدوم کر دیا،

ہلاکو کی اولاد سے ایلخانان ایران کے نام ہلاکو یا ہولاگو ۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء اباقا خان ۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء، احمد مغلی نام نکودار تھا، یہ مسلمان ہو گیا تھا، ۶۸۰ھ/۱۲۸۱ء، ارغون (مسلمان نہ تھا، مسلمانوں پر ظلم کئے) ۶۸۳ھ/۱۲۸۴ء، گاے ختو ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء، بایدو ۶۹۴ھ، غازان محمود ۶۹۴ھ/۱۲۹۵ء، الجائیتو (مسلمان تھا، اور اسلامی نام محمد خدابندہ تھا) ۷۰۳ھ/۱۳۰۴ء، ابوسعید ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء، اریا (ہلاکو کے بھائی اریق بوقا کی اولاد سے تھا) ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء، موسیٰ ۷۳۶ھ/۱۳۳۶ء، محمد ۷۳۶-۷۳۸ھ/۱۳۳۶-۱۳۳۸ء، تغا تیمور ۷۳۹-۷۵۲ھ/۱۳۳۸-۱۳۵۱ء، جہان تیمور ۷۳۹-۷۴۱ھ/۱۳۳۸-۱۳۵۱ء، ستی بیگ یا ساتی بیگ

۷۳۹، ۷۴۰ھ / ۱۳۳۹ء، سلیمان (ستی بیگ سے نکاح کرلیا) ۷۴۰، ۷۴۴ھ / ۱۳۳۹، ۱۳۴۴ء، نوشیروان ۷۴۵ھ / ۱۳۴۴ء،

شجرۂ ایلخانان ایران

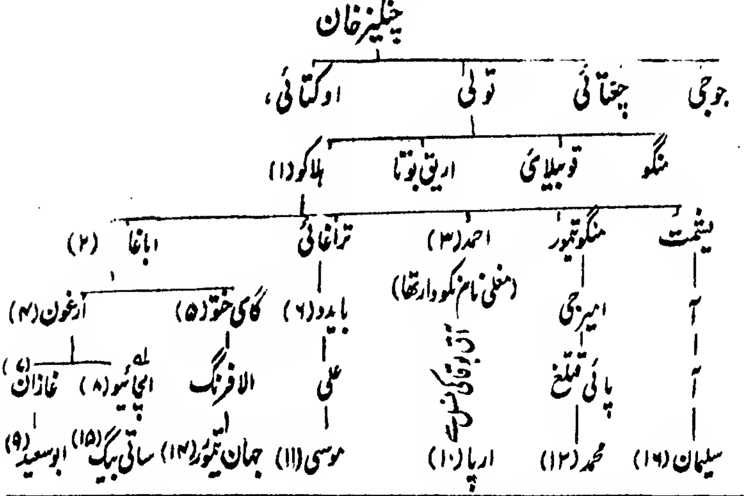

۷۰۵ھ مسلمان ہوگیا سلطان خدا بندہ نام ہوا،

نوٹ اس نقشہ مین نمبر ۱۳ کہیں مذکور نہین، غالباً اصل کتاب کے نقشہ مین کچھ غلطی رہ گئی ہے، (مترجم)

چنگیزخان

"تاتاریون کے پہلے باقاعدہ فرمانروا چنگیزخان کے حالات اور کارنامون پر ہیرلڈلیب کی محققانہ کتاب کا اردو ترجمہ، مصنف نے اس مین تاتاری و فرنگی و عربی و فارسی ماخذون سے اس عجیب وغریب بادشاہ کے حالات مرتب کئے ہین، جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ کیونکر اس وقت دنیا ے اسلام پر چھا جانے کا مستحق ہوا، ترجمہ کی صحت اور خوبی کیلئے مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے ناظم دارالترجمہ عثمانیہ کا نام نامی ضمانت ہے،

معارف پریس کی بہترین لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ، ضخامت ۲۴۲ صفحے قیمت: عہ/۲ر"

"مینجر"

اخبار علمیہ

عربی کی بعض نئی کتابیں

دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن کی علمی و دینی خدمات اہلِ قلم کی نگاہوں سے مخفی نہیں، ادھر چند مہینوں کے عرصہ میں اسنے بہت سی نئی اہم مطبوعات شائع کین، اور بعض زیرِ طبع ہین، شائع شدہ کتابون کے نام حسب ذیل ہین:

(۱) کتاب المنتظم ابن جوزی ساتوین جلد سے دسوین تک (۲) کتاب الافعال ابن القطاع (المتوفی ۵۱۵ھ) کی پہلی جلد (۳) اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن ابن الخالویہ (المتوفی ۳۷۰ھ) (۴) کتاب الاعتبار ابن حازم کا دوسرا اڈیشن (۵) الاشباہ والنظائر سیوطی کی پہلی جلد (۶) امام بخاری کی تاریخ کبیر کے چوتھے حصّہ کا نصف اول (۷) کتاب الکنی امام بخاری (۸) انباط المیاہ الخفیہ، حاسب کرخی (۹) رسائل نصیر الدین طوسی جلد دوم، اس مین حسب ذیل رسالے ہین: کتاب مانالاوس فن ریاضیات مین (ب) الرسالۃ الشافیہ، خطوط متوازیہ مین (ج) کتاب فی المطالع ہیئت مین (د) کتاب الطلوع والغروب،

مندرجۂ ذیل کتابین زیرِ طبع ہین:-

(۱) امام بخاری کی تاریخ کبیر چوتھی جلد کا دوسرا حصّہ (۲) الافعال ابن القطاع جلد دوم (۳) الاشباہ والنظائر سیوطی کی دوسری، تیسری اور چوتھی جلد،

حیدرآباد کے دوسرے قابلِ قدر ادارہ احیاء المعارف النعمانیہ کی طرف سے حسب ذیل کتابیں زیرِ اشاعت ہین،

(۱) کتاب الحج امام محمد شیبانی (۲) المختصر طحاوی (۳) مناقب الامام ابی حنیفۃ وصاحبیہ ذہبی (۴) مناقب ابی حنیفہ صیمری (۵) کتاب الآثار امام محمد (۶) شرح العتابی علی الزیادات (۷) شرح السرخسی علی زیادات الزیادات (۸) اصول الفقہ سرخسی،

گیس کی ہلاکت خیزی

جنگ مین استعمال کے لئے مختلف قسم کی گیسین ایجاد ہورہی ہین، مثلاً ایک گیس ایسی ایجاد ہوئی ہے جو رات کو فضا میں چھڑک دیجاتی ہے، اور جب اس پر آفتاب کی شعاعین پڑتی ہین، تو اس سے بم کی طرح دھماکے کی آواز پیدا ہوتی ہے، ایک دوسری قسم ایسی خطرناک ہے، کہ اس سے قلب کی حرکت یکایک بند ہوجاتی ہے، تیسری قسم ایسی ہے کہ جب وہ آبادی پر چھڑک دیجاتی ہے تو لوگوں کی آنکھون سے آنسو جاری ہوجاتے ہین بعض اوقات اس سے آنکھون کی روشنی بھی زائل ہوجاتی ہے گیس کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس سے چھینکین بکثرت آتی ہین،

جرمنون نے پہلی دفعہ ۱۹۱۵ء کی جنگ مین گیس استعمال کی، وہ کلورین کی ٹکیان بناکر مخالف فوجون کی خندق کی سمت ہوا مین اڑا دیتے تھے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا تھا، وہ اُڑکر انھی ہی کی طرف واپس آجاتی تھین، جس سے ان کو نقصان پہونچتا تھا، اس سے بچنے کے لئے انھون نے گیس کو بم مین بھر کر دشمنون کی طرف پھینکنا شروع کیا گیس کی ٹوپیان پہننے کے بعد کلورین کا زیادہ اثر نہیں پڑتا، اس لئے جرمنون نے Carbonyl

(mustard gas) کا استعمال شروع کیا، اور اوس سے زیادہ موثر رائی کی گیس (
.(Mustard gas) ہوتی ہے، اس کا استعمال جرمن کثرت سے کرتے ہین،
بعض اوقات انھون نے اتحادیون کی فوجون اور شہرون پر ایک رات مین اوس کے پچاس ہزار
گولے گرائے، خود اتحادیوں کا بیان ہے کہ اس گیس سے تین لاکھ پچاس ہزار
سپاہی ایسے بیکار ہوگئے تھے، کہ ان کو ہسپتال بھیجنے کی ضرورت ہوئی، مگر ان مین سے اکثر جلد
شفایاب ہوگئے، صرف دو فی صدی ضائع ہوئے، رائی کی گیس اب تک بہت ہی مہلک
سمجھی جاتی ہے، لیکن ممالک متحدہ امریکہ کے ایک موجد نے لیوسائٹ گیس نکالی ہے، جو اس
سے بھی زیادہ مہلک ہوگی، گو ابھی تک اس کا تجربہ نہیں ہوا ہے، جنگ مین اب تک گیس کا
بہت زیادہ استعمال نہین ہے، اسکی بڑی وجہ یہ ہے، کہ اس کے استعمال مین کثیر رقم خرچ
ہوتی ہے، جس سے مالیات پر بہت بار پڑتا ہے، اس کے مقابلہ مین بم اور گولے سستے ہین،
گیس کی ٹوپی پہن لینے کے بعد آدمی زہریلی گیس کی مضرتون سے محفوظ ہوجاتا ہے،
عام طور سے زہریلی گیس سے بچنے کے لئے ناریل کے کوئلے، سوڈا لائم اور پوٹاشیم پرمگنیٹ
بہت مفید ثابت ہوئے ہین، گیس کو اب "موت کی شبنم" بھی کہنے لگے ہین، بعض گیس کے بم ایسے
بھی ہین جو کھیتون کی فصل کے لئے بہت ہی مضر ہوتے ہین، اس بم کے موجد انگریز ہین،
لیکن گذشتہ اور موجودہ جنگ مین جرمنون نے اس کا استعمال کثرت سے کیا ہے، اس قسم
کے بم جب کھیتون مین گرتے ہین، تو ان کا پتہ مشکل سے چلتا ہے، لیکن بم کے گرنے
کے بعد کھیتون کی فصل بالکل برباد ہوجاتی ہے، پختہ عمارتون کو مسمار کرنے کے لئے بم مین
لوہے کے اجزا بھر دیئے جاتے ہین، جاپانیون کے پاس اس قسم کے بم بکثرت ہین،

"ص ع"

ادبیات

عہد حاضر کے نوجوانانِ اسلام

از جناب یحییٰ اعظمی

یہ مانا اے عزیزو حکمت آموز جہان تم ہو
علوم عصر کے آئین شناس و نکتہ دان تم ہو

نگاہوں میں ہے مستی نشۂ صہبائے دانش کی
خمارِ بادۂ علم و ہنر سے سرگران تم ہو

رگوں میں ہے تمھاری جوئے خون زندگی جاری
خدا کا شکر ہے سرتاقدم ارباب جان تم ہو

حیاتِ تازہ طوفان خیز ہے ہر قطرۂ خون میں
خدا رکھے ادائیں کہہ رہی ہیں نوجوان تم ہو

یہ مانا سرو رعنا ہو شکوہ و سربلندی کے
یہ مانا آئینہ دار وقار و عز و شان تم ہو

یہ سب کچھ ہے بجا لیکن خدارا یہ تو فرماؤ
کہ بزمِ دہر میں کس کی چراغِ دودمان تم ہو

بتادو یہ کہ کس کے نونہالانِ چمن تم ہو
یہ فرمادو کہ کس گلزار کی سروِ روان تم ہو

کہاں تم جادہ پیما ہو کہاں منزل تمھاری ہے
تمھیں کچھ ہوش بھی ہے کس کی گرد کاروان تم ہو

اگر پاسِ شرف ہے کچھ تو پہچانو مقام اپنا
تمھیں احساس ہے اس بزم ہستی میں کہاں تم ہو

وراثت تم نے پائی ہے سلف کے نام نامی کی
خبر بھی ہے جہان میں یادگار باستان تم ہو

رگ و پے میں تمھارے اب بھی جنکا خون جاری ہے
انھیں اسلاف کی سرمایہ دار عز و شان تم ہو

مگر اے دوستو اک بات تم سے پوچھتا میں ہوں
بزرگانِ سلف کی آج کیا شایانِ شان تم ہو

یقین ہے یہ اگر اس دور میں اسلاف جی اٹھیں
نہ مانیں یہ کہ ان کے ہی چراغِ دودمان تم ہو

خردمندو! کبھی کچھ غور بھی اس پر کیا تم نے
کہ کیوں یوں پائمالِ انقلابِ آسمان تم ہو

سبب کیا ہے تمھیں اب دہر میں جینا نہیں آتا
مگر ناواقفِ رازِ حیاتِ جاوداں تم ہو

جو مسلم ہو تو مسلم کا طریقِ زندگی سیکھو،
وہی رخشندگی سیکھو، وہی تابندگی سیکھو

بس اتنا ربط ہے اب ملتِ اسلام سے تمکو
کہ تھوڑا سا تعلق رہ گیا ہے نام سے تم کو

تمھاری زندگی میں ولولے اسکے نہیں باقی
ہے بیزاری خدا کے آخری پیغام سے تم کو

کہاں اب وہ سرور و انبساط و کیفِ روحانی
خدا کے نام سے تمکو نبی کے نام سے تم کو

زبانوں پر ہے کلمہ حکمت آموزانِ مغرب کا
عقیدت اب کہاں پیغمبر اسلام سے تم کو

تمھیں ہو ذوق کیونکر شرعی علم و معارف سے
شغف سا ہو رہا ہے مغربی اوہام سے تم کو

تمھارے واسطے تہذیبِ حاضر مایۂ نازش
اگر ہے عار تو بس سنتِ اسلام سے تم کو

تعلق جس قدر ہے تم کو تفریحی مشاغل سے
نہیں اتنی بھی نسبت دین کے احکام سے تم کو

خدا کا حکم مانو دین کی خدمت بجا لاؤ،
بھلا فرصت کہاں اتنی دلِ خودکام سے تم کو

تمھیں کیا دینِ حق گر صفحۂ ہستی سے مٹ جائے
تن آسانی سے مطلب، واسطہ آرام سے تم کو

کبھی جوشِ عمل کا ولولہ پیدا نہیں ہوتا
گلہ گردوں سے شکوہ گردشِ ایام سے تم کو

رہوگے یونہی محوِ خوابِ غفلت تا بکے آخر
سبق ملتا ہے کچھ بیداریِ اقوام سے تم کو

زمانہ کے حوادث تم کو کچھ پیغام دیتے ہیں
نیا درسِ عمل لینا ہے صبح و شام سے تم کو

خبر بھی ہے، کہ ہے مدت سے دنیائے عمل سونی
اٹھانا ہے نیا اک حشر ہر اک گام سے تم کو

اٹھو پھر از سرِ نو دہر میں ہنگامہ آرا ہو
نئے جوشِ عمل سے نوجوانو! جادہ پیما ہو

باب التقریظ والانتقاد

تذکرۂ نصرآبادی

تذکرۂ شعرائے فارسی، مؤلفہ میرزا محمد طاہر نصرآبادی مطبوعہ ایران، چاپخانہ ارمغان طہران، ضخامت ۵۵ صفحے، ٹائپ، قیمت ۴۰ ریال، ملنے کا پتہ:- کتابخانہ دانش نمبر ۶ پوسٹ بکس کلکتہ،

ایران مین فارسی کی جو نئی کتابین ہر سال شائع ہوتی ہین، ان مین سے ایک میرزا محمد طاہر نصرآبادی کا تذکرۂ شعراء ہے، میرزا محمد طاہر کا وطن نصرآباد تھا جو اصفہان کے متعلقات مین ہے، اور اب تک یہ قصبہ آباد ہے، اور پانچ چھ ہزار نفوس کی آبادی ہے، میرزا محمد طاہر ۱۰۲۷ھ مین پیدا ہوا، ۵۶ برس کی عمر مین ۱۰۸۳ھ مین یہ تذکرہ لکھا، اور اسی صدی کے آخر مین شاہ سلیمان صفوی کے عہد مین وفات پاگیا،

اُس کا یہ تذکرہ تقریباً اکیزار معاصر شعرا کے نام اور کلام پر مشتمل ہے، کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس مین ایران کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کو بھی جگہ دی گئی ہے،

کتاب کے مضامین کا مختصر خلاصہ یہ ہے:-

مقدمہ معاصر صفوی بادشاہ اور شاہزادے،

۱- ایران کے امرا اور مقربان شاہی،

۲- ہندوستان کے امرا و مقربان شاہی،

۳- وزراء اور عمالِ دفاتر،

۴ - سادات اور شرفا،

۵ - علما، و فضلاء

۶ - خوشنویس،

۷ - فقراء اور درویش،

۸ - عام شعراے عراق و خراسان،

۹ - شعراے ماوراء النہر،

۱۰ - شعراے ہندوستان،

۱۱ - مصنف کا خاندان،

خاتمہ چیستان معما اور پہیلیون پر ہے، جن کا سمجھنا اور سمجھانا آسان نہین، اسی سلسلہ مین بعض ابجدی تاریخین لکھی ہین جن مین کوئی خاص صنعت ہے،

مصنف نے مقدمہ مین لکھا ہے کہ عوفی، دولت شاہ اور سامی کے تذکرون کو دیکھکر اُس کو یہ خیال ہوا کہ وہ بھی اپنے زمانہ کے شعراء کا یہ تذکرہ ترتیب دے، افسوس ہے کہ تذکرہ مین حالات کا حصہ بہت ہی کم ہے، بلکہ گویا نہین ہے، سنین کا ذکر کہین نہین، البتہ اشعار کا انتخاب اچھا ہے، اس لئے ایک عمدہ بیاض سے زیادہ اس کی حیثیت نہین، تاہم ضمناً صفویون کے متعلق کوئی واقعہ یا اسی قسم کی باتین ریزہ چینی سے ہاتھ آسکتی ہین،

ہندوستان پر اس مین دو باب ہین، پہلا باب یہان کے سخنور اور سخن سنج امراء پر ہے اور دوسرا اوس کے عہد کے ہندوستان کے عام فارسی شعراء پر جن کا نام اور کلام ایران تک پہنچا، پہلے مین میرزا جعفر مشہور بہ آصف خان وزیر جہانگیر کا نام پہلا ہے، جعفری اس کا تخلص بتایا ہے، مثنوی خسرو شیرین اسی کی تصنیف ہے، نصرآبادی کا بیان ہے، کہ نظامی کے بعد کسی نے ایسی خسرو شیرین

کے قصہ مین اس پایہ کی مثنوی نہیں لکھی، اس مثنوی کے بہت سے اشعار درج کئے ہین، پھر اوسکی غزلون کے کچھ اشعار لکھے ہین،

دوسرا نام میرزا راجہ (راجہ جے سنگھ کچھواہہ؟) کا ہی جس کو شاہجہان کا خالو کہکر تعارف کرایا ہے، اس کا ایک ہی شعر لکھا ہی، مگر خوب ہی،

بہار گشت دگر، فکرِ میگساران چیست | من از صلاح گذشتم صلاحِ یاران چیست

چوتھا نام عبدالرحیم خانخانان کا ہی، ان کی مشہور غزل چند است اور بند است کے چند شعر نقل کئے ہین، اور تین چار اور شعر دیئے ہین،

پھر میر جملہ، ظفر خان خلف خواجہ ابو الحسن، میرزا امان اللہ خلف مہابت خان، ملا شاہ، میر دارا شکوہ، جہان آرا بیگم کا نام بھی لکھا ہی، اور اُن پر چوٹ کی ہے، اسی سلسلہ مین اپنے دادا میرزا صادق کا نام دیا ہی، اور مختصر حال لکھا ہی، وہ شاہ شجاع کے ساتھ بنگال مین رہا تھا، اسی تقریب سے بنگال کی برسات کی تعریف میں اوسکی مثنوی کے چند شعر دیئے ہین، جس مین اوس نے بنگال مین اپنے ایک معرکہ کا حال لکھا ہی،

خوشا ملک بنگالہ در برشگال | سوادش بہ روے زمین ہمچو خال
زمین پر ز آب و ہوا پُر ز میغ | نہان آب در سبزہ چون آب میغ
سپہ ابر پیوستہ در ہاے ہوے | تو گوئی بلا لیست تکبیر گوے
ز کوہ آبشار آنچنان ریختہ | تو گوئی فلک کہکشان ریختہ

ص ۴۴۴ سے ص ۴۵۶ تک معاصر شعراے ہند کا تذکرہ ہے، اسمین پہلا نام شیدا کا ہی، دوسرا غنی کشمیری کا، اسی سلسلہ مین حیدر علی خان کشمیری، فانی کشمیری ندیم کشمیری، طاہر کشمیری فنائی کشمیری، محمد عارف لاہوری، مائل دہلوی، ملا لطف اللہ کشمیری، ملا افضل سرخوش لاہوری، اور عبد القادر بیدل کے نام اور کلام کو جگہ دی ہی، (بیدل کی جگہ بیدلی چھپ گیا ہی) اور ان کو لاہوری بتایا ہی، "س"

مطبوعات جدیدہ

مطلع سعدین و مجمع بحرین حصہ دوم جزو اول کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی تقطیع بڑی ضخامت ۷۵۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۵ر

پتہ:- شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور،

مطلع سعدین ایران اور اس کے ہمجوار ملکون کی آٹھوین اور نوین صدی ہجری کی نہایت مستند تاریخ ہی، اس کا مصنف کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی اپنے عہد کا نامور فاضل تھا، سلطان شاہرخ کے زمانہ سے لیکر سلطان ابوسعید مرزا کے زمانہ تک آلِ تیمور کے دربار سے وابستہ رہا، اس نادر کتاب کے دو حصے ہین، پہلے حصہ مین ۷۰۴ھ سے ۸۰۷ھ تک ایک صدی کے حالات ہین، دوسرا حصہ ۸۰۷ھ سی ۸۷۵ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہی، مصنف کا عہد ۸۱۶ھ سے ۸۰۷ھ تک ہی، اس لئے دوسرے حصہ کے حالات بڑی حد تک چشم دید واقعات کی حیثیت رکھتے ہین پہلا حصہ بھی معتبر تاریخون سے ماخوذ ہے، اس لئے یہ کتاب اس دور کی مستند ترین تاریخون مین ہے، اس کے قلمی نسخے یورپ کے مختلف کتبخانون مین ہین، فاضل محقق مولوی محمد شفیع صاحب پرنسپل اورنٹل کالج لاہور نے مختلف نسخون سے تصحیح و مقابلہ کرکے مفید حواشی و تعلیقات کے ساتھ اس اہم کتاب کی دوسری جلد کا پہلا حصہ جسمین ۸۳۳ھ تک کے حالات ہین شائع کیا ہے، مقابلہ و تصحیح سے محنت اور دیدہ ریزی نمایان ہے، حواشی و تعلیقات مین کثیر التعداد فارسی اور انگریزی کتابون سے مدد لیگئی ہے، جس سے کتاب کے مباحث پر جا بجا مفید روشنی پڑتی ہی، آخر مین ترکی اور مغلی الفاظ کا فرہنگ بھی دیدیا ہے، اس

کتاب کی اشاعت سے ایران اور اس کے ملحقہ ممالک کی تاریخ میں ایک اہم ماخذ کا اضافہ ہوا امید ہے کہ فاضل محترم اس کے بقیہ حصہ سے بھی جلد اہلِ علم کو استفادہ کا موقع دین گے،

کتاب العلم جزو اول مرتبہ جناب محمد سعید بیگ صاحب و محمد اسمٰعیل نعیم صاحب تقطیع بڑی، ضخامت ۱۵۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت نفیس، قیمت ۱۲؍ پتہ:۔ ایسٹرن پبلشنگ اسٹیشنری لمیٹڈ نیم بلڈنگ ۲۳ ب اڈورڈ روڈ لاہور،

اردو دائرۃ المعارف کی تالیف کا خیال عرصہ سے اہلِ علم کے دماغون مین ہی لیکن اب تک عملی جامہ نہ پہن سکا، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد نے اس اہم کام کی طرف قدم بڑھایا ہے اور اس کے باہمت کارکنون سے اوسکی تکمیل کی امید ہے، دائرۃ المعارف تو بڑی چیز ہے، اردو مین کوئی ایسی کتاب بھی موجود نہین ہے جس مین یک آنت ناریخ، کے طریقہ پر اختصار کے ساتھ مختلف قسم کے ضروری معلومات جمع کر دیئے گئے ہون، ایسٹرن پبلشنگ کمپنی لاہور نے کتاب العلم کے نام سے یہ پہلی کتاب شائع کی ہے، اس حصہ میں بیس مختلف موضوعون مثلاً معدنیات، حیاتیات، اقتصادیات، فنونِ لطیفہ وغیرہ پر مختصر معلومات ہین، ترتیب حروفِ تہجی کے بجاے فنون پر ہے، گو دائرۃ المعارف کے معیار سے یہ کتاب بہت پست ہے لیکن اردو مین یہ بھی غنیمت ہے اور بقیہ حصون کی تکمیل کے لئے حوصلہ افزائی کی مستحق ہے، اس سے کم از کم عام معلومات کی ایک کتاب اردو مین ہو جائیگی، کتاب کی ظاہری نفاست اور تصویرون نے اسکی دلچسپی مین اضافہ کر دیا ہے،

بہائی تحریک پر تبصرہ از ابو العطاء صاحب جالندھری تقطیع بڑی ضخامت ۱۵۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت معلوم نہین، پتہ بیت العطاء، قادیان،

اس طرف آخری دور مین مسلمانوں کی جانب منسوب جو فرقے پیدا ہوئے، ان مین سب سے

زیادہ گمراہ بلکہ مخالف اسلام بابی اور بہائی فرقے ہین، اورون نے تو ستر حال کے لئے اپنے چہرے پر کسی نہ کسی نوع کی نقاب ڈالے رکھی ہے لیکن ان دونون کا چہرہ بالکل بے نقاب ہی، اس کے باوجود بہتیرے خوش خیال مسلمان انھین اسلام ہی کا ایک فرقہ تصور کرتے ہین، ہندوستان مین ان کے حریف یا رقیب قادیانی ہین، چنانچہ ابوالعطار صاحب قادیانی نے اس کتاب مین خود بہائی لٹریچر اور ان کی کتابون سے اس تحریک کی تاریخ اور اس کے عقائد پر تبصرہ کرکے اسکی گمراہیون کو آشکارا کیا ہے، بہائیون کی کتاب "اقدس" کا عربی متن بھی مع ترجمہ کے دیدیا ہے، کتاب مفید اور دلچسپ ہے لیکن لائق مصنف اپنے فرقہ کی تبلیغ سے نہین چوکے ہین، اور جہان موقع ملا ہے اپنے نبی کی نبوت کا ثبوت بھی دیتے گئے ہین، نسخ آیات کے بارہ مین بھی انھون نے اپنے عقیدہ کی ترجمانی کی ہے،

ہندوستانی کھیل مرتبہ جناب خواجہ الطاف علی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، اور اسکی شاخین لاہور لکھنؤ بمبئی نمبر ۳

بچون اور نوجوانون کی جسمانی نشو و نما کے لئے ورزشی کھیل بہت ضروری چیز ہے، جناب خواجہ الطاف علی صاحب نگران تربیت جسمانی جامعہ نے جنھین اس کا عملی تجربہ ہے، اس کتاب مین کئی سو دلچسپ ورزشی کھیلون کے طریقے بتائے ہین، اور تصویرون سے ان کی تشریح بھی کردی ہی، کتاب کے شروع مین ورزش کی اہمیت اور اس کے اصول و قواعد پر ایک مقدمہ ہے، آخر مین صحت کا چارٹ بھی دیدیا ہی، یہ کتاب بچون کے لئے مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی، ورزش جسمانی کے اساتذہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہین،

سلیس اردو مرتبہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ :- انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن،

انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن نے بالغون کی تعلیم کے لئے ایسی اردو ریڈرون کا سلسلہ شروع کیا ہو جس مین زبان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ پڑھنے والون کے معلومات مین اضافہ کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، اس کا پہلا حصہ آسان اردو کے نام سے پہلے شائع ہو چکا ہو، سلیس اردو اس کا دوسرا حصہ ہو، اس مین ممتاز اہلِ قلم کے آسان معلوماتی مضامین، اخلاقی کہانیان اور مفید نظمین جمع کردی گئی ہین، اخلاقی کہانیان بہت اچھی ہین، گو یہ رسالہ بالغون کے لئے لکھا گیا ہے، لیکن نابالغون کے لئے بھی ویسا ہی مفید ہے،

منتخب داغ حصہ اول و دوم، جناب احسن مارہروی مرحوم، تقطیع بڑی ضخامت ۴۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد صر پتہ:- مطبع انوار احمدی الہ آباد،

متقدمین مین میر اور متاخرین مین داغ کا کلام اتنا صاف سادہ اور سلیس ہو کہ اس کا بڑا حصہ معمولی خواندہ بھی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہین، داغ کے شاگرد رشید جناب احسن مارہروی مرحوم نے ان کے کلام سے ایک ایسا انتخاب کیا تھا، جو فارسی عطف و اضافت سے خالی ہو، لیکن ان کی زندگی مین اس کی اشاعت کی نوبت نہین آئی، ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادہ جناب سعید مارہروی نے اس کو شائع کیا ہے، انتخاب کے شروع مین مولف مرحوم کے مختصر حالات اور ان کے قلم کا لکھا ہوا مقدمہ ہے، جس مین داغ کی شاعری پر مختصر تبصرہ اور اس پر جو اعتراضات کئے جاتے ہین، اس کے جوابات ہین، اس کے بعد ۴۰۰ صفحون مین اصل انتخاب ہے، انتخاب متفرق اشعار کا نہین ہو، بلکہ پوری پوری غزلین ہین، اس سے داغ کے کلام کی سادگی اور سلاست کا ثبوت ملتا ہو، دوسرے حصہ مین بے عطف و اضافت کے اشعار کا التزام نہین ہو اسلئے حسنِ انتخاب کے اعتبار سے یہ حصہ پہلے سے بہتر ہے، یہ انتخاب ان معترضین کا مسکت جواب ہو، جو اردو شاعری کے تمام سرمایہ کو فارسی کا مثنیٰ سمجھتے ہین، "م"

جلد ۴۹ ماہ صفر المظفر ۱۳۶۲ھ مطابق ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء عدد ۳

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی،	۱۶۲ - ۱۶۴
قرآن اور سیرت سازی،	ڈاکٹر میر ولی الدین پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن،	۱۶۵ - ۱۸۹
یاد پاستان	جناب مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی	۱۹۰ - ۲۰۶
خاکی	جناب غلام مصطفیٰ خانصاحب ایم اے ایل ایل بی علیگ لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی،	۲۰۷ - ۲۰۹
امام غزالی غیروں کی نظروں میں	"ص ع"	۲۲۰ - ۲۲۴
پولینڈ کے مسلمان،	"	۲۲۵ - ۲۲۶
اخبار علمیہ،	"	۲۲۶ - ۲۲۹
رسالوں کے سالنامے اور خاص نمبر،	"م"	۲۳۰ - ۲۳۶
مطبوعات جدیدہ،	"	۲۳۶ - ۲۴۰

لغات جدیدہ

چار ہزار جدید عربی الفاظ کی ڈکشنری یعنی لغت مع ضمیمہ، ۱۲ "منیجر"

شذرات

عربی مصنفین کی تصنیفات اور عربی علوم وفنون کی کتابوں کی سب سے بڑی اور مستند فہرست کا نام کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون ہے جو حاجی خلیفہ چلپی دسویں صدی ہجری کے ایک ترک عالم کی تصنیف ہے، یہ کتاب یورپ میں اور قسطنطنیہ میں پہلے چھپ چکی ہے، اور عربی کتابوں کے محققین اور اصحابِ ذوق کے مطالعہ میں متداول ہے لیکن افسوس ہے کہ یورپ اور قسطنطنیہ میں جو نسخہ چھپا تھا وہ غلط بھی تھا اور ناقص بھی، خوش قسمتی سے قسطنطنیہ ہی میں اس کا دوسرا کامل اور صحیح نسخہ اب دستیاب ہوگیا ہے، جس میں "دال" تک کا حصّہ خود مصنف کے قلم کا مبیضہ ہے، اور باقی کے لئے مصنف کا مسودہ سامنے رکھا گیا ہے،

ترکی میں جب سے عربی حروف موقوف ہوئے ہیں، کسی عربی کتاب کی اشاعت کا موقع کم ہوگیا ہے، ان ہی کم موقعوں میں سے کشف الظنون کے اس نسخہ کی اشاعت ہے، محمد شرف الدین یالتقایا استاذ جامعۂ استنبول اور پروفیسر رفعت بیگ الکلیسی نے بڑی محنت سے اس جدید نسخہ کو مرتب کیا ہے، اور اس کی پہلی جلد جو حرف "ذ" پر ختم ہوتی ہے، اور جس کے ۷۰۰ صفحے اور ۱۴۰۹ کالم ہیں، چھپ کر ہندوستان آگئی ہے، قلمی نسخہ کے چند صفحوں کے فوٹو، مصنف کے حالات کے ۱۸ صفحے اور مقدمہ احوال العلوم کے ۵۰ صفحات شامل ہیں، نہایت عمدہ چھپائی کے ساتھ عمدہ کاغذ پر چھپی ہے، اہل علم کے لئے اس جدید نسخہ کی اشاعت نوید بشارت ہے، بقیہ دو جلدیں زیر طبع ہیں، اس بارہ میں خط وکتابت شرف الدین الکتبی واولادہٗ نمبر ۲۶ محمد علی روڈ بمبئی ۳ سے کی جائے،

جناب مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کے انگریزی ترجمۂ قرآن مجید کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے، تاج کمپنی لاہور نے اب اس کا اشتہار اور نمونہ کے دو صفحے چھاپے ہیں، امید کہ وہ حضرات جو قرآن پاک کو تاویل و تحریف کے بغیر اس کو اس کی اصلی اسپرٹ میں پڑھنے کے شائق ہیں وہ اپنی درخواست تاج کمپنی کو (پوسٹ بکس ۲۵۲ ریلوے روڈ لاہور کے پتہ سے) جلد از جلد روانہ کریں گے، غالباً یہ ایک ایک پارہ کی صورت میں شائع ہو، اور ہر پارہ کی قیمت عامہ ہوگی، جو کاغذ کی موجودہ گرانی کے زمانہ میں اعتراض کے قابل نہیں،

کتاب رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہندی ترجمہ اس وقت الہ آباد میں ایک ہندی انشا پرداز کی نظر ثانی کے اندر ہے، اس کے واپس آنے کے ساتھ انشاء اللہ اس کی چھپائی شروع ہوجائے گی، مسلمانوں کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ احمد آباد میں ایک ہندو خاتون دن مالا بہن نے جو زہری بھائی پریکھ گاندھی آشرم کے سکریٹری کی بڑی لڑکی ہیں، خود اپنے ذاتی شوق سے اس کا ترجمہ اردو سے گجراتی زبان میں کیا ہے، جو اب زیر طبع ہے،

اس کی بھی خوشی ہے کہ اب وہ اسلامیہ اسکولوں اور مکتبوں کے درس میں بھی شامل ہو رہی ہو سرکار نظام کے محکمۂ تعلیمات نے اپنے ہائی اسکولوں اور کالجوں میں اس کی خریداری کی ہدایت کی ہے، امید ہے کہ بہت جلد اس کے دوسرے اڈیشن کی ضرورت پیش آئے گی،

جناب مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو کا کام جس تندہی، محنت اور جانفشانی سے کر رہے ہیں اس کے لئے ہر اردو بولنے والا ان کا ممنون ہے، اس عمر میں پورے ہندوستان میں جس طرح وہ دورے

کرتے ہیں، لوگوں سے ملتے ہیں، تجویزیں سوچتے ہیں، اُن کو عمل میں لاتے ہیں وہ سب پر ظاہر ہے، انھوں نے ادھر چند برسوں میں اس کی کوشش کی ہو کہ انجمن کی بنیاد کو اس طرح پائدار بنا دیں کہ آیندہ بھی وہ مضبوطی کے ساتھ کام کرتی رہے، اسی غرض سے وہ انجمن کے لئے دلی میں ایک مستقل عمارت بنوانا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں اپنے دوستوں سے قریباً بیس ہزار روپیہ جمع کئے ہیں،

لیکن لوگوں کو یہ سُنکر اور بھی خوشی ہوگی کہ موصوف اردو کی خدمت صرف قدمے اور قلمے نہیں کر رہے ہیں، بلکہ درمے بھی انجام دے رہے ہیں، چنانچہ موصوف نے انجمن کو ابھی پچاس ہزار روپئے کی کثیر رقم اپنی ذاتی ملک سے ہبہ کی ہے، مسلمانوں میں غالباً اپنی نوعیت کی یہ پہلی مثال ہے کہ کسی قومی خادم یا علمی خدمتگذار نے اپنی جسمانی و مادی خدمتوں کے ساتھ اتنی بڑی مالی اعانت کی توفیق پائی ہو، شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ موصوف نے جو زن و فرزند کا جھگڑا نہیں پالتے، عمر بھر کی اپنی ساری کمائی اپنی متبنّی اولاد انجمن ترقی اردو کے حوالہ کردی ہے، ہم موصوف کو ان کی اس جوانمردانہ سخاوت پر مبارکباد دیتے ہیں،

ادارۂ **معارف اسلامیہ** لاہور کا جو اجلاس دارالمصنفین اور طلباے قدیم ندوۃ العلمار کی دعوت پر ۱۷-۱۸-۱۹ مارچ ۱۹۴۲ء کو لکھنؤ میں ہو رہا تھا وہ بعض وجوہ سے ملتوی کردیا گیا ہے،

مقالات

قرآن اور سیرت سازی

از ڈاکٹر میر ولی الدین پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

(یہ مقالہ حیدر آباد اکاڈیمی میں پڑھا گیا تھا)

شہ نیست کسے کہ تخت عاجے دارد ۔۔۔ تا آنکہ نہ شاہانہ مزاجے دارد
یعنے کہ خروس پیش ارباب شعور ۔۔۔ سلطان نشود اگرچہ تاجے دارد (درد)

دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت شے، سب سے زیادہ گران قدر اور عزیز شے پاک سیرت ہے! زندگی تربیت گاہ ہے، حق تعالیٰ مربی و معلم ہیں، واقعات، حادثات، آلات و ادوات ہیں جن کے ذریعہ وہ ہماری سیرت کی تکمیل کر رہے ہیں، دنیا کی "روح ساز" وادی میں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت ہی کے خفتہ نغمے بیدار کئے جاتے ہیں، زندگی کی غایت ہی یہ نظر آتی ہے کہ سیرت کو سنوارا جائے، پختہ کیا جائے، کامل بنایا جائے، کیوں؟ اس لئے کہ سیرت ہی پر دنیوی کامیابی کا انحصار ہے، سیرت ہی پر فوز آخرت کا مدار ہے، دین و دنیا کی اصلاح سیرت ہی کی اصلاح سے ہو سکتی ہے، سیرت ہی پر جسمانی اور روحانی صحت مبنی ہوتی ہے، اور بردقلبی اور طمانیت خاطر پاک سیرت ہی کا نتیجہ ہے! بنی آدم کا "اکرام" سیرت ہی کی پاکی کی وجہ سے ہوتا ہے، جو انسان پاک سیرت نہیں، وہ صورۃً گو انسان ہے، لیکن حقیقۃً وہ حیوان ہے!

یا دیو ہے یا غول ہے، "شیاطین الانس" میں اس کا شمار ہے، وہ دنیا، دین اور آخرت کی حقیقی اقدار سے محروم ہے!

سیرت، علماے نفسیات کی باریک بین اور دوررس نگاہ میں، ان تیقنات، عادات و میلانات کا مجموعہ ہے، جو فرد کے کردار کی رہنمائی کرتا ہے، اس کو دوسروں سے متمیز کرتا ہے، اور اسکی وحدت کردار کا باعث ہے، ہر فرد دوسرے فرد سے متمیز ہوتا ہے، صورت میں اور سیرت میں، صورت کی غیریت تو حقیقی واقعی ہوتی ہے، یہ رفع نہیں کیجا سکتی، اور نہ کوئی اسکو رفع کرنا چاہتا ہے، لیکن سیرت میں ایک قسم کی مماثلت ہوسکتی ہے، یہ مماثلت عینیت نہیں، انفرادیت ناقابلِ انکار ہے، باوجود مماثلت کے انفرادیت موجود ہوتی ہے، اور اس انفرادیت کا مبدا اس کے وہ اقتضاءات و قابلیات ہیں، جو اپنا ظہور عادات و افعال میں کرتے ہیں، اور اس تمام مجموعہ کو ہم نفسیات کی اصطلاح میں سیرت سے تعبیر کرتے ہیں، سیرت افعال میں وحدت پیدا کرتی ہے، اور سیرت کے کامل علم کے بعد بڑی حد تک فرد کے افعال کی پیشین گوئی ممکن ہوجاتی ہے،

سیرت کی تحلیل میں ہمیں اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے، کہ یہ عادات کی تنظیم کا نام ہے، عادت کی تشکیل افعال کی تکرار سے ہوتی ہے، افعال کا صدور بظاہر محرکات پر مبنی ہوتا ہے، لیکن محرکات کا ماخذ و منبع وہ تیقنات و اذعانات ہوتے ہیں، جو انسان زندگی کے تجربات، ماحول کے اثرات، تعلیم اور دوسرے ذرائع سے حاصل کرتا ہے، علم و یقین، عمل و عادت یہ وہ اہم عناصر ہیں، جن میں سیرت کی تحلیل کیجا سکتی ہے، سیرت سازی کے طریقہ کو جاننے کے لئے ہمیں ان ہی عناصر کی تحقیق کرنی ہوگی،

(۱) علم و یقین: اَلعِلمُ نُکتَۃٌ، سیرت سازی کے لئے صرف ایک نکتہ کا وجدانی اجمالی علم کافی ہے، پھر عقلی طور پر اسکی تفصیل و توضیح میں دفاتر رنگے جاسکتے ہیں

دل گفت مرا علم لدنی ہوس است تعلیم کن گرت بدین دسترس است
گفتم کہ الف، دگر گفتم ہیچ در خانہ اگر کس است یکحرف بس است

(شیخ عزالدین محمود الکاشی)

وہ وجدانی علم، علم لدنی، حق تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار ہے، اسی اقرار کی مضبوط چٹان پر سیرت کی مشیدٔ عمارت تعمیر کیجاسکتی ہے، اس اقرار کے تضمنات پر غور کرو: جب مین ایمان و اذعان کی شاہانہ قوت سے حق تعالیٰ کے الٰہ ہونے کا اقرار کرتا ہون تو سب سے پہلے مین یہ مان رہا ہون کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہین، وہی عبادت یا پرستش کے قابل ہین، عبادت کیا ہے، یہ غایتِ تذلل کا نام ہے، اظہارِ ذلت کا نام ہے، میرا یہ سر اگر جھک سکتا ہے، تو بس میرے خالق، میرے مولیٰ، میرے مالک و حاکم ہی کے سامنے جھک سکتا ہے، اور غیر کے سامنے ہرگز نہین جھک سکتا! اظہار ذلت کی وجہ کیا ہے؟ مین فقیر ہون، محتاج ہون، میرا معبود غنی ہے، قوت و اقتدار سے متصف ہے، علم و حکمت سے موصوف ہے، رب ہے، پالنے والا ہے، مستعان ہے، مدد کرنے والا ہے، استعانت ہی کی خاطر میں اس کے سامنے اظہارِ ذلت کرتا ہون اور جانتا ہون کہ سارا عالم فقیر ہے، اور میرا معبود ہی صرف غنی و حمید ہے، میں اس کا فقیر ہوکر سارے عالم سے غنی ہون، میرا یہ احساس کہ مین اُس شہنشاہ کا دریوزہ گر ہون، جس کے دریوزہ گر سارے شاہ و گدا ہین، مجھے سارے عالم سے بے نیاز کر دیتا ہے، اور مین کفی باللہ وکیلا کہکر عبادت و استعانت کے نقطۂ نظر سے ماسوی اللہ سے کٹ جاتا ہون، اور فقر و ذلت پابندگی کی نسبت اللہ ہی سے جوڑ لیتا ہون، اب کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی میرے نہ امیدون کا مرکز بن سکتی ہے، اور نہ خوف و ہراس کا سبب، ان سب کا فقر ان سب کی ذلت و مجبوری، بیچارگی و بے بسی میری نظرون مین اتنی ہی آشکارا و ہویدا ہو جاتی ہے، جتنی کہ

خود میری بیکسی و مجبوری، ہم سب عبد ہین، کوئی چیز اصالۃً ہماری نہین، فقر ہماری ذاتی صفت ہے، امانتہً چند روز کے لئے چند چیزین ہم کو دی جاتی ہین، نادانی سے ہم ان کو اپنی سمجھتے ہین حقیقی مالک کو بھول جاتے ہین، انہی کی محبت مین فریفتہ ہو جاتے ہین حقیقی اقدار سے غافل ہو جاتے ہین، ناگہان یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہی، اور یہ ساری محبوب و مرغوب چیزین موت ہم سے چھین لیتی ہی، اور پھر اپنے اصلی فقر و ذلت کے ساتھ ہم نادم و پشیمان اس جہان سے رخصت ہو جاتے ہین تاکہ اپنے اعمال کے اثرات کو، اپنے افعال کے نتائج کو، اپنے کردار کے اثمار و عواقب کو جو اس دنیا مین بھی اپنی موجودگی کا مختلف رنگون مین ہمین احساس بخش رہے تھے، زیادہ نمایان، زیادہ واضح اور اجاگر طریقے سے دیکھین، اور حسرت و ندامت کی آگ مین جلین!

سیرت کی تعمیر اسی اساسی یقین پر ہوتی ہے، کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہین جن کے آگے یہ میرا سر جو ساری جہان کے مقابلہ مین معزز و مفتخر، بلند و بالا ہے، فقیرانہ شان سے جھک رہا ہے، اور حیات و علم، رزق و فراخی، صحت و عزت، ہدایت و رشد کی استدعا کر رہا ہی، اور غیر متزلزل یقین کے ساتھ کر رہا ہے، کہ جو اس کی آنکھ چاہے جو تماشا دکھلائے، اور وہم چاہے جو مانے اور منوائے، یہ ساری نعمتین حق تعالیٰ ہی دے سکتے ہین اور دیتے ہین، ان کے سوا نہ کسی مین حول و قوت ہی، اور نہ فعل و اثر، ﴿وما بکم من نعمۃ فمن اللہ﴾ صورتون سے جو ہم نے امیدین باندھ رکھی ہین، صورتون کو جو ہم نے خوف کی چیزین سمجھ رکھی ہین، صورتون کے سامنے جو ہم ذلت کا اظہار کر رہے ہین، اور صورتون کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہین، اور ان کو رب بنا رکھا ہے، یہ کس قدر عظیم الشان دھوکا ہے، اس کے ضرر و اضلال کا پہلو کس قدر قوی ہی، عزت نفس کی خونریزی کو دیکھو، اپنی ذلت و رسوائی کو دیکھو، اس کذب و افترا کے نتائج پر غور کرو، فقیرون کے در پر سوال کرنے سے بھی کچھ ملا ہے، اس غریب کے ہان کیا رکھا ہی جو

دوسرون کو دے، امیدون کا خون ہونا لازمی ہے، حسرت وحرمان قطعی، جو بیچارہ اپنے درد دکھ کو دفع نہ کرسکتا ہو، وہ تمھارے درد وغم کا کیا علاج کرسکتا ہے، وہ تمھارا مولیٰ و رب کیسے ہوسکتا ہے، ہائے تم نے حقیقت کو چھوڑ کر سایہ کا تعاقب شروع کردیا ہے بیدار کو چھوڑ کر مدہوش سے التجا کررہے ہو، زندے کو چھوڑ کر مردے سے لپٹے ہوے ہو تمھارے وہم نے تمھیں کس التباس میں مبتلا کررکھا ہے!

بقولِ دشمن پیانِ دوست بشکستی
ببین کہ از کہ بریدی وباکہ پیوستی!

معبود و مستعان صرف حق تعالیٰ ہی ہین، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی سے ہمین جوڑنا چاہئے، وہی ہماری امیدون کے مرکز ہین، ان ہی کی ناراضی سے ہمین خوف کرنا چاہئے ان چوب و سنگ یا گوشت و پوست کے جھوٹے خداؤن سے بندگی کی نسبت قطعاً توڑ لینی چاہئے ان سے نفع وضرر کی توقع قطعاً چھوڑ دینی چاہئے،

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی
بگذر از خدائے کہ بصد رنگ تراشی!

حق تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت پر یہ یقین، یہ ایمان، سیرت کا سنگ بنیاد ہے، اسی یقین کی پرورش ہونی چاہئے، آلہہ باطلہ کی نفی، الٰہِ حق کا اثبات قلب کی گہرائیون مین متمکن ہوجائے تحت الشعور نفس مین جاگزین ہو، رگون مین خون کی طرح دوڑ جائے، علم الیقین کے مرتبہ سے گزر کر حق الیقین کے درجہ تک پہونچ جائے، متحقق ہوجائے تو پھر ایسی شخصیت کی تخلیق ہوتی ہے جس کا مقابلہ کائنات کی کوئی قوت نہین کرسکتی، وہ بفحوائے تخلقوا باخلاق اللہ خلقِ الٰہی سے مزیّن ہوتا ہے، تمام صفات رذیلہ سے پاک اور تمام اوصافِ حمیدہ سے آراستہ

پیراستہ ہوتا ہے، کامل عبد ہوتا ہے جس سے بہتر، جس سے زیادہ مقدس دنیا مین کوئی شئے نہین ہوتی !

توحید معبودیت کی رو سے حق تعالیٰ ہی مالک و حاکم قرار پاتے ہین، اور مستحق عبادت ٹھہرتے ہین، ہمارا سر حقیقی مالک و حاکم ہی کے سامنے جھکتا ہے، جس کے آگے ساری کائنات سرنگون ہے، طوعاً و کرہاً اور توحید ربوبیت کی رو سے حقیقی فاعل حق تعالیٰ ہی قرار پاتے ہین، وہی خالق ہین، وہی نافع و ضار ہین، وہی زندہ کرتے ہین اور مارتے ہین، ہمارا ہاتھ ان ہی کے آگے دراز ہوتا ہے، اور انہی سے ہم مدد و اعانت کیلئے درخواست کرتے ہین، غنی کی فقیری ہمین ساری کائنات سے بے نیاز اور غنی کر دیتی ہے، !

دیکھو توحید معبودیت و ربوبیت کا سبق دیکر عرب کے امی معلم (فداہ ابی و امی) نے اپنے متبعین کو صفات رذیلہ سے کس طرح پاک اور صفات حمیدہ سے کس طرح مزین کر دیا تھا، صفات رذیلہ جس سے تمام علمائے اخلاق قلوب کا تزکیہ چاہتے ہین، اس رباعی مین یون ادا کئے گئے ہین :-

خواہی کہ دلت شود صاف چو آئینہ ده چیز برون کن از درون سینہ
حرص و حسد و بخل و حرام و غیبت کذب و غضب و کبر و ریا و کینہ

دیکھو ان صفات قبیحہ سے قلب کا تزکیہ سقراط کے "طنزیات" افلاطون کے "مکالمات"، ارسطو کے "اخلاقیات" اور جدید فلسفیون کے عالمانہ "خطبات" کے بغیر پڑھے اور سمجھے صرف لا الٰہ الا اللہ کے مختصر جملہ کو ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے کس آسانی سے ہو جاتا ہے!

جب تک انسان دولت کو اپنی ملک سمجھتا ہے، خود ہی کو اس کا مالک جانتا ہے، نہ حرص کا اس کے قلب پر تسلط اٹھ سکتا ہے اور نہ بخل و حسد کا، جون ہی اوس نے سچے دل سے توحیدی

کا اقرار کیا، اور یہ مان لیا کہ لہ مافی السماوات ومافی الارض ومابینھما اللہ ہی کے لئے ہے سارے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے، تو اس نے اپنی مالکیت وحاکمیت کی نفی کی اور حق تعالیٰ کی مالکیت وحاکمیت کا اثبات کیا، حقیقی مالک و حاکم و متصرف حق تعالیٰ کو جانا، اور اپنی ذات کو محض "امین" سمجھا، آپ اسکی سمجھ میں یہ بھی آگیا کہ حقیقی مالک ہی کو تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، امین امانت کی شرائط کے تحت ہی تصرف کا اختیار رکھتا ہے، اگر دولت پر جو اس وقت اس کی امانت میں ہے، کوئی آفت آجاتی ہے، تو وہ بحیثیت امین اس کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے، اگر بچ نہ سکے، تو جانتا ہے، کہ مالک حقیقی امانت کا استرداد چاہتا ہے، اور بخوشی وہ اپنی امانت حوالہ کر دیتا ہے، اس طرح نہ اس کے جانے کا اس کو رنج ہوتا ہے، اور نہ اس کے آنے کی خوشی، اور اس کا قلب ان اختلال پیدا کرنے والے تاثرات سے پاک اور آزاد رہتا ہے، اور وہ ع: "یک دل داری بس است یک دوست ترا" کہہ کر حق تعالیٰ ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، اور ایک دم رنج و غم، پریشانی و پشیمانی کے تمام احساسات و جذبات سے حقیقی معنی میں نجات حاصل کر لیتا ہے، ایسے ہی خوش قسمت کی ذہنیت کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے،

لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا	تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ نہ آیا اور شیخی نہ کرو
بِمَا اٰتٰکُمْ، (پ ۲۷ ع ۱۹)	اس پر جو تم کو اس نے دیا،

ان اصول کو سمجھ لینے کے بعد غور کرو کہ وہ شخص حریص کیسے ہو سکتا ہے، جو مال و دولت کا حقیقی مالک حق تعالیٰ کو سمجھتا ہے، اور ان احمقوں کو جو اپنے ذات کو مالک سمجھ رہے ہیں مخاطب کر کے کہتا ہے،

گمان مبر کہ زر و سیم دادہ اند ترا ... ودیعتے است کہ داری بدست و زر چند
چہ سود گر بشوی غرہ بر متاع کسے ... چو موش بر سر دکان روستا خرسند!

حرص کے ساتھ بخل وحسد کی بھی جڑیں کٹ جاتی ہیں، جب مال و دولت ودیعت و امانت ہیں، اور وہ بھی چند روزہ امانت، موت کے وقت یہ ہم سے واپس لے لی جاتی ہے، اور دوسروں کے حوالہ کیجاتی ہے، تو پھر اس علم کے بعد ہماری ذہنیت اس چوہیا کی طرح کیسے رہ سکتی ہے، جو بنیے کی دوکان کی ساری چیزوں کو اپنی سمجھتی ہے، اور اپنے ہی کو مالک ومتصرف جان کر بخل وحرص کا شکار بنتی ہے، غیر کے مال میں بخل بے معنی ہے، بخل ہوتا ہے اپنے مال میں، مال اپنا نہیں، پھر بخل کیسا؟ حرص کی بنیاد ہی اس خیال پر قائم ہے کہ مالک ہم ہیں، حقدار ہم ہیں، ہم کو نہیں مل رہا ہے دوسروں کو مل رہا ہے، ہم کو کیوں نہ ملے! جب مال میرا ہے نہ تیرا بلکہ مالک حقیقی کا تو حسد کس پر؟ حسد، حرص اور ان کے لازمی نتائج ہم وغم، درد وحزن، رنج والم نتیجہ ہیں خیانت فی الامانت کا، یعنی شرک کا، جوں ہی شرک کی جڑیں قلب سے لاالہ الا اللہ کے ذریعہ اکھاڑ کر پھینک دی گئیں اور اس کی بجائے توحید جلوہ افروز ہوگئی، انسان ان تباہ کن جذبات کے چنگل سے نجات پاجاتا ہے حقیقی آزادی کا لطف اٹھاتا ہے، سکون و برد قلبی کی دولت سے سرفراز کیا جاتا ہے!

کبر و فخر وعجب کی اس قلب میں گنجایش ہی کہاں جو اپنے کو حاکم نہیں محکوم، مالک نہیں مملوک، رب نہیں مربوب، مولی نہیں عبد سمجھتا ہو، اپنی محکومیت ومملوکیت کا یقین جو موحد کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے، فخر وغرور کے جذبات کو پیدا ہونے نہیں دیتا، اسکی عضویت اس زہر کو قبول کرنیکی صلاحیت یا استعداد ہی نہیں رکھتی،

اب توحید فی الربوبیت کے قیام کے آثار پر غور کرو، جب تم نے فاعل حقیقی حق تعالیٰ کو مان لیا، لاحول ولاقوۃ الا باللہ کے قائل ہوگئے، نافع وضار فی الحقیقت انہی کو سمجھنے لگے، تو خوف وحزن سے تم نے رستگاری حاصل کرلی، غیر کو نافع وضار قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم کو اس سے نفع پہونچنے کی امید ہوتی ہے، اور اس امید کی شکست حزن وغم کو ضروری طور پر

پیدا کرتی ہی، اس سے ضرر کا اندیشہ تمھارے سینہ کو خوف سے بھر دیتا ہے، جونہی تم نے وہم کے اس بت کو توڑا، اور حق تعالیٰ کی اس تنبیہ کو یاد کیا، کہ

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ	اللہ کے سوا کسی کو مت پکارا یسے کو نہ
وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا	بھلا کرے تیرا اور نہ بُرا، پھر اگر تو ایسا
مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ. (پ۱۱ ع ۱۶)	کرے، تو تو ہو جائے گا ظالمون مین

غیر اللہ کی ربوبیت تمھارے قلب سے فنا ہو گئی، نفع کی امید، ضرر کا خوف تمھارے سینہ سے جاتا رہا، اور حزن و خوف سے تم نے ہمیشہ کے لئے نجات پالی،

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا	مقرر جنھون نے کہا کہ رب ہمارا اللہ
فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ	ہے، پھر ثابت قدم رہے، تو نہ ڈر ہی
(پ۲۶ ع ۲)	ان پر اور نہ وہ غمگین ہون گے،

ربوبیت پر جہان تم نے استقامت پیدا کر لی کہ دنیا اور زندگی کے متعلق تمھارا سارا نقطۂ نظر بدل گیا، نقطۂ نظر کا بدلنا تھا، کہ زمین و آسمان بدل گئے، ؎

چون برخیزد خیال از چشم احول   زمین و آسمان گردد مبدل

ایک وہم تھا خیال تھا، جس نے تمھین خوف و حزن کی زنجیرون مین جکڑ رکھا تھا، اب تم نے اس خیال کی تصحیح کی، ذہنی صحت تمھیں حاصل ہوئی، نور کی طرف تم نے اپنا منہ کر لیا، اور تمھاری روح اپنے خالق و حاکم کو مخاطب کرکے چیخ اٹھی،

اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِيْ اِلَيْكَ وَ	اور مین نے اپنی جان تیرے سپرد کی اپنا
وَجَّهْتُ وَجْهِيْ اِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ	منہ تیری طرف کیا، اپنے کام تیرے حوالہ
اَمْرِيْ اِلَيْكَ وَاَلْجَاْتُ ظَهْرِيْ	کئے، اپنی پیٹھ تیرے سامنے جھکائی تیرے

الیك رغبۃً ورهبۃً الیك — فضل کی امید میں اور تیری ناراضی سے
لا ملجاء ولا منجاء منك — ڈر کر، میری پناہ اور نجات کا مرکز
الا الیك"[1] — تو ہی ہے"!

اس اقرار ربوبیت کے ساتھ ہی، تم نے اپنے قلب میں طمانیت وراحت محسوس کی، اعتماد ویقین نے خفتہ قوتوں کو جگایا، سارا عالم تمھیں نفع وضرر سے خالی تمھارے ساتھ تعاون عمل کے لئے تیار، تمھارا رفیق وخادم نظر آنے لگا؛ زندگی کے راستہ میں تمھارے قدم بے باک انداز میں اٹھنے لگے، تمھارا سینہ کینہ سے پاک ہوگیا، کیونکہ تمھارا یہ وہم دور ہوگیا، کہ سوائے حق تعالیٰ کے ضرر اور نقصان پہنچانے والا درحقیقت دوسرا کوئی ہوسکتا ہے، جو اس کی آنکھ جس کو دشمن بے رحم دیکھ رہی تھی، ایمان کی آنکھ اس کو حق تعالیٰ کا فرستادہ بتلا رہی ہے، اور سعدیؒ کے پُراثر الفاظ میں کہہ رہی ہے،

چون دشمن بے رحم فرستادۂ اوست — بدعہدم اگر نہ دارم این دشمن دوست

اسی وقت غیظ وغضب سے بھی تمھارا نفس پاک ہوگیا، دوست پر غضب کیسا؟ اس یقین کے بعد کہ ہر آفت ہر مصیبت سیرت کے کسی نقص کو رفع کرنے آتی ہے معلم حقیقی کی طرف سے ایک تنبیہ ہے، جو ہمیں اپنے نقائص وذمائم کی طرف متوجہ کرتی ہے، ان کی اصلاح کا موقع دیتی ہے، ہم کو ظلمت سے نکالتی اور نور کی طرف ہمارا رخ پھیر دیتی ہے، حق تعالیٰ سے جوڑتی اور نفس وشیطان سے توڑتی ہے؛ ہاں پھر اس یقین واذعان کے بعد ہمارا سینہ غیظ وغضب کا محل کیسے بن سکتا ہے۔؟!

---

[1] یہ اس حدیث کے الفاظ ہیں جو صحاح ستہ میں موجود ہے، رواہ الجماعۃ عن البراء بن عازب، رسول اللہ صلعم سوتے وقت آخری چیز یہ پڑھتے تھے،

ریا جو خلق کے لئے اپنے اعمال کی تزئین ہے، اسی وقت ممکن ہو جب خلق کو نافع و ضار سمجھا جائے، خلق سے توقعات وابستہ ہون، یا ضرر کا اندیشہ ہو، اس وہم کے دور ہو جانیکے ساتھ ہی ریا کاری اور تصنع و نمایش کی جڑین کٹ جاتی ہین، عمل صرف حق تعالیٰ ہی کے لئے جاری ہو جاتا ہے، حور و قصور کے لئے نہین رہتا، کیونکہ یہ بھی مخلوق ہین، اور مخلوق سے نہ راحت ہو اور نہ سرور و عزت اور نہ یہ مقصود بالذات!

کذب یا دروغ بافی کا محرک یا تو نفع کا حصول ہوتا ہے، یا ضرر کے دفع کا خیال، یا پھر خود بینی و خودستائی، کبر و فخر، عجب و ریا، ہم نے اوپر دیکھا کہ ربوبیت حق ان صفات ذمیمہ کا استیصال کس خوبی سے کر سکتی ہے، اسی لئے موحد کا قلب صداقت کا خزینہ ہوتا ہے، وہ وعدون کا پکا، قول کا سچا ہوتا ہے، "والموفون بعهدهم اذا عاهدوا"[1] کا مصداق،

اسی طرح غیبت شرک فی الربوبیت کا نتیجہ ہے، غیبت کی وجہ یا تو عداوت ہوتی ہے جس کا محرک نقصان و ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے، یا حسد یا محض کذب سے حاصل ہونے والی شیطانی لذت، ربوبیت کا صحیح علم اور اوس پر یقین ان تمام ذمائم کی بے خطا دوا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر ثابت کیا، غیر اللہ کو حقیقی نافع و ضار قرار دے کر عداوت و بغض و حسد مین مبتلا ہون، اور غیبت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، خود آفریدہ التباس کو صحت علمی نے دفع کر دیا اور ان ذمائم کی گرفت سے قلب کو نجات ملی!

غرض تزکیہ نفس و تصفیہ قلب یعنی سیرت سازی کے لئے سب سے پہلے شرک فی المعبودیت اور شرک فی الربوبیت کی بیخ کنی ضروری ہے، لا کی شمشیر سے مالکیت حاکمیت اور ربوبیت ذوات خلق سے کاٹ دیجاتی ہے، اور الا سے اس کا اثبات ذات حق مین کیا جاتا ہے، اور

---

[1] پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کرین،

اس طرح اخلاقِ الٰہیہ سے آراستہ ہونے کی قابلیت اور استعداد پیدا کیجاتی ہے، اب مجاہدہ اور عمل اس مقصود کے حصول کے لئے ضروری ہیں، اس کی توضیح میں چند مقامات کا پیشِ نظر رہنا لازمی ہے :

ابتدا میں ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ علم ہی سے عمل پیدا ہوتا ہے، لیکن علم سے مراد محض نظری علم نہیں لینا چاہئے، جو کانوں کی راہ سے داخل ہوتا ہے، لیکن قلب میں جاگزیں نہیں ہوتا، اس لئے عمل کی صورت میں نمایاں ہونے کی قوت نہیں رکھتا اور اس لئے منفعت بخش نہیں ہوتا[۱]، علم سے ہماری مراد وہ یقین و اذعان ہے، جو قلب کی گہرائیوں میں اپنا مسکن بناتا ہے، خون کی طرح تمام رگوں میں دوڑتا ہے، دماغ پر کامل تسلط رکھتا ہے، اور لازماً عمل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، ایسا یقین تفکر و تدبر یا مراقبہ سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے تفکر کو عبادت سے افضل قرار دیا گیا ہے[۲]، تفکر و مراقبہ سے علم راسخ ہوتا ہے[۳]، مضبوط ہوتا ہے، تلوین جاتی ہے، تمکین رونما ہوتی ہے اور راسخ عقیدہ ہی عملاً اپنا خارج میں ظہور کرتا ہے، جب عمل کی تکرار ہوتی ہے، تو عادت پیدا ہو جاتی ہے، جو فطرتِ ثانیہ کہلاتی ہے، اب عمل کے لئے فکر و غور کی ضرورت باقی نہیں رہتی، غیر شعوری نفس عمل کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے، مضائقت رفع ہو جاتی ہے، سہولت پیدا ہو جاتی ہے، سیرت قائم ہو جاتی ہے، اسی لئے کہا گیا ہے ع

چند روز جہد کن باقی بخند

اب ہمیں سیرت سازی کے دوسرے اہم عنصر مجاہدہ یا عمل و عادت کی طرف توجہ کرنی چاہئے،

---

[۱] ایسے علم سے استعاذہ کیا گیا ہے، اعوذ بک من علم لا ینفع ومن قلب لا یخشع [۲] تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ سبعین سنۃ، الدیلمی وروی ابو شیخ من حدیث ابو ہریرہ [۳] قل انما اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مثنیٰ وفرادیٰ ثم تتفکروا (۲۲ ع ۱۲) سے تفکر کا حکم صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے،

(۲) مجاهدہ: پاک سیرت جس طرح بغیر صحیح علم اور عقیدے کے ممکن نہین، اسی طرح بغیر عملِ صالح اور مجاہدہ کے اسکی تمام خوبیون کا نمایان ہونا بھی ممکن نہین اسی لئے فرمایا گیا، جَاهِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِهَادِہٖ[۱] اور صحیح عقیدہ مجاہد ہی کی چشم بصیرت افروز کے سامنے نیکیون کی تمام راہین کھول دیجاتی ہین، وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا[۲]، ہمین مجاہدہ کی ماہیت اور اس کے طریقون کو سمجھ لینا چاہئے،

ذرا اپنے ذہن کے نہان خانہ کو تو دیکھو کہ کیا یہ ایک لحظہ خیالات، تصورات، خواطر اور وساوس سے خالی بھی رہتا ہے؟ علم کا ایک دریا ہے، کہ امڈا چلا آرہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ یہ ایک لاتناہی مبدأ سے نکل رہا ہے اسکی ماہیت و نوعیت پر غور کرو تو ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ یا تو ہدایتی علم ہے یا اضلالی، اسکی آمد کسی طریقہ سے روکی نہین جا سکتی، کونسی قوت اس کو روک سکتی ہے؟ کسی خیال کو محض ارادہ کی قوت سے پیدا نہ ہونے دنیا بشری طاقت سے باہر ہے، خیالات آزادی کے ساتھ ایک نامعلوم منبع سے ظہور کرتے ہین، اور ایسا معلوم ہوتا ہی کہ انسان نہ ان کے پیدا کرنے پر قادر ہے اور نہ اُن کے فنا کرنے پر! لیکن انسان کو اتنی طاقت دی گئی ہے کہ اپنی توجہ اضلالی علم کی طرف سے ہٹا کر ہدایتی علم کی طرف منعطف کردے یا نفسیاتی اصطلاح میں یون کہو کہ سلبی خیالات کو ایجابی خیالات مین بدل دے، یہی مجاہدہ کی ماہیت ہی: ذہن مین سلبی یا اضلالی خیال غیر اختیاری و اضطراری طور پر پیدا ہو رہا ہے، اب یہ میرے اختیار مین ہی کہ مین اس خیال کو گلے سے لگاؤن، پیار کرون، قلب کے میدان مین تخت بچھادون اور اس کو معزز مہمان کی طرح عزت و وقار سے بٹھادون یا یہ کہ اس کے ذہن کے دروازہ

[۱] مجاہدہ کرو اللہ کے واسطے جیسا کہ چاہئے اس کے واسطے مجاہدہ کرنا (پ، ا ع ۱۷) [۲] جنھون نے ہمارے واسطے مجاہدہ کیا ہم ان کو اپنی راہین سجھا دین گے، (پ ۲۱ ع ۳)

سے سر نکالتے ہی اس کے مقابل ہدایتی یا ایجابی خیال کو اس کی سرکوبی کے لئے لے آؤں، اور نور کی قوت کو ظلمت کی طاقت سے لڑا دوں، ظاہر ہے کہ نور و ظلمت کے مقابلہ مین نور ہی کامیاب ہوگا، کیونکہ ظلمت نور ہی کے غیاب کا تو نام ہے، نور ہی کے عدم سے ظلمت پیدا ہوتی ہے، جہان نور ہو وہان ظلمت کیسے چھا سکتی ہے، ! مجاہدہ حق تعالیٰ ہی کی حول و قوت سے اضلالی علم کی بجائے ہدایتی علم پر عمل کرنے کی نام ہے، اضلالی خیالات کے ذہن مین خطور کرتے ہی مجاہد کی روح "خیر کے مبدء" کی طرف استعانت کے لئے متوجہ ہو جاتی ہے، استعاذہ کرتی ہے، پناہ مانگتی ہے، اپنی محدود قوت پر بھروسہ نہین کرتی، اپنی بیچارگی سے واقف ہوتی ہے، لا تمناہی قوت کے آستان پر تیزی کے ساتھ پہونچ جاتی ہے، اور چیخ اٹھتی ہے:

سبحان ذی الملک والملکوت سبحان ذی العزۃ والجبروت سبحان الحیّ
الذی لا یموت اعوذ بعفوک من عقابک واعوذ برضاک من سخطک
واعوذ بک منک جلّ وجہک[1]"

اور یہ لا متناہی عزت و جبروت، یہ لا محدود ملک و ملکوت والا آقا ہم سے دور نہین، وہ جو بالذات ہے جہان مین موجود ہر جگہ" ہمارے پاس ہی تو ہے، رگِ جان سے زیادہ قریب ہے" بما از ما نزدیک تر"! وہ الغیاث کی اس پکار پر شان رحمت کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہے، اور اس کی تجلی کے ساتھ ہی قلب کے ضرر و اضلال سے پوری حفاظت ہو جاتی ہے! یا نفسیاتی اصطلاح مین یون کہو کہ سلبی خیال کی جگہ ایجابی خیال لے لیتا ہے، اور شر کا صدور ہی نہین ہونے پاتا!

نفسیات کے اس مسلمہ قانون کو یاد کرو جس پر اس مقالہ کی بنیاد قائم ہے، کہ افکار ہی سے اعمال کا صدور ہوتا ہے، اعمال ہی کی تکرار سے عادت کا قیام ممکن ہے، اور عادات کی

---

[1] یہ اس حدیث کے الفاظ ہین، جس کو حاکم نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

تنظیم و ترتیب سے سیرت کی تشکیل ہوتی ہے، مجاہدہ سلبی یا بدیا اضلالی خیالات کا گویا دروازہ ہی پر مقابلہ ہے، جونہی ان خیالات نے کتم عدم سے سر نکالا، ان کے مقابل کے ایجابی یا نیک یا ہدایتی خیالات نے اُن سے ٹکر لی، اپنی محدود و کمزور قوت سے ان کا مقابلہ نہین کیا، بلکہ لامتناہی قوت و جبروت کے مبدا سے اخذ فیض کیا، اور اس طرح بے پناہ طاقت کے ساتھ ان پر ضرب لگا دی، اور ان کا قلع قمع کر دیا، جب عمل ہی کا صدر اس طرح روک دیا گیا، اور ابتدا ہی مین روک دیا گیا، تو تکرار کی نوبت ہی کہان، عادت کا قیام کس طرح ممکن اور سیرت بد کی تشکیل کا کیا ذکر، یاد رکھو کہ فاسد خیالات کو قوت اس وقت ملتی ہے، جب وہ تخیل کے دروازہ سے خانۂ قلب مین داخل ہو جاتے ہین، اور یہ داخل اسی وقت ہو سکتے ہین، جب دربانِ قلب غفلت کی نیند سو رہا ہو، چوکس نہ ہو، ہوشیار اور خبردار نہ ہو، یا پھر اپنی حول و قوت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہے، اس صورت میں معلوم ہوتا ہے، کہ ان کا زور مرد افگن ہے، ان سے مقابلہ بچون کا کھیل نہین، یہ بڑے سے بڑے پہلوان کو آسانی سے پچھاڑ سکتے ہین، ان کے داؤن پیچ سے بہادر سے بہادر بھی پناہ مانگتے ہین ان سے مقابلہ کی ایک ہی صورت ہے، ان کے ورود کے وقت ہی انھین پچھاڑ دیا جائے، سنبھلنے کا موقع نہ دیا جائے، اور حق تعالیٰ کی حول و قوت سے ان کا سامنا کیا جائے، اللّٰھم اعذنی من شر نفسی[1] کی فریاد فوراً بلند ہو، اعوذ بک منک کی چیخ فوراً نکلے، پھر شکست ناممکن ہے، کامیابی قطعی ہے، حق تعالیٰ کی پناہ مین آکر مغلوبیت کیا معنی رکھتی ہے، ناکامی کیا چیز ہے، ان کی معیت کے ساتھ ہی، بلندی نصیب ہوتی ہے، انتم الاعلون واللہ معکم[2] کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے!

---

[1] اے اللہ میرے نفس کے شر سے مجھکو پناہ دے، [2] تم ہی رہوگے غالب اور اللہ تمھارے ساتھ ہین (۴۷ ع ۸)

یہی نفسیاتی الہیاتی طریقہ بدعادات کی شکست میں بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے، بدعادت سے مراد کوئی عادت ہو، جو ہمارے اختیار و تصرف میں نہیں، بدعادت کی غلامی تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے، بدعادت کا غلام دنیا میں نہ کامیاب ہوسکتا ہے، اور نہ بردلبی اس کو نصیب ہوسکتی ہے، چونکہ افعال ہی کی تکرار سے عادت بنتی ہو، اور افعال کا محرک ہمیشہ خیال یا تصور ہوتا ہو لہذا بدعادت کی شکست خیال کی تبدیل پر منحصر ہے، عادت کے قائم ہوجانے پر فعل کے ارتکاب کی ایک طبعی خواہش ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی اس خواہش کی تکمیل کا خیال پیدا ہوتا ہے، ممکن ہے کہ خواہش پر ہمارا قابو نہ ہو، لیکن خیال ہمارے تصرف میں آسکتا ہے، اگر خیال کا صحیح طریقہ سے مقابلہ کرلیا جائے، تو خواہش بھی مغلوب ہوجاتی ہے، مثال کے طور پر شرابی کی حالت پر غور کرو، اس کو شراب کی خواہش ہوتی ہے، اور یہ خواہش یہ خیال پیدا کرتی ہے، کہ چل کر پینا چاہئے، خیال کا کامیابی سے مقابلہ کرنے پر خواہش کے اشتداد میں کمی ہوتی جاتی ہے، ایک مرتبہ کا مقابلہ دوسرے دفعہ کے مقابلہ کو آسان تر بناتا ہے، اور مجموعی نتیجہ حیرت خیز ہوتا ہے، یہی معنی ہیں اس قول کے کہ خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں"۔

بہرطور بری عادتوں کے آہنی پنجہ سے رہائی اسی وقت ممکن ہے کہ خیال کے پیدا ہوتے ہی اس کا مقابلہ کیا جائے، اور اسی طریقہ سے مقابلہ کیا جائے جس کا اوپر ذکر ہوا، اگر اس کے باوجود ہمیں ناکامی کی صورت دیکھنی پڑے، تو ہمیں مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہئے، جو ہر کے نزدیک یاس کفر ہے، گناہ کے ارتکاب کے بعد یا عادت بد کا پھر ایک مرتبہ (باوجود عزم راسخ کے کہ ایسا نہ ہوگا) شکار بننے کے بعد، جو ندامت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے، جو حزن و ملال کہ وہ محسوس کرتا ہو، وہ اس کے ارادوں کو مضبوط کرنے میں غیر محسوس طریقہ پر

مفید ہوتے ہیں، اور وہ وقت بہت جلد آپہنچتا ہے، جب وہ شخص اسی طریقہ پر عمل پیرا ہوکر فاتحانہ شان سے اپنی خود ساختہ بیڑیوں کو توڑ کر ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتا ہے! عارف رومی نے مجاہدہ کے اس اعتبار کو اپنے خاص انداز میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے:

اندرین رہ می تراش و می خراش تا دمِ آخر دمے فارغ مباش!

تا دمِ آخر دمے آخر بود که عنایت با تو صاحب سر بود!

دوست دارد دوست این آشفتگی کوشش بیہودہ بہ از خفتگی!

کارکے کن تو و کاہل مباش اندک اندک خاکِ چہ را می تراش!

چون ز چاہے می کنی ہر روز خاک عاقبت اندر رسی در آب پاک!

چون نشینی بر سر کوے کسے! عاقبت بینی تو ہم روے کسے!

بہرحال مجاہد ہمت سے کام لیتا ہے، حق تعالیٰ نے اس کو جو اختیار دے رکھا ہے اس کو استعمال کرتا ہے، اور عزم راسخ رکھتا ہے کہ جب تک گوہر مقصود ہاتھ نہ آئے، قلب کا تزکیہ، روح کا تجلیہ نہ ہو جائے، وہ دم نہ لیگا، اور حق مجاہدہ ادا کرے گا، ولولہ انگیز طریقہ سے ہر قدم پر وہ یہ گنگناتا جاتا ہے:

دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید یا تن رسد بجانان یا جان زتن برآید!

کامیابی و فتحمندی اس مجاہد کے ہاتھ چومتی ہے، کَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ کا وعدہ اس سے متعلق ہوتا ہے! ہدایت کے راستے کھل جاتے ہیں "لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" کا قول پورا ہوتا ہے،

مجاہدہ بیوی بچوں کا چھوڑنا، فاقوں میں کم سونا، فاقہ پر فاقہ کرنا، حقوق نفس کو تلف کرنے کا نام نہیں، مجاہدہ "حقوق نفس" کا ادا اور غیر شرعی "حظوظ نفس" کا ترک کرنا ہے، مجاہدہ

قلب کا تصفیہ ہی، روح کا تجلیہ ہے، اس کا بہترین طریقہ خیالات فاسدہ کا دماغ سے تخلیہ ہی، جو شخص اپنے قلب و دماغ مین فاسد خیالات کے بجائے پاک خیالات کو، سلبی افکار کے بجاے ایجابی افکار کو جگہ دیتا ہے، وہ اعمال سیئہ کا دروازہ بند کردیتا ہے، اس کے لئے امتثال مامور، اجتناب محظور اور رضا بمقدور آسان ہوجاتے ہین، جو عارف اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رضؓ کے الفاظ مین دین کا خلاصہ ہین [۵]!

ایجابی خیالات مین سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے، جو سرچشمہ ہین تمام محامد و محاسن کا، تمام خوبیون اور نیکیون کا، جو مبدا ہین طمانیت و سرور کا، علو و بلندی کا، قوت و عزت کا، اگر تم اپنے قلب کو تمام سلبی خیالات سے خالی کرکے حق تعالیٰ کے خیال کو اس مین جمانے کی کوشش کروگے، تو چند روز مین پاؤگے کہ یہ تمام صفات مقید پیمانہ مین تم مین خود ظاہر ہورہی ہین، انفسیات کا یہ عام قانون ہے، کہ آدمی جس چیز کے خیال اور دھن مین رہتا ہے، رفتہ رفتہ اسی کی خو بو اس مین پیدا ہونے لگتی ہے، یا نفسیاتی زبان مین یون کہو کہ اس کا جو معروض فکر ہوتا ہو، وہی وہ بھی بن جاتا ہے! اس قانون کو جان کر اور مان کر تم ہرگز سلبی خیالات پر فکر و توجہ کو زیادہ مرکوز نہ کروگے، ایجابی خیالات ہی کو جمانے اور بسانے کی کوشش کروگے، اب ہم عارف روم کے الفاظ مین پوچھتے ہین، کہ حق تعالیٰ سے بہتر کوئی اور چیز ہوسکتی ہے، جس سے تم ایک لحظہ کیلئے حقیقی معنی مین خوش رہ سکتے ہو،

کیست زو بہتر بگواے ہیچ کس | تا بدان دل شاد باشی یک نفس؟

اگر تمھین چشم بصیرت ملی ہے، اور تم عارف روم کے ساتھ اتفاق کرتے ہو تو پھر کیا حق تعالیٰ کی دھن سے بہتر اور کسی کی دھن ہوسکتی ہے؟ اب ان کا زیادہ حصہ اسی دھن مین گزارو، گفتار کو چھوڑ کر اسی کار بزرگ مین لگ جاؤ، رفتہ رفتہ جامی سامی نے جو کہا تھا، اسکا

---

[۵] فتوح الغیب مقالہ اول

تم کو تحقق ہونے لگے گا ۵

گر در دلِ تو گل گزرد گل باشی   ور بلبلِ بے قرار بلبل باشی
تو جزوی و حق کل است گر روزے چند   اندیشۂ کل پیشہ کنی کل باشی

جو چیز تم کو خود تجربہ سے معلوم ہو جائے گی اس کا ذکر ہم کیا کریں، لیکن تحریض کے لئے اتنا کہنا کافی ہے، کہ تم پر سرور اور فرح کے دروازے کھل جائیں گے، "اطمینان قلب" جو دنیا کی کسی چیز سے حاصل نہیں ہو سکتا، وہ نقد دم ہوگا، اور اس آیہ کریمہ کا اپنی ذات کو مصداق پاؤ گے:

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی   اے وہ جی جس نے چین پکڑ لیا، پھر
الی ربک راضیۃ مرضیۃ   چل اپنے رب کی طرف تو اس سے
فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی،   راضی وہ تجھ سے راضی، پھر شامل ہو میرے
(پ ۳۰ ع ۱۴)   بندوں میں اور داخل ہو میری بہشت میں۔

نفس مطمئنہ کا حصول، رضائے الٰہی کا تحقق، جنت ذات میں دخول، یہ نتائج ہیں اس مجاہدہ کی تکمیل کے! جو لذت کہ حق تعالیٰ کی یاد میں ہے، جو مستی اس کی یافت و شہود سے حاصل ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں "لذاتِ جہان" ہیچ ہیں، جامی اس ذوق و مستی کو اس والہانہ انداز سے ادا فرماتے ہیں:۔

کاے بلبلِ جان مست بیادِ تو مرا   وے پایۂ غم پست بیادِ تو مرا
لذاتِ جہان را ہمہ دریا نکند   ذوقیکہ دہد دست بیادِ تو مرا

حق تعالیٰ کی یاد کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کا ذکر زبان پر جاری ہے، فاذکروا اللہ ذکراً کثیراً پر عمل ہو، اٹھتے بیٹھتے یہی مشغلہ ہو، اس سے مقصود رضا و قرب الٰہی ہو، جب تمھاری توجہ ذکر کی وجہ سے خرافاتِ دنیوی سے ہٹ کر ایک نکتہ پر مرکوز ہو گی، تو خود بخود

فاسد سلبی پریشان کن خیالات اور وساوس کا دروازہ بند ہو جائے گا، اور جونہی خیالات کی یہ پراگندگی موقوف ہوئی، ایک روحانی کیف و طمانیت سے تمھارا قلب مملو ہو جائے گا، الا بذکر اللہ تطمئن القلوب کے یہی معنی ہیں، ذکر کا قیام مشق اور مجاہدہ سے آہستہ آہستہ ہوتا جاتا ہے، اور ذہول و غفلت کا ارتفاع ہو جاتا ہے، اس دولت کے حاصل ہو جانے کے بعد تم تمام چیزوں سے غنی ہو جاتے ہو، نہ کسی چیز کے حصول سے تمھیں لذت ہوتی ہے، اور نہ کسی چیز کے ضائع ہونے سے رنج، لکیلا تاسوا علی ما فاتکم و لا تفرحوا بما اٰتاکم کے مصداق ہونے لگتے ہو، اللہ کو رکھکر تمھیں کسی چیز کی خواہش نہیں رہتی، تم عارف روم کے الفاظ میں کہنے لگتے ہو:-

روزہا گر رفت گو رو باک نیست

تو بمان اے آنکہ جز تو پاک نیست!

یاد کے قائم کرنے کا ایک اور آسان گر ہم تمھیں تبلاتے ہیں، یہ تو تم مانتے ہو کہ ہر شے کے خالق حق تعالیٰ ہیں، شے ان کی مخلوق ہے، ہمارا رات دن سابقہ ان ہی اشیا سے ہوتا ہے، یہی ہمارے دل اور دماغ میں بسی ہوئی ہیں، ان ہی کی محبت سے ہمارے قلوب بھرے ہوئے ہیں! چونکہ یہ فانی اور گریز پا ہیں، ان کا زوال اور ان کی فنا پذیری ہمارے غم و حزن کا باعث ہوتی ہے، اب قانون ایتلاف ذہنی کی رو سے یہ ممکن ہے کہ مخلوق کو دیکھ کر خالق کی طرف ذہن منتقل ہو جائے، تم یہی کوشش کرتے رہو کہ شے کو دیکھکر تمھارا خیال شے کے خالق کی طرف جائے، اس طرح تمھیں ہر طرف حق تعالیٰ ہی کا جلوہ نظر آئے گا، اور اینما تولوا فثم وجہ اللہ کے معنی کا ابتدائی فہم حاصل ہونے لگے گا، شئی کی سلبی جہت سے توجہ ہٹ کر جہت حق کی طرف مرکوز ہو جائیگی، اور اس طرح یاد قائم ہونے لگے گی، تمھارا معروض فکر اب شے نہیں حق ہوگا اور ان تمام انوار سے تمھارا قلب معمور ہونے لگے گا، جو وجہ اللہ کی طرف رُخ کرنے سے

حاصل ہوتے ہین،

اس طریقہ سے تمھین بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ سعادت و مسرت کا سرچشمہ خود ہمارا قلب ہے حق تعالیٰ کا جلوہ گاہ خود ہمارا قلب ہے آفاق میں حق تعالیٰ ظاہر ہین ہر شے کیساتھ جہت حق موجود ہے، صحیح علم کے استعمال سے وہم اور التباس دور ہوا اور نظر کی اصلاح ہوئی، نقطۂ نظر بدلا معلوم ہوا کہ انفس و آفاق مین حق تعالیٰ نہان و عیان ہین، انہی سے تعلق قائم کرنا، انہی کی یاد کا جمانا تمام مسرتوں اور سعادتوں کا حاصل کرنا ہے، ان سے غفلت اور ذہول اور خلق مین استغراق اور فنائیت تمام بلاؤن اور آفتون مین گرفتار رہونا ہے: مَنْ يُعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا جو کوئی اپنے رب کی یاد سے منہ موڑتا ہے، چڑھتے عذاب میں ڈال دیا جاتا ہے (پ ۲۹ ع ۱۱) اسی مفہوم کو رومی کے دل نشین الفاظ مین یاد رکھو:

گر گریزی بہ امید راحتے — ہم ازانجا پیشت آید آفتے،

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست — جز بخلوت گاہ حق آرام نیست!

حق تعالیٰ کو چھوڑ کر خلق مین محویت، خواہ بظاہر وہ کیسی ہی دلفریب اور دلکش نظر کیون نہ آئے نور کو چھوڑ کر ظلمت مین گرفتار ہونا ہے، اور ظلمت سے ضیق، غم و حزن و خوف کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے، ظلمت مین چیزین اپنے صحیح خد و خال مین کہان نظر آتی ہین، کسی شے کا حسن و جمال تاریکی مین دکھائی دے گا! پھر تمھاری نظر میں اشیاء کی یہ دلفریبی تمھارے نفس کا دھوکا ہے، التباس ہے، تمھارا واہمہ ہی تو خلاق ہے، کیسی کیسی دلربا صورتین یہ تمھاری خوشی کے لئے پیدا کرتا ہے! ان سے تمھین ابھی لذت حاصل ہوتی ہے، تھوڑی ہی دیر بعد غم کا سایہ تمھارے قلب پر چھا جاتا ہے، ابھی اعتماد ہوتا ہے، ذرا دیر بعد خوف کا زبردست حملہ ہوتا ہے، اور تم کانپ اٹھتے ہو، تمھاری طبیعت مین استقلال نہین، استحکام نہیں، تمھاری

کوئی پناہ گاہ نہیں! اگر تم اپنی غفلت سے جاگ اُٹھو، اگر تمھاری چشم بصیرت کھل جائے، اور نور اور صداقت کی دنیا نظر آنے لگے، تو تمھیں اشیا ویسی ہی دکھائی دینے لگیں گی جیسی کہ وہ ہیں، اب تم کو حیاتِ طیبہ نصیب ہوگی، طمانیت و بردِ قلبی حاصل ہوگی، خوف و حزن زائل ہو جائے گا، استقلال و استحکام عطا ہوگا، اور حق تعالیٰ کے اس وعدہ کا ایفا ہوگا،

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ	جس نے نیک کام کیا، مرد ہو یا عورت
هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً	اور وہ ایمان پر ہے، تو ہم اس کو زندگی
(پ ۱۴ ع ۱۹)	دیں گے، ایک اچھی زندگی،

یادِ حق کو قائم کرنے، تمھارا رُخ ظلمت سے نور کی طرف پھیرنے، مجاہدہ کے راستہ کو آسان کرنے خلق سے توڑنے اور حق سے جوڑنے میں نیکوں کی صحبت عجیب و غریب اثر رکھتی ہے، صحبت کا اثر نفسیات کا ایک مسلّمہ اصول ہے[۱]، ہر فرد میں بے سوچے سمجھے ہر قسم کے قضایا کو قبول کرنے کی استعداد یا صلاحیت پائی جاتی ہے، جب یہ قضایا خود اپنے ذہن کے اندر سے وصول ہوتے ہیں، تو اس کو جدید نفسیات کی اصطلاح میں "خود ایعازی" (Auto Suggestion) کہا جاتا ہے، اور جب کسی خارجی ذریعہ سے حاصل ہوں، تو "غیر ایعازی" (Hetero Suggestion) کہا جاتا ہے، رات دن ہم خود ایعازی اور غیر ایعازی کے اثر کے تحت خیالات کو قبول کر رہے ہیں، اور ان کو جزو ذہن بنا رہے ہیں، اگر سلبی یا اِضلالی افکار غیر ایعازی قوت کی وجہ سے ہمارے

---

۱ وَمَثَلُ جَلِيسِ الصَّالِحِ كَمَثَلِ صَاحِبِ الْمِسْكِ اِنْ لَمْ يُصِبْكَ مِنْهُ شَيْءٌ اَصَابَكَ مِنْ رِيحِهِ
مثل جليس السوء كمثل صاحب الكير ان لم يصبك من سواده اصابك من دخانه (ابوداؤد و نسائی عن انسؓ)
نیک ہم نشین کی مثال مشک والے کی سی ہے، اگر تجھے اس سے کچھ نہ ملے تو خوشبو تو ضرور پہونچے گی، اور برے ہم نشین کی مثال لوہار کی بھٹی یا بھٹے کی سی ہے، اگر تجھکو اس کی سیاہی نہ لگے، تو دھواں تو ضرور پہونچے گا،

قلب میں جگہ پا رہے ہیں، تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم بری صحبت میں ہیں، اور ان کے تیقنات و افعال کی نقل کر رہے ہیں، اور اضطراری طور پر اُن سے متاثر ہو رہے ہیں، ان کے سمی اثرات سے بچنے کے لئے ضروری ہے، کہ ہم صحبت ناجنس سے قطعی احتراز کریں ؎

زاحمقان بگریز چون عیسیٰ گریخت صحبتِ احمق بسے خونہا بریخت

سلبی اثرات سے اس طرح بچ کر ایجابی اور ہدایتی علم کے لئے نیکوں کی صحبت کی تلاش کرنی چاہئے، اہل اللہ کی زبان سے حاصل کیا ہوا علم اپنے اندر خاص اثر و قوت رکھتا ہے، وہ قلب کی گہرائیوں تک پہونچ جاتا ہے یقین و اذعان کی شکل اختیار کر لیتا ہے، علم حق کو شیخ اکبر محی الدین عربی رضؒ نے علم "اذواق" قرار دیا ہے، اور فرماتے ہیں، کہ "علم الحق علم الاذواق لا عن الاوراق وھو العلم الصحیح وما عداہ لا حدث و تخمین لیس العلم اصلاً" یعنی علم حق ذوق و وجدان سے حاصل شدہ علم ہے، محض کتابوں سے حاصل کردہ نہیں، اور یہی علم صحیح ہے، باقی اٹکل پچو، مطلق علم نہیں، شاید اسکا مطلب یہ ہو کہ اہل اللہ کا علم قیاسی نہیں، مبدء نبوت سے اخذ کردہ ہے قطعی و یقینی ہے حقیقی واقعی ہے، اس کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے حق تعالیٰ خود ان کے معلم ہو گئے ہیں، اور اب وہ براہ راست اسی مبدء سے علم حاصل کرنے لگے ہیں، اتقوا اللہ ویعلمکم اللہ[۱] اس پر دلیل ہے، اسی لئے ایک دوسرے رازدان کی نصیحت ہے، کہ خذ العلم بافواہ رجال اللہ ولا من الصحائف و الدفاتر، مردانِ حق کی زبان سے علم حاصل کرو، کتابوں اور دفتروں سے نہیں، کیونکہ ان کتابوں میں قیاس و تخمین اور ظن ورائے کے سوا کیا رکھا ہے! اہل اللہ کی صحبت خاک کو کیمیا کرتی ہے، ان کے افعال و اعمال، ان کے افکار و خیالات رفتہ رفتہ قلوب کے زنگ کو دھوتے جاتے ہیں، اور تم غیر شعوری طور پر نیکی کی طرف مائل ہوتے جاتے ہو، اور بدی سے مجتنب اور محترز ہو

---

[۱] اللہ سے ڈرو وہ تمھیں علم دیتے ہیں ۱۲

بالآخر ظلمت سے نکل نور کی طرف تمھارا منہ ہو جاتا ہے، عارفِ روم نے صحبتِ مردانِ حق کے اثرات کو یون بیان فرمایا ہے:

خواہی کہ درین زمانہ فردے گردی یا در رہ دین صاحب دردی گردی

این را بجز از صحبتِ مردان مطلب مردے گردی چو گردِ مردے گردی

یہ کونوا مع الصّادقین کے حکم کے پنہان فائدون کی اجمالی توضیح ہے،

سیرت سازی کے قرآنی اصول کی اوپر جو توضیح پیش کی گئی، اس کو اجمالاً ایک دفعہ پھر دہرا لیجئے "اذاتکرر تقرر" تکرار سے چیزین زیادہ دلنشین ہوتی ہین، سیرت کی عمارت کا سنگ زاویہ لا الہ الا اللہ پہ پختہ یقین و اذعان ہے، تمام انبیاء کا اپنی قوم کو یہی پیغام تھا، کہ یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہٍ غیرہ اے قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمھارا کوئی معبود و رب نہیں" اللہ ہی لائق عبادت ہین، استعانت انہی سے کیجانی چاہئے، سر اسی انہی کے سامنے جھک سکتا ہے، غیر کے سامنے نہین، اس بنیادی عقیدہ کا زبان سے اظہار اور قلب سے اقرار ضروری ہے، زبان سے بار بار کی تکرار یقین کو پختہ کرتی ہے، جس قدر یقین مین پختگی ہو گی، اسی قدر عمل مین سہولت ہو گی، یقین مین شدت پیدا کرنے کے لئے غور و فکر، تدبر و مراقبہ ضروری ہین، یقین اس شدت کا پیدا ہو جائے، کہ شک و شبہہ کی مطلقاً گنجایش نہ رہے، تم جانتے ہو کہ آگ مین ہاتھ ڈالنے سے تمھارا ہاتھ جل جائے گا، اسی طرح تمھیں توحید فی المعبودیت و توحید فی الربوبیت کا یقین ہو جانا چاہئے، ذلت (جو عبادت کی اصل ہے) حق تعالیٰ ہی کے سامنے اس کا ظہور ہو سکتا ہے، جو ہمارے مالک ہین، حاکم ہین، مولی ہین، خالق ہین، رب ہین، وکیل و نصیر ہین، حق تعالیٰ ہی نافع و ضار ہین، معز و مذل ہین، حاجت و مراد و سوال ان کے کوئی پوری نہین کر سکتا، اس لئے انہی کے سامنے دستِ سوال دراز ہو سکتا ہے، کسی اور کے سامنے ہرگز نہیں زبان پر یہ دعا جاری رہے اور قلب مین اسکا مفہوم متمکن

اللّٰھُمَّ کَمَا صُنْتَ وُجُوْھَنَا اَنْ تَسْجُدَ الٰہی جس طرح تونے ہمارے چہرون کو غیر کے آگے

بغیرک فصن ایدینا ان تمتد بالسؤال لغیرک، — سجدہ کرنے سے بچا لیا، اسی طرح ہمارے ہاتھوں کو اپنے غیر کے آگے سوال کرنے سے بچائے رکھ،

اس عقیدہ اور یقین کا شخص اپنے ہم جنسوں کے آگے کیسے خود کو ذلیل کر سکتا ہے، اسکی سیرت غلاموں کی سی کیسے ہو سکتی ہے، وہ نفع و ضرر کی توقع غیر اللہ سے کب رکھ سکتا ہے، اور اپنی عزت اس وہمی نفع و نقصان کی خاطر کیسے بیچ سکتا ہے! مجاہدہ اسی یقین اساسی کو پختہ کرتا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے، کہ خواطر کی نگہبانی کی جائے، سلبی اور اضلالی علم کو ایجابی و ہدایتی علم سے بدلا جائے قانون تقلیب افکار (Law of The Polarisation thoughts) نفسیات کا ایک مسلمہ قانون ہے، اسی قانون کے استعمال سے اضلالی علم ہدایتی علم میں مبدل کیا جا سکتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ ایجابی خیالات ہدایتی افکار کو ذہن میں ہمیشہ جمانے کی کوشش کرنی چاہئے، اور سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے جب یہ قلب پر چھا جاتا ہے، تو قلب تمام ظلمتوں سے پاک ہو جاتا ہے، نورانی ہو جاتا ہے، نور ہو جاتا ہے، اللّٰھم اجعل فی نفسی نورا اللّٰھم اجعلنی نوراً کی دعا قبول ہو جاتی ہے، اس کا نتیجہ سرور و طمانیت ہے، مسرت و سعادت ہے، جو پاک سیرت کی لازمی خصوصیت ہے، نیک سیرت شخص مسرور و مطمئن ہوتا ہے، اس کی جان اس کا تن راحت میں ہوتا ہے، وہ قطرۂ نور ہوتا ہے، غم سے فارغ اور دائماً مسرور ہوتا ہے، یہ روحانی مسرت ہے، جو طبعی غم و حزن میں بھی باقی رہ سکتی ہے؛ الا ان اولیاءَ اللہ لا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون، الذین آمنوا وکانوا یتقون لھم البشریٰ فی الحیوٰۃ الدنیا و فی الآخرۃ لا تبدیل لکلمات اللہ ذٰلک ھو الفوز العظیم ؏

(پ ۱۱- ع ۱۱)

یادِ پاستان

از

جناب مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی

(۳)

(۱۲) ایک اور بے نام کی تاریخ کشمیر کا پتہ چلتا ہی،

سکھ جیون، ذات کا کھتری، کابل کا رہنے والا تھا، میر غلام علی آزاد بلگرامی اس کے حسن صورت و خوبی سیرت، کمالات ذات کی بڑی توصیف فرماتے ہین، نصیبے نے یاوری کی، عالمگیر ثانی کے نام سے کشمیر فتح کیا، راجہ بنا دیا گیا، اوس نے بہت سی اچھی اچھی باتیں اس ملک مین رائج کین، سیاسی اصلاحات عمل مین لایا، وہان کے نامی گرامی شاعرون کی ایک مجلس مقرر کی، تاکہ کشمیر کی تاریخ، ابتدا سے آبادی سے اُس کے زمانہ تک کی لکھ ڈالین، اس کام پر پانچ شخص مامور کئے تھے، سر حلقہ محمد توفیق، توفیق تخلص تھا[1] جس کا اصلی نام لالہ جو تھا، میر صاحب لکھتے ہین کہ کشمیری زبان کا اس سے بڑھ کر کوئی شاعر نہ تھا، دوسرے محمد علی خان متین تھے، جن کا تذکرہ سخنوران حیات الشعراء کے نام سے خوب شہرت پا چکا ہے، یہ حسام الدین خان مغل باشندۂ کشمیر کے

---

[1] توفیق کا یہ شعر میر حسین دوست کے تذکرہ حسینی (صفحہ ۹۰) سے نقل کیا جاتا ہے،

دریاو دو زلف بت کشمیر نژاد ست　　　شد تار سرد مار سراز گریہ دو چشم

تار سراو مار سر کشمیر کے دو تالابون کے نام ہین،

بیٹے اور بادشاہی منصب دار تھے، (ان دونوں باپ بیٹوں کا ذکر مع ان کے علمی فضائل وخدمات کے تاریخ الہ آباد جلد اول، صفحہ ۲۵۰ مین کرچکا ہون) تیسرے رکن کا نام بھی محمد علی تھا، مگر لقب پنبہ، ان پانچون مین سے ہر ایک کی امداد کے لئے دس دس مستعد با کمال "کلکی" متعین تھے، خدا معلوم اس کتاب کی تکمیل کی نوبت پہونچی تھی یا نہین محض شعرار کی نامزدگی وانتخاب سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ تاریخ نظم مین لکھی گئی ہوگی، (خزانۂ عامرہ ص ۱۱۵، امرائے ہنود ص ۲۰۲)

مولینا سعید احمد مارہروی بھی راجہ کی خوبیون، بے تعصبی اور مروت وفتوت کی بڑی ستایش کرتے ہین، ۱۱۷۵ھ (۱۷۶۱ء) مین مارا گیا،

دو تاریخون کا ذکر قدرے تفصیلاً مگر یکجا کرنا چاہتا ہون، (۱۳) فارسی کی، واقعاتِ کشمیر نام، مولف کا نام محمد اعظم ولد خیر الزمان معلوم ہے لیکن ان کے القاب وخطاب، خاندان ومسکن سب جلبابِ خفا مین ہین، قطعۂ ذیل سے جو مصنف موصوف کا طبع زاد ہے، سالِ تکمیلِ تالیف ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) پایا جاتا ہے،

چو از تجدید تحریر این صحیفہ	مرتب شد بہ آئینِ لطیفہ
قلم در فکر تاریخش روان شد	بسا معنی کہ فیضان ز آسمان شد
اگر پرسند تاریخش چسان یافت	بگو ترتیب ابواب الجنان یافت
بسالِ اختتامش باز فرمود	کہ زیب وزینتِ کشمیر این بود ۱۱۵۹ھ

جیسا کہ تجدید تحریر سے مفہوم ہوتا ہے، نظرِ ثانی کی نوبت بعد کو آئی، تصنیف کا آغاز اس سے بہت پہلے ۱۱۴۸ھ (۱۷۳۵ء) مین بعہد محمد شاہ ہو چکا تھا، واقعاتِ کشمیر (۱۱۴۸ھ) تاریخی نام ہے، دس گیارہ برس کے عرصہ مین جو واقعات جدید ومزید رونما ہوئے یا معرکہ آرائیان ہوئین

---

۱۵ تاریخ کشمیر ترجمہ واقعاتِ کشمیر، ص ۳۵،

مولف نے ان کو بھی داخل و شامل کر دیا ہے[۱] اسی قدر نہیں، سال بھر کے بعد یعنی ۱۱۶۰ھ (۴۷-۱۷۴۶ء)
کے بھی کچھ حالات مندرج پائے جاتے ہیں[۲] محمد اعظم اچھے شاعر تھے، اپنی کتاب میں فارسی
کے خود تصنیف اشعار اور چھوٹے چھوٹے قطعے اور مثنویاں جا بجا لکھی ہیں، جن کو مترجم نے برقرار
رہنے دیا ہے[۳]، یہ کتاب میرے مطالعہ میں نہیں آئی، لیکن ایک دوسرے مقبول یعنی خان بہادر
شیخ مقبول حسین مرحوم وزیر مال جموں و کشمیر نے اپنے مختصر رسالہ "حالات مسجد جامع سری نگر" میں
اس کو تاریخ اعظم کے نام سے یاد کیا ہے[۴]

اس کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ کشمیر کے بعض حالات اس کے ہندی مورخ لکھا کرتے تھے،
تیس تیس برس کا ایک ایک دورہ (دور؟) ہوتا تھا، اس کے عوض ان لوگوں کو راجاؤں سے
روزینے ملتے تھے، ان کی تاریخ کا نام راج ترنگ (؟) ہے، ادھر بادشاہوں نے روزینے موقوف
کئے، ادھر انھوں نے لکھنا بند کر دیا، ان کے بعد بعض مسلمانوں نے تھوڑی سی تاریخ فارسی زبان
میں ترجمہ کے طور پر لکھی، لیکن وہ واقعات مجمل اور اپنے ہی زمانہ کے حالات تک محدود رکھے[۵]،
انہی میں سے ملا حسین خانی (محسن فانی؟) کی ایک مجمل سی تالیف ہے[۶] ان کے بعد حیدر ملک چاودری
کی کتاب سامنے آئی، ملک صاحب نے نہ تو اس ملک کے تمام حالات قلمبند کئے، نہ ضروری تاریخی
واقعات کا احصار و ضبط فرمایا، ان کو چھوڑ چھاڑ کر خود ستائی اور نیاگاں سرائی میں مصروف
ہو گئے، ایک موقع پر توضیح بھی کرتے ہیں، کہ مرزا نے بچشم خود دیکھ بھال کر ایک علحدہ کتاب لکھی
تھی، یہ ملک چندے اس کے تصرف میں رہا تھا[۷]، کسی کسی واقعہ کو نقل کرتے وقت منشی اعظم نے
اس کتاب کا حوالہ بھی دیدیا ہے، جیسے جہانگیر کے عہد میں سلطان سکندر بت شکن کی مسجد جامع

---

[۱] صفحات ۱۱۱ و ۱۱۲، لغایۃ ۱۲۹ [۲] صفحات ۱۳۰ و ۱۳۱ [۳] ص ۲۰۰ [۴] فہرست کتب تاریخی حوالہ داده [۵] ص ۴ [۶] صفحہ ۴ [۷] صفحہ ۱۱،

کلان کی آتش زدگی،[1]

پھر فرماتے ہین کہ جب دو تین دورے تیس تیس برس کے اور گذر گئے، تو چند باکمالون نے انہی (مذکورہ) کتابون کو دیکھ کر اپنے عہد تک کے اضافے کر دیئے، ایک رسالہ مرتب ہوگیا، اس کے قریب ہی اُسی زمانہ کے ایک ہندو نے کمال اختصار کیساتھ ایک اور کتاب لکھ ڈالی، یہ تمام نسخے مشرح نہ تھے، ان کتابون میں بہت سی عجیب و غریب باتین چھوٹی ہوئی تھین اسلئے احقر الناس (محمد اعظم) نے (بزعم خود) اس کمی کو پورا کیا، احتیاط یہان تک برتی (ملک حیدر کے ضد) کہ باپ دادا کی تعریف و توصیف درکنار اپنی ذات ستودہ صفات کا ذکر یا وطن مالوف کا نام تک حوالۂ قلم کرنا جائز نہین رکھا،

یہ کتاب عہدِ اکبری اور خواجہ نظام الدین کے بہت عرصہ بعد کی تالیف ہے، مگر مین نے اس کا تذکرہ اس واسطے لازم سمجھا کہ اسکی تمام معلومات اسی ملک میں اور اُسی ملک کی پرانی تحریرون اور تاریخون سے حاصل کی گئی تھین، وہ کتابین خواہ سنسکرت اور ہندی کی رہی ہون یا فارسی کی، اس سے زیادہ اس کی درمیانی تفصیلات اور اور تاریخون کے باہمی اختلافات پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت نہین پاتا،

البتہ کچھ باتین ایسی رہی جاتی ہین، جو اصل فارسی اور اوس کے ترجمۂ اردو سے مشترکاً تعلق رکھتی ہین،

۱- ہندوانہ نامون کو خواہ راجگان کے ہون خواہ مقامات کے، خواہ کتابون کے سمجھ کر درست کر لینے اور صحیح چھاپنے کی ادنیٰ کوشش بھی نہین کی گئی، پنڈت کلہن کی تاریخ کشمیر کا نام ہر جگہ صرف راج ترنگ لکھا ہے[2] جس کی نسبت فرماتے ہین، کہ سنسکرت زبان میں تھی،[3]

---

[1] صفحہ ۱۹، [2] صفحات ۵۰ و ۶۴ و ۶۹ [3] صفحہ ۱۶۴

۲۔ بہت سے نامون کے ساتھ زینہ یا اس کا ہم شکل لفظ رینا لگا ہوا ہے، مقامات اور کتابون کے نام سے پہلے بھی نظر آتا ہے، بعد مین بھی[1]، مجھ ایسا بوڑھا طالب علم جو کشمیری زبان سے اتنا ہی ناآشنا ہو جتنا سنسکرت سے، اس التباسِ کتابت سے شک و شبہہ مین پڑ جاتا ہو، اس بارہ مین کیا زبان کھول سکتا ہو، پتھر کی چھپائی نے جابجا نقطے بھی غائب کر دیئے ہین،

۳۔ مرزا حیدر، صاحبِ تاریخ کو، جہان جہان ذکر آگیا ہے، ایک نئے انداز اور نئے طرز سے لکھا ہے، کہیں مرزا حیدر کاشغری (ص ۱۰۹) کہین حیدر ملک (ص ۱۱۳) ارقام فرماتے ہین، ایک جگہ مرزا حیدر بھتیجا سعید خان والی کاشغر اور خالہ زاد بھائی بادشاہ بابر کا بتاتے اور ستایش فرماتے ہین کہ علوم رسمی دینی سے باخبر، شعر و سخن سے بہرہ ور تھا، تاریخ اسی کی تالیف ہے، اور یہ تاریخ معتمد مشتمل اور پر غرائب حالات کے ہے، (ص ۱۳۶)

یاللعجب یہ ہی تاریخ ہے، جس کی واقعاتِ کشمیر کے دیباچہ مین اسی مصنف نے اسی قلم سے ابھی تحقیر کی تھی، جس کو باپ دادا کے حالات کا روزنامچہ اور ستایش دنیایش کا طومار بتایا تھا، غرائب و عجائب کے اندراجات سے خالی ہونے کا عیب لگایا تھا، صفحہ ۲۰۰ پر اس کو چادورا اور صفحہ ۲۰۱ پر حیدر ملک چادورہ لکھا ہے، ص ۲۲۳ پر تحریر ہوتا ہے، کہ اسی حیدر ملک کا بیٹا حسین ملک چادورہ تھا جو قاضی عسکر کے حکم سے قتل کیا گیا تھا، اس پر بعض شیعون نے اتہاماً یہ شعر موزون و مشہور کیا تھا،

حسین ابنِ حیدر دوبارہ شہید[2] شد از ظلم و بیداد قوم یزید

اس ایک نام یا چند مشابہ نامون کے سبب سے اور ہر ایک کا عہد صحیح معلوم نہ ہونے سے پڑھنے والا تردد مین پڑجاتا ہے، فوری فیصلہ نہین کرسکتا،

۱؎ صفحات ۶۵ و ۸۸ و ۱۰۰ و ۱۱۳ و ۱۲۲ و ۱۳۱ و ۱۴۶ و ۲۳۹ ۲؎ صفحہ ۲۲۴

۴۔ ترجمہ مین گندہ وناشایستہ لفظین بھی کہین کہین بے تکلفی سے آجاتی ہین، بیہودہ ضرب الامثال یا کہاوتین اور بازاری محاورے بھی موجود ہین۔ زمانہ بدلتا رہتا ہے، آج سے ایک صدی پیشتر یہی باتین جائز اور شیرین سمجھی جاتی ہون گی، اور یہی الفاظ پسندیدہ ہون گے،

۵۔ واقعات کا زمانہ بتانے کے لئے سینِ ہجری کا التزام رکھا گیا ہے،

(۱۴) اسی واقعات کشمیر کا اردو ترجمہ تاریخ کشمیر ہے، جو منشی اشرف علی ملتزم مدرسہ دہلی نے کیا تھا، منشی صاحب رقمطراز ہین، کہ جب کشمیر کو انگریزون نے سکھوں سے چھینا، تو راجہ گلاب سنگھ جمون والے کو اس کا بھی مستقل راجہ مقرر کر دیا" مسٹر اسپرنگر اُس زمانہ مین مدارسِ دہلی کے پرنسپل جامع علوم وفضائل شخص تھے، ان کو ایسی کتاب کی تلاش دامنگیر ہوئی، جس مین کشمیر کے گذشتہ حالات درج ہون، اس کا ترجمہ کرایا جائے، بخت اتفاق کہ خود اسپرنگر صاحب کی کاوش و کوشش سے مفتی صدر الدین خان بہادر صدر الصدور دہلی کے بےمثل ولاجواب کتاب خانہ مین یہ کتاب واقعاتِ کشمیر دستیاب ہوگئی، موصوف نے اس کو پسند فرمایا، اور مجھ نیازمند (اشرف علی) اپنے یہان کے ایک استاد کو ترجمہ کی خدمت پر مامور کیا، حکم کی تعمیل کی گئی، ۱۰ اگست ۱۸۴۶ء کو ترجمہ شروع ہو کر تاریخ کشمیر کے نام سے موسوم ہوا، [۱] اور ۱۰ مہینہ کے اندر پنڈت دھرم نرائن کے اہتمام سے مطبع العلوم مدرسہ دہلی مین، ۳۵ صفحات پر چھپ کر ۱۱ نومبر کو شائع ہو گیا، [۲] لوحِ کتاب پر اس کو انگریزی کے کتابت کے حرفون مین دہلی کالج اور دہلی کالج پریس لکھا ہے، اور ورنیکولر سوسائٹی کے فیضانِ علم کا حوالہ دیا ہے، کہنے کی ضرورت ہے کہ اس وقت تک ... دہلی ... تھی، ... نہین بنائی گئی تھی ... مدرسہ کی حیثیت اسکول سے بلند تر تھی،

---

[۱] صفحہ ۱۳ [۲] صفحہ ۳۵، ص ۳۵،

پیشِ نظر نسخہ پبلک لائبریری الہ آباد کے قبض و ملک میں ہے، اور ان چند مخصوص و محفوظ تبرکات میں سے ہے، جو نامور فاضل و مستشرق بلاک مین (H. Blochmann) کے زیرِ مطالعہ رہے تھے، موصوف نے اس پر کتاب[۱] کا نام، مصنف[۲] کا نام، مترجم[۳] کا نام، نیز اپنا[۴] نام مع سنہ ۱۸۶۴ء (انگریزی میں تحریر فرما دیا ہے، سر لوح کلکتہ مدرسہ کی بیضوی بڑی مہر ثبت ہے[۵]،

بعض سوانح و حوادثِ کشمیر کوتاہ ہمت قاصر قلم تبصرہ نگار کو یہاں کسی راست نویسی و انصاف پسندی کے دعوے کی ضرورت نہیں، مقبول ہر حال میں مقبول ہے، لیکن متواتر و مسلّم روایات کے مناط پر دنیائے جرأت و آگاہی کے یقین کی بنا پر کچھ ایسے واقعات بھی سامنے ہیں، جن کو حوالۂ کاغذ کرنے سے قلم کا شہ سوار گریز نہیں کر سکتا، اور جو بقولِ مصنف ایک بڑی حد تک عجائب و غرائب میں داخل ہیں باتیں وہی معمولی ہیں، جو تماشا گاہِ عالم میں ہمیشہ اور برابر ہوتی رہتی ہیں، مگر کبھی کبھی انکی سنگینی و شدت بڑھی ہوئی محسوس ہوتی ہے،

بدنصیب کشمیر ہمیشہ سے آفاتِ ارضی و بلیاتِ سماوی کا آماجگاہ رہا ہے، آسمان اوپر ہے، اس لئے اس سے منسوب مظالم و شدائد کا ہاتھ بھی اونچا رہا ہے، اس مد کی تفصیلات میں عبرت انگیز دبائیں، غلہ کی روح فرسا گرانیاں، آتش بار خشک سالیاں ہیبت ناک قحط ہیں، جو کشمیر پر برابر چھائے رہتے تھے[۶]، اور یہاں کے بدقسمت باشندوں کو کبھی سکون اور چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے، ان کے لئے اطمینان و فراغ عنقا کا حکم رکھتا تھا، اس میں ملک کی پریشانی ایک مستقل دفتر طومار کی محتاج تھی، جس کو مولفِ تاریخ نے ایک پوری مثنوی "شہر آشوب قحط" کے عنوان سے لکھ کر اپنا ولولہ پورا کیا ہے، اپنی چشم دید آپ بیتی لکھتا ہے،

زبس در اضطرار اند اہلِ کشمیر　　غمِ خود ہم نہ خوردہ ہیچ کس سیر

---

[۵] جلد کے آخر میں ایک مطبوعہ پرچہ انگریزی کا چسپاں ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ نسخہ کبھی زبان دان تمیز

زسوزِ جوع از بس آتش افروخت | بیاد دانہ پختن اشتہا سوخت
چو چشم مردمان از قحط برگشت | گرفتہ انقلاب از شہر تا دشت
نشانِ غلہ پیدا نیست یکسر | بغیر از حسن گندم گونِ دلبر
ترقی منحصر دانند مردم | درافزونی نرخ کال[۵] گندم
تنور آسا شکم ہا گشتہ بریان | بسوزِ آرزوے یک لب نان
زما کولات حاصل غصہ خوردن | بہاے مشت شالی جاں سپردن
بجز ماہی دلِ فارغ زغم داشت | میسر نان آبے از درم داشت
ز انبارے کسے گر دانہ چیند | پئے یک کال صد دشنام بیند
اگر جاے ظہورے کرد دہان | نمک دانش بود از شور افغان
جہان پامال سرچنگِ جفا شد | ز قحط آب و دانہ کربلا شد
ز پا افتادگانِ دست خالی | ہمہ سرچنگ خود از مشت شالی
بیاد کال وارزن ہمچو خاک اند | براے جو چو گندم سینہ چاک اند
شدہ ہر فرقہ غرق بحرِ تشویش | نخوردہ بہرہ غیر از حسرتِ خویش
خلائق بر سر دریا و بازار | چو مور دانہ خور خوارِ لگد خوار
چو ماہ و گنج قوت ہر کہ و مہ | بغیر از خاک نہ از شہر تا دہ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۶) ایڈونی ٹی اٹکنسن (Edwin T. Atkinson) بنگال سول سروس کی ملکیت الہ آباد میں تھا [۴] صفحات، ۳، ۱۲، ۱۲ و ۱۵، ۱۷۲ و ۱۹۳ و ۲۱۰ و ۲۳۲ و ۲۸۸ و ۲۹۴ و ۳۲۶،

[۵] کسی کے سر پر زور سے ہاتھ مارنا۔

سپاہی بسکہ دادہ تن بہ مردن غنیمت می شمارد زخم خوردن[1]

قحط تو روز بروز بڑھتا تھا، نالہ و فریاد کی صدائیں نئی نئی بلند ہوتی تھیں، تاج الشعراء کشمیر مولانا احمد تخلوق کی کیفیت یہ بیان کرتے ہیں :-

گرہ نظر بر ہلال می کردند لب نانے خیال می کردند
دہن آز باز می کردند گردنِ خود دراز می کردند[2]

کچھ دن بعد پھر قحط پڑا، اسکی شدت اور بھی غضب کی تھی، عسرت، کلفت اور صعوبت تو پہلے ہی سے لاحقِ حال اور وبالِ ہستی تھی، کہ غلہ نایاب ہوگیا، مویشی بھوکوں مرگیے، انسانی مخلوق نے لباس، زیور، اور ان سو بھی عزیز تر چیز اپنے آلاتِ حرفہ کو کنکر پتھر کے مول بہا دیا،

فشرد آن چنان قحط پائے ثبات کہ نایاب شد نان چو آب حیات
دو صد منزل از دیگ شد آتش دو فراموش شد نام نان بر تنور

قحط کے مارے ہوے مردے اوّل اوّل تو گھاس پھوس میں دبا دیئے جاتے تھے، بعد چندے تباہی و ہلاکت بہت زیادہ بڑھی، گنجایش گھٹنے لگی، تو دریا میں ڈالنے لگے، یہ صورت بھی قائم نہ رہ سکی، ان کو دریا تک لے جانے کی مہلت نہ ملتی، دریا کا پانی بھی سڑنے لگا تھا، ناچار لاشیں جہاں ہوتیں وہیں چھوڑ دیجاتیں،[3]

آتش زدگیاں جو اتفاقاً ہو جاتیں، اور آتش زنیاں جو عمداً کسی مخالف فریق کو نقصان پہنچانے کے لئے یا غیر مذہب والوں کی بدخواہی سے کیجاتی تھیں، ان کی تعداد بھی بہت ہے[4] کشمیر کی مسجدیں، خانقاہیں اور مزارات کی عمارات جو سرتاپا لکڑی کی بنائی جاتی تھیں، (اور

---

[1] صفحات ۲۰۰ و ۲۰۹ [2] ص ۲۰۱، [3] صفحہ ۲۳۲، [4] صفحات ۱۹۰ و ۲۰۴ و ۲۲۶ و ۲۶۳ و ۲۹۶ و ۲۹۸ و ۳۰۳،

اب بھی بنتی ہیں) ابتدا انہی سے کی جاتی تھی، رفتہ رفتہ آگ پھیلتی جاتی، اور محلوں اور شہروں کے علاقوں کو خاک سیاہ کر ڈالتی تھی، پرانے پرانے معابد اور تاریخی پرستش گاہیں بھی اس بلاے بے درمان سے محفوظ نہ رہتی تھیں، پھر بھی اگر کچھ بچ رہتا، تو برف باری کے نذر ہو جاتا تھا[۵۱]، اس قہر خداوندی کے نشانات مٹانے تباہی کی تکمیل، خاک و خاکستر کو یکسر بہا لے جانے کے لئے طوفانِ باراں شدید کو حکم ہوتا، سیلاب کی مزید آفت بھی نازل ہوتی،[۵۲] سرزمین ارم پر سیلِ عرم کا قبضہ دخل ہو جاتا،

شاعر اس عبرت خیز حسرت بھرے منظر کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتا ہے :-

دلم از عبرتِ آشوبِ طوفان　　شدہ گریان چو ابرِ نو بہاران

برنگے کرد چشمم خون فشانی　　کہ گر دیدہ نگاہم ارغوانی

ندیدم فرش غیر از چادرِ آب　　بجاے حلقہ در بود گرداب

گرفتہ آب از مہ تا بہ ماہی　　جہاں را سمان گشتہ تباہی[۵۳]

آہ - ایک اور مصیبت بھی تھی جو خطۂ کشمیر اور باشندگانِ کشمیر پر بار بار نازل ہوتی تھی، در پردہ اس میں بھی گردشِ فلکی کا ہاتھ تھا، میری مراد زلزلوں سے ہے[۵۴]، ان کے حملے شدید ہوتے تھے، ان سے اور ان کی تباہ کاریوں سے رستگاری محال تھی، مورخ ان کو بھونچال سے تعبیر کرتا ہے،

جب مسلمانوں کی عملداری ہوئی، تو ہندوؤں کا ان سے لڑنا بھڑنا تکلیف پہونچانا، معمولی بات مقتضاے فطرت بشری تھی، لیکن اس سے پہلے کی باتیں بھی سن لیجئے، جب خود ہندو یہاں حکمران تھے، اس ملک پر تباہی و بربادی برابر طاری و ساری رہی، لوگوں کے

---

۵۱ صفحات ۱۵۰، ۲۱۴، ۲۵۶ ۵۲ صفحات ۲۲۸، ۲۹۶ و ۳۳۱ ۵۳ صفحہ ۳۳ ۵۴ صفحات ۱۸۳، ۲۲۰ و

ذاتی عناوات، آپس کی حریفانہ عداوتین، خاندانی کینے اور رنجشین، باہمی تفریقین، روز روز ایک کو دوسرے پر اُبھارتین، اور زد و کشت بلکہ بڑی بڑی خونریزیون کا باعث ہوتی تھین، لاریب کارساز حقیقی کا ارشاد بجا ہے،

وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ   یہ اتفاقات زمانہ ہمارے حکم سے نوبت

(پارۂ چہارم رکوع پنجم)   بہ نوبت سب لوگون کو پیش آتے رہتے ہین

بے شبہہ صفحۂ ہستی پر ایسا ہی ہوتا رہا ہے، اور ایسا ہی ہوتا چلا جائے گا،

ہمارے ہندوستان کی حالت بھی بلا شبہہ ایسی ہی رہی ہے، مین نے نالندہ کے دارالعلم والفن کی غارت شدہ عمارتون کو دیکھا ہے، ان کے نشیب و فراز اور اُن کے اسباب پر غور کیا ہے، آپ گجرات پر نگاہ ڈالین، اور تاریخ کے صفحات پڑھین اور برہمنی مذہب والون کا جب تک وہان دخل اور دور دورہ رہا، باہم بیخ کنی اور استیصال کی کوشش و کاوش جاری رہی، جنگ و پیکار کے شعلے بلند ہوتے رہے، ایک فریق کا دوسرے کے مندرون اور پرستش گاہون کو مسمار کر دینا اپنی اچھی سے اچھی یادگار سمجھا جاتا تھا، ان کے کھنڈر زبان حال سے اب بھی اپنی تباہی و بربادی کی داستان سُنا رہے ہین، جب پیروان بودہ کا غلبہ و تسلط ہوا تو انھون نے ہندوؤن پر ہاتھ صاف کیا، اپنے مقدور بھر، ان کے عبادت خانون کو صفحۂ عالم سے مٹا کر چھوڑا (تاریخ گجرات از مولوی ذکار اللہ خان بہادر، و ہندوستان گذشتہ و حال صفحہ ۸۶ از لالہ بیج ناتھ رائے بہادر)

ہندو مسلمانون کے جھگڑون اور فسادون سے بھی بالاتر و درازتر اور بسیارتر سنی شیعہ کے مخاصمات تھے، صدیون چلتے رہے ہین، مسلمانون کے زوال اور قوت و حکومت کے ختم ہونے کے بعد ان کا خاتمہ ہوا ہے، یہ روزافزون تھے، ہر فرمانروا کی تخت نشینی یا مقامی حاکمون اور

ناظموں کے ردّ و بدل پر بڑی گرمی اور پورے جوش و خروش سے اٹھ کھڑے ہوتے، اور یہ مغرور انسان، سفاک، و بے درد انسان، اپنے برادران دینی و ملکی کا خون مذہب کے پاک نام پر بہاتا تھا، ان کے معتقدات، طریقِ عبادت، روشِ زندگی سے جو شخص ذرا بھی اختلاف رکھتا، اس قربان گاہ پر بے دھڑک چڑھا دیا جاتا تھا، اس میں شیعہ یا سُنّی کی طاقتور ہی پشت پناہی، پیش قدمی یا حملوں کی تقدیم اور حفاظتی کارروائیوں کی تخصیص و تحدید نہ تھی، یہ خونبار ہنگامے ہر دم ہر ساعت ہوتے رہتے تھے، احتیاط اور بچاؤ کی تمام تدبیریں ان کے سامنے گرد اور ہیچ ثابت ہوتی تھیں،

جلبِ منفعت، خزانہ بھرنے کیلئے کوئی کوئی چابک دست مسلمان فرمانروا جزیہ کا حکم جاری کر دیتا تھا،[۵۱] فی نفسہٖ یہ ٹیکس تھا تو نہایت خفیف اور بے حقیقت سا لیکن مذہب کے برائے نام تعلق اور ایک فرقہ کی تخصیص و تجرید نے اس کی اہمیت کو ہیبت ناک، وحشت انگیز اور ناقابل برداشت بنا رکھا تھا، اسکی سیاسی عظمت؟ العظمة لله الواحد القهار" زمانہ کا بہروپ بدلتا رہتا ہے، کچھ دن بعد جب مصلحانہ اور رعیت پروانہ پالیسی اور مدبرانہ چاپلوسی یا بیسویں صدی کی اصطلاح میں رفارم کا زور ہوتا تو ہوائے موافق کا ایک جھونکا آجاتا، جزیہ کو منسوخ اور سخت گیریوں کو فنا کر کے رکھتا تھا،[۵۲] ہندو رعایا پھر چین کی نیند سونے لگتی، پیٹ بھر کے کھانے پینے کی لذت سے آشنا ہو جاتی، کسی سرپھرے گورنر یا دین کو بدنام کرنے والے امیر کو اپنے

---

۵۱ ص ۲۸۴ ۵۲ مؤلفِ امرائے ہنود (صفحہ ۲۲) سلطان زین العابدین (شاہی خان) کے منصفانہ و عادلانہ احکام کا بصراحت ذکر فرماتے اور لکھتے ہیں، کہ اس نے اپنے باپ (سکندر والی کشمیر) کے جابرانہ و ظالمانہ طور طریق کی تلافی کی غرض سے جزیہ معاف کر کے اپنے تمام ممالک محروسہ سے گاؤکشی کی بھی ممانعت کر دی تھی، (بحوالہ تاریخ فرشتہ و تاریخ ہندوستان مولفہ شمس العلماء ذکاء اللہ خان)

مخالف مفسدہ پردازون کو کچلنے کی سوجھتی، یا انتظامی مصالح و تدابیر کے جذبات موج زن ہوتے، تو خفتہ بخت ہندوؤن کے لئے یہ فرمان ناواجب الاذعان نافذ ہوتا،

حریفِ مے گسارِ صدق آہنگ　　چنیں زد شیشۂ این قصہ بر سنگ

کہ از کفار آن با محتوی خان　　بہ تشہیر و شدند دل دشمنِ جان

منادی کرد یک سر اینکہ دستار　　فرو آرند از سرہاے کفار

دگر بر اسپ ننشینند آنہا　　نشانِ قشقہ شویند از جبینہا

ز پا ہم کفشِ چرمیں دور سازند　　نگشتہ با دلِ رنجور سازند

مقرر شد کلاہ از بہرِ کفار　　فتاد از بامِ طشتِ شانِ دستار

کلہ ہم گاہ گاہے می دہد دست　　بسانِ بدر، ماہے می دہد دست[1]

مین نہین جانتا کہ کن رحم دل رقیق القلب مسلمانون کے طبع زاد یہ احکام و اصول تھے، یا انھون نے کسی قدیم ترآئین شریعت کی تعلیم و ارشاد سے اخذ و اختیار کئے تھے، مگر مورخ اعظم شاہد ہے کہ محتوی خان نے یہ خنجر بیداد ہندوؤن پر چلانا چاہتا تھا[2]، "حریف مے گسار" میر احمد خان نائب صوبہ بھی در پردہ اس منصوبہ مین شریک تھا، تاریخ نگار اس جدت طرازی اور سوجھ بوجھ کا سہرا اکیلے محتوی خان کے سر باندھتا ہے، جس کا عرفی نام ملا عبد الغنی تھا، جس کو دیندار اور باعمل بتاتا ہے، اسکی بعض علمی خدمات کے صلہ مین فضیلت و بزرگی کی قدر شناسی مین، برائے عزت افزائی شاہ عالم بہادر شاہ نے محتوی خان خطاب دیا تھا، کشمیر اس کا وطن تھا، وہین منصب و جاگیر مرحمت ہوئی تھی[3]، اس کا بیٹا ملا شرف الدین بھی عالم شخص تھا[4]، ضرورت وقت سے باپ بیٹے دونون اپنے وطن کشمیر ہی مین اقامت گزین تھے، با اقتدار و صاحب اعتبار تھے،

---

[1] ص ۲۰۹ [2] ۲۰۸ [3] ص ۲۰۹ [4] ص ۲۰۵،

عہدہ داران عامل کی سازش وصلاح سے یہ ہدایتین نافذ کی گئین کہ (۱) ہندو سر پر پگڑی نہ باندھین، ٹوپی پہن سکتے ہین، وہ بھی کبھی (۲) گھوڑے پر سوار نہ ہون (۳) پیشانی پر قشقہ نہ لگائین، (۴) چمڑے کے جوتے نہ پہنین، ع

دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی تراست

اوّل تو ہندوؤن کی خود ایک زبردست و با اثر جماعت تھی، دوسرے دربارشاہی مین ان کو پورا رسوخ حاصل تھا،[۵۱] تیسرے شیعہ بھی ان کے ہمساز و دمساز ہو گئے تھے،[۵۲] محتوی خان اور میر احمد خان کی کوششیں ناکام رہین، اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ مرحمت خسروی کے دریا میں کوئی طغیانی آئی، شاہانہ ترحم و نصفت شعاری کی ایک ہی لہر اس تمام خس و خاشاک کو بہا لے گئی، راعی و رعایا دونون خودبخود فارغ و مطمئن اور شیر و شکر ہو کر رہنے لگے، نہیں، اس کی روداد طویل ہے، مختصراً کہتا ہون، واقعہ طلب اوباش وضع بے فکرے جمع ہو گئے، طلبہ نے بھی سر اٹھایا[۵۳] مثل مشہور ہے، ملا کی دوڑ مسجد تک یہان یہ صورت بدلی، کہ ملا (طالب علم) کی دوڑ ملا (عبدالغنی) تک، شدید شورشیں برپا ہوئین، بڑھتی رہین، محتوی خان اور میر احمد خان کے ہم خیال رفقا کے مشورے ہوئے، موقع پا کر محتوی خان میر احمد کے کنگاش خانہ (کونسل روم) سے بھاگ نکلا، عوام نے پیچھا کیا، فوجین بلائی گئین،

چون این ہنگامہ بر اوجِ سما رفت ❊ ازین رہ میر احمد خان زجا رفت
روان فوجے پےِ احضارِ شان کرد ❊ کہ ہر یک بود در مردانگی فرد
ہمہ از پاے تا سر غرقِ آہن ❊ تو گوئی کرد طغیانِ آبِ جوشن
چو این آوازہ در ہر سو سمر شد ❊ بخانِ معدلت آئین خبر شد

---

[۵۱] ص ۲۸۰، [۵۲] ص ۲۸۴ [۵۳] ص ۲۸۰،

کہ فوجے شد روان مانندِ سیلاب زشمشیر و سپر با موجِ گرداب
زفرمانِ خود از بیمِ خرابی کسے کو بود آتش گشت آبی
پئے تسکینِ مردم بے زتشویش قدم بیرون نہاد از مسکنِ خویش
نداوش دہ کس از بیگانہ خویش خدایش خواند زان در خانۂ خویش[۵۱]

محتوی خان نے سنا کہ فوج متعین ہوئی ہے، مجھ ایسے ناانجام بداندیش کا یار و غمگسار کون ہوگا، اس پر خوف و ہراس غالب ہوا، پہلے خدا کے گھر یعنی پڑوس کی مسجد میں پناہ لی عجز زار نالی بھی کی، بلوائیوں کا ہجوم حملہ آوروں کا نرغہ چاروں طرف سے بڑھتا جاتا تھا، اس جگہ بھی عافیت و امان نہ دیکھی، ناچار خانقاہ معلّی میں چلا آیا[۵۲]، رعایا کی شورش و آمادگی، عوام کا اژدحام فوج کا سنگین مقابلہ، نازنین و پری پیکر، نازک اور البیلی عورتوں کا چھتوں پر چڑھ کر اینٹ پتھر نشانہ بازی کرنا، موسلوں سے مارکوٹ، شہر کی بربادی، محلوں میں آگ لگا دینا، بد معاشیوں اور جفا کاریوں کا نامتناہی سلسلہ تاخت و تاراج کی گرم بازاری[۵۳] اس کو بھی اس مورخ شاعر کی زبان سے سن لیجئے،

ازیں سو پردلان راحربۂ جنگ بکف بود فلاخن[۵۴] از خرِ سنگ[۵۵]
بمرداں صف شکن در عرصۂ کین ندیدہ کس بدین سا فوجِ سنگین
چنان از زندپوشان اجتماع[۵۶] است کہ گوئی غزوۂ ذات الرقاع است
چو شد نزدیک فوجِ خانِ ناظم دران ساعت قیامت گشت قائم
بسانِ شمع از بادِ سحرگاہ تزلزل یافت در پیر و جوان راہ

---

۵۱ ص ۲۰۲ ۵۲ صفحہ ۲۰۲ ۵۳ صفحات ۲۰۱ و ۲۰۳ ۵۴ پتھر پھینکنے کا آلہ، گوپھن ۵۵ بڑا سا پتھر
۵۶ کہنہ پارچہ، دلق، خرقہ،

نشد یک تن مقابل از پئے جنگ   نیامد کس بروے شان بجز سنگ
ز بام خانہا چون بر سر شان   ہکس کرد از دو جانب سنگ باران
فگندہ از دو جانب نوجوانے   برہ چون قصہ خوانان نرد بانے
چو آہن پوش مردان سپاہی   دران ہنگامہ از قہر الٰہی
فراز از بیم سنگ انداز کردند   زنان خبث الحدید آغاز کردند
در آب جوے بار آن تشنگان را   بیفگندند مردم بے محابا
ز قتل نوخطان چہرہ گلگون   چو جدول یک قلم شد سرخ از خون[۱]

محتوی خان کی داستان غم ختم پر آتی ہے، وہ خواجہ عبد اللہ خان میر بخشی صوبہ کے گھر میں سے ملنے گیا، سید اطہر خان دیوان بیوتات نے سن پایا تو بہت سے منصب دارون کے مشورہ و صلاح سے محتوی خان کو وہین ہلاک کرا دیا، اسی ہنگامۂ رستخیز مین اور بہت سے قصور وار، نیز ناکردہ گناہ کام آئے، محتوی خان کے دوست ہون یا دشمن، بے دریغ تہ تیغ کر دیئے گئے[۲] ان شور شون اور فسادات کے زمانہ مین شیعون نے اچھی طرح مورچہ بندی کر لی تھی، خوب مضبوط اور تیار ہو گئے تھے، مجمع عوام اس سے بے خبر نہ تھا، ان کی طرف متوجہ ہوا، یہ تو پہلے ہی سے عوام و خواص کی زبانون پر تھا کہ محتوی خان کا قتل انہی کے ایما و تحریک سے ہوا ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ الزام سچ تھا، یا جھوٹ، بہرکیف ان تیاریون اور اہتمامون کی بدولت بلوائی ان کے محلون پر چڑھ گئے، بھلے آدمیون کو لوٹا، ننگ و ناموس خراب کیا، معصوم بچے، مظلوم عورتین اور مرد تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے، اثنا عشری فرقہ کے مجتہد اور مقتدائے اعظم مولانا شمس الدین عراقی[۳] کی خانقاہ بھی منہدم و مسمار کر دی گئی، ان جفا کوش ستم گارون کی شمشیر زنی

۱؎ ص ۲۸۲ ۲؎ ص ۲۸۴ ۳؎ ص ۱۳۲ و ص ۱۵۱ و ص [illegible] ۔

اور خون آشامی سے شیعہ در کنار، نہ ہندو بچے نہ سُنّی، مورخ کا قلم آگے بڑھتا ہے،

پس از یک چند خانِ صدق تخمیر | دلِ خود جمع کرد از اہلِ تزویر
براے دیدنِ بخشی روان شد | اجل در پردہ با او ہم عنان شد
چو بود از زمرۂ اتراک بخشی | سکون در قتلِ خان انگاشت بخشی
بسی شصت چشم از دہر پوشید | قبائے ہستیش صد پارہ گردید
پس از یک لحظہ خلق شورش انگیز | شدند آتش صفت ہر سو جلو ریز
زوند آتش بخان و مانِ بخشی | مسلم جست لیکن جانِ بخشی
نمودندش سکان بے اعتدالی | زدو بہ بازیِ قومِ شغالی
دگر بر حضرت قاضی دویدند | چو آتش یک نفس آنجا رسیدند
بجرم بے گناہی خانہ اش را | کشیدند آتش و کردند یغما[۱] (باقی)

---

[۱] صفحہ ۲۸۵،

کلیاتِ شبلی فارسی

مولانا شبلی مرحوم کے تمام فارسی قصائد، غزلیات، مثنویات اور قطعات کا مجموعہ جواب تک متفرق طور سے، دیوانِ شبلی، دستۂ گل، بوۓ گل، برگِ گل کے ناموں سے چھپے تھے، اس میں سب یکجا کر دیئے گئے ہیں،

ضخامت ۲۴۴ صفحے، قیمت: عہر

منیجر دارالمصنفین

خاکی

از

جناب غلام مصطفٰے خانصاحب ایم اے ایل ایل بی (علیگ) لکچرار کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی (برار)

حالات اردو کے صوفی شاعر خاکی کے متعلق آج یہ معلومات نذر ناظرین ہیں، ان کا مکمل دیوان حبیب گنج میں ہے، جس کے اوراق کی تعداد اکیانوے ہے، اور اشعار تقریباً اٹھارہ سو ہیں، خط نسخ ہے اور خاتمے کی عبارت یہ ہے:

"تمت تمام شد، دیوان رنگین من کلام توحید انجام سید محمد قادری عرف مدن صاحب

ابن سید جمال اللہ قادری مدظلہم العالی!

بخط نوشت سید حسین قادری عرف شاہ میان، بتاریخ دہم ربیع الاول ۱۱۸۲ھ قلم شد"

اس عبارت سے یہ چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:-

۱- خاکی کا نام سید محمد تھا، اور عرف "مدن صاحب"

۲- ان کے والد کا نام سید جمال اللہ تھا، اور یہی غالباً ان کے پیر بھی تھے، جیسا کہ ان کے بعض اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:-

جمال اللہ مرشد جب دکھا کر یو کون خاکی ... کیا ہے تجکون او محرم مہی نا محرم سوں کیا مطلب

---

[۱] تمکین صاحب نے (تذکرۂ ریختی، ص ۳۶) اس جگہ "مدن صاحب" کی بجائے "بڑے صاحب" پڑھا ہے،

خاکی جمال ذات اپس پیر کوں سمجھ تجلّوں کیا ہے مست جوں پیو سوں ملا

اپنے خاکی کیتں جمالِ اللہ نت پیاسوں ایسے ملا دینا

۳- لفظ "قادری" جو خاکی اور اُن کے والد کے نام کے ساتھ پایا جاتا ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ پیری مریدی میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۵۶۱ھ / ۱۱۶۶ء) کے سلسلے میں منسلک تھے، اسی لئے خاکی نے کئی قصیدے شیخ کی مدح میں بہت عقیدت کے ساتھ لکھے ہیں،

ایک کا مطلع یہ ہے :-

توں بادشاہِ دو جہاں یا غوث الاعظم دستگیر ہے لامکاں تیرا مکاں یا غوث الاعظم دستگیر

ایک اور جگہ کہتے ہیں :-

یوں تصدق ہے غوث الاعظم کا فیض اُن کا ہر آن ہے ہو حق

۴- کاتب سید حسین قادری عرف شاہ میاں بھی غالباً خاکی کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اُس نے اس دیوان کی تکمیل ۱۰ ربیع الاول ۱۱۸۲ھ مطابق دوشنبہ ۲۵ جولائی ۱۷۶۸ء عیسوی میں کی تھی،

۵- فقرہ "مدظلہم العالی" خاکی کے نام کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ خاکی کم از کم ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء تک ضرور زندہ تھے، جب کہ یہ دیوان مکمل ہوا،

یہ چند باتیں تو خاکی کے متعلق بلاشک وشبہہ صحیح ہیں، اب دوسرے مشتبہ حالات کو پرکھنا ہے: میر حسن دہلوی کا تذکرہ جو ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء اور ۱۱۹۲ھ / ۱۷۷۸ء کے درمیان لکھا گیا ہے، اس میں ایک خاکی کا حال پایا جاتا ہے، جو یہ ہے :-

خاکی۔ تخلصِ مردے بود درویش از شاہجہان آباد، در عہدِ جہانگیر، احوالش معلوم نیست[۱]

---

[۱] تذکرہ مطبوعہ علی گڈھ ۱۹۲۲ء، صہ ۲

از یک مرد پیرے ایں شعرش بگوش خورد، از دست"؛۔

ٹھانی ہے اپنے من مین اب تو ہی سجن — تجھ پیم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا

صاحب گل رعنا (ص ۱۱-۱۲) کو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ اس عبارت میں جہانگیر کے بجاے عالمگیر (المتوفی ۱۱۱۸ھ) ہونا چاہئے، اور یہ خاکی وہی ہیں، جن کا دیوان حبیب گنج میں ہے میرا خیال بلکہ یقین ہے کہ ہمارے خاکی بالکل مختلف شخص ہیں اور ان کا تعلق شاہجہان آباد (دہلی) سے نہیں بلکہ دکن سے تھا، ثبوت حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ میر حسن دہلوی نے جس خاکی کا شعر نقل کیا ہے، وہ ہمارے خاکی کے دیوان میں نہیں ہے۔

۲۔ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں، کہ ہمارے خاکی کم از کم ۱۱۲۴ھ ۱۷۱۲ء تک یعنی عالمگیر اورنگزیب کے بھی تقریباً ساٹھ سال بعد تک زندہ تھے، اور یہ زمانہ قریب قریب وہی تھا، جب کہ میر حسن دہلوی نے اپنا تذکرہ لکھا ہے، اب اگر ہمارے خاکی دہلی کے ہوتے، تو میر حسن اپنے ہم وطن اور ہم عصر شاعر کے متعلق صرف اتنا لکھنے پر اکتفا نہ کرتے، کہ "احوالش معلوم نیست"۔

۳۔ جس وقت ہمارے خاکی زندہ تھے، اس وقت تک شاہجہان آباد (دہلی) کی زبان بہت صاف ہو چکی تھی، اور اردو کے چند بہترین شعراء، مثلاً میر، سودا، درد وغیرہ مشہور ہو چکے تھے، ان لوگوں کی زبان ہرگز وہ نہ تھی، جو ہمارے خاکی کی ہے، جن کے یہاں دکھنی زبان و بیان کے علاوہ خیالات بھی ولی کی طرح دکھنی اثر سے متاثر ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ خاکی شاہجہان آباد دہلی کے نہ تھے،

۴۔ ایک اور بات غور طلب ہے، اور میرے خیال میں وہ خاکی کو دکھنی ثابت کرنے میں مدد دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کا پورا دیوان پڑھ جائیے بعض بزرگوں کی مدح میں قصیدے

لہ تذکرہ مطبوعہ علی گڑھ ص ۲،

پائیے گا، لیکن ہندوستان کے صرف ایک بزرگ دکن والے یعنی حضرت گیسو دراز "بندہ نواز" (گلبرگہ) (المتوفی ۸۲۵ھ ۱۴۲۲ء) کی مدح مین صرف ایک قصیدہ ہے، مطلع اس کا یہ ہے:

نزول رحمت رب کریم بندہ نواز ۔۔۔ تون فیض بخش ہو گنج رحیم بندہ نواز

ان باتون سے یقین کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے خاکی دکھنی تھے، جب اتنا ثابت ہوچکا ہے تو پھر دکن کی تاریخ پر نظر جاتی ہے، لیکن ہمین اُس عہد کی کسی تاریخ اور کسی تذکرے مین کوئی خاکی نظر نہین آتے، سوا ان چند زبانی روایات کے جن کا بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا،

۱۔ برار (دکن) کے مشہور شہر امراوتی، اور ایوت محل کے درمیان موٹر کی سڑک پر ایک مقام "نیر ہے، وہان سے ۵۔۶ میل پر ایک گاؤن اجنتی ہی، اور وہان سے ۹ میل پر اڑ گانو ہے مشہور ہے کہ تقریباً پونے دوسو سال ہوئے، کہ موخر الذکر مقام پر خاکی پہونچے، وہان ایک بوڑھا مالی اور اس کی بیوی دونون اپنے باغ کے کام مین مشغول تھے، انھون نے خاکی کو اجنبی اور خستہ حال سمجھ کر کچھ کھانا پیش کیا، خاکی نے دعا کی کہ ان کا خاندان ہمیشہ خوشحال رہے، چنانچہ مشہور ہے کہ اس دعا کی برکت سے اس مالی کا خاندان اب تک بہت طمانیت کی زندگی بسر کرتا ہی،

(۲) خاکی نے اڑ گانو مین کچھ عرصہ کے لئے قیام کر لیا، اور ان کی کرامتون کی شہرت جب اطراف مین ہوئی، تو اجنتی سے بھی ایک ہندو ڈھیڑ (چھوٹی ذات والا) ملکو نامی[1] ان کی خدمت مین روز پہنچتا تھا، خاکی نے اُسے مستفیض کرکے صاحب کرامت بنا دیا، اس بھلے آدمی نے خاکی کی روانگی کے بعد خاکی کی ایک مصنوعی قبر اجنتی مین بنالی تو اڑ گانو والے کیون پیچھے رہتے؟ انھون نے بھی ایک قبر اپنے لئے تیار کر لی، اب دونون مقامون پر خاکی صاحب کا عرس ہوتا ہی،

---

[1] مرہٹون کی اصطلاح کا ایک لفظ "بوا" بھی اس کے نام کے ساتھ بولا جاتا ہے، جو صرف مقدس ہستیون کے لئے مستعمل ہے،

اجنتی مین اتنا ہوا کہ ملکو کے مرنے کے بعد اسے خاکی کی مصنوعی قبر کے قریب دفن کر دیا گیا، اور اس وقت سے اب تک وہان مُردون کو جلاتے نہین ہین، بلکہ دفن کرتے ہین، خدا جانے خاکی کس خاک مین سو رہے ہین لیکن وہان یہ مشہور ہی، کہ وہ پاک پٹن (پنجاب) چلے گئے تھے، اور وہین انکی اصلی قبر ہے،

(۳) ایک اور قصہ خاکی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے، جو دوسرے بزرگون کے ساتھ بھی منسوب ہی، وہ یہ کہ خاکی اُٹاگانو مین بیٹھے ہوئے کچھ وظیفہ پڑھ رہے تھے، یکایک انھون نے اپنے مصلے کے نیچے ہاتھ ڈالا، تھوڑی دیر مین ہاتھ باہر کھینچا، تو وہ کیچڑ مین لتھڑا ہوا تھا، کچھ عرصہ کے بعد ایک جہاز کا مالک آیا، جس سے معلوم ہوا کہ خاکی صاحب نے اُس کے جہاز کو ڈوبنے سے بچایا تھا،

خاکی کی سخن گستری حبیب گنج والے نسخہ مین جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے اکیانوے ۹۱ اوراق ہین ہر صفحے پر عموماً دس شعر ہین، اقسام نظم یہ ہین :-

(۱) غزلین، جو سب کی سب عشقِ حقیقی کے نغمون سے پُر ہین،

(۲) قصیدے، کئی قصیدے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مدح مین ہین، ایک قصیدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت مین ہی، جس کا مطلع یہ ہی :-

صاحب شجاع وبھیلی بے شک ولی اللہ علیؓ ۔۔۔ نین ہی جدا حق سون کبھی بیشک ولی اللہ علیؓ

ایک اور قصیدہ حضرت گیسو دراز "بندہ نواز" کے متعلق ہی جس کا ذکر اوپر آچکا ہی،

(۳) کئی مستزاد ہین،

(۴) ایک مثنوی بھی ہی جس مین پچپن ۵۵ اشعار ہین، ارکانِ اسلام کی تاویل صوفیانہ رنگ مین کی گئی ہی، شروع کے اشعار یہ ہین :-

کہوں کیا زباں سوں خدا کی صفت — صفت ہو کہ موجود ہے سب جگت
خدا کوں صفت سب سزاوار ہے — وہی جُز و کُل کا سدا یار ہے
جنے حق کوں پایا جہان مین نہین — رہے ہو کے اعمیٰ حشر تک وہین
سمجھ کر اپس کے اول جیو کوں — اپس جیو مین دیکھ لے پیو کوں
فرائض تو باطن کے ہین پانچ جان — بیان کھول کرتا ہون سن کوں پچھان
محمدؐ کے جیب نور مین رب کا نور — دسے پر سمج او ہی کلمہ ظہور
مثال اس کی کہتا ہون کر گیان توں — اسے سُن اتا دل کے توں کان سوں
کہ جوں ماہ کے نور مین تج دسے — کہ خورشید کا نور اس مین بسے
جو نورٌ علیٰ نُور حق نے کہا — سمج اس کتین بے خبر کیون رہا
محمدؐ کے نت نور مین ذات کون — کہ پاتا ہے او صلوٰۃ ربطوں
وصل پا کے واصل جیپی بات کوں — اُسنے ہور کہے بلکہ او ذات سوں
وصل پا خدا سوں جو باتاں سنے — صلوٰۃ ربطوں سوں ادا ہوے اونے
سمج لے خدا کا بھی ہے قول یوں — سخن رب سوں کرنا نماز بطوں

دیوان مین خاکی کی سخن گستری بس انہی اقسام تک محدود ہے، لیکن گُلِ رعنا (صفحہ ۱۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ انھون نے ایک مثنوی فیض عام بھی لکھی تھی، جو مولوی عبدالرزاق صاحب مرحوم (چیف ٹرانسلیٹر، ناگپور) کے کتب خانہ مین تھی، زمانہ طالب علمی ہی سے جب کہ مین علی گڑھ مین تھا، مجھے یہ اشتیاق پیدا ہوا تھا کہ چونکہ میرے وطن جبل پور سے ناگپور قریب ہے، اس لئے مین آسانی کے ساتھ اس مثنوی کا پتہ چلا سکون گا، مولوی صاحب مرحوم[1] کی زیارت مجھے نصیب

---

[1] مولوی صاحب مرحوم کے صاحبزادہ حمید الرزاق صاحب بھی اپنے والد صاحب کے عہدہ پر فائز ہین، ان کے

ضرور ہوئی لیکن افسوس ہو کہ مین انھین اس سلسلہ مین نہ پہچان سکا تھا، اب ان کے بھائی عبد الستار صاحب سے شہر ایلچپور (برار) مین وہ مثنوی دیکھنے کو ملی، اس کی تفصیل انشاء اللہ پھر کبھی پیش کرون گا، ابھی مختصراً اتنا عرض کرتا ہون کہ وہ مثنوی خاکی کی نہین ہو، بلکہ ایک دوسرے شاعر عبد المحمد کی ہے، مثنوی سے معلوم ہوتا ہو کہ سید محمد صاحب "مہدی" جونپوری (المتوفی ۹۱۰ھ ۱۵۰۵ء) کے کوئی صحابی" شیخ ویش (؟) تھے، ان کے پوتے مصطفےٰ تھے جنھون نے مہدوی عقائد کی بہت تبلیغ کی تھی، اسی کی تفصیل اور مصطفےٰ کے حالاتِ زندگی پر یہ مثنوی مشتمل ہو، تقریباً چار ہزار اشعار ہین، اور اس طرح حمد سے شروع ہوتی ہو:-

خدا کی کرون صفت اول بیان بنایا جنے سب زمین آسمان
بھی انسان کون خاک سیتی کیا انا ستر ہ شرف اس کون دیا
جنے جان کون آگ سو کر بدن پری جن کا تستین بنجا رتن

یہ قصہ دراصل کسی شیخ آدم نے فارسی مین لکھا تھا جس کا یہ دکھنی منظوم ترجمہ عبد المحمد نے کیا ہو، خود شاعر کہتا ہو:-

آنا سُن بیان اس قصے کا ای یار اگر تو اچھے دل ہنے ہوشیار
میان مصطفےٰ کا قصہ فارسی بنایا تھا دل کھول جیون آرسی
میان شیخ آدم نے کر کر بیان سو بولے تھے اس کون مبارک زبان
ولے اَن پڑھیا اس کون کیا بوجھتا کہ جیسے اندھے کون نہین سوجھتا
سہل کر کو دکھنی میں جوڑی کتاب سمجھنے مین ہر اک کے آوے شتاب

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۲) یہان مہدوی" مذہب کے متعلق کافی کتابین ہین، سید محمد صاحب "مہدی" کا ایک اور فقرہ مین نے ایک کتاب میں یہ دیکھا ہو، "ہون تو ون میانے خدا بہتر کے محب ہے جیو"

کیا ہی یو دکھنی زباں سوں کلام رکھا نا نو اس کا یقین فیض عام

اب ہم اس مثنوی کے آخری اشعار نقل کرتے ہین جس سے شاعر کا نام اور تاریخ تالیف معلوم ہوسکے گی :-

نوین چاند شعبان کی رات کوں
خدا نے یو آخر کیا بات کوں

اتھا سن ہجری جداں یک ہزار
بھی یک سو پو چالیس یک در شمار

سو عبدالمحمد نبیؐ کا غلام
خدا کے فضل سے کیا یو تمام

اِتا چاہتا ہے یو عاجز غریب
کہ ہو عاقبت بیچ نیکی نصیب

کہ یعنی خدا آپ کر کر فضل
سوا یمان بخشے عطا بے خلل

شریعت نبیؐ کی اوپر مستقیم
رکھے آپ صاحب غفور الرحیم

پڑھے جو میان مصطفےٰ کا ذکر
بھی جو کر عقیدہ سنے کان دھر

تو اپنی زبان سون خدا کے بدل
دعا سوں کرے یاد صاحب عقل

وگر جو خطا چوک دیکھیں کبھی
تو کر عیب پوشی سنو ادین سبھی

نبیؐ پر درودان پڑھو بے شمار
بھی مہدی پہ بھیجو سلامان ہزار

ان اشعار مین صاف بتلایا گیا ہی کہ عبدالمحمد نے (شب پنجشنبہ) ۹ شعبان سنہ ۱۱۴۱ھ (مطابق ۲۷ فروری سنہ ۱۷۲۹ء) کو یہ مثنوی مکمل کی یعنی یہ شخص ہمارے خاکی سے کم از کم چالیس سال پہلے ہوا ہے اور وہ مہدوی بھی تھا، اسی لئے خاکی کے برعکس اس نے حمد و نعت کے بعد سید محمد "مہدی" جونپوری اور ان کے بعض خاص "صحابہ" کی منقبت بھی لکھی ہے،

کیا خاکی نے بھی ریختی لکھی تھی ؟

جناب تمکین صاحب نے تذکرۂ ریختی ص ۳۶ مین خاکی کے ان اشعار کو ریختی کہا ہی :-

پیا بن اے سہیلی انجھوان سوں مکھ دھوتی ہوں — کبھی میں ممتنع گہرا اندھارا دیکھ روتی ہوں
کرو پیو پیر تسین ظاہر ہوئے سب بل ساہو سکیاں — جنم سب ہجر میں غم کے ترے بن نت پو کھوتی ہوں
پو جاری میں ممکن ہووے جب دیکھ بالا سوں — بھٹی سوں برہ کی تب میں نکل پیو سات ہوتی ہوں
رہوں میں کب تلک جھرتی جلا کر دل کتیں کڑتی — کداب غم کے پہاڑوں پہ بھلا ہے سر بڑدتی ہوں
رہوں کیوں ابتدا میں میں دسے جب انتہا مجھ کوں — فنا فی الشیخ ہو کر میں بقا باللہ ہوتی ہوں
سجن کا ورد کرنے کو محبت کے پو رشتہ میں — سدا میں من کے منکوں کوں اپس پلکوں پروتی ہوں
درخت عاشقی کوں میں فقر کے پھول پھل ہونے — نت اٹھ کر دل بن میں اپنے تخم عشق بوتی ہوں
کروں ممکن کہ ساتی میں کبھی سیر لدنی کا — چلوں جب باٹ لے پیو کی یوں دھب تن کوں دھوتی ہوں
مدوسوں شاہزادہ کی ترقی پاکے اے خاکی — کبھی وحدت کے دریا میں مرائے پن ڈبوتی ہوں

خاکی کی اس قسم کی شاعری کو بعض ادیبوں[۵۱] نے ریختی سمجھ لیا ہے، بلکہ ہاشمی بیجاپوری (م ۱۶۹۷ء) کو بھی اسی خیال کے تحت میں ریختی کا پہلا شاعر قرار دیا ہے، لیکن مولانا عبدالسلام ندوی[۵۲]، پروفیسر مسعود حسن رضوی[۵۳]، جناب مبین نقوی[۵۴] وغیرہ کے خیال کے مطابق ایسی شاعری کا شمار بھاشا میں ہوگا، جس میں عورت کا خطاب مرد سے ہے، میری رائے بھی یہی ہے، کیونکہ ریختی میں عورتوں کے جذبات، خیالات اور احساسات کے علاوہ ان کی زبان اور اصطلاحات کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے، اور ساتھ ہی "عریانی" کی جھلک بھی آجاتی ہے، یہ بالکل حقیقت ہے، جو تمام ریختی گو شعراء کے یہاں پائی جاتی ہے، اور جس کا انکار مشکل ہے، ریختی کی یہ تعریف ذہن میں رکھتے ہوئے خاکی کے مذکورۂ بالا اشعار دیکھے جائیں تو صاف روشن ہو جائیگا کہ

---

۵۱ اردو شہ پارے (جلد اول صفحہ ۲۵۹) تذکرۂ ریختی (صفحہ ۲ مقدمہ) وغیرہ ۵۲ شعر الہند (جلد دوم صفحہ ۳)
۵۳ مجالس رنگین (مقدمہ صفحہ ۷) ۵۴ تاریخ ریختی (مقدمہ صفحہ ۳)

ان کا تعلق ریختی سے نہین، بلکہ بھاشا سے ہے جس کا اثر اُس زمانہ مین دکن مین ضرور تھا،

خاکی کا تصوف اس عنوان کا یہ مقصد نہین ہو کہ خاکی کے خیالات تصوف مین کوئی خاص درجہ رکھتے ہین، بلکہ صرف یہ بتانا ہو کہ وہ کس صوفی شاعر کے پیرو ہین، ان کے اٹھارہ سو اشعار پڑھ جائیے کہین عشق مجازی کی جھلک بھی نہ ملے گی، انھون نے جو کچھ کہا شاعر کی حیثیت سے نہین بلکہ صوفی بن کر کہا، پھر بھی ایسا کہا کہ وہ اردو کے صوفی شعرا مین ممتاز سمجھے جائین گے،

ہمارے صوفی شاعر عموماً "المجاز قنطرۃ الحقیقۃ" پر کاربند رہتے ہین، اور اس گروہ مین جامی (م ۱۴۹۲ء) بہت ممتاز ہین، چنانچہ وہ اپنی مثنوی "یوسف زلیخا" میں صاف کہتے ہین :-

دلے فارغ ز درد عشق دل نیست — تنے بے دردِ دل جز آب و گل نیست[1]

متاب از عشق رو گرچہ مجازی ست — کہ این بہر حقیقت کارسازی ست

بلوح اول الف باتا نخوانی — ز قرآن درس خواندن کے توانی ؟

دوسرا گروہ حقیقت ہی حقیقت دیکھنا چاہتا ہے، اور مجاز سے نفرت رکھتا ہے، مثلاً مولانا رومؒ (م ۱۲۷۳ء) فرماتے ہین،

عشقہائے کز پئے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود

عشق نبود آن کہ در مردم بود — این فساد از خوردنِ گندم بود

عشق با مردہ نہ باشد پائدار — عشق را بر حیّ و بر قیوم دار

اس دوسرے گروہ میں ہمارے خاکی بھی شامل ہین، جو مولانا رومؒ کی طرح مجاز

---

[1] علامہ اقبال نے تن اور دل کے لئے خوب پیغام پیش کیا ہے:-

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے — تنے محکم تر از سنگین حصارے

درونِ او دلے درد آشنائے — چو جوئے در کنار کوہسارے

(پیام مشرق ص ۱۰۱)

کے متعلق بقولِ جگر یہ سمجھتے ہین، کہ ع

لطف کچھ دامن بچا کر ہی گذر جانے مین ہے

اسی لئے خاکی تو یہان تک کہتے ہین:۔

جو کرتے ہین عالم سو شادی نہین — کہ احمق ہین کرتے ہین شادی یہین
جسے اس حقیقت کا لذت لگے — مجازی طرف دل کبھی نہ جھکے
مجازی حقیقت سوں کرنین جُدا — نظر سو حقیقت پہ رکھ توں سدا
خودی چھوڑ کر پا خودی کوں سدا — خودی بن نہ ہوئے گا حاصل خدا (مثنوی)

چنانچہ مولنا رومؒ اگر اس بات پر زور دیتے ہین، کہ

گرچہ آن وصلت بقا اندر بقاست — لیک در اوّل بقا اندر فناست
آئینہ ہستی چہ باشد نیستی — نیستی بگزین گر ابلہ نیستی

تو خاکی بھی کہتے ہین :۔

نین فنا کوئی شئے ہے عین بقا — نفی کہتے سو ہے وہی اثبات
یون سمجھ عارفانِ جزو کل ہین — ہور ہین ہے سدا وہی یک دھات (مثنوی)

اسی لئے اس دنیا کو "مزرع الآخرۃ" سمجھتے ہوئے ارکانِ اسلام کو صوفیانہ رنگ مین پیش کرتے ہین :۔

سمجھ لے خدا کا بھی ہے قول یون — سخن رب سون کرنا نماز بطون
طلب جس کوں ہے حق کے دیدار کا — وہ ہے روزۂ باطنی یار کا
ہے افطار، دیدار دیکھا ہے جن — نہین کس کون افطار دیدار بِن
گواہی ہے اس پر حدیث نبیؐ — اسی کا کہا ہون بیان مین بھی

جو چوتھا فرض ہے زکواۃ بطون | بیان اس کا کرتا ہون سُن خوب تون
محمدؐ کے جن نور ہور ذات کون | اگر پا کے ظاہر کرے خلق سون
سچ سے یو باطن کا ہے گا زکواۃ | کیا ذکر تحقیق کریں یو بات
فرض پانچوان یار اوبوج حج | بیان کھول کرتا ہون اس کون سچ
ایس دل کون پا، دل کا کرنا طواف | وہی حج اکبر ہے نیں ہے خلاف
کہ او دل جسے نین ہر یو، دل نہین | نہ سمجھے تون یو مضغۂ گوشت کین
کہین ہین نبیؐ قلب مومن دوام | کہ بے شک ہے اوکعبۃ اللہ مُدام
شریعت کے لوگاں کون دعوت کرون | کندوری کون وحدت کے آگے دھرون
انا مین طریقت کی شادی گناؤن | حقیقت کے دولا دولن کون ملاؤن
اوشاہد امین کنج مخفی میں جب | بچھونے کون کرلائے دو لی کون تب
کہ دولا بھی عاروس یک جا ملے | لگے وصل میں محو ہو جا کلے
مشاطہ کون دولے نے اس وقت کھو | ملا جا کہ عاروس سوں ایک ہو (مثنوی)

خاکی نے جگہ جگہ رومیؒ کا اتباع کیا ہو، رومی اپنے پیر کے متعلق کہتے ہین :-

شمس در خارج اگرچہ ہست فرد | مثل او ہم می تواں تصویر کرد
لیک آن شمسے کہ شد ہستش اثیر | نبودش در ذہن و در خارج نظیر
در تصور ذاتِ اورا گنج کو | تا در آید در تصور مثل او
شمس تبریزی کہ نور مطلق است | آفتاب ست وز انوارِ حق است

ایک جگہ اور فرماتے ہین :-

دستِ پیر از غائبان کوتاہ نیست | دستِ او جز قبضۂ اللہ نیست

اسی طرح خاکی پوری عقیدت کے ساتھ اپنے پیر کا درجہ بیان کرتے ہین :-

مرشد جمال اللہ ہے خاکی وہی اللہ ہے ۔ کل شیئ لوجہ اللہ ہے جا دیکھ در قرآن مجید

عین اللہ جمال اے خاکی ۔ جس سون پایا نشان ہی ہو حق

عین اللہ ہے جمال اللہ ۔ خاکی اس کے قدم پہ جا جائی

جمال اللہ کون کل مین دیکھ رہنا ۔ کفایت ہے کفایت ہی کفایت

لیکن جس طرح رومیؒ اپنے لئے بلکہ پیر کے لئے بھی شریعت مقدم سمجھتے ہین :-

رہبر راہِ طریقت آن بود ۔ کو بہ احکامِ شریعت می رود

گر نباشد در عمل ثابت قدم ۔ چون رہاند خلق را از دستِ غم

اسی طرح خاکی نے بھی صوفی کے لئے شریعت کو پہلی منزل قرار دیا ہے :-

یہو کا تون مقام پاوے تب ۔ جب کرے تون عروج نہ درجات

اولاً پاک ہو شریعت سون ۔ نفس کے دور کر تون سب خطرات

تب طریقت میں رکھ قدم اپنا ۔ لے حقیقت کا دیکھ کر لذات،

خاکی دریا کون معرفت کے پیر ۔ موج عرفان مین تو بنیک ذات

خاکی کے تصوف کے علاوہ زبان پر بحث کرنا ضروری نہین معلوم ہوتا، کیونکہ ان کی زبان وہی ہے، جو ولی کے عہد کی ہے اور ناظرین خود بھی اندازہ لگا سکتے ہین :

گلِ رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اسکی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد کے اردو شعراء کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار، اردو مین یہ شعراء کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے جس مین آب حیات کی غلطیون کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی سے لیکر حالی اور اکبر تک کے حالات، قیمت للعہ، ۵۴۰ صفحے "منیجر"

تلخیص و تبصرہ

امام غزالی غیرون کی نظرون مین

مسلم ورلڈ بابت ماہ جنوری ۱۹۴۲ء مین پرنسٹن یونیورسٹی کے ایک عیسائی اہلِ قلم کا امام غزالی پر ایک مقالہ شائع ہوا ہے، جس کی تلخیص ذیل مین درج کیجاتی ہے،

علامہ سبکی نے امام غزالی کے متعلق فرمایا، کہ "انھون نے دنیا کی طرف پیٹھ کر لی، اور وہ خلوت اور جلوت مین خدا کے لئے وقف ہو گئے" غزالی نے جب دنیا چھوڑی تھی، اس وقت ان کو وہ تمام اعزاز و امتیازات حاصل تھے، جس کا ایک علامۂ اجل کے لئے حاصل کرنا ممکن تھا، نظام الملک کے دربار مین امام الحرمین کے جانشین ہوئے، مدرسۂ نظامیہ مین کوئی اور استاد ان سے زیادہ جلیل القدر تسلیم نہین کیا جاتا تھا، اور وہ امام خراسان اور امام العراق کے لقب سے مشہور تھے طلبہ کی ایک جماعت اسباق سننے کے لئے جمع رہتی تھی، عمائدِ ملک ان کی عنایات کے محتاج رہتے تھے، ان کی شہرت اسلامی ممالک کے ہر گوشہ مین پھیل رہی تھی، سلجوقیون کا دار السلطنت بغداد[1] گویا انہی کے زیرِ نگین تھا، لیکن پھر بھی ان کی روح کو چین اور اطمینان حاصل نہ تھا، ان کو اپنی صلاحیتون، غیر معمولی ذہانت اور حیرت انگیز محنت اور مشقت کی قوت کا احساس تھا، اس احساس برتری مین وہ اپنے ہمعصر علماء و فضلاء کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، لیکن یکایک انھون نے دنیا چھوڑ دی، اور جاہ و شوکت، دبدبہ و حشمت اور عزت و شہرت سے بے نیاز

۱؎ معارف: سلجوقیون کا دار السلطنت نیشاپور تھا،

ہوکر ایک نئی زندگی اختیار کرلی، ان کا خود بیان ہو کہ ان پر خشیت الٰہی ایسی طاری ہوئی کہ خدا کے سوا ہر چیز ان کے ذہن سے محو ہوگئی، جن اثرات سے ان کی زندگی کا قالب یکایک بدل گیا، ان کو انھون نے اپنی سوانحعمری المنقذ من الضلال مین قلمبند کیا ہی، وہ لکھتے ہین میری زندگی کی ابتدار ایک مقلد کی حیثیت سے ہوئی، لیکن طبیعت تحقیقات کی طرف مائل تھی، اس لئے تقلید کی بندشون سے آزاد ہوکر عقلیات کی جانب متوجہ ہوا، مگر عقلیات مین بھی شک ہونے لگا، پھر تشکیک کے بعد تصوف کا دور شروع ہوا جو عقلیات سے ماورار ہے، اور جس مین تمام علوم عالم بالا سے حاصل ہوتے ہین، اللہ تبارک وتعالیٰ نے میرے ذہن کی ژولیدگی دور کردی اور مجھ مین عقل اور توازن کا ظہور ہونے لگا، مجھکو سکون دلائل وبراہین سے حاصل نہین ہوا بلکہ ایک ایسے نور کی بدولت جس سے میرا قلب منور ہوگیا،

احیار العلوم کی ضخیم شرح کے مصنف سید مرتضیٰ کی روایت ہو کہ ایک دن امام غزالی وعظ کہہ رہے تھے، کہ اتفاق سے وہان ان کے بھائی احمد غزالی آنکلے، اور بھائی کو مخاطب کرکے یہ اشعار پڑھے،

واصبحت تھدی ولا تھتدی وتسمع وعظا ولا تسمع

تم دوسرون کو ہدایت کرتے ہو لیکن خود ہدایت نہین پکڑتے، اور وعظ سناتے ہو، لیکن خود نہین سنتے،

فیا حجر الشحذ حتی متی تسن الحدید ولا تقطع

اے سنگِ فسان! کب تک تو لوہے کو تیز کرتا رہیگا لیکن خود نہ کاٹیگا

یہ اشعار سنتے ہی امام غزالی دنیا سے کنارہ کش ہوگئے، اس کنارہ کشی مین انھون نے دنیا سے تو منہ موڑ لیا، لیکن فلسفۂ اخلاق کے ایسے ضوابط اور قوانین بنائے، جن کی تقلید انھون نے خود سختی سے کی، یہ فلسفۂ اخلاق احیار العلوم کے مطالعہ سے معلوم ہوسکتا ہی، لیکن

اس کا خلاصہ غزالیؒ کے ایک مختصر رسالہ القواعد العشرہ میں درج ہے، جس کی تلخیص ذیل میں دی جاتی ہے،

(۱) ارادے ہمیشہ اچھے اور ان میں پائداری ہونی چاہئے، مگر ارادوں میں دنیاوی اغراض وابستہ نہ ہوں، اور جب کسی ارادہ میں دنیاوی غرض نہ ہو تو اس کی تکمیل کے لئے پوری کوشش کرنی چاہئے، لیکن اس کے نتائج کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہمیشہ محتاج رہنا چاہئے،

(۲) مقاصد میں اتحاد ہونا چاہئے، یعنی ہر مقصد کے سامنے خدا ہو، اور حصولِ مقصد کا ذریعہ ہر حال میں سچائی اور راستبازی ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ کی بندگی دنیا سے علحدگی ہی میں ہوسکتی ہے، یعنی بندہ جسمانی طور سے دنیا میں رہے، لیکن روحانی حیثیت سے ایسی دنیا میں رہے، جہاں بقا ہو، اس دنیا میں اس کا وجود ایک رہرو یا مسافر کا ہونا چاہئے، یہ گویا توکل کی تعلیم ہو، اس توکل کا معیار یہ ہو کہ اگر کسی کو جَو کی روٹی میسر ہو تو اس کو گیہوں کی روٹی کی خواہش نہ ہونی چاہئے، اور ایک مٹھی جو ہو تو سونے کی طرف بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھتا ہو، اور اس توکل میں خواہ وہ کیسے ہی آلام ومصائب میں مبتلا ہو جائے، لیکن خدا کی ذات پر ہمیشہ اس کا بھروسہ قائم رہنا چاہئے، کسی حال میں بھی اس کی طرف سے اپنے دل میں شک وشبہہ کا گذر نہ ہونے دے،

(۳) سچائی کا دامن ہمیشہ ہاتھ میں رہے، اس کی خاطر عیش وعشرت اور تمام نفسانی لذتوں کو چھوڑ کر مصیبت میں گرفتار ہو جانے سے گریز نہ کرتا ہو، اگر یہ درجہ حاصل ہو جائے تو سچائی کو وہ اصلی حقیقت میں دیکھنے کا عادی ہو جائے گا، اس طرح نیند میں بھی وہ بیدار رہے گا، جلوت میں بھی اوس کو خلوت نظر آئے گی، اشتہا میں بھی آسودگی محسوس ہوگی، اور

اس کو سارے اعلیٰ امتیازات اور ادنیٰ درجہ کے اوصاف معلوم ہون گے، اسکی تقریرین بھی خاموشی نظر آئیگی، اور زیادتی کمی سے بدل جائیگی،

(۴) کسی شخص کے وہم تفاخر اور غرور کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے عقائد مین راسخ نہین ہوتا ہے، اس لئے اخلاق کا ایک اہم جزء راسخ العقیدگی ہے، بدعت سے عقیدہ مین پختگی پیدا نہین ہوتی ہے، اس لئے اصول و روایات کی پابندی ضروری ہے، غزالیؒ ایک آزاد متفکر تھے لیکن انھون نے مقررہ اصول و روایات کی پابندی کی دعوت دی، حالانکہ عملاً وہ خود روایات کی پابندی سے آزاد تھے لیکن یہ خیال رکھنا چاہئے کہ غزالی کا تعلق عوام کی تعلیم سے تھا، اور عوام کی آزادانہ راے اور فکر پر ان کو اعتماد نہین تھا، اس لئے وہ راے کی افراتفری کے بجاے مستند روایات کی تقلید کو زیادہ بہتر سمجھتے تھے،

(۵) غزالیؒ کام مین تعویق و التوا کسی حال مین بھی پسند نہیں کرتے تھے، انھون نے عمل مین عزم کے ساتھ سرگرمی کی تلقین کی،

(۶) بندون کو ہمیشہ اپنے عجز کا احساس رکھنا چاہئے یعنی یہ خیال ہمیشہ جاگزین رہنا چاہئے، کہ وہ محض لاچار اور عاجز بندے ہین، ان کے ذریعہ سے جو کچھ ہوتا ہے، وہ اللہ تبارک تعالیٰ ہی عمل مین لاتا ہے، لیکن اس احساس کے یہ معنی ہرگز نہین ہین، کہ وہ کاہل ہو جائین اور آزادانہ طور سے کام بجا لانے سے غافل رہین، بلکہ اس احساس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ خاکسار اور متواضع ہوں، اور بنی نوع انسان کی عزت اور عظمت اون کے دلون مین ہو،

(۷) بندوں کو اپنی نجات کی امید اپنے عمل سے نہین، بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات سے رکھنی چاہئے، نجات اسی کی رحمتون اور برکتوں سے ملتی ہے، پالؔ[1] نے بھی یہی تعلیم دی

---

[1] معارف :۔ پال اور امام غزالی کی تعلیم مین جو اسلام ہی کی تعلیم ہے، آسمان و زمین کا

ممکن ہو غزالی نے پال کی تعلیمات سے استفادہ کیا ہو، یا دونون اپنے مذہبی تجربات سے اسی نتیجہ پر پہونچے ہون،

(۸) اصلی زندگی وہ ہے جو ریاضت اور عبادت مین گذرتی ہے، ریاضت اور عبادت کے بغیر روحانیت حاصل نہیں ہوتی،

(۹) مسلسل ریاضت و عبادت سے مراقبہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، جس سے ایک بندہ پر احوال طاری ہوتے ہین، اس طرح اس کے دل میں اللہ تبارک وتعالی کے سوا کوئی اور چیز نہیں رہ جاتی، اور وہ صرف ایک ہی حقیقت دیکھتا ہے، اور وہ جو کچھ دیکھتا ہے، تو خدا ہی کے ذریعہ سے دیکھتا ہے، اور جو کچھ محسوس کرتا ہو، خدا ہی کے واسطہ سے محسوس کرتا ہے لیکن ان کیفیات کے باوجود وہ اللہ تبارک وتعالی کے بندون کے ساتھ بہت ہی اخلاق اور تواضع کے ساتھ پیش آتا ہے،

(۱۰) ایک بندہ کے علم کی نشان یہ ہے کہ اس مین تقدیس ہو تاکہ وہ اللہ تبارک وتعالی کا مشاہدہ کرسکے، اور اس تقدیس کی پابندی ظاہر اور باطن دونون مین ہو، چنانچہ اعمال حسنہ مین ہر حال مین مداومت و استقلال ہونا چاہئے، اعمال حسنہ کے بغیر ایک بندہ محاسن اخلاق سے بالکل عاری ہے، "ص۔ ع"

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۳) فرق ہے، پال کی تعلیم یہ ہے کہ شریعت گناہ ہے، صرف ایمان کافی ہے، اور یہ کہ کوئی عمل کے ذریعہ سے نجات نہین پائے گا، بلکہ مسیح پر ایمان لانے سے (رومیون ۳-۲۰) اور امام غزالی کی تعلیم یہ ہے کہ شریعت پر عمل کرنا ضرور ہی، مگر نجات اور فلاح کو اپنے عمل کا نتیجہ نہ سمجھو بلکہ خدا کے فضل کا،

پولینڈ کے مسلمان

ایشیاٹک ریویو بابت ماہ جولائی ۱۹۴۱ء کے ایک مقالہ نگار کا بیان ہے، کہ ۱۳۸۶ء سے ۱۵۶۹ء تک لتھونیا پولینڈ کا ایک جز تھا، لتھونیا میں تاتاری مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ہے، جن کی مجموعی تعداد پندرہ ہزار بتائی جاتی ہے، ان کا ایک بڑا مرکز ولنو میں ہے، جب پولینڈ ۱۵۶۹ء سے لتھونیا علحدہ کیا گیا، تو تاتاری مسلمان بہت سے سیاسی اور مذہبی مشکلات میں گرفتار ہو گئے، کے آئین کے روسے وہ نہ کسی عیسائی کو ملازم رکھ سکتے تھے، نہ کوئی نئی مسجد تعمیر کرسکتے تھے اور نہ پرانی مسجد کی مرمت کرا سکتے تھے، اشاعتِ اسلام کی سزا موت تھی، ۱۶۱۵ء کے آئین کے مطابق کسی عیسائی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتے تھے، اب تک وہ اپنے سرداروں کے ماتحت ہوتے تھے، لیکن قانوناً اس سرداری کے نظام کا بھی خاتمہ کر دیا گیا، ۱۶۲۰ء میں جب پولینڈ اور ترکی میں جنگ چھڑی تو ان تاتاری مسلمانوں کی حالت اور بھی بدتر ہوگئی، جائدادیں ان کے حقوق بہت ہی محدود کر دیئے گئے، اس ظلم و ستم سے گھبرا کر وہ لوگ کریمیا اور ترکی ہجرت کرنے لگے، یہ صورت دیکھکر پولینڈ کی حکومت نے اپنے رویہ میں تبدیلی کی، اور ۱۶۵۹ء کے آئین نے اُن کو ان کے پرانے حقوق دینے کی کوشش کی، پولینڈ کے اہلِ قلم نے ان کی وفاداری کو سراہنا شروع کیا اور مسلمانوں نے بھی اپنے اس وطن کا پورا حقِ خدمت ادا کیا، چنانچہ کارکو یونیورسٹی کا ایک پروفیسر اپنی کتاب "دی مسلمز" میں لکھتا ہے، کہ "پولینڈ کے تاتاریوں نے اپنے وطن کی فدائیانہ خدمت شجاعانہ حد تک کی ہے،"

ان تاتاریوں کا بڑا مرکز ولنو میں ہے، وہاں ان کا ایک مفتی رہتا ہے، اس شہر میں ان کے ثقافتی نظام کے بہت سے مرکزی دفاتر بھی ہیں، وارسا میں ان کی تعداد کم ہے، لیکن یہاں اُسے

بہت سے مسلمان ہیں، جو سوویٹ روس کریمیا، قازان، کوہ قاف اور یورپ کے مختلف حصون سے آکر آباد ہو گئے ہیں، ایرانی اور ترک بھی ہیں، جو مختلف چیزون کی تجارت کرتے ہیں، بیسوین صدی کے آغاز مین نامعلوم اسباب کی بنا پر پولینڈ کے بہت سے مسلمان نیو یارک میں مستقل طور پر متوطن ہوگئے، لیکن انھون نے پولینڈ سے بھی اپنا تعلق قائم رکھا، چنانچہ جنگ عظیم مین جب پولینڈ کی مسجدون کو نقصان پہنچا تو نیو یارک کے ان مسلمانون نے ان کی مرمت کے لئے بڑی بڑی رقمین بھیجین،

پولینڈ کے مسلمانون کے اپنے جرائد و رسائل بھی ہین، "اسلامک ریویو" ان کا ایک سہ ماہی رسالہ ہے، جو وارسا سے شائع ہوتا ہے، یہ رسالہ اسلامی ممالک کے مسلمانون سے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، ولنو سے ایک ماہانہ رسالہ "تاتار لائف" نکلتا ہے، یہ زیادہ تر مسلمانون کے مقامی حالات وکیفیات پر تبصرہ کرتا ہے، سال مین ایک Tartar Year Book بھی شائع ہوتی ہے، جس مین زیادہ تر تمدنی اور ثقافتی مسائل پر ریویو ہوتا ہے،

پولینڈ کے مسلمانون کے یہ حالات جرمنون کے حملے سے پہلے کے ہین، "ص ع"

الفاروق

حضرت فاروق اعظم کی لائف اور طرز حکومت صحابہ کے فتوحات، عراق و شام مصر و ایران کے فتح کے واقعات حضرت عمرؓ کی سیاست، اخلاق، زہد، عدل اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر یہ کتاب مولانا شبلی کی بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، مطبع معارف نے نہایت اہتمام سے اس کا نیا اڈیشن تیار کرایا ہے، جس کے ساتھ دنیاے اسلام کا رنگین نقشہ بھی شامل ہے، طباعت وکاغذ نہایت عمدہ، قیمت سیر، ضخامت :- ۲۱۲ صفحے

"مینیجر"

اخبار علمیہ

سات سمندر

آکسفورڈ انگریزی ڈکشنری مین سات سمندرون کے نام یہ ہین، بحر شمالی، بحر جنوبی، شمالی بحر اوقیانوس، جنوبی بحر اوقیانوس، شمالی بحر الکاہل، جنوبی بحر الکاہل اور بحر ہند، مذکورۂ بالا لغت کا بیان ہے کہ سات سمندر کی اصطلاح سب سے پہلے عمر خیام کی رباعیات مین ملتی ہے، لیکن اگست سنہ ۱۹۴۱ء کے جیوگرفیکل جرنل کے ایک مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ یہ اصطلاح عمر خیام کی نہین ہے بلکہ اس سے پہلے عرب اور ایران کے قدیم جغرافیہ نویسون مین سمندرون کی تعداد بتانے کا عام رواج تھا، چنانچہ عمر خیام سے دو سو برس پہلے مسعودی نے لکھا ہے، کہ ان سمندرون کی تعداد جو دنیا کے آباد حصون سے گذرتے ہین، چار بتائی جاتی ہے، لیکن اس تعداد مین جغرافیہ دانون کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک پانچ، بعض کے نزدیک چھ اور بعض کے نزدیک سات ہے، سب ایک دوسرے سے علحدہ ہین اور ان مین باہم آمد و رفت کا راستہ نہین ہے، یہ سمندر حسب ذیل ہین، بحر حبش، بحر روم، بحر نیطاس (Sea of Azov) بحر مایوطیس (بحر اسود) بحر خضر اور بحر محیط جس کے حدود کی کوئی انتہا نہین، مسعودی کا بیان ہے کہ بحر نیطاس، بحر مایوطیس اور بحر روم ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہین، اس لئے دراصل مستقل چار سمندر ہین، مسعودی نے بحر ہند کو بھی سات حصون مین تقسیم کیا تھا،

ایک نامعلوم ایرانی مصنف نے حدود العالم کے نام سے ۹۸۲ء مین ایک جغرافیہ لکھا تھا، اس کو روسی، منورسکی نے اڈٹ کرکے شائع کیا ہے، اس مین بھی سات سمندر کے نام بتائے گئے

بحر مشرق، بحر مغرب، بحر اعظم، بحر روم، بحر خضر، بحر جارجنیا اور بحر خوارزم،

یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ایرانیون نے سات سمندر کی اصطلاح کو اتنی کیون اہمیت دی شاید یہ خیال چینیون سے لیا گیا ہو کیونکہ ان کے یہان افلاک کی تعداد سات ہی ہے، توریت کی بعض روایتین بھی اسی چینی تخیل سے متاثر ہین،

یہ بھی عجیب بات ہے کہ چینی مختلف رنگون کو مختلف سمتون سے منسوب کرتے ہین سبز کا انتساب مشرق سے، سرخ کا جنوب سے، سفید کا مغرب سے اور سیاہ کا شمال کی سمت سے ہے، شاید اسی مناسبت سے ایرانی اور ترک بحر جنوب کو بحر احمر، بحر روم کو بحر ابیض اور Euxine کو بحر اسود کہتے ہین، مسعودی بحر محیط کو بحر اخضر بھی کہتا ہے، جو شاید اس نے چین کی مشرقی سمندر کے لئے استعمال کیا ہو، ان باتون سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سات سمندر کی اصطلاح چینیون کے تخیل سے ماخوذ ہے،

ہنری مارٹین اسکول کا شعبۂ اسلامیات

عیسائی گرجون کے ایک فرقہ United Presbyterian church نے گیارہ سال پہلے مذکورۂ بالا نام سے لاہور مین ایک شعبہ اس غرض سے قائم کیا تھا، کہ اسلامیات کا مطالعہ کرکے مسلمانون کے مذاق کے مطابق انھیں عیسائی مذہب کا پیام پہونچایا جائے، اسی سلسلہ مین شعبۂ مذکور نے حسب ذیل کتابین انگریزی زبان مین شائع کی ہین "اہل مسجد"، "تصوف" اور "اسلام مین عورتین" اب یہ شعبہ لاہور سے علی گڈہ منتقل کر دیا گیا ہے، اور اس کے پرنسپل ڈاکٹر

ڈونالڈسن مقرر ہوئے ہین، انھون نے ایران مین تیس سال تک تبلیغی کام کیا ہے، اور عیسائیون مین اسلامیات پر ان کی نظر وسیع سمجھی جاتی ہے، وہ ایک کتاب "شیعہ مذہب" کے مصنف بھی ہین،

جامعۂ بیت المقدس

بیت المقدس کی مشہور عبرانی یونیورسٹی مین موجودہ جنگ کی وجہ سے غیر معمولی ترقی ہورہی ہے، چنانچہ جنگی ضروریات کے پیش نظر بیت المقدس کی سب سے بڑی پیداوار سنترون کو زیادہ دنون تک محفوظ رکھنے کیلئے ایک ایسا کیمیا وی غلاف ایجاد کیا گیا ہے جس کو سنترون پر لپیٹ دینے کے بعد وہ عرصہ تک اپنی اصلی حالت پر قائم رہتے ہین، اور دور دراز ممالک کو بھیجنے مین کوئی خرابی نہین پیدا ہوتی، اسی شعبہ نے ایک پودہ دریافت کیا ہے، جس کے ریشون سے کپڑا تیار کیا جاسکتا ہے، شعبۂ کیمیا پودون سے Cellulose تیار کرتا ہے، شعبۂ طب نے ٹائیفائڈ کا ایک تریاق تیار کیا ہے، جس کی تحقیقات اور آزمائش کے لئے ایک ترک عالم جراثیمیات بھیجا گیا ہے، ۱۹۴۱ء مین اس یونیورسٹی مین ۲۰۷ طلبہ داخل ہوئے ہین، ان مین زیادہ فلسطینی ہین، اور کچھ مشرقی یورپ کے اور دس بارہ عرب بھی ہین، گذشتہ موسم سرما مین یونیورسٹی مین مشرق قریب کے عربون کی ثقافتی زندگی" پر کئی لکچر دیئے گئے ہین،

(ص - ع)

باب التقریظ والانتقاد

رسالون کے خاص نمبر

ترجمان القرآن اشاعتِ خاص } مرتبہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ :- مبارک پونچھ روڈ لاہور،

ترجمان القرآن کی تین اشاعتون کو یکجا کرکے یہ خاص نمبر بنا دیا گیا ہے، اگرچہ اس نمبر مین کل پانچ مضمون ہین لیکن فائدہ کے لحاظ سے پورا نمبر پڑھنے کے لائق ہے، مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے قلم سے مولنٰنا حمید الدین مرحوم فراہی کے مشہور مقدمہ تفسیر القرآن کا ترجمہ، تفسیر القرآن پر غور و فکر کرنے والون کے لئے خاص طور سے مفید ہے، جناب سید محمد نواز صاحب ایم اے نے اسلامی تعلیمات کی رو سے اس زمانہ کے اس غلط مگر عامۃ الورود خیال کو کہ مذہب سے انسان کا تعلق محض ذہنی اور عقلی حد تک ہے، اور اس کا اثر اسکی پرائیوٹ زندگی تک محدود ہے دلنشین انداز مین دور کرکے دکھایا ہے، کہ دین کا تعلق محض ذہنی نہین ہے، بلکہ اسکی اصلی روح اسکے ساتھ قلبی اور جذباتی شیفتگی مین مضمر ہے، مولنٰنا سید فضل اللہ نے "فریضۂ جہاد" کے عنوان سے مسلمانون کے ایک فراموش سبق "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی طرف توجہ دلائی ہے، مولنٰنا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے خاص رنگ مین اسلامی نقطۂ نظر سے انسانون کے اقتصادی مسائل کا حل

پیش کیا ہی، مولانا ابو الاعلیٰ کے مجموعۂ مضامین "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" پر مولوی ذکاء اللہ صاحب کا تبصرہ غور و تامل سے پڑھنے کے لائق ہی،

علی گڈھ میگزین احسن نمبر، مرتبہ جناب محمد مجتبیٰ حسن صاحب ایم اے علیگ۔

تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۴ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت معلوم نہین، پتہ:۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

اردو زبان کے نامور شاعر جناب احسن مارہروی مرحوم جس درجہ کے شاعر تھے، اسی درجہ کے زبان اردو کے محقق بھی تھے، اور اس حیثیت سے اردو شعراء مین ان کا درجہ بہت بلند تھا، ان کی ساری عمر زبان کی خدمت مین گذری وہ داغ کی یادگار اور اسی اسکول کے پیرو تھے لیکن انکی شاعری نئے اثرات سے بھی خالی نہین ہی، زبان کی صحت اور قواعد کی پابندی میں بڑا اہتمام تھا، مسلم یونیورسٹی کے استاد بھی رہ چکے تھے، اس لئے اس پران کا دہرا حق تھا، میگزین نے یہ نمبر نکال کر اس حق کو ادا کیا ہے، اس مین مرحوم کے حالات و سوانح اخلاق و سیرت، شاعری اور علمی و ادبی خدمات ہر پہلو پر مضامین ہین، غلام مصطفیٰ خانصاحب محمد رضا علی خانصاحب، جناب راز سہسوانی، ابو اللیث صاحب صدیقی ضیا احمد صاحب بدایونی اور رشید احمد صاحب صدیقی کے مضامین خاص طور سے بہت اچھے ہین، یادگار کے طور پر خود جناب احسن مارہروی مرحوم کا ایک پرانا مضمون "ریویو" جو رسالہ فصیح الملک ۱۹۰۵ئ؁ میں نکلا تھا شامل کر دیا گیا ہے، یہ مضمون آج بھی آزادی پسند ادیبون کے پڑھنے کے لائق ہے،

سالنامہ نظامیہ مرتبہ مولٰنا ابو الخیر صاحب کنج نشین تقطیع بڑی ضخامت ۱۹۶ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، قیمت:۔ عہ/ :۔ پتہ دفتر نظامیہ حسینی علم حیدر آباد دکن،

گذشتہ فروری میں حیدر آباد دکن کی مشہور اور قدیم عربی درس گاہ مدرسۂ نظامیہ کا یوم تاسیس منایا گیا تھا، مدرسہ کے ترجمان رسالہ نظامیہ نے اس نمبر مین اسکی روداد شائع کی ہے اس مین خطبۂ صدارت اور اجلاس کی رودادون کے علاوہ مدرسہ کی ۰ ۲ سالہ سرگذشت اور وہ علمی و مذہبی مقالے بھی ہین، جو یوم تاسیس کے موقع پر پڑھے گئے تھے، اس سے اس نمبر مین علمی شان پیدا ہو گئی ہے، مقالون مین "عربی تعلیم و مدارس کی اصلاح" پر مولنا سید محمد شاہ صاحب شطاری کا مضمون عربی کے طلبہ و اساتذہ دونون کے غور سے پڑھنے کے لائق ہے، "شعر العرب" مولوی محمد ہبۃ اللہ صاحب "زبان عربی اور اسکی اہمیت" مولوی محمد منیر الدین صاحب "آزادی نسوان اور مسئلۂ حجاب" مولوی محمد علی صاحب مفید مقالے ہین،

ایشیا مکاتیب نمبر (ج اول) مرتبہ جناب ساغر نظامی تقطیع اوسط ضخامت ۲۴۸ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت:- عہ؍ پتہ:- ادبی مرکز میرٹھ،

اردو مین ہندوستان کے اکابر کے خطوط کے متعدد مجموعے موجود ہین، جناب ساغر نے یہ جدت کی ہے کہ اپنے نام دوسرون کے خطوط کا یہ مجموعہ مرتب کیا ہے، اس مین بڑا حصّہ موجودہ دور کے نوجوان شعرا اور ادیبون کے خطوط کا ہے، تبرکاً بعض علما اور سیاسیین کے بھی چند خطوط ہین، مکاتیب کی مجموعی تعداد کئی سو تک پہنچ جاتی ہے، جناب مرتب نے اپنے ساتھ نسبت کے اعتبار سے ان خطوط یا لکھنے والون کے مختلف مدارج قائم کئے ہین، مثلاً یاران میکدہ میں شعرا اور ادبا ہین، پیارون کی بزم خاص مین خواجہ حسن نظامی اور جناب سیماب کو جگہ دیگئی ہے، یہ مجموعہ اپنے تنوع اور بوقلمونی کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہے اور اس مین رنگ برنگ کے جلوے نظر آتے ہین، بعض خطوط اپنے اندر اہلِ نظر کے لئے بڑی دلچسپی کا سامان رکھتے ہین، معلوم نہین ساغر صاحب نے نسوانی مکاتیب کو استفہامیہ نشان لگا کر کیون چھوڑ دیا، مردون کے خطوط تو انکے شاعرانہ اوصاف

کمال کی سند ہین، لیکن اسکی تاثیر کا نتیجہ تو نسوانی خطوط مین نظر آتا،

اضطراب مرتبہ جناب مسعود اختر جمال صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۴ صفحے،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲؍ پتہ دفتر اضطراب پانڈے حویلی بنارس

یہ رسالہ عرصہ سے ایک خوش مذاق نوجوان مسعود اختر جمال کی ادارت مین بنارس سے نکلتا ہے، اور ادبی حیثیت سے عام رسالون سے بلند ہے، اس کا یہ امتیاز اس خاص نمبر مین بھی قائم ہے، اس مین ادب اور افسانے کے ساتھ اور سنجیدہ ادبی و تنقیدی مضامین کا بھی معتدبہ حصہ ہے، علمی مضامین سے بھی خالی نہین، ادبی و تنقیدی حصہ مین "غالب اردوے معلیٰ کے آئینہ مین" ابو سلم صاحب ایم اے علیگ،" میری شاعری" فراق گورکھپوری،"ادب کا نیا نظام" ل احمد صاحب "غالب کی ہیرین" مالک رام صاحب خوش مذاقی سے لکھے گئے ہین، افسانون کا حصہ بھی ستھرا ہے، علی عباس صاحب حسینی، ذکیہ خاتون، وجاہت حسین صاحب سندیلوی، راحت سعید خواجہ غلام السیدین اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے افسانے، خاص طور سے دلچسپ ہین نظمون کا حصہ بھی قابلِ لحاظ ہے، لیکن نئے ادب کی بے اعتدالی کی جھلک اس مین بھی پائی جاتی ہے، پرانے ادب کی اصلاح شوق سے کیجئے، لیکن اس کو مٹا کر کسی ادب کا راستہ نہین مل سکتا، اس سلسلہ مین ل احمد صاحب کا مضمون البتہ سنجیدہ ہے،

ساقی، مرتبہ جناب شاہد احمد صاحب دہلوی تقطیع بڑی، ضخامت ۲۴۰ صفحے، کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ دفتر ساقی دہلی،

یہ نمبر ضخامت، افسانون کے تنوع اور کثرت کے اعتبار سے پوری کتاب ہے، مشاہیر افسانہ نگارون کے کئی درجن افسانے فراہم کئے گئے ہین، نمک کے طور پر بعض سنجیدہ مضامین بھی نظر آتے ہین، "سلطانہ رضیہ کی پاکدامنی" پر انور شادانی کا مضمون محققانہ ہے، پروفیسر

محمد مسلم کے قلم سے "دیسی زبان کی ترقی کے وسائل" پر دلچسپ اور سنجیدہ تبصرہ ہے، مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی کے قلم کا ایک ادبی تبرک "اکیسوں بادشاہ تھسی کا آسمان پر چڑھنا" بھی موجود ہے، افسانون مین "بھول بھلیان" عصمت چغتائی "بے پر کی" ادارہ "سیارٹا کا صنم" ظفر قریشی دہلوی، "لندن سے آداب عرض" آغا محمد اشرف، "سامان جنگ" قیسی رامپوری "چراغ کے نیچے" وجاہت سندیلوی زیادہ دلچسپ اور پسندیدہ ہین، البتہ مختلف افسانون کی زبان مین کہین کہین مخمل مین ٹاٹ کے پیوند کا منظر نظر آتا ہے، آغا محمد اشرف اور ادارہ کی پاکیزہ زبان کو پڑھنے کے بعد بعض افسانون کی بھنگم زبان کو پڑھ کر ذوق کو سخت دھکا لگتا ہے، اگر شاہد صاحب خود بیرونی افسانہ نگارون کی زبان پر نظر ڈال لیا کرین، تو ساقی کے ناظرین اس ادبی جراحت سے محفوظ رہین،

سہیل، مرتبہ جناب عارف سنہاروی و قیصر عثمانی، تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۲ صفحے، کاغذ کتابت، و طباعت قیمت عہ، پتہ شمسی پریس گیا،

یہ سالنامہ بھی مضامین کے تنوع دلچسپی اور معلومات ہر لحاظ سے قابل قدر ہے، تفریحی لٹریچر کے ساتھ مفید اور سنجیدہ معلومات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، "موازنہ مومن و غالب" عطاء اللہ صاحب پالوی، "دقیقی و فردوسی" پروفیسر طاہر رضوی، "دکن میں نواب داؤد خان قریشی کے کارنامے" سید رضا قاسم مختار "فخرالدولہ" سید حیات حسین طباطبائی، اور "الف" جناب سید وصی احمد صاحب بلگرامی اچھے مضامین ہین، موازنہ مین البتہ کہین کہین غالب پرستی کی جھلک ہے، حاجی نبی احمد صاحب بریلوی کے نئے ادب میں الفاظ زیادہ اور حقیقت کم ہے، افسانون میں "دو مائین" اختر اور نیوی "قرض" پیارے لال شاکر میرٹھی "نقاب" اختر قادری ایم اے ستھرے ہین، ڈرامہ "رقاصہ کی محبت" بھی دلچسپ ہی،

عالمگیر سالنامہ مرتبہ حافظ محمد عالم صاحب تقطیع بڑی، ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت :- عہ پتہ :- دفتر عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور،

عالمگیر نے بھی اپنی روایات کے مطابق مفید وسنجیدہ مضامین اور دلچسپ افسانوں کا مجموعہ پیش کیا ہے، سنجیدہ علمی وادبی مضامین میں "فسانہ عجائب کی بعض اہم خصوصیات" خواجہ مسعود علی ذوقی "سلطان ٹیپو کی رواداری" پروفیسر سالک" ملا عبد القادر بدایونی اور علامہ آزاد" حامد حسن صاحب قادری، مفید مضامین ہیں، مولانا آزاد عجم پرستی میں فردوسی ثانی تھے، اور اس غلو میں وہ کبھی کبھی انشا پردازی کے پردہ میں مذہب پر بھی چوٹ کر جانے میں باک نہ کرتے تھے، ان کی کوئی کتاب اس زہر سے خالی نہیں ہے، حامد حسن صاحب نے ابھی صرف ایک فرض ادا کیا ہے، ضرورت ہے کہ ارباب علم ونظر آزاد کی گپ بازی کی طرح ان کی عجم پرستی کا پردہ بھی فاش کریں، افسانوں میں "جنیتان" فضل حق صاحب قریشی "من درچہ خیالم وفلک درچہ خیال" جمیل احمد صاحب "دوشیزاؤں کی سردی" علی احمد صاحب دلچسپ ہیں خیال آتا ہے کہ "رومیو جولیٹ" کا ترجمہ ساقی کے کسی نمبر میں مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی کے قلم سے نکل چکا ہے،

ہندوستانی ادب نیا سال نمبر } مرتبہ جناب غلام محمد خانصاحب ایم اے تقطیع بڑی ضخامت ۴۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت، عہ پتہ ہندوستانی ادب پنجل گوڑہ حیدرآباد دکن،

ہندوستانی ادب حیدرآباد کے اچھے رسالوں میں ہے اس کا یہ خاص نمبر بھی اپنے سنجیدہ مضامین اور مفید معلومات کے لحاظ سے قابل قدر ہے، بقدر اعتدال شعر وادب کی چاشنی بھی موجود ہے، "فصلی سنہ کی کہانی" "لالہ جواہر لال" "سطح قمر پر چند عرب اور عجم کے مجنون کے نام" عبد الرحمن خانصاحب سابق صدر کلیہ "ہندی زبان کی تاریخ پر ایک نظر" رشید الحسن صاحب ایم اے مفید مضامین ہیں، افسانوں میں ایم اسلم صاحب کے "ہفوات" دلچسپ ہیں، لیکن اردو زبان کی خدمت کے دعوی کے ساتھ انجمن ترقی اردو

کی مخالفت سمجھ مین نہین آئی، کسی مسئلہ مین سنجیدگی کے ساتھ اختلاف بُرا نہین ہے، لیکن ذاتی اختلاف کی بنا پر ایک مفید اور کام کرنے والے ادارہ کو بدنام کرنا کونسی ادبی خدمت ہے، مولوی عبد الحق صاحب اور انجمن ترقی اردو کے خدمات اتنے ظاہر اور مسلّم ہین، کہ ان مخالفتون سے خود اپنے وقار کو گھٹانے کے علاوہ اور کچھ حاصل نہین،

ہمایون سالگرہ نمبر، مرتبہ جناب میان بشیر احمد صاحب تقطیع بڑی، ضخامت ۹۵ صفحے، کاغذ، کتابت، و طباعت بہتر، قیمت :- ۱۲- پتہ دفتر ہمایون ۱ لارنس روڈ لاہور،

ہمایون کا سالگرہ نمبر گو مختصر اور سالنامون کی ظاہری رسمیات سے خالی ہے، لیکن جو کچھ بھی ہے، وہ حشو و زوائد سے پاک ہے، میان بشیر احمد صاحب کے قلم سے حسب دستور اردو کی سالانہ سرگذشت اور ۱۹۴۱ء کے حوادث عالم پر تبصرہ ہے، قیام کراچی کے حالات دلچسپ ہین، فلک پیما کا افسانہ "لاڈ" بہت خوب ہے،

پیام تعلیم، مرتبہ مولوی حسین حسان صاحب ندوی، تقطیع بڑی، ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت، و طباعت معمولی قیمت :- ۸ ر پتہ :- دفتر پیام تعلیم جامعہ ملیہ، قرول باغ نئی دہلی،

اس مرتبہ پیام تعلیم کے سالنامہ مین بچون کے جغرافی معلومات کا زیادہ لحاظ رکھا ہے، مضامین کا بڑا حصہ اسی سے متعلق ہے، اور مختلف قسم کے خشک جغرافی معلومات کو نہایت دلچسپ طریقہ سے پیش کیا گیا ہے، بچون کی تفریح اور دلچسپی کے سامان سے بھی خالی نہین ہے بچون کیلئے یہ سالانہ علمی تحفہ ان کے لئے مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی،

مطبوعات جدیدہ

نصرۃ الحدیث مولفہ جناب مولنا حبیب الرحمن صاحب اعظمی، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۱۴ صفحے، کاغذ، کتابت، وطباعت بہتر، قیمت :- عہ، پتہ :- محمد ایوب صاحب ناظم مدرسہ مفتاح العلوم مئو ضلع اعظم گڈھ،

یادش بخیر جناب "حق گو" نے عرصہ ہوا حدیث کی مخالفت مین ایک رسالہ لکھا تھا، اسی زمانہ مین ان کے ایک اور ہم مشرب چغتائی نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی تھی، ان دونون رسالون مین منکرین حدیث کے بارہا کئے ہوئے اعتراضات دہرائے گئے تھے، کہ اصل چیز کتاب اللہ ہے، اسکی موجودگی مین کسی دوسری چیز کی ضرورت نہین، آنحضرت صلعم نے کتابت حدیث کی ممانعت فرمائی تھی، صحابہ نے حدیثین نہین لکھین، آنحضرت صلعم کے کئی صدیون بعد ان کی تدوین ہوئی، اتنے عرصہ مین بہت کچھ تغیر و تبدل ہوسکتا ہی، محدثین نے حکومت کے اثر سے ان کے مصالح کے خاطر حدیثین وضع کین، حدیثون مین ایسے واقعات ملتے ہین، جنھین صحیح مان لینے سے مذہب اسلام، کلام اللہ، آنحضرت صلعم، صحابۂ کرام یا اسلامی تعلیمات کے کسی پہلو کے متعلق شکوک واعتراضات پیدا ہوتے ہین، اس لئے حدیثین سرے سے ناقابل اعتبار ہین، مولانا حبیب الرحمن اعظمی صدر مدرس مفتاح العلوم مئو نے اسی زمانہ مین ان اعتراضون کے جواب مین نصرۃ الحدیث لکھی تھی، اب مزید اضافہ اور تکمیل کے بعد انھون نے اس کتاب کا دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے، اس میں ان تمام اعتراضون کا نہایت محققانہ اور مسکت جواب ہے، اور کلام اللہ سے قول رسول

حجیت اور اوس کے واجب العمل ہونے کا ثبوت آنحضرت صلعم کی زندگی مین آپ کی اجازت سے کتابتِ حدیث کا آغاز اور اس کے بعد صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانون مین کتابت و اشاعتِ حدیث کی تاریخ، حفظ و روایتِ حدیث میں ان بزرگون کا اہتمام، حکومت کے مقابلہ مین ان کی آزادی اور حق پرستی وغیرہ کو دکھانے کے بعد معترضین کی پیش کردہ حدیثون پر تفصیلی بحث کرکے دکھایا ہے، کہ ان اعتراضات مین حدیثون کا نہین، بلکہ معترضین کی فہم اور ان کے علم کا قصور ہے، جا بجا انکی تدلیس اور خیانت کا پردہ بھی فاش کیا ہے، ان مباحث کی تفصیل مین منکرین کے اعتراضون کے جواب کے علاوہ حدیث کے متعلق بہت سی مفید معلومات آگئے ہین، یہ رسالہ ان تعلیم یافتہ لوگون کے خاص طور سے مطالعہ کے لائق ہے، جن کے دلون مین حدیث کے متعلق شکوک و شبہات ہون،

میر محمد مومن مولفہ ڈاکٹر محی الدین زور قادری تقطیع اوسط ضخامت ۳۰۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ سب رس کتاب گھر خیرت آباد حیدر آباد دکن،

قطب شاہی عہدہ دارون مین میر محمد مومن استرآبادی کی بڑی جلیل القدر شخصیت تھی، وہ ایران کے ایک ممتاز خاندانِ سیادت سے تھے، جس کا سلاطین قاجاریہ تک احترام کرتے تھے، میر صاحب سلطان محمد قطب شاہ کے زمانہ مین دکن آئے، وہ خاندانی شرافت و نجابت کے ساتھ مختلف کمالات کے جامع تھے، اس لئے سلطان نے ان کی بڑی قدردانی کی، اور دکن مین انکو بڑا عروج حاصل ہوا، سلطان محمد قطب قلی شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ دو فرمانرواؤن کے زمانہ مین پیشوائی کے منصب پر جو حکومت کا سب سے بڑا عہدہ تھا، فائز رہے، اپنے زمانہ پیشوائی مین انھون نے بہت سے مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی کارنامے انجام دیئے، حیدر آباد کی تعمیر و ترقی مین ان کا بڑا حصہ ہے، ان کے آثار اب تک حیدر آباد اور اس کے نواح مین موجود ہین،

ڈاکٹر محی الدین نے اس کتاب مین تفصیل کیساتھ اس جلیل القدر شخصیت کے حالات اور کارنامون کو پیش کیا ہے، میر صاحب کی شخصیت اتنی اہم تھی، اور حکومت کے تمام شعبون سے ان کا اتنا گہرا تعلق تھا، کہ ان کے حالات مین دونون بادشاہون کے عہد کی تاریخ کے بہت سے اہم واقعات آگئے ہین، اور یہ کتاب میر صاحب کی سوانحعمری کے ساتھ ایک حد تک ان کے زمانہ کے قطب شاہی دور کی تاریخ بن گئی ہے، کتاب مین میر صاحب کے آثار کے متعدد فوٹو بھی ہین۔

سازِ شکستہ جناب مولوی رشید اختر صاحب ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۶۰ صفحے، کاغذ و کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:- اردو بک اسٹال لاہور،

جناب مولوی رشید اختر صاحب ندوی روشناس لکھنے والون مین ہین، اس کتاب سے انکی ایک نئی صلاحیت کا علم ہوا، یہ ایک اصلاحی اور رومانی افسانہ ہے، جس مین امرار کی مترفانہ زندگی، تاجرانہ اخلاق اور خودغرضی اور دولت وامارت کے گہوارہ اور آزادی کی آب و ہوا مین پلی ہوئی لڑکیون کی بے باکی، بے راہ روی اور اس کے بُرے نتائج اور غریب اہلِ علم کی پرمحن زندگی اور بلندیِ اخلاق کو خوبی کے ساتھ دکھلایا گیا ہے، نواب محمود سرور، ان کی بہن سلمیٰ اور ان کا غریب صاحبِ علم اور بلند نظر دوست، مذکورۂ بالا تینون کردارون کی خصوصیات کے پورے مظہر ہین، اس افسانہ کو موجودہ اصطلاح مین ترقی پسند ادب سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، لیکن اسمین اس کی خوبیان تو موجود ہین، اور برائیون سے پاک ہے،

امیر مینائی مؤلفہ جناب شاہ ممتاز علی صاحب آہ تقطیع بڑی ضخامت ۳۱۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ شاہ محمد عبد الباری صاحب چیف کورٹ لکھنو اور عثمان الزمان صاحب بذریعہ جناب صدیق الزمان صاحب شنکر باغ، کوچہ نصیح جنگ مرحوم حیدرآباد دکن،

امیر مینائی کی کئی سوانحمریاں لکھی جا چکی ہیں، یہ نئی سوانحمری ان کے ایک شاگرد اور عزیز جناب شاہ ممتاز علی آہ مرحوم میٹھوی نے لکھی تھی لیکن اسکی اشاعت کی نوبت مؤلف کی وفات کے بعد آئی، یہ سوانحمری دوسری سوانحمریوں کے مقابلہ میں زیادہ جامع اور مفصل ہے، امیر مرحوم اودھ کے ایک قدیم اور شریف خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، اور لکھنؤ اور اس کے بعد رامپور کے دربار دون سے انکا تعلق رہا تھا، اس لئے اس کتاب میں امیر کے حالات کے ضمن میں شرفائے اودھ کی معاشرت، لکھنؤ کے تمدن، اس کے آداب و تہذیب، واجد علی شاہی دور کی ادبی محفلوں، ادبا و شعرائے رامپور کی علم نوازیوں اور علمی صحبتوں کے دلچسپ حالات بھی آگئے ہیں، دوسرے حصہ میں امیر کی شاعری پر مختصر تبصرہ، ان پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، اس کے جوابات، کلام کا انتخاب، مختلف اصناف کے نمونے، دوسرے شعرا سے موازنہ اور امیر کی نثر پر تبصرہ ہے، جناب مؤلف خود صاحب نظر تھے، اس لئے کتاب میں شعر و ادب کے متعلق بہت سی مفید باتیں ملجاتی ہیں، کتاب کے شروع میں مولنا سید سلیمان ندوی، پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی اور مولنا عبد اللہ عمادی کے قلم سے تعارف پیش نامے اور مقدمہ ہے، جناب شاہ محمد عبد الباری صاحب نے اس کتاب کو شائع کر کے اردو ادب میں ایک قابل قدر کتاب کا اضافہ کیا،

خرمن عشق از جناب شفیق جونپوری، تقطیع بڑی ضخامت ۱۹۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ :۔ مکتبہ ادبستان پانڈے حویلی بنارس،

طبقہ شعرا میں جناب شفیق جونپوری کا نام بیگانہ نہیں، وہ مولانا حسرت موہانی کے شاگرد رشید اور نئے شعرا میں پرانے طرز کے خوش گو شاعر ہیں، ان کا کلام اس دور کی آزادی ادب اور اس کے نقائص سے پاک ہے، زبان کی صحت و صفائی اور کلام کی پختگی میں قدیم شعرا کی جھلک نمایاں ہے، گو انکی شاعری کی زمین پرانی ہے، لیکن اس میں نئے گل بوٹے بھی نظر آتے ہیں، اور قدیم تغزل میں نئے خیالات کا بھی خاصہ اثر موجود ہے، کلام درد و تاثیر سے بھی خالی نہیں، امید ہے کہ صاحب ذوق طبقہ میں ان کے دیوان کو حسن قبول حاصل ہوگا،

"م"

جلد ۴۹ ماہ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۴۲ء عدد ۴

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۲۴۲-۲۴۴
کلمة اللہ	جناب مولوی محمد اویس صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین،	۲۴۵-۲۵۹
خطبۂ صدارت،	مولانا عبد السلام ندوی،	۲۶۰-۲۶۸
یاد پاستان،	جناب مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی	۲۶۹-۲۹۲
مغل حکمرانوں کی بادشاہت کا تخیل،	"ص ع"	۲۹۳-۳۰۱
اخبار علمیہ،	"اس"	۳۰۲-۳۰۴
جذب مجذوب،	جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب غوری،	۳۰۵
بیانِ حقیقت،	مولانا قمر نعمانی سہسرامی،	۳۰۶
تاریخ اسلام کے فیصلہ کن لمحے۔ (انگریزی)	مولانا مسعود عالم ندوی کٹیلاگر اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ،	۳۰۷-۳۱۲
ابن خلدون" (انگریزی)	"	۳۱۲-۳۱۵
مطبوعات جدیدہ،	"م"	۳۱۶-۳۲۰

شذرات

حامد نعمانی مرحوم

مولنا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک ہی جسمانی یادگار باقی رہ گئی تھی وہ بھی مٹ گئی، یعنی ان کے اکلوتے صاحبزادہ حامد نعمانی صاحب نے ۶۲ برس کی عمر میں ۲ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۴۲ء کی شب کو جونپور میں دفعۃً وفات پائی، وہ کئی برس سے مرض قلب میں گرفتار تھے، علاجوں کے سہارے سے چلتے پھرتے تھے، مگر اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے، ۱۹ مارچ کو وہ ایک ضرورت سے جونپور گئے تھے، شام کو پہنچے، اپنا کام کیا، رات کو ۳ بجے کے قریب دردِ دل کا دورہ ہوا، ان کے میزبان دوست ان کے کراہنے کی آواز سنکر ان کے پاس آئے، مرحوم نے کہا کہ مجھے ذرا سہارا دے کر بٹھا دو، انھوں نے اپنے سینے کے سہارے سے بٹھا دیا، اسی کے ساتھ مرحوم نے ان کو السلام علیکم کہا، اور آخری سانس لیکر نامعلوم سفر کی منزل پر روانہ ہو گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، ۲۰ کی صبح کو لاش کار سے اعظم گڈہ آئی، اور شبلی منزل میں باپ کے پہلو میں بیٹے کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا گیا،

مرحوم بڑے توانا و تندرست، قوی ہیکل، بلند و بالا، اور علی گڈہ کالج کے مشہور کھلاڑیوں میں تھے، گھوڑے کی سواری اور پولو میں بھی ممتاز تھے، تحصیلداری کے عہدہ پر فائز ہو کر پنشن پائی پھر ریاست مجھولی میں منیجر ہوئے، مگر صحت کی خرابی کے سبب سے مستعفی ہو گئے، پابند صوم و صلوٰۃ، نیکدل اور بہت رحیم المزاج تھے، اپنی ذاتی زندگی میں گو وہ بہت قانع اور منتظم تھے، مگر اس طرح سے جو بچتا تھا، اس کو ہمیشہ فیاضی کے ساتھ نیک کاموں میں لگا دیا کرتے تھے، ۱۹۲۷ء میں حج بھی کیا تھا، زکوٰۃ کا پورا حساب رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے، اور اپنے خزانۂ

سے ان کو اجر جزیل عطا کرے، مولانا شبلی مرحوم کی جو صاحبزادیاں تھیں وہ تو باپ کی زندگی ہی میں وفات پا چکی تھیں، ایک یہ فرزند تھے جو اب چل بسے،

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

زمانہ کے حالات جس تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں، خوشی کی بات ہے کہ مسلمان اس سے بیخبر نہیں معالجوں کی رایوں میں اختلاف ہو سکتا ہے، مگر مرض کی شدت اور نفس علاج کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں، قوم و ملت کے معالجوں کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے، ایک وہ جو مسلمان قوم کی سیاسی تنظیم کرکے اس کو بر سرِ عروج لانا چاہتے ہیں، دوسرے وہ جو نام کے مسلمانوں کو پہلے کام کا مسلمان بنانا چاہتے ہیں، اور پھر ان کو استخلاف فی الارض کا مستحق ٹھہراتے ہیں، لیکن اس کے لئے ضرورت یہ ہے کہ اس پیام کے مبلغ اور رہبر پہلے خود کام کے مسلمان بنیں، کہ

خفتہ را خفتہ کے کند بیدار!

سچ یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ ہم دوسروں پر حکومت کریں، ہم کو خود اپنے نفس کے اوپر آپ حکومت کرنا چاہئے، حق کے پیام پر غیر متزلزل ایمان، احکامِ الٰہی پر بے چون وچرا عمل، حق کی راہ میں مجاہدانہ روح، ثباتِ قدم، عزمِ راسخ، حق کے لئے ایثار، اور ذاتی خود غرضیوں کا استیصال، کیونکہ دنیا کسی دعوت کو اس وقت تک قبول نہیں کرتی جبتک داعیوں کی جان ومال کا پورا امتحان نہیں لے لیتی اور دعوت کے حرفوں کو داعیوں کے خون کی روشنائی میں نہیں پڑھ لیتی، یہ خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے اصولِ فطری ہیں، جو نہ کبھی بدلے ہیں، نہ بدلیں گے،

ایک اور نکتہ کو بھی بھولنا نہیں چاہیئے، اسلام اور مسلمان ایک نہیں دو چیزیں ہیں، مسلمان آ ایک قوم کا نام پڑگیا ہے جس کے اسلاف پیام اسلام کے حامل اور تعلیم اسلام کے عامل تھے، انھوں نے دنیا پہ فتح پائی، اور اپنی مفتوحہ دولت اپنے اخلاف کے سپرد کردی، زمانہ کے مرور سے یہ اخلاف یہ بھول گئے کہ یہ انعام اُن کے اسلاف کو ان کے خاص اوصاف کے صلہ میں ملا تھا، جب تک وہ اوصاف رہے وہ انعام ان کے پاس رہا، اور جب وہ جاتے رہے تو ان کا یہ انعام بھی چھن گیا، اب اگر اس کے حصول کی پھر تمنا ہے تو پھر انھیں اوصاف کو حاصل کرنا ہے، مَاکَانَ اللہ لیغیر ما بقوم حتی یغیروا مَا بِانفُسِھِمۡ حکم ناطق ہے،

نادانی سے ہم لازم کو ملزوم اور ملزوم کو لازم سمجھتے ہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے کسی طرح حقوق حاصل کرنے چاہئیں، پھر اس کے ساتھ سلطنت وحکومت کے اوصاف پیدا ہو جائیں گے، یہ خیال قطعاً غلط ہے، پہلے اوصاف حاصل کرو پھر اس کے نتیجوں کی امید رکھو، اگران اوصاف کے بغیر کوئی چیز ہم کو رعایت سے ملی بھی تو وہ ہمارے پاس کبھی رہ نہیں سکتی،

لیکن ایک سوال اس سے بھی زیادہ دقیق ہے، فرض کریجئے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں مسلمانوں کی ایک سلطنت کا اضافہ ہوگیا تو کیا اس سے اسلام کا پیام زندہ ہو جائے گا، اس سے مسلمان پھر مسلمان ہو جائیں گے، زیادہ سے زیادہ جو خوش کن خواب نظر آسکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ایک اور طویل وعریض عراق یا شام یا مصر مل جائے تو کیا اس سے اسلام کی بیکسی وغربت میں کچھ بھی کمی ہو سکتی ہے،

مقالات

کلمۃ اللہ

از

جناب مولوی محمد اویس صاحب ندوی نگرامی رفیق دارالمصنفین

درس قرآن کے سلسلہ مین حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ نے لفظ "کلمۃ اللہ" کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا تھا، اس مضمون مین اسکو تفصیل کیساتھ بیان کرنیکی کوشش کیگئی ہے، جن کتابون سے مزید استفادہ کیا گیا ہے، انکا حوالہ موجود ہے،

پیروان حضرت مسیح علیہ السلام حضرت مسیحؑ کو ایک خاص عقیدہ کے لحاظ سے خدا کا کلام کہتے ہین جس کی تفصیل یہ ہے کہ عیسائی الٰہیات خدا کو تین صفات سے مرکب مانتی ہے، جن کو اقانیم ثلاثہ کہا جاتا ہے (۱) اقنوم وجود (۲) اقنوم حیاۃ (۳) اقنوم علم، اقنوم علم ہی کو وہ خدا کا کلام کہتے ہین، ان کا خیال ہے کہ یہی کلام مسیح کے جسم سے متحد ہوگیا، گویا اس طرح لاہوت نے ناسوت کا جامہ پہن لیا، اور تین ایک ایک تین کا فلسفہ تکمیل کو پہنچا؛[۱]

کلام الٰہی کی اس کیفیت اتحاد مین عیسائی فرقون نے مختلف راہین اختیار کی ہین، یعقوبیون کا عقیدہ ہے کہ مسیح کی ذات خود خدا ہے، ملکانی کہتے ہین، حضرت مسیحؑ الٰہ کامل اور انسان دونون ہین، ان مین سے کوئی دوسرے سے الگ نہین، حضرت مریمؑ سے اللہ و انسان

[۱] ملل ونحل شہرستانی جلد ۲ بحث نصاریٰ،

دونون پیدا ہوے، نسطوری ملکانیون کے ہم مشرب ہین، لیکن وہ کہتے ہین، کہ حضرت مریم سے اللہ کی پیدایش نہیں ہوئی[۱]، ایک جماعت ان تثلیث پرستون کی ہے، جوان اقانیم ثلاثہ کی الوہیت کے قائل ہین،

قرآن پاک مین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ہے،

وَکَلِمَتُہٗ اَلْقٰھَا اِلٰی مَرْیَمَ ۔ اور اللہ کا کلمہ ہین جس کو اللہ نے مریم تک پہونچایا،

(نساء)

دوسری جگہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کی طرف سے ایک "کلمہ" ہین، ان آیتون مین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن مین لفظ "کلمہ" دیکھ کر عیسائیون نے یہ سمجھا ہے کہ اسلام بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ انھی معنون مین کہتا ہے، جن معنون مین وہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا کلام کہتے ہین، ذیل کے مضمون مین اسی غلطی کا ازالہ مقصود ہے،

کلمۃ اللہ اور فتنۂ خلق قرآن عیسائیون نے مسلمانون کو اس لفظ سے ہمیشہ کسی نہ کسی فریب مین مبتلا کرنا چاہا ہے، چنانچہ عباسی عہد کے فتنۂ خلق قرآن مین بھی اسی لفظ کا تماشا نظر آرہا ہے، جسکی تفصیل یہ ہے کہ اہل سنت والجماعۃ کا عقیدہ ہے، کہ کلام اللہ غیر مخلوق ہے، نصاریٰ اس پر اعتراض کرتے تھے کہ جب کلام اللہ غیر مخلوق ہے تو مسیح جو "کلمۃ اللہ" ہین، وہ بھی غیر مخلوق ہین[۲]، معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانون کی ایک جماعت کو کلام اللہ کے مخلوق ہونے پر جو اس قدر اصرار تھا وہ عیسائیون کے اسی اعتراض کی بنا پر تھا،

عجیب دلچسپ بات ہے کہ نصاریٰ کلمۃ اللہ کے لفظ سے حضرت مسیح علیہ السلام کے غیر مخلوق ہونے پر استدلال کرتے تھے، اور جہمیہ اسی لفظ سے قرآن کے مخلوق ہونے کو ثابت کرتے تھے[۱]،

---

[۱] الجواب الصحیح ابن تیمیہ جلد ۱ صفحہ ۳ مصر،

کا استدلال یہ تھا کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ کہا ہے اور حضرت عیسیٰ مخلوق ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ کلام اللہ بھی مخلوق ہے۔[۵]

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے نصاریٰ اور جہمیہ دونوں کے اقوال کو رد کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف جن امور کا انتساب کیا جاتا ہے، ان کا انتساب قرآن کی طرف ممکن نہیں، حضرت عیسیٰؑ بچہ تھے، جوان ہوئے، کھاتے تھے، پیتے تھے، امر و نہی کے مخاطب تھے، حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے تھے، پھر کیا قرآن پاک کے متعلق بھی اس قسم کے امور کی نسبت ممکن ہے؟

مطلب یہ ہوا کہ قرآن پاک اور حضرت عیسیٰؑ کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا درست نہیں ہے، اب رہا قرآن کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "کلمۃ اللہ" کہنا، تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ اللہ کے کلمہ (کن) سے پیدا ہوئے نہ یہ کہ وہ خود کلمہ تھے، امام صاحب کے الفاظ یہ ہیں:-

لکن المعنی فی قول اللہ "انما المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ" فالکلمۃ التی القاھا الی مریم حین قال کن فکان عیسیٰ بکن ولیس عیسیٰ	اللہ تعالیٰ کے قول انما المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ میں کلمہ وہ ہے جس کو اللہ نے مریم تک پہونچایا جبکہ کہا کہ "کن" ہو جا، پس عیسیٰ "کن" سے ہو گئے، عیسیٰ "کن" نہیں ہیں، بلکہ وہ "کن" سے۔

[۵] کتاب الرد علی الجہمیہ امام احمد بن حنبل ص ۲۱۸، بر حاشیہ جامع البیان فی تفسیر القرآن للشیخ السید معین الدین ابن الشیخ صفی الدینؒ مطبوعہ دہلی۔

هو كُنْ، ولكن بكن كان فالكن من قولِ الله وليس كن مخلوقًا وكذبت النصارىٰ والجهمية على الله تعالىٰ في أمر عيسى وذلك إنّ الجهمية قالوا روح الله وكلمته الا انّ كلمته مخلوقة قالت النصارىٰ عيسىٰ روح الله من ذاتِ الله كما يقال انّ هذه الخرقة من هذا الثوب قلنا نحن انّ عيسى بالكلمة كان وليس هو الكلمة وانّما الكلمة قول الله قوله وروح منه يقول من امره كان الروح فيه كقوله (وسخر لكم ما في السموات والارض جميعًا منه) يقول من امره وتفسير روح الله انما معناه انها روح بكلمة الله خلقها كما يقال عبدُ الله ه وسماء الله، وارض الله،

(الرد على الجهمية ص ۲۱۹)

کن اللہ کا قول ہے اور کن مخلوق نہیں ہے، نصاریٰ اور جہمیہ نے حضرت عیسیٰؑ کے بارہ میں خدا پر جھوٹ کہا ہے، جہمیہ کہتے ہیں، کہ وہ اللہ کے روح اور اس کے کلمہ ہیں، اور اس کا کلمہ مخلوق ہے، نصاریٰ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ اللہ کی روح ہیں، اور اللہ کی ذات میں سے ہیں، جسطرح کہا جاتا ہے کہ یہ ٹکڑا اس کپڑے میں سے ہے، ہم کہتے ہیں کہ عیسیٰ کلمہ سے ہوئے ہیں، وہ خود کلمہ نہیں ہیں اور کلمہ تو اللہ کا قول ہے،

اور خدا کا قول کہ عیسیٰ "روح ہیں اللہ سے" (روح منہ) کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے حکم سے ان میں روح آگئی، یہ مطلب ہے کہ وہ خود اللہ کی روح ہیں جیسے خدا کا قول ہے (تمہارے کام میں لگایا ہے جو زمین اور آسمانوں میں ہے اپنے سے" (جمیعا منہ) مقصود اپنے حکم سے ہے اور اللہ کی روح ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ روح ہیں جسکو خدا نے اپنے حکم سے پیدا کیا، جیسے کہا جاتا ہے

ہ: اللہ کا بندہ، اللہ کا آسمان، اور اللہ کی زمین، یعنی اللہ کی پیدا کی ہوئی،

بہرحال اس مسئلہ سے عیسائیون کو اس قدر دلچسپی تھی، کہ ایک شخص ابن کلاب جو مسلمانون مین کلابیہ فرقہ کا بانی ہوا ہے، اور جو کہا کرتا تھا کہ کلام اللہ خود اللہ ہے، اس کے مرنے پر بغداد کا بڑا پادری فیثون نصرانی افسوس کرتا تھا، اور کہتا تھا کہ اگر یہ زندہ رہتا تو ہم مسلمانون کو عیسائی بنا لیتے، ابن کلاب کے اسی قول کی بنا پر اس وقت کے علماء نے اس کے نصرانی ہوجانے کا فتوی دے دیا تھا[1]،

کلمہ قرآن پاک مین | قرآن پاک نے حضرت عیسی علیہ السلام کے لئے تین جگہ کلمہ کا لفظ استعمال کیا ہے،

(۱) آل عمران مین حضرت زکریا علیہ السلام کو حضرت یحیی علیہ السلام کی بشارت دی گئی تو فرمایا :-

اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًا	اللہ تعالی آپ کو بشارت دیتا ہے،
بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ ،	یحیی کی جو تصدیق کرنے والے ہونگے
(رکوع ۴)	اوس کلمہ کی جو اللہ کی طرف سے ہوگا،

(۲) سورۂ نساء مین حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق عیسائیون کی غلط فہمی دور کرتے ہوے فرمایا،

انما المسیح عیسی ابن مریم	مسیح عیسی ابن مریم اللہ کے صرف رسول
رسول اللہ وکلمتہ القاھا	ہین، اور اللہ کے کلمہ ہین، جس کو اللہ
الی مریم (رکوع ۲۳)	نے مریم تک پہونچایا،

(۳) آل عمران کے پانچوین رکوع مین حضرت مریمؑ کو خوش خبری دی گئی،

اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ	بیشک اللہ تم کو ایک کلمہ کی جو اسکی
مِّنْہُ ،	جانب سے ہوگا بشارت دیتا ہے،

---

[1] فہرست ابن ندیم ص ۲۵۵،

لیکن تحقیق طلب امر یہ ہے کہ قرآن نے حضرت عیسیٰؑ کو ایک جگہ اللہ کا کلمہ، اور دو جگہ اللہ کی طرف سے کلمہ جو کہا ہے، اس کا کیا مفہوم ہے، کیا وہی جو عیسائیون کا عقیدہ ہے!

حقیقت یہ ہے کہ عیسائیون نے کلمۃ اللہ" کا جو مفہوم پیش کیا ہی، خود اصل دین عیسوی بھی اس سے بری ہے، کوئی سچا دین کفر کی تعلیم نہین دیسکتا ہے، عیسائیون نے "کلمۃ اللہ" کے تحت مین جتنے عقیدے پیدا کئے ہین وہ سب کے سب مصر اور یونان کے بُت پرست فلاسفہ سے ماخوذ اور توحید کے خلاف ہین،

قرآن پاک نے ان مین سے ہر عقیدہ کی تردید کی ہے،

یعقوبیون کے لئے کہا،

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ (مائدہ)	وہ کافر ہین جو کہتے ہین، کہ مسیح ابن مریم خدا ہین،

نسطوریون اور ملکائیون کے متعلق ارشاد ہوا،

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ، (مائدہ)	وہ کافر ہین جو کہتے ہین، کہ خدا تین مین کا تیسرا ہے!

تثلیث پرستون کے لئے عام طور پر فرمایا،

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ، (نساء)	مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح صرف خدا کے رسول تھے، اور اس کے "کلمہ" جس کو مریم تک اوس نے پہونچایا، اور اسکی طرف سے ایک بھیجی ہوئی روح تھے، پس خدا اور اسکے رسول پر ایمان لاؤ اور تین خدا نہ کہو

عیسائی کلمۃ اللہ کی تاریخ | اس قسم کے تمام عقائد باطلہ جنھون نے دین عیسوی کو مسخ کر دیا، ان کے متعلق حافظ ابن قیم نے اغاثۃ اللہفان (ص ۲، ۲۷۰) مین بہت معقول بات کہی ہو وہ یہ کہ عیسائیون نے جب اپنے صحیح دین کو کھو دیا، اور دوسرے مذاہب نیز اہل فلسفہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تو عیسوی مسائل مین ایسی لچک پیدا کرنا شروع کر دی کہ ہر مذہب و مسلک کے لوگ ان کے دین مین گنجائش پا سکین، چنانچہ انھون نے اہل فلسفہ کو دیکھا کہ وہ عقل، عاقل اور معقول کے اتحاد کے قائل ہین، تو انھون نے بھی باپ، بیٹے اور روح القدس کا نقشہ اپنے یہان کھینچ لیا،

حافظ ابن قیم نے "اتحاد ثلاثہ" کے جس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اس سے عقیدۂ کلمہ کی تاریخی حیثیت آشکارا ہوتی ہے، اس لئے اس کی کسی قدر وضاحت کی ضرورت ہی!

جس طرح اہل مذہب عبد و معبود کے درمیان فرشتون، دیوتاؤن اور ارواح کی وسائط کو مانتے ہین، جن کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ تدبیر عالم کا کام لیتا ہے، اسی طرح اہل فلسفہ مین اس قسم کا تخیل موجود ہے، گو مسلمانون کے سوا دوسری فرقون نے اس سلسلہ مین سخت دھوکا کھایا ہی، اور انھون نے ان وسائط کو معبود بنا لیا ہی!

اہل مذہب مین صابئی ان ہستیون کو ستارون کی صورت مین مانتے ہین، پارسی امشاسپند کہتے ہین، یہودی کروبیم کہتے ہین، عیسائی جبریل اور روح القدس کے نام سے تعبیر کرتے ہین، ہندو دیوتا اور دیبی کی شکل مین جانتے ہین اور اہل عرب خدا کی بیٹیان کہا کرتے تھے[۱]،

مصر کی اسکندری فلسفہ بھی اسی تصور کے ماتحت عقول عشرہ، اور نو آسمانون مین الگ ذی ارادہ نفوس تسلیم کرتا ہی!

---

[۱] سیرۃ النبی جلد ۴ ص ۵۵۵۔

ابن کثیر اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ (جلد ۲ ص ۱۰) میں کہتے ہیں کہ قرآن پاک کی آیت

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْزٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ	اور یہودیوں (میں سے بعض) نے کہا کہ
النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ	عزیر خدا کے بیٹے ہیں، اور نصاریٰ (میں
قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ	سے اکثر) نے کہا کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں
قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ،	یہ ان کا قول ہے منہ سے کہنے کا !
(توبہ - ۵)	یہ بھی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے
	جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں،

میں (قول الذین کفروا من قبل) سے اہلِ فلسفہ کے اسی تخیل کی طرف اشارہ ہے،

خالص یونانی فلسفہ نے بھی لوگس (Logos) کے نام سے ایک اولین ہستی کو تسلیم کیا ہے، جس کو خدا نے تمام کائنات کی پیدایش کا ذریعہ بنایا ہے، اسی کو اہلِ فلسفہ "عقل اول" سے تعبیر کرتے ہیں،

عیسائی اپنے دین میں اہلِ فلسفہ کے لئے کوئی گنجایش نکالنا ہی چاہتے تھے، انھوں نے اسی لوگس کے تخیل کو اپنے یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر چسپاں کر کے بت پرست یونانی فلسفیوں کو دین عیسوی میں شامل کرنے کی کوشش کی! لیکن اس اندھی تبلیغ میں وہ خود گمراہ ہوگئے !

حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں خدا کے بندے اور رسول کی حیثیت سے آئے تھے لیکن عیسائیوں کی فلسفہ پرستی نے ان کو عقل اول کی تقلید میں کبھی خالق اور مخلوق کے درمیان واسطہ بنایا، کبھی خدا بنایا اور کبھی بہ یک وقت دونوں بنا دیا،

یونانی فلسفہ میں لوگس کیا چیز ہے، اس کو ڈاکٹر ولیم نیسل کی زبان سے سنئے، وہ کہتا ہے

"اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ خدا بالکل وراے عالم ہونے کے باوجود اس کے اندر کس طرح عمل کرتا ہے، فائلو[۱] ایک مفروضہ قائم کرتا ہے، جس سے اس زمانہ کے اور لوگ بھی ناواقف نہیں تھے، لیکن جس کو فلاطینوس سے پیشتر فائلو سے زیادہ منظم طور پر کسی نے نہیں پیش کیا، یہ وہ مفروضہ ہے کہ خدا اور عالم کے درمیان واسطی ہستیاں پائی جاتی ہیں، ان ہستیوں کے مزید تعین کے لئے اس نے ملائکہ اور جنات کی نسبت مروجہ عقائد اور روح کی نسبت افلاطون کے بیانات کے علاوہ اس رواقی تعلیم سے بھی لیا، کہ خدا کی ہستی سے روحی اخراجات تمام عالم میں حلول کئے ہیں، ان واسطی ہستیوں کو وہ قوی یا ملکات کہتے ہیں، ایک طرف ان کو صفات الٰہیہ یا افکار الٰہیہ قرار دیتا ہے، جو عقل کل اور قوت کل کے اجزار ہیں، دوسری طرف ان کو خدا کے نبیے اور پیامبر کہتا ہے، اور انھیں ارواح، ملائکہ اور جنات قرار دیتا ہے، جو خدا کے ارادے کے مطابق عمل کرتے ہیں،

ان دو انداز ہاے بیان میں موافقت پیدا کرنا اور اس بات کا جواب دینا کہ یہ قوتیں شخصیت رکھتی ہیں یا نہیں، اس کے لئے ممکن نہ تھا، یہ تمام قوتیں ایک واحد قوت کے اندر پائی جاتی ہیں جو لوغوس ہے، لوغوس خدا اور عالم کے درمیان ایک واسطہ کلی ہے، وہ تمام تصورات کا ماخذ، اور خدا کی عقل و حکمت ہے، وہ تمام قوتوں کو شامل ہے، وہ خدا کا خلیفہ اور اس کا رسول ہے، عالم کی خلقت اور

---

[۱] ڈاکٹر توفیق صدقی اپنی کتاب نظرۃ فی کتب العہد الجدید میں کہتے ہیں کہ فائلو اپنے پیشرو یونانی فلسفی زینو کا بڑا مداح تھا، اور زینو لوگس کے عقیدہ کا زبردست مبلغ تھا،

حکومت اسی کے ذریعہ سے ہوتی ہے، وہ سب سے بڑا فرشتہ اور خدا کا سب سے پہلا بیٹا ہے، جسے خدائے ثانی بھی کہہ سکتے ہین، لوغوس یا کلمہ عالم کا اصلی نمونہ ہے جس نے کائنات کو بہ طور ایک پیراہن کے پہن لیا ہے۔[۱]

فلسفۂ یونان کا یہ لوگس عیسائیون کے یہان یوحنا کی انجیل مین اس طرح ظاہر ہوا،

"ابتدا مین کلام تھا، اور کلام خدا کے ساتھ تھا، سب چیزین اس سے موجود ہوئین، اور کوئی چیز موجود نہ تھی، جو بغیر اس کے ہوئی، (یوحنا ب)

عیسائیون نے اہلِ فلسفہ کی طرح جب مسلمانون کو اپنے دام مین لانا چاہا، تو لوگس کے اسی تخیل کو قرآنی لفظ "کلمۃ اللہ" کے ذریعہ سے ادا کرنا چاہا کہ شاید ابن کلاب جیسے کچھ اور لوگ بھی ان کو ہاتھ آجائین، یہ ہے عیسائی کلمۃ اللہ کی تاریخ!

قرآن مین کلمۃ اللہ کا مفہوم اب دیکھنا چاہئے کہ قرآن پاک نے "کلمہ" کو کس معنی مین استعمال کیا ہے!

قرآن پاک نے کلمہ کا اطلاق "ایک قول تام" پر کیا ہے[۲] یہ قول تام کہین صرف بات کے معنی مین ہے، ارشاد ہوا،

(۱) وَيُنْذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ (کہف ۱)	اور تاکہ ان لوگون کو ڈرائے جو یون کہتے ہین، کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے، تو اسکی کوئی دلیل ان کے پاس نہین ہے بڑی بھاری بات ہے جو انکے

بات کے معنی مین

---

[۱] مختصر تاریخ فلسفہ یونان ص ۲۶۹ دار الترجمہ [۲] الجواب الصحیح ابن تیمیہ جلد ۲ ص ۱۶۳ الرد علی المنطقیین ابن تیمیہ ص ۲۲۳ قلمی،

اس آیت میں قرآن نے قول (اتخذ اللہ ولدا) کو کلمہ کہا،

(۲) قُلْ یَا اَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (آل عمران)

آپ فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمھارے درمیان (مسلم ہونے میں) برابر ہے، کہ بجز اللہ تعالیٰ کے اور کسی کی عبادت نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے

اس آیت میں یہ پوری بات (اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ الخ) کلمہ ہے،

(۳) حَتّٰی اِذَا جَاءَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَکْتُ کَلَّا اِنَّھَا کَلِمَۃٌ ھُوَ قَائِلُھَا، (مومنون-۶)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت آتی ہے، اسوقت کہتا ہے اے میرے رب مجھ کو پھر واپس بھیج دیجئے تاکہ جس کو میں چھوڑ رہا ہوں، اس میں نیک کام کروں، ہرگز نہیں یہ ایک وہ ایک ہی بات ہے، جس کو یہ

یہاں قول (رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت) کلمہ ہے،

لفظ کلمہ کے دوسرے معنی "طے شدہ بات" اور "امر مقدر" کے ہیں، یعنی وہ بات جو علم الٰہی میں پہلے طے ہو چکی ہے، آیات ذیل اسکی شاہد ہیں،

(۱) وَلَقَدْ سَبَقَتْ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا اور ہمارے خاص بندوں یعنی پیغمبروں

الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ	کیلئے ہماری بات پہلے ہی سے مقرر
وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ،	ہو چکی ہے، کہ بیشک وہی غالب کئے
(صافات ۵)	جائین گے، اور ہمارا ہی لشکر غالب

معلوم ہوا کہ یہ بات کہ پیغمبرون کو کامیابی اور خداوندی لشکر کو غلبہ ہوگا، پیشتر ہی اس کا فیصلہ ہو چکا ہے، اسی کو (سبقت کلمتنا) سے ادا فرمایا،

(۲) كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى	اسی طرح تمام کافرون پر آپکے رب
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّهُمْ اَصْحَابُ	کی یہ بات ثابت ہو چکی ہے، کہ وہ
النَّارِ، (مومن)	لوگ دوزخی ہون گے،

یعنی کافرون کا دوزخی ہونا اللہ کے نزدیک ایک امر ثابت ہے، اس امر ثابت کیلئے حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ ارشاد فرمایا،

(۳) وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا	اور ہم نے ان لوگون کو جو بالکل کمزور
يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ	شمار کئے جاتے تھے، اس سرزمین کے
وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا وَ	پورب اور پچھم کا مالک بنا دیا جس مین
تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى	ہم نے برکت رکھی ہے، اور آپکے رب
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ،	کی بھلی بات بنی اسرائیل کے حق مین انکے
(اعراف - ۱۶)	صبر کی وجہ سے پوری ہو گئی،

گویا بنی اسرائیل کا صبر کے باعث مصریون کے مقابلہ مین کامیاب ہونا اور زمین کا وارث بننا خدا کے نزدیک ایک ہونے والی بات تھی، جو ہو کر رہی، اسی کو تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى سے ظاہر فرمایا،

اہل فسق اپنے تمرد اور سرکشی کی وجہ سے ایمان نہ لائین گے، یہ بات خدا کے نزدیک مسلم ہے،
اسی امر کو حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ سے یون ادا کیا،

(۴) كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى	اسی طرح آپ کے رب کی یہ (ازلی)
الَّذِيْنَ فَسَقُوْا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ	بات کہ ایمان نہ لائین گے، تمام سرکش
(یونس ۴)	لوگون کے حق مین ثابت ہو چکی ہے،

ان تمام تشریحات کے بعد قرآن پاک کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "کلمۃ اللہ" کہنے کا مقصد واضح ہو جاتا ہے یعنی بغیر باپ کے پیدا ہونا علم الٰہی مین ایک طے شدہ بات تھی،

اسی طے شدہ بات کو قرآن پاک نے (امر مقضی) کہہ کر بالکل صاف کر دیا ہے فرمایا،

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلَامٌ وَّلَمْ	(حضرت مریم) کہنے لگین بھلا میرے لڑکا
يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا قَالَ	کس طرح ہو گا، حالانکہ مجھکو کسی بشر نے
كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ	ہاتھ نہین لگایا، اور نہ مین بدکار ہون
هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗ اٰيَةً لِّلنَّاسِ	فرشتہ نے کہا یون ہی ہو جائیگا، تمھارے
وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا	رب نے فرمایا ہے کہ یہ بات مجھ کو آسان ہے
(مریم ۲)	اور اس طور پر اس لئے پیدا کرین گے) تاکہ اس فرزند کو ہم لوگون کے لئے ایک نشانی اور رحمت کا سبب بنائین، اور یہ ایک طے شدہ امر ہے،

اس سے صاف ظاہر ہوا کہ قرآن کی اصطلاح مین حضرت عیسیٰ علیہ السلام "کلمۃ اللہ" اس لئے ہوئے کہ ان کا اس طرح پیدا ہونا ایک امر مقدر اور طے شدہ بات تھی،

کلمۃ اللہ اور بائبل | بائبل کے عربی تراجم مین بھی ایسی آیات موجود ہین جن مین کلمہ کا وہی مفہوم ہے

جو قرآن کا مفہوم ہے یعنی کلمہ بمعنی بات، حکم اور امر مقدر،

چند مثالین ملاحظہ ہون،

(۱) مزمور الثالث والعشرون آیت ۶،

بکلمۃ الرب صُنِعَت السموات — خدا کے کلمہ سے آسمان بنے،

(۲) اخبار الایام الاول باب ۱۷، آیت ۳

حلّت کلمۃ اللہ علیٰ ناثان النبی — خدا کا کلمہ ناثان نبی کے پاس پہونچا،

(۳) کتاب ہوسیع باب اول،

کلمۃ الربّ التی صارت الیٰ ھوسیع — خدا کا کلمہ جو ہوسیع کے پاس پہونچا

(۴) لوقا باب ۳، آیت ۲،

حلّت کلمۃ الرّب علیٰ یوحنّا بنُ زکریا، — خدا کا کلمہ یوحنا بن زکریا کے پاس پہنچا،

کلمۃ اللہ اور کلمۃ تکوین اس سلسلہ مین یہ امر بھی ذہن نشین کر لینے کے قابل ہے کہ مفسرین عموماً کہتے ہین، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدایش کلمۂ تکوین یعنی کُن (ہو جا) سے ہوئی، جس طرح سارے عالم کی تکوین اسی کُن (ہو جا) کے حکم سے ہوئی ہے،

اذا قضیٰ امرًا فانّما یقول لہٗ کُنْ فیکُون (مریم ۲) — جب کسی کام کو پورا کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے،

اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام "کلمۃ اللہ" کہے گئے،

اس سے معلوم ہوا کہ کلمۃ اللہ وہی امر مقدر ہے، اور کلمہ تکوین اس امر مقدر مین تصرف کے لئے تعبیر ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی کلمۂ تکوین کو عالم مین تصرف ارادی

سے تعبیر کیا ہے[1]

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن پاک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا کلمہ اس لئے نہین کہا ہے، کہ وہ خدا کی صفت کلام ہین، جو ذات الٰہی کے ساتھ قائم ہے، یا ذات الٰہی ین ہین، یا ذات الٰہی ہین، جیسا کہ عیسائیون کا بیان ہے، بلکہ اس لئے کہا ہے کہ جس طرح وہ حضرت مریمؑ کے پیٹ سے مستثنیٰ شکل مین پیدا ہوے، یہ پیدایش اللہ تعالیٰ کا امر مقدر تھا، جس کا ظہور حکم الٰہی سے ہوا،

سوال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدایش کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے اپنا امر مقدر یا طے شدہ یا بحکم الٰہی ان کی پیدایش کیون بتایا اور انکی روح حیات کو اپنی طرف کیون منسوب کیا، اس کا جواب یہ ہے کہ یہود نے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر جو الزام لگائے تھے کہ حضرت مریمؑ نعوذ باللہ منہ مرتکب حرام ہوئی تھین، اور حضرت عیسیٰ نعوذ باللہ ولد الحرام تھے اس الزام کو دور فرما کر دونون کی پاکی اور طہارت کے اظہار کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی پیدایش کے طریق کو اپنا حکم تقدیری اور اپنی جانب سے بخشی ہوئی روح زندگی فرمایا، اور حضرت مریمؑ کی نسبت ارشاد فرمایا،

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ	اور مریم عمران کی بیٹی جس نے اپنی
فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُّوحِنَا وَ	شرمگاہ کی محافظت کی، پس پھونکا
صَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكَانَتْ	ہم نے اس مین اپنی روح سے، اور
مِنَ الْقَانِتِينَ،	مانتی تھی اپنے رب کی باتون کو اور
(تحریم ۲)	اوس کی کتابون کو، اور تھی فرمانبردارون مین

---

[1] فوز الکبیر بحث شرک،

مشاعرۂ نمایش اعظم گڈھ

کا

خطبۂ صدارت

از مولانا عبد السلام صاحب ندوی

افسانۂ یاران کہن خواندم و رفتم دریاب کہ لعل و گہر افشاندم و رفتم

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ یہ مشاعرہ اوس سرزمین پر ہو رہا ہے جس نے علامہ شبلی، مولانا حمید الدین اور مولانا فاروق جیسے ادیب و انشا پرداز اور نقادانِ فنِ شعر پیدا کئے ہیں، اور اس سرزمین کی اسی علمی حیثیت کو پیشِ نظر رکھکر یہاں دار المصنفین قائم کیا گیا ہے، جس کی علمی عظمت و شان سے آپ لوگ واقف ہیں، ایسی حالت مین اگر اس مشاعرہ کو صرف تفریحی حیثیت دیجئے تو یہ اس سرزمین بلکہ اس سرزمین پر ہونے والے مشاعرہ کی سب سے بڑی توہین ہو گی، اسلئے دار المصنفین کے ادنیٰ خادم ہونے کی حیثیت سے مولوی بشیر احمد صاحب صدیقی صدر مشاعرہ کمیٹی نے مجھ سے یہ خواہش کی ہے، کہ مین اپنے خطبۂ صدارت مین اردو غزلگوئی پر ایک مختصر سا تاریخی اور تنقیدی تبصرہ کر دن، اگر میں اس خواہش کے پورا کرنے مین کامیاب ہو گیا تو یہ میرے لئے باعثِ اعزاز اور آپ لوگون کے لئے موجبِ دلچسپی ہو گا، مین جانتا ہون کہ جو لوگ شعراء کی نغمہ سنجیون سے لطف اندوز ہونے کے لئے بیقرار ہین، وہ میری دراز نفسی کو بہت زیادہ پسند نہ کرین گے، لیکن اس قسم کے لوگون کی تسکین کے لئے مین اپنے تبصرہ کو جہان تک ممکن ہو گا

دلچسپ بنانے کی کوشش کرونگا، البتہ مین اپنے اندازِ بیان مین ترنّم آمیز موسیقیت پیدا کرنے پر قادر نہین ہون،

حضرات! لغت مین غزل کے معنی عورتون سے بات چیت کرنے یا اون سے لگاوٹ پیدا کرنے کے ہین، لیکن اصطلاح میں اُس صنفِ شعر کو کہتے ہین، جس مین عشق و محبت کے حالات و واقعات بیان کئے جاہین، لیکن یہ حالات و واقعات غیر محدود ہوتے ہین، اس لئے سب سے پہلے یہ متعین کرنا چاہئے، کہ کون کون سے حالات و واقعات غزل کا موضوع بن سکتے ہین، یعنی عشق و محبت کے کن حالات و واقعات کو غزل میں بیان کرنا چاہئے، تیسری اور چوتھی صدی کے نقادانِ فنِ شعر نے اس کا یہ اصول بتایا ہے، کہ جن واقعات و حالات کی بنیاد قوت کے بجائے ضعف پر ہو، وہی غزل کا اصل موضوع اور غزل کا حقیقی سرمایہ ہین، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے، کہ کامیاب غزل گو شاعر وہی جو دنیا کے محبوب و مرغوب اخلاقی اور معاشرتی بلکہ جسمانی نظام کو بالکل الٹ پلٹ دے، دنیا عزت چاہتی ہے، لیکن وہ ذلت کا خواستگار ہو، دنیا خوش قسمت بننا چاہتی ہے، مگر وہ بد قسمت بننا پسند کرے، دنیا زندہ رہنا چاہتی ہی لیکن وہ موت کا خواہشمند ہو، غرض دنیا کے پسندیدہ نظام کو جو غزل گو شاعر جس قدر الٹ پلٹ سکے، اُسی قدر وہ غزل گوئی مین کامیاب ہوگا، اردو شعراء مین سب سے پہلے میر نے جو مسلّم طور پر ایک کامیاب غزل گو شاعر سمجھے جاتے ہین، غزل کی اس حقیقت اور غزل کے اس موضوع کو سمجھا ہی اور فخریہ اس کا اظہار کیا ہی،

تری چال ٹیڑھی تری بات الٹی — تجھے میر سمجھا ہے یان کم کسو نے

لیکن متاخرین کے دور مین سب سے زیادہ غزل کی اس حقیقت کو حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی نے واضح کیا ہی، اس لئے غزل کی حقیقت کے سمجھانے کے لئے مین سب سے پہلے

انہی کے دیوان سے آپ کو چند الٹے پلٹے شعر سنانا چاہتا ہون،

ناتوانی کا ہے کچھ بل انھین کچھ ضعف کا زور
عاشقوں کے ہین یہی قوت بازو دونون

ہمین دیکھے ذلت وہ محفل مین اپنی
معزز کرین گے گرامی کرین گے

خوش نصیبی کبھی ہم پر بھی عنایت کرتی
کہہ کے کمبخت ہی اک دن وہ پکارے ہوتے

فانی جو ترے عشق مین قبل از وفات ہین
بس ہے انہی کی زیست یہی ذی حیات ہین

مرنے والے مجھے کہکر وہ جلا لیتے ہین
کو سنا اون کا مرے حق مین دعا ہوتا ہے

ہوش مین آو کسی کا یہ ادا سے کہنا
اور اے وحشت دل ہوش رہا ہوتا ہے

غرق دریا ے محبت ہی کا تھا بیڑا پار
ڈوبنے والے سے بہتر کوئی تیراک نہ تھا

کھلی ہین بند ہو کر جلوہ گاہ یار مین آنکھین
حواس رفتہ ہی کچھ ہوش مین ہوش کو لاتے ہین

تا کہ خود گم نہ ہو عاشق نہین ملتا معشوق
ہوش کہتا ہے مجھے کھوؤ تو کچھ پاؤ بھی

حواس کھوتے ہین جو راہ عشق مین اپنے
انہی کے ہوش کو ہم کچھ بجا سمجھتے ہین

لیکن یہ غزل گوئی کا پہلا درجہ ہے، کیونکہ اس درجہ مین اگرچہ انسان اولٰی خواہشین رکھتا ہے تاہم وہ خواہشون سے دست بردار نہین ہوتا، لیکن اس کے بعد اس سے اعلیٰ تر ایک اور درجہ آتا ہے، جہان انسان تمام خواہشون سے الگ ہو کر اپنے آپ کو صرف معشوق کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے، اس لئے اس درجہ کی غزل گوئی پہلے درجہ سے بھی زیادہ معصوم اور زیادہ مقدس ہوتی ہے، لیکن اس قسم کے جستہ جستہ اشعار بڑی محنت و تلاش سے صرف اہل ذوق کو ملتے ہین، مثلاً

آتش

الٹے سیدھے سے غرض ہم نہیں رکھتے
جو کہے یار ہمیں سُن کے یہ کہنا بہتر

مین جو کہتا ہون سراسر ہے غلط
سب بجا ہے آپ جو فرمائیے

ہجر اچھا ہے نہ الفت مین وصال اچھا ہے
یار جس حال مین رکھے وہی حال اچھا ہے

تجھ سے مانگون مین تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالون سے یہی ایک سوال اچھا ہے

عشق و محبت کا یہ وہ درجہ ہے، جس مین عاشق کو معشوق کی بُری چیزین بھی بھلی معلوم ہونے لگتی ہین، مثلاً

تمکو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھکو غصہ پہ پیار آتا ہے

وصل سے ہجر وہ اچھا جو کوئی پوچھنے آئے
صبح کیونکر ہوئی؟ گذری شب فرقت کیسی؟

برا وہ کہیں یا بھلا ہم کو ناصح
بہر طور اپنا بھلا ہو رہا ہے

لیکن ان مضامین اور ان خیالات کے اظہار کے لئے سب سے زیادہ ضروری شرط یہ ہے کہ غزل کا لہجہ نہایت خاکسارانہ عاجزانہ اور نیازمندانہ بلکہ غلامانہ ہو، مثلاً

تقصیر ہو معاف تو اک عرض ہے یہ مین
یہ عرض ہے قصور ہمارا معاف ہو

کیا پوچھتے ہو تجھپہ عنایت ہو کس قدر
اذنِ غرور و ناز تمھیں جس قدر ملے

نہین ہم سے ہو سکتی طاعت زیادہ
بس اب خانہ آباد دولت زیادہ

دیکھو ہمیں بد کہتے ہو اچھا نہیں کرتے
ہر طرح تمھارے ہین بُرے ہیں کہ بھلے ہم

اس اصول کے مطابق عشق و محبت مین انسان جتنی ہی بلندی سے اپنے آپ کو گرائے اسی قدر غزل گو شعراء کے نزدیک سر بلند ہوتا ہے، مرزا غالب فرماتے ہین :-

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار مین
فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

اس شعر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ہندوستان کا بادشاہ تخت و تاج کو چھوڑ کر اور معشوق کی گلی مین بیٹھکر عشق و محبت کا نام بلند کرتا ہے لیکن اس سے زیادہ واضح مطلب یہ ہے کہ جو شخص سایۂ دیوار یار مین بیٹھتا ہے، اوس کا درجہ اس قدر بلند ہو جاتا ہے کہ اس کو

ہندوستان کا بادشاہ کہہ سکتے ہین،

اصولِ فن کے مطابق غزل کے چند سرسری اشعار جو مین نے آپ کو سنائے ان سے آپ کو اس قدر تو معلوم ہو گیا ہوگا، کہ فحاشی، بیحیائی، بدتمیزی، بداخلاقی، رندی، سیہ کاری اور شراب خواری جیسے قابلِ اعتراض مضامین غزل کے موضوع سے الگ ہین، اسی طرح اعلیٰ درجہ کے پیچیدہ مضامین بھی مثلاً فلسفہ، تصوف اور اخلاق کے مسائل اور سیاسی خیالات بھی عشق و محبت کے دائرے سے خارج ہین، صرف چند سیدھی سادھی نیاز مندانہ باتین ہین، جو نرم، شیرین اور عاجزانہ لہجہ مین غزل میں بیان کیجاتی ہین، اس لئے غزل گو شاعر کا دائرہ نہایت محدود ہے، نواب مرزا داغ فرماتے ہین،

کیا کہوں گا جو کہا اوس نے کہ اچھا کہئے بات اے داغ محبت کے سوا کون سی ہو

لیکن ان کے علاوہ چند اور مضامین بھی ادنیٰ مناسبت سے غزل میں شامل کر لئے گئے ہین اور یہ وہ چیزین ہین، جو معشوق کی یاد کو تازہ کرتی ہین، برسات کی اندھیری راتون مین بجلی کی چمک، بادل کی کڑک، نسیم سحر کے خوشگوار جھونکے، باغ و بہار، سبزہ و لالہ زار غرض اس قسم کی بہت سی چیزین ایک غزل گو شاعر کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہین، اور وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے

کیا بلا جھوم کے گھنگھور گھٹا آئی ہے ہائے اس وقت مرا گیسوؤن والا ہوتا

گلشن بھی ہے بہار بھی ہے ابر تر بھی ہے یادش بخیر یار کو لائین کہان سے ہم

اس قسم کے حالات مین ہوس کا شائبہ بھی کسی قدر غزل مین شامل ہو سکتا ہے، لیکن عشق و محبت کی پاکیزگی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب معشوق کو مصیبت کے اوقات میں یاد کیا جائے ایک جاہلی شاعر کہتا ہے،

ذکرتک والخطی یخطر بیننا وقد نھلت منا المثقفۃ السمر

اس جاہلی شاعر کا یہ شعر فارسی اور اردو کے پورے عاشقانہ لٹریچر پر بھاری ہو، وہ معشوق سے کہتا ہو کہ مین نے تجھکو اُس وقت یاد کیا جب کہ دشمنون کے نیزے میرے خون کو چوس رہے تھے، اس قسم کے بلند عاشقانہ شعر ایک جفاکش جنگجو شاعر ہی کہہ سکتا ہو، عیش و طرب کے گہوارے مین پلنے والے نازک خیال شاعر نہین کہہ سکتے، عربی شاعری مین عاشقانہ مضامین یہین تک محدود تھے، لیکن ایرانی شعرا اہلِ عرب سے زیادہ وسیع الخیال اور وسیع المشرب تھے، انھون نے دیکھا کہ انسان کے علاوہ جانورون بلکہ غیر ذی روح چیزون مین بھی عشق و محبت کا مادہ پایا جاتا ہی، اور ان سے شاعری مین کام لیا جاسکتا ہی،

چنانچہ ہندی شاعری مین سرخاب کے جوڑے کا عشق ضرب المثل ہی، اسی طرح ہندو شعرا کے نزدیک بھونرا، کنول کے پھول کا عاشق تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن ایرانیون نے ان بھدے جانورون کو چھوڑ کر اور بہت سی چیزون کے اشتراکِ عمل سے عشق و محبت کی ایک مستقل برادری قائم کر لی، ان کی نازک خیالی نے دیکھا کہ ذرہ آفتاب پر، قمری سرو پر، بلبل پھول پر اور پروانہ شمع پر فریفتہ ہے، تو وسیع المشربی کی بنا پر ان سب کو عشق و محبت کی بزم مین اپنے برابر جگہ دی، اور ان کے عشق و محبت کے واقعات سے نہایت نازک اور لطیف مضامین پیدا کئے، اردو زبان کے شعرائنے بھی انہی کی تقلید کی، اور ان چیزون کو عاشقانہ شاعری کا جزو بنا دیا،

جو دل ہی حلقۂ بزم شراب سے باہر وہ ذرہ ہی عملِ آفتاب سے باہر

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

مستی مین بلبلون نے نشیمن کی واسطے تاکی ہین جھومتی ہوئی شاخین نہال مین

ہر شمع پہ پروانے گر کر پکا رے لگی دل کی عاشق بجھاتے ہین جل کر

جانِ سمندر و دلِ پروانہ دی مجھے اے سوزِ عشق ہمتِ مردانہ دی مجھے

تاریخی افسانے مثلاً لیلیٰ و مجنون اور شیرینؔ فرہاد کے عشق و محبت کی داستان بھی اسی سلسلہ کی چیز ہے، بلبل، پروانہ اور قمری کی مناسبت سے صیاد آشیان قفس، شمع، لگن، بزم و انجمن اور سرو و جو بار سب غزل مین آگئے، اور ان سے شعرائے نہایت لطیف مضامین پیدا کئے، فارسی شاعری مین شیخ سعدی، امیر خسرو اور حسن دہلوی کے زمانہ تک زیادہ تر یہی عاشقانہ خیالات فارسی غزلگوئی کا جزو اعظم رہے، لیکن ان کے بعد خواجہ کرمانی نے دنیا کی بے ثباتی وسیع المشربی اور رندی و مستی کے مضامین غزل مین شامل کئے، اور یہ پہلا دن تھا کہ غزل مین ایسے مضامین شامل ہوئے جو غزل سے کوئی تعلق نہین رکھتے تھے، خواجہ حافظ نے اس مین اور بھی زیادہ وسعت پیدا کی، اور اخلاق، فلسفہ، تصوف، علم کلام، پند و موعظت اور سیاست غرض ہر قسم کے مضامین غزل مین شامل کر دیئے، اور ان مضامین کو اس خوبی سے ادا کیا، کہ غزل کی زبان اور غزل کی لطافت مین ذرہ برابر بھی فرق نہین آنے پایا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بیگانہ مہمان خود صاحب خانہ بن گئے اور اب غزل کا جو اثاثہ قائم ہوا وہ عشق و محبت سے زیادہ اسی قسم کے غیر متعلق مضامین پر مشتمل تھا، اس لئے اب عاشقانہ شاعری کی پاکیزگی جاتی رہی، اور رندی و سیہ کاری کے مضامین کی وجہ سے ایک طرف تو ملحدانہ مضامین کا سلسلہ شروع ہوا، دوسری طرف اپنے گناہون کی ندامت سے توبہ و استغفار کا غلغلہ بلند ہوا، اور رحمتِ خداوندی کی وسعت کا راگ گایا گیا، غرض دوزخ و جنت، حشر و نشر، حور و قصور، عذاب و ثواب، حساب و کتاب بھی غزل کا جزو ہوگئے، حالانکہ ان مضامین کو عشق و محبت سے کوئی تعلق نہین، یہ مسجد و منبر کی چیزین ہین، لیکن رندی و مستی کے خیالات خواجہ صاحب نے جس جوش اور بلند آہنگی سے ادا کئے تھے، اون کے بعد کسی سے ادا نہ ہو سکے، البتہ فلسفیانہ اور صوفیانہ مسائل کی پیچیدگی اور کثرت مین روز بروز اضافہ ہوتا گیا، اور عرفی و فیضی نے

ان کو نہایت مغلق اور مبہم انداز مین ادا کیا، مرزا صائب اور کلیم وغیرہ نے تمثیلی پیرایہ مین بہت سے اخلاقی مسائل بیان کئے اور اس طرح تمام دنیا کے علوم و فنون غزل مین شامل ہو گئے، لیکن باین ہمہ شعرار کا ایک گروہ دیکھ رہا تھا، کہ غزل اپنے اصلی موضوع یعنی عشق و محبت کے مضامین سے بیگانہ ہوتی جاتی ہے، اس لئے نظیری نے خالص تغزل کا رنگ اختیار کیا، اور اس حیثیت سے عرفی کی بہ نسبت زیادہ مشہور و مقبول ہوا مرزا صائب فرماتے ہین ع

عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

شرف جہان، ولی دشت بیاضی، علی قلی میلی اور وحشی یزدی نے وقوعہ گوئی یعنی اہل لکھنؤ کی اصطلاح مین معاملہ بندی شروع کی، اور معاملہ بند شعرار کا عشق اگرچہ سوقیانہ اور بازاری ہوتا ہی تاہم بازاری عشق بھی بہرحال عشق و محبت ہی کی ایک قسم ہی، اور چونکہ عوام کی حالت کے زیادہ مطابق ہی، اس لئے عرفی کے فلسفہ، مرزا صائب کے اخلاقی مضامین بلکہ خود نظیری کی متغزلانہ رنگ سے بھی اس کو زیادہ حسن قبول حاصل ہوا، اور اس دور کے اکثر مشہور شعرار اسی رنگ مین کہنے لگے، فارسی شاعری مین چند اور مضامین بھی غزل مین شامل ہوئے، جو غزل سے بالکل بے تعلق تھے، یعنی دیر و حرم، ناقوس و کلیسا، قشقہ و زنار، شیخ و برہمن، بت و بت خانہ وغیرہ، اور مین خیال کرتا ہون کہ اس قسم کے مضامین عوام پسند تصوف کی اس منزل مین پہنچ کر پیدا ہوئے، جہان تمام مذاہب ایک ہی سطح پر نظر آتے ہین ع

از یک چراغ کعبہ و بتخانہ روشن است

اردو شاعری چونکہ فارسی شاعری کا ایک پرتو اور عکس ہے، اس لئے اردو شاعری مین ابتدا ہی سے یہ تمام مخلوط مضامین شامل ہو گئے، صرف ایک خارجی اور غیر متعلق مضمون رہ گیا تھا جس کی آمیزش شیخ ناسخ کے زمانہ سے ہوئی، اہل ادب نے لکھا ہی کہ جن اشعار مین معشوق

کے اعضاء جوارح اور زیبایش اور آرایش کی تعریف کیجاتی ہے، وہ غزل میں شامل نہیں ہیں لیکن شیخ ناسخ نے نہ صرف معشوق کے اعضاء جوارح کی تعریف کو بلکہ اوس کے ہاتھی، گھوڑے، پاندان، خاصدان، پیچوان، اور حلم و تمنا کو، سب کی مدح و ستایش کو غزل کا جزو بنا دیا، اس لئے ایک ایسی شاعری پیدا ہو گئی، جو غزل اور قصیدہ دونوں سے الگ تھی لیکن خود انہی کے زمانہ میں اسکی اصلاح بھی ہونی شروع ہوئی، اور آتش اور اُن کے تلامذہ نے ایک مستقل عاشقانہ رنگ اختیار کیا، چنانچہ خواجہ آتش فرماتے ہیں :-

ڈھلتی ہے عاشقانہ ہماری غزل تمام پھانے ہوئے ہیں کوہ فرنگی محل تمام

ان کے شاگرد میر وزیر علی صبا کہتے ہیں،

مضمون پیدا رہیں مگر وہ اے صبا اشعار ہر زمین میں ہیں عاشقانہ فرض

یہ درحقیقت ناسخ پر چوٹ ہے، ایک تو یہ کہ ناسخ مضمون آفرینی کرتے تھے، جو غزل کے لئے ناموزون ہے، غزل کے اشعار کو صاف اور واضح ہونا چاہئے، دوسرے یہ کہ ان کا کلام عشق و محبت کے جذبات سے بالکل خالی ہے، حالانکہ یہی چیز غزل کی جان ہے، خواجہ آتش کے ایک دوسرے شاگرد آغا حجو شرف نے اردو غزل گوئی میں سب سے بڑی اصلاح یہ کی کہ فارسی اور اردو غزلگوئی کے ان تمام الفاظ کو متروک قرار دیا، جنھوں نے غزل کو رندی، ہوسناکی، بدتہذیبی، بداخلاقی، بلکہ الحاد اور بے دینی کا مجموعہ بنا دیا تھا، مثلاً انھوں نے بت، صنم، کلیسا، بتخانہ، برہمن، ناقوس، زنار، زاہد، واعظ، ناصح، شیخ، پیر مغان، مغبچہ، ساقی، رند، جام، ساغر، شیشہ، قلقل، صہبا اور شراب وغیرہ کے الفاظ و مضامین کو چھوڑ دیا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ غزل گوئی کا ایک نہایت بلند اور پاکیزہ معیار قائم ہو گیا، اور وہ تمام مضامین غزل کے دائرہ سے خارج ہو گئے، جن کا غزل سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن بایں ہمہ ناسخ کا رنگ متاخرین شعراے لکھنو کے زمانہ تک قائم رہا، اور امیر اسیر اور منیر وغیرہ

اسی رنگ مین کہتے رہے، البتہ حکیم سید ضامن علی جلاؔل لکھنوی نے بتدریج اپنے کلام کی اصلاح کی، اور اخیر مین ان کا کلام یکسر عشق و محبت بن گیا جس مین نہ فلسفہ ہے، نہ تصوف، نہ شراب ہے نہ کباب، نہ رندی ہے نہ ہوسناکی، نہ مذہب ہے نہ اخلاق، بلکہ صرف عشق و محبت کی بے میل باتین ہین، چونکہ مجھکو خالص اور بے میل غزل کا ایک نمونہ دکھلانا ہے، اس لئے مین ان کی ایک غزل کے چند اشعار آپ کو سناتا ہون،

ستم کو ہم غنیمت جانتے ہین ۔۔۔ یہی تیری عنایت جانتے ہین
عداوت ہی کئے جائین وہ ہم سے ۔۔۔ اسی کو ہم محبت جانتے ہین
تری محنت کشانِ عشق اے دوست ۔۔۔ ہر اک ایذا کو راحت جانتے ہین
وہ گھر جس گھر مین خاک اُڑتی ہو دنیا ۔۔۔ اوسی ہم دشتِ وحشت جانتے ہین
نہ جانین ناز سے چلنا وہ لیکن ۔۔۔ بپا کرنا قیامت جانتے ہین
جلاؔل ان کا اگر کرتا ہون مین شکر ۔۔۔ اُسے بھی وہ شکایت جانتے ہین

اساتذۂ دہلی مین بھی ذوقؔ اور شاہ نصیرؔ نے بالکل ناسخؔ کا رنگ اختیار کیا، غالبؔ نے پہلے زیادہ بیدلؔ کی اور بعض موقعون پر ناسخؔ کی روش اختیار کی، اور اس رنگ مین ایسے اشعار لکھے جو اس زمانہ مین مہمل اور بے معنی سمجھے جاتے تھے، اس کے بعد عرفیؔ اور نظیریؔ کا رنگ اختیار کیا، لیکن وہ بھی مقبول نہ ہوا، مجبوراً میرؔ کی سادہ عاشقانہ روش اختیار کی، اور اسی رنگ کے اشعار غالبؔ کے دیوان کی زینت ہین، بیدلؔ اور عرفیؔ وغیرہ کی تقلید نے شعرائے دہلی کے کلام مین بہت زیادہ پیچیدگی پیدا کر دی تھی، اور فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبون کا عنصر غالب کر دیا تھا، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ غزل کے اشعار وہی پسندیدہ ہین، جو صاف، سادہ اور روان ہون، اس لئے غالبؔ، مومنؔ اور ذوقؔ کے تلامذہ نے صفائی اور برجستگی کی طرف توجہ

کی، اور شیفتہ، مجروح، انور اور داغ جیسے برجستہ گو شعرا پیدا ہوگئے،

ان تمام تغیرات اور اصلاحات کے بعد دور جدید کے غزل گو شعراء کی باری آتی ہے جن کے بہترین نمایندے ہماری خوش قسمتی سے یہان موجود ہین، اور جن کی نغمہ سنجیون سے میری ہرزہ سرائی کے چند ہی منٹ بعد اس جلسہ کی فضا گونجنے لگے گی، چونکہ اس وقت ہمارے کانون مین انہی کی غزلون کی خوشگوار آوازین آئین گی، اسلئے مین نہایت اختصار کے ساتھ بغیر کسی قسم کی دلآزاری اور عیب جوئی کے ان کے کلام کے عیب و ہنر کی طرف چند اجمالی اشارات کرنا اپنا تنقیدی فرض سمجھتا ہون،

اردو زبان مین غزل گوئی کا جدید دور مولانا حالی کے اون اصلاحی خیالات سے شروع ہوا ہے، جن کو انھون نے اردو غزل گوئی کی نسبت مقدمۂ دیوان حالی مین ظاہر کیا ہو، مولانا حالی کے یہ اصلاحی خیالات اگر صرف شاعرانہ حیثیت رکھتے تو غالبًا ان پر مشکل سے تنقید کیجا سکتی تھی، لیکن انھون نے بعض اصلاحی صورتین ایک ریفارمر اور مصلحِ اخلاق ہونے کی حیثیت سے پیش کی ہین اسلئے کوئی شخص ان کو بحیثیت غزل گو شاعر کے قبول نہین کرسکتا، مثلًا یہ کہ

(۱) غزل مین اخلاقی اور تمدنی مضامین باندھنے چاہئین اور مسلسل غزلون مین مناظر قدرت مثلًا کوہ و دشت صحرا و بیابان اور برق و باران وغیرہ کا سمان دکھانا چاہئے جیسا کہ انگریزی شاعری مین دکھایا جاتا ہے، لیکن اہل فن کے نزدیک غزل صرف عشق و محبت تک محدود ہے اور اس موضوع کو چھوڑ کر غزل مین کتنے ہی پاکیزہ خیالات ظاہر کئے جائین، غزل کی لطافت ان کو برداشت نہین کرسکتی، اس لئے مین شعراے دور جدید کو مبارکباد دیتا ہون کہ انھون نے عملًا مولنٰا حالی کے اس غلط مشورہ کو قبول نہین کیا، اور غزل کو عشق و محبت ہی کے مضامین ہی تک محدود رکھا، اس معنوی اور انقلاب انگیز مشورے کے بعد

انھون نے ایک اور نہایت اہم معنوی مشورہ دیا ہی جس پر عمل کرنے سے قدیم غزلگوئی خصوصاً شعرائے لکھنؤ کی غزل گوئی کی شکل مسخ ہو کر غزل کا ایک جدید خوشنما قالب تیار ہو سکتا ہی، وہ فرماتے ہین کہ غزل مین ایسے عاشقانہ خیالات ظاہر نہین کرنے چاہئین جن سے علانیہ معشوق کا مرد یا عورت ہونا ظاہر ہو، اس بنا پر غزل مین ایسے الفاظ نہین لانے چاہئین، جو مردون یا عورتون کی وضع لباس پر دلالت کرسکین، مثلاً کلاہ، دستار، قبا، سبزۂ خط وغیرہ کہ مردون کے ساتھ اور انگیا کرتی مہندی، چوڑی، چوٹی، موباف، آرسی اور جھومر وغیرہ کہ عورتون کے ساتھ مخصوص ہین، اور ان کی وجہ سے اردو غزلون مین نہایت مبتذل اور رکیک مضامین پیدا ہو گئے ہین، مولنا حالی کا یہ مشورہ نہایت صحیح ہی، اور مین شعرائے دور جدید کو مبارکباد دیتا ہون کہ انھون نے اس مشورہ پر عمل کرکے اپنی غزلون کو نہایت لطیف پاکیزہ اور اصول فن کے مطابق بنالیا ہی لیکن اس مشورہ پر عمل محض وضع ولباس پر دلالت کرنے والے الفاظ کو چھوڑ دینے سے نہین ہو سکتا، بلکہ اور بھی چند مضامین کا جو فارسی اور اردو شاعری کا بہت بڑا سرمایہ ہین، چھوڑنا ضروری ہے، مثلاً عربی شاعری مین اہل عرب کا معشوق ایک باعفت پردہ نشین عورت ہوتی ہی، جہان بہ مشکل رسائی ہوسکتی ہی، لیکن شعرائے ایران کا معشوق اکثر شاہد بازاری اور مبتذل ہوتا ہی، وہ ہر ایک کو ہاتھ آسکتا ہے، سینکڑون سے تعلق رکھتا ہے، جب محفل مین جلوہ آرا ہوتا ہے، تو چارون طرف سے عشاق کا جمگھٹا لگ جاتا ہی، وہ کسی سے آنکھین لڑاتا ہی، کسی سے اشارے کرتا ہی، اسی کے ساتھ وہ دنیا بھر کے اخلاقی عیوب کا مجموعہ ہوتا ہے، وہ جھوٹا ہے، بدعہد ہے، ظالم ہی، سفاک ہے، قاتل ہی، مکار ہے، فتنہ گر ہے، حیلہ ساز ہے، شریر ہے، کینہ پرور ہی، ہر ایک کی بات مان لیتا ہے، اور ہر ایک کے قابو مین آجاتا ہی، گھوڑے پر سوار ہوتا ہے، اور تیر وخنجر چلاتا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان اوصاف رذیلہ کا مجموعہ مرد ہی ہو سکتا ہے، عورت کتنی ہی آوارہ گرد ہو نہ وہ

استقدر سہل الوصول اور بیباک ہو سکتی، اور نہ گھوڑے اور ہاتھی پر سواری کر سکتی، مولانا حالی نے اس قسم کے مضامین کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دلائی ہے، اسلئے شعراے دورِ جدید بھی ان مضامین سے اردو غزل گوئی کو بالکل پاک نہ کر سکے، حالانکہ غزل کو اگر مردون کے باہمی عشق و محبت سے جو ایرانیون کا شیوہ تھا، بالکل پاک کرنا ہے تو اس قسم کے مضامین کو بھی چھوڑ دینا چاہئے تاہم اس مین شبہہ نہین کہ شعراے دورِ جدید کے کلام مین اس قسم کے مضامین کی کثرت نہین پائی جاتی اور اس حیثیت سے وہ اردو شاعری کے معنوی مصلح کہے جا سکتے ہین، اس اصلاح کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلے گا کہ اردو غزل گوئی جور و ستم اور بیرحمی اور سنگدلی کے مضامین سے بالکل خالی ہو جائیگی اور معشوق حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت کا بھی مظہر ہو جائے گا، افسوس ہے کہ اردو شعرا کے دواوین مین اس قسم کے اشعار بہت کم ملتے ہین، جن سے عاشق و معشوق کی باہمی محبت اور خوشگوار تعلقات کا اندازہ ہو سکے، مجھے چند شعر البتہ یاد ہین، جن کو باہمی محبت کا نمونہ قائم کرنے کیلئے سناتا ہون،

ہم تم یک جان ہیں دو قالب باہم کیا کیا محبتین ہین

جہان مین جو ہین یک جان دو قالب وہ میری جان تو ہے اور مین ہون

محفلِ دشمن سے میری پیشوائی کیلئے جھوم کر آنا وہ تیرا ہاے متوالے ترے

لیکن مولانا حالی کے مشورہ کے برخلاف اس زمانہ مین ایک میلان یہ پیدا ہو رہا ہے کہ غزل مین صاف طور پر یہ ظاہر کر دیا جائے کہ معشوق عورت ہے مرد نہین، اردو غزلون مین گو معشوق کی تمام زنانہ خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے، لیکن صیغہ ہمیشہ مذکر کا استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً:۔

کبھی کھلتا ہے جوڑا اور کبھی گیسو بکھرتے ہین وہ میرے سوگ کے پردے مین بھی کیا کیا سنورتے ہین

صرف غالب نے ایک موقع پر معشوق کے لئے مؤنث کا صیغہ استعمال کیا ہے،

ان پہ پیزاد دن سے لین گے خلد مین ہم انتقام قدرتِ حق سے یہی حورین اگر وان ہوگئین

اسی شعر کی سند پکڑ کر ایک صاحب نے جو اپنے آپ کو مجدد غزل کہتے ہین اسی زمین مین ایک پوری غزل لکھی اور تمام صیغے مونث کے استعمال کئے، میں اس وقت گرامر کے اصول و قواعد پر تو کوئی راے نہین دیسکتا، تاہم مین اس سے متفق ہون کہ اگر غزلون میں زنانہ پوشاک، زنانہ زیورات اور زنانہ زیبایش و آرایش کا ذکر مہذب الفاظ مین کیا جاے تو اس سے غزل کی لطافت اور پاکیزگی مین کوئی فرق نہین آئے گا، بلکہ لکھنو کی شاعری کا وہ قابلِ اعتراض حصہ جو اس زمانہ مین بیکار سمجھا جاتا ہے، باکار ہو جائیگا،

ان معنوی اصلاحات کے ساتھ مولانا حالی نے چند لفظی مشورے بھی دیئے ہین مثلاً یہ کہ صنائع و بدائع بالخصوص رعایتِ لفظی اور ضلع جگت سے شعراء کو احتراز کرنا چاہیئے مشکل زمینون مین غزل نہیں کہنی چاہئے، بہت لمبی چوڑی غزلین نہین لکھنی چاہئین، اور شعراے دورِ جدید نے نہایت آسانی کے ساتھ ان پر عمل کرکے لفظی اور معنوی دونون حیثیتون سے غزل کا ایک نیا قالب تیار کیا ہو جس مین خوبیان زیادہ اور برائیان کم ہین، ایک لفظی خوبی یہ ہو کہ وہ نہایت لطیف اور معنی خیز ترکیبین ایجاد کرتے ہین، مثلاً :-

ع :- نہ پوچھو اس شرابی کے خرامِ لاابالی سے

ع :- لغزشِ نیم گام نے مارا

"خرامِ لاابالی" اور "لغزشِ نیم گام" نہایت لطیف اور معنی خیز ترکیبین ہین لیکن اس کے برعکس بعض بے معنی ترکیبین بھی ایجاد کرتے ہین مثلاً

ع :- ورنہ پہلے سوزِ غم اک شعلۂ بیہوش تھا

ع :- اے قیس نظرِ حسنِ حقیقت سے خبردار

"شعلۂ بیہوش" اور "قیسِ نظر" بے معنی ترکیبین ہین،

دوسری خوبی یہ ہے کہ نہایت لطیف، نازک اور نئے نئے استعارے اور تشبیہین پیدا کرتے ہین، مثلاً

ع فردوس ایک پھول ہے دستِ بہار مین

تم شامِ شبِ فرقت جیسا حجتہ نکلے یا کفر کے پردے سے ایمان نکل آیا

مرکب تشبیہ ہے اور نہایت لطیف ہی،

کیا وہ نظر دن کا مری حُسنِ تلاطم سمجھے جس نے دیکھا ہی نہ ہو جلوۂ رقصان کوئی

متحرک تشبیہ ہی، جو تشبیہ کے عمدہ اقسام مین شمار کی گئی ہے، حسنِ تلاطم اور جلوۂ رقصان کا مقابلہ نہایت خوب ہی، لیکن اسی کے ساتھ بعض اوقات نہایت مکروہ، قابلِ نفرت اور غلط استعارے اور تشبیہین بھی پیدا کرتے ہین، مثلاً

ع لاش کی صورت زبان تھی اور مین خاموش تھا

جبینِ درد ہے بیتاب سجدہ اے فانی کدھر ہے خاک تری دل کے آستانے کی

جبینِ درد اور دل کے آستانے کی خاک، یہ سب مہمل تشبیہین ہین، اور زبان کی تشبیہ مُردہ لاش کیساتھ نہایت مکروہ ہے،

ع۔ یہان تو کام ہو اک نشترِ توجہ سے

نشترِ توجہ کوئی چیز نہین،

اس کے ساتھ لفظی اور معنوی غلطیان بہ کثرت کرتے ہین،

کیا کرین بندگانِ محبوبی عاشقی کی فدائیان توبہ

فدا کاریان صحیح ہے،

اے درد یہ چٹکیاں کہانتک اٹھ اور جگر کے پار ہو جا

درد کا جگر کے پار ہونا معنیً غلط ہے،

ان کے کلام کا سب سے بڑا عیب ان کے کلام کی ناہمواری ہے، بعض اوقات تو نہایت بلند رواں اور برجستہ اشعار کہتے ہیں، اور ہر رنگ مین کہتے ہین، اس مختصر تقریر میں انتخاب کی گنجایش نہین، اس لئے صرف فانی کی ایک سیدھی سادھی غزل سناتا ہون،

دل کو اس کی یاد سے آباد رکھ بھولنا اچھا نہین ہے یاد رکھ
جبتک اس در تک نہ پہنچون اے فلک میری مٹی کو یونہی برباد رکھ
ایک دن یہ عرش بھی ہو جائیگا پہلے دل مین عشق کی بنیاد رکھ
حشر مین کہنا پڑے گا اے شباب اپنی ناکامی کا قصہ یاد رکھ

یہ میر کا رنگ ہے، لیکن ان مین بعض لوگ کبھی کبھی عرفی اور نظیری کی بولی بھی بولنے لگتے ہین، مثلاً

بزم نظارہ ہے پھر آج سراپا گستاخ جلوہ بیباک، نگہ شوخ، تماشا گستاخ
تم ہو آغوشِ تصور مین کہان کی تمکین شوق بدمست ہے اور دستِ تمنا گستاخ
نازِ بیجا سے بڑھی جاتی ہے شانِ ابرام لو ہوا جاتا ہے عنوانِ تقاضا گستاخ

لیکن اسی کے ساتھ بعض اوقات بالکل بے معنی اور مہمل بھی کہتے ہین، فانی کی پہلی صاف وسادہ غزل سنانے کے بعد ان کی ایک دوسری غزل سناتا ہون،

پہلوے زوال ہون معنی کمال مین مین ہون حدِ امتیاز جلوۂ جمال مین
آدمی مین کچھ نہین آپ نے سمو دیا عالمِ غبار کو عالمِ خیال مین
ابتداے زندگی، انتہاے زندگی آپ کے خیال سے آپ کے خیال مین

عرضِ نیاز، راز ہے، کثرتِ مجاز کا آئینے سے لگ گئے پرتوِ جمال مین
فانیِ شکستہ دل تونے کردیئے جدا ورنہ ممکنات شوق جذب تجھے محال مین

اتنا تو ہر شخص محسوس کرے گا کہ یہ غزل کے اشعار نہین ہین، لیکن مین کہتا ہون کہ بالکل بے معنی ہین،

ایک خاص کمی جو اس زمانہ مین عام طور پر محسوس کیجارہی ہے، اور اس کو شعرائے دورِ جدید پورا کر سکتے ہین، یہ ہے کہ دورِ جدید کی غزل گوئی مین ہندی شاعری کے پاکیزہ مضامین اور لطیف تشبیہات اور استعارات کی آمیزش بہت کم نظر آتی ہے، مدّت ہوئی کہ ایک ہندو مضمون نگار نے مسلمانون پر یہ الزام لگایا تھا، کہ انھون نے ہندوستان مین کئی صدی تک حکومت کی لیکن ہندوؤن کا علم ادب ہمیشہ ان کی توجہ سے محروم رہا، علامہ شبلی نے اس غلط الزام کی تردید مین دو مضمون لکھے تھے، جن مین سے ایک مضمون مین مستند تاریخی حوالون سے ثابت کیا، کہ مسلمانون نے صرف یہی نہین کیا کہ ہندوؤن کے علوم و فنون سے واقفیت حاصل کی، اور ان کی بلند پایہ کتابون کے ترجمے کئے، بلکہ ان کو نہایت ترقی بھی دی، اور ہندو پنڈتون کی نہایت قدردانی کرتے رہے، دوسرے مضمون مین انھون نے ان مسلمان شعراء کا تذکرہ لکھا، جنھون نے ہندی زبان مین شاعری کی تھی، اور ہندو کبیشرون نے ان کے شاعرانہ کمال کی داد دی تھی، بلکہ بعض موقعون پر ان سے اصلاح بھی لی تھی، ہمارے اسلاف کے ان کارنامون کے بعد یہ نہایت آسان کام تھا کہ ہم اردو غزل گوئی مین سنسکرت اور بھاشا شاعری کے پاکیزہ مضامین کو شامل کرتے، لیکن دورِ جدید کے شعراء کے کلام مین ان خیالات کی آمیزش مطلق نہین معلوم ہوتی، اردو کے اساتذۂ قدیم کے زمانہ تک ہندی شاعری کا ایک خفیف سایہ تو اردو شاعری مین نظر آتا ہے، جس کی وضاحت اشعار کے انتخاب سے کیجا سکتی ہے، مین نے شعر الہند مین اس

قسم کے بہت سے اشعار منتخب کئے ہین، لیکن اس وقت اختصار کے لحاظ سے ان کو نظرانداز کرتا ہون، لیکن بعد کو یہ اثر کم ہوتا گیا، البتہ واجد علی شاہ کے دورِ حکومت مین اس کی طرف پھر توجہ کی گئی، واجد علی شاہ کو دنیا صرف ایک عیاش فرمانروا کی حیثیت سے جانتی ہے، لیکن درحقیقت وہ بہت سی خوبیون کا مجموعہ تھے، جن مین سب سے بڑی خوبی یہ تھی، کہ وہ نہایت غیر متعصب شخص تھے، اور اسی بے تعصبی کی وجہ سے انھون نے اپنے عیش و عشرت کے سامانون مین ہندی تہذیب کے بہت سے اجزا شامل کئے تھے، اس وقت مین بہت زیادہ تاریخی تفصیلات مین پڑنا نہین چاہتا، ورنہ نہایت کامیابی کے ساتھ ہندو تہذیب کے اُن اجزا کو دکھلایا جا سکتا تھا جو ان کے زمانہ مین مسلمانون کی تہذیب مین شامل تھے، اکبر اعظم کی بے تعصبی سیاسی حیثیت رکھتی تھی لیکن واجد علی شاہ کی بے تعصبی بالکل معاشرتی اور بعض صورتون مین علمی تھی، اس علمی بے تعصبی کا اثر ان کے دور کی غزلگوئی پر بھی پڑا، اور بعض شعرا نے اپنی غزلون مین ہندوانہ جذبات اور ہندوانہ خیالات کی آمیزش کی، چنانچہ سید محمد خان رند فرماتے ہین،

جھوم جھوم آتی ہے گھنگھور گھٹا ساون کی ٹھنڈی ٹھنڈی چلی آتی ہے ہوا ساون کی
خونِ عشاق مین پھر پینگ لگی گندھنے لگی رنگ لائی تری ہاتھون مین حنا ساون کی
کوکے اک سمت پپیہا کہین کوئل کرے شور مور چلاتے ہین رُت آئی ہے کیا ساون کی
لہلہانے لگے جنگل ہوئے پھر کھیت ہرے روپ دکھلانے لگی نشو ونما ساون کی
کان مین دیس کی آواز چلی آتی ہے رند تانین لیتی ہے کوئی حورلقا ساون کی

امانت لکھنوی نے ایک پوری غزل بسنت پر لکھی ہے، جس کے چند شعر یہ ہین :-

ہین جلوہ تن سے در و دیوار بسنتی پوشاک جو پہنے ہے مرا یار بسنتی
گیندا ہے کھلا باغ مین میدان مین سرسون صحرا وہ بسنتی ہے یہ گلزار بسنتی

ہی لطف حسینون کی دو رنگی مین اماؔنت دو چار گلابی ہون تو دو چار بسنتی

اماؔنت کی اندر سبھا مین بھی خاصا ہندی رنگ نمایان ہی،

لیکن یہ ایک سطحی آمیزش ہی، قدیم ہندی شاعری مین نہایت لطیف اور نازک مضامین پائے جاتے ہین، جو بآسانی اردو مین منتقل ہو سکتے ہین، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے عربی اشعار مین بہت سی ہندی دوہون کے مضامین کا ترجمہ کیا ہی، اور اردو مین بھی اس قسم کے ترجمے بآسانی کئے جا سکتے ہین، ایک جدید ہندوستانی علم ادب کی تعمیر انہی مضامین کی آمیزش سے ہو سکتی ہی، اسلئے شعراے دور جدید کا فرض ہی، کہ وہ ان مضامین کو اپنی غزلون مین منتقل کرین لیکن جو لوگ اردو زبان مین سنسکرت اور بھاشا کے ثقیل اور بھدے الفاظ کی آمیزش کرکے نئی ہندوستانی زبان بنانا چاہتے ہین، وہ ایک حسین عورت کے چہرے پر پوڈر کے بجاے کالک لگا رہے ہین، اردو زبان کی نزاکت اس قسم کے الفاظ کے بوجھ کو کبھی نہین برداشت کریگی، اور ان کو اس غیر شاعرانہ کوشش مین سخت ناکامی ہوگی، جو لوگ مغز کو چھوڑ کر چھلکون پر جان دیتے ہین، ان کی قسمت مین ناکامی کے سوا لکھا ہی کیا ہی، اس کے بالکل برعکس ایک کوشش یہ ہی کہ اردو زبان مین عربی اور فارسی کے جو الفاظ شامل ہین، اُن کو بالکل نکال کر ایک عام فہم سلیس اردو زبان پیدا کیجائے ایک مشہور شاعر نے ایک پورا دیوان اسی سلیس اردو زبان مین مرتب کر ڈالا ہی جس مین جنون کے بجای سنک اور طواف کے بجای پھیری کا لفظ استعمال کیا ہی لیکن اگر اردو زبان مین سنسکرت اور بھاشا کے ثقیل الفاظ ٹھونس دیئے جائین اور عربی اور فارسی کے خوشنما الفاظ نکال دیئے جائین، تو اس زبان کا کیا نام ہوگا؟

از حسن این چہ سوال است کہ معشوق تو کیست

این سخن را چہ جواب است تو ہم می دانی

یادپاستان

از

جناب مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی

(۴)

اب ایک نیا گورنر سخت مزاج، سخت گیر، تجربہ کار، صاحب تدبیر مع لشکر کثیر کشمیر پہنچتا ہے، تو فتنہ پردازون کے سرخیل مُلا شرف الدین اور اُس کے مُعاونین و رُفقا کو کمال احتیاط، حزم و دانشمندی سے گرفتار کرلیتا ہی، امن وامان قائم کرتا ہے، یہان کے مصائب و مصاعب پورے ڈیڑہ سال بعد رخصت ہوتے ہین، اذیت رسانی، دست درازی عارضی طور پر دور ہو جاتی ہے، خود مسلمان مورخون کو تسلیم ہے، کہ اس کا اثر بیچارے ہندوؤن پر خاص کر تھا، باوجودیکہ ان کی جماعت و کثرت تھی، مگر اس عرصہ مین نہ وہ پگڑی باندہ سکتے تھے، نہ اچھی پوشاک پہننے پاتے تھے، گھوڑا میسر تھا، مگر سواری سے محروم تھے، اب لباس وسواری کی اجازت از سرِ نو ملی، مفسدون کی تنبیہ اور گوشمالی قرار واقعی عمل مین آئی،

آپ اسکو افسانۂ غم نہ سمجھین، یہ دو ہم وطن و ہم سایہ قومون کے افتراق و انشقاق کی دردناک روداد ہے، مین نے اس کو تفصیل سے نہین، اختصار و ایجاز ہی سے لکھا ہے، ہمارے وہ سیاسی لیڈر جو قومی و نسلی تعصبات مین خود غرق اور اختلافات کی آگ پھیلانے مین پیش پیش ہین، اور ہندو مسلمانون کی فریقانہ مخاصمت کو اپنی (خود قومی رہنماؤن کی) فتنہ پردازی و شعبدہ بازی سے

منسوب نہین ہونے دیتے، بلکہ ایک بیگانہ حکمران قوم (انگریزون) کے سر تھوپتے ہین، سُن لین اور جان لین کہ دو ڈھائی سو برس پہلے آپ کے باہمی تعلقات اور قومی روابط کیسے رہتے تھے اس کا دوش (الزام) کس کے دوش (کندھون) پر رکھو گے،

مفتوح ممالک مین، مغلوب اقوام و باشندگان کو فتح مند طبقون کی دست درازی اور ستم طرازی کی شکایت بالعموم رہی ہے، پانچ سات ہزار برس کے بنی نوع آدم کی آبادی کے دفاتر یعنی سارے عالم کی تاریخون مین اس کلیہ سے استثنار کی ایک نظیر بھی نہین ملتی، ان جفاکیشیون اور دغاکوشیون سے بیچارے کشمیری کیسے محفوظ رہ سکتے تھے، ہندو مسلمانون کے مناقشات و منافرات صدیون تک دامِ گردن اور استخوان شکن رہے ہین، خون کی ندیان مسلسل قرنون تک بہائی گئی ہین، مگر اپنے ہی ہاتھون سے اپنے ہی افعال و اعمال کی بدولت مسلمان فرمانرواؤن اور سلاطین کے دامن اس داغ سے پاک رہے ہین، میرا مقصدِ گذارش صرف سلاطین و والیانِ کشمیر کا اِبرا ہے، ان کے اعمال اور کارکنون کے افعال سے بحث نہین،

ہماری نہین، اغیار کی تاریخون کو ملاحظہ فرمائیے، مسلمانون نے عالم عالم فتوحات کی تھین صدیون تک ان کا قدم جہان گیری و جہانداری، اشاعتِ دین اور احیاے ملّت کی راہ مین تیز اور استوار رہا ہے، فتحِ ممالک کیساتھ ساتھ ان کی اولوالعزمیان بڑھتی چلی جاتی تھین، ایسے حالات مین جن ناپسندیدہ تعلقات، ناشایستہ حرکات اور ناگوار شکایات کا ارتکاب ایک فریق دوسرے کے ذمہ عائد کرتا ہے، مسلمانون کی مظفر و منصور جماعتون کی نسبت بھی پیدا ہو جانا چاہئے تھا، مگر اہلِ نظر کو حیرت ہوتی ہے، کہ ان کے کردار پر کلھم دو ہی دھبے لگائے گئے ہین، ایک بتون اور بت خانون کا توڑنا، دوسرے کتبخانون کا جلا دینا،

پہلی بات مین اسی قدر سچائی ہے جتنی اس متعارف کلیہ مین کہ اسلام بت پرستی کے

استیصال کے لئے اترا ہے، پانچ چھ ہزار برس ہوئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس تیرہ وتار کرۂ ارض کو اپنے مبارک و مسعود قدموں سے موزون و روشن فرمایا، اور اسی وقت سے اپنے مذہب حقہ اور اپنے عقائد و توحید کی اشاعت شروع کر دی تھی، نواہی و اوامر کا اعلان فرما دیا تھا، جب خدا کا آخرین رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوا، تو اوس ہادی بنی نوع آدم نے بھی یہی تلقین و تعلیم جاری فرمائی، پتھر اور مٹی کے، لکڑی کے، اور کہیں کہیں ملے تو قیمتی جواہرات اور سونے چاندی کے خود ساختہ معبود بھی نیست و نابود کر دیئے گئے، مکہ اور اس کے مضافات مین ان کا زور و شور بہت تھا، اس لئے یہ قدم پہلے اسی طرف اٹھا، خدا کی شان لوہا لوہے کو کاٹتا ہی، بُت پرست بھی عرب تھے، اور بُت شکن بھی عرب، پہلے گروہ کی جماعت و قوت زبردست اور غالب تھی، بایکدگر مزاحمتین بھی ہوئین حسبِ ضرورت جارحانہ یا مدافعانہ حملے بھی اس سلسلہ مین ہوئے خونریزیان بھی ہوئین، مگر ان کی حقیقت، وسعت اور سنگینی اس سے زیادہ نہ تھی جیسے ہمارے زمانہ اور ہمارے ملک مین اصطلاحی فرقہ وارانہ فسادات "یا کمیونل ڈسٹربینس" ہر محرم اور ہر دسہرہ کے منانے پر ہوتے رہتے ہین، ہندوستان جنت نشان بہار بداماں بقرعید کے تیوہار پر اسی گاؤکشی یا گاؤپرستی کی بدولت خدا کی بے گناہ مخلوق مین سے متنفسون کو ذبح کرا دیتا ہی، کیا یہ حقیقت قابلِ انکار ہی،؟

رہا بُت خانون کا توڑنا، دنیا کا سب سے پُرانا اور مشہور بُت خانہ کعبہ، تو آپ کی آنکھون کے سامنے موجود ہے، مسلمان فاتحین کے غیظ و غضب اور تاخت و تاراج سے محفوظ رہا، بتون سے خالی کرا دینے کے بعد مسلمانون نے اسکی ہیئت اور وضعِ عمارت مین بھی کوئی فرق نہین آنے دیا، اُس کی عظمت و بزرگی قائم رکھی، اور اس کی تقدیس و حرمت برقرار، حتی کہ عجم کے ایک گوشہ سے یہ صدا بلند ہوئی،

بہ بین کرامتِ بت خانۂ مرا اے شیخ! کہ چون خراب شود خانۂ خدا گردد

ہندوستان کے بگاڑے ہوئے معابد میں ہمارے اہلِ قلم سب سے پہلے سومنات کا نام لکھتے ہین، اور توڑنے والون میں محمود غزنوی کا، لیکن اس صدی کے محققین اور اُن کے نتائج الکتشافات و تحریرات بتاتے ہین، کہ یہ محض افسانہ و افسون اور اندازِ نگارش و انشار ہے، محمود نے جو کچھ کیا اور جہان کہین کیا، اپنی طاقت و قوت کی نمایش، زر و مال کے جمع و استحصال کے لئے کیا تھا، اسے ہاتھیون کے اکٹھا کرنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا تھا، خدا شناسی، دینداری، اشاعتِ مذہب، اعلاء کلمۃ الحق کا کچھ حصہ اس مین ضرور تھا، مگر کم تھا، اور وہ بھی محض مصالح وقت، تدابیر سلطنت رانی کے اقتضا سے سبکتگین کے بیٹے کو ملک گیری کی ہوس بے شبہہ تھی، لیکن وہ کشور کشائیون کے ساتھ اپنے وسیع مفتوحات پر قبض و تسلط رکھنے مین کمزور ثابت ہوا، آپ چاہین تو اس کو بے نیازی و بے پروائی پر محمول کر سکتے ہین، فردوسی کے سوا ہمارے اکثر ذہین و طبّاع شاعرون نے اسکو جس رنگ مین دکھانا چاہا ہے وہ اسکے اصلی رنگ سے جدا ہے، گذشتہ ایک ہزار برس کی تاریخی رفتار اور روز افزون ترقیون نے ان حضرات کی شوخ نگاری کا پردہ اٹھا دیا ہے، یہ قولِ فیصل غیر ممالک اور غیر اقوام کے دیدہ ور اور ہوشمند محققین کا ہے، سومنات اور محمود کے وجود سے کسکو انکار ہو سکتا ہے، صرف بُت شکنی کے قصے اور خدا واسطے بلند بانگی کی جو داستانین مشہور کر دیگئی ہین، ان کو حرف بحرف سچا ماننے مین اکثر اہلِ علم کو تامل ہے، بعض تو قطعاً باور نہیں کرتے، اور شاعرانہ داستان سرائی سے زیادہ اوس کو وقعت نہین دیتے ہین[1]، ظاہر ہے کہ ہندوستان کے سوا جدھر

---

[1] ہمارے عاشق مزاج پارسا خیال، پاکباز، سخنور اپنی ہی دُھن مین مگن ہین، غزنوی غازی کو منزلِ مقصود تک پہونچنے بھی نہین دیتے، وہ اس فردوسی دنیا کے سومنات کو اپنی شاعری، اپنے عشق، اپنے دل کے سومنات اور اسکے صنم خانہ کے خرابہ پر نثار کرتے رہتے ہین، حزین اصفہانی کا قول یاد ہے،

نگاہ جاتی ہوگی، تمام تر مسلمانوں کی آبادیاں تھیں، ان میں بُت وبت خانہ کی گنجایش کہاں، مومن و مجاہد افغان کو وہاں کیا دکھائی دیتا ہوگا، ہندوستان کی طرف توجہ کی تو اس کو دارالاصنام پایا، یہاں پہنچکر "بُت شکن" کا لقب اختیار کیا، مگر ذرا یہ تو بتا دیجئے کہ کتنی جگہ، کتنے شہروں میں اس نے کتنے بت توڑے تھے، کتنے بُت خانوں کو مسمار و منہدم کیا تھا، مسلمان مورخین کو چھوڑیئے یہ تو بعض اوقات شیخیاں بگھارنے اور ڈینگ مارنے کے عادی نظر آتے ہیں، خود اپنی اور اپنی جماعت کی بہادری اور ممدوحین کا نام اونچا کرنے کیلئے محمود کو بھی کیا نہیں بنا چکے ہیں، اس لئے میرا روئے خطاب نامسلم منصف مزاج مورخین اور محققین سے ہے، والصدق ماشھدت بہ الاعداءُ،

اس تذکرہ میں میں ایک بلند پایہ ہندو مورخ راجہ کندن لال اشکی کی تحقیقات کو نظر انداز نہیں کرسکتا جنھوں نے اپنی کتاب منتخب تنقیح الاخبار میں صرف دو مندروں کا نام اس صورت سے لیا ہے، ان کے علاوہ کسی عبادتگاہ کا نشان نہیں دیتے، (۱) فتحِ تھانیسر بردست محمود غزنوی و تخریبِ مندرِ سومجک، در چہار صد و دو (۲) فتح کرات (گجرات ؟) و ہدم معبد چہل ہزار سالہ بردستِ محمود، در چہار صد و سیزدہ،[۱]

البتہ ہمارا ہم وطن مگر فرنگی نژاد مصنف بیل (Beale) اپنے قطعاً غیر مورخانہ رنگ میں فرماتا ہے، کہ "ہندوستان پر محمود نے بارہ حملے کئے، اوس نے ہندوؤں کے صدہا بہت سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۲) سوادِ سومناتِ اعظمِ دل — خرابِ چشمِ شہلائے تو باشد
شکستِ کفر وکین (؟) خونریزِ سلام — زمژگانِ صف آرائے تو باشد (صفحہ ۲۶۶) دین؟
نخست خردنہ بُردزنہ قال می زنیم — در سومناتِ عشق دم از حال می زنیم (صفحہ ۵۸۴)

[۱] مطبوعہ ۱۲۶۰ھ صفحہ ۲۷،

سیکڑے) مندر گرا کر زمین کے برابر کردیئے، ہزاروں (کئی کئی ہزار) بُت توڑ واڈالے، سومناتھ کے مشہور بُت کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے، اور یہ ٹکڑے غزنین، مکہ اور مدینہ کو بھیج دیئے[1] یہاں یہاں مجھے دوہرے شکوے ہیں، دو خود مسٹر بیلی سے، ایک تو یہ کہ اپنی تحریر کی توثیق و ثبوت میں کسی تاریخ یا کتاب کا حوالہ نہیں دیتے، دوسرے بُت فروشی پر سلطان کی آمادگی، اور ایک عزیز رشید کے روکنے کی داستان کیوں فراموش فرماتے ہیں، جو زبان زد عام ہی، نیز جس کو کاغذ و سیاہی سے استناد کی قوت حاصل ہی، محمود خان سے صرف ایک گلہ ہے، اس ستمگر جفا کیش نے ہمارے ہند کی سرزمین پر اس محبوب و پرستیدہ تو ہے یا پتھر کا ایک ٹکڑا بھی نہ چھوڑا ع

میں لپٹ کے رو تو لیتا جو کہیں مزار ہوتا!

موصوف نے کمال دانشمندی و دوراندیشی سے سومناتھ کے صندلیں پھاٹکوں کو غزنین لیجانے کا ذکر نہیں فرمایا، وہ جانتے تھے، کہ پول کھل چکا اور جھوٹ، جھوٹ ثابت ہوچکا ہی، اب کسی نئی تاریخ کے اوراق میں ایسے صاف و صریح افترا کی گنجایش کہاں باقی ہے، (راقم بو مقبول کم سواد، تاریخ الہ آباد حصہ اول میں صفحات ۳، او ۴، پر ضروری تفصیل اور قدرے تدلیل کیساتھ سرکاری و غیر سرکاری تحریرات کے حوالوں سے اس بُہتان پر بحث کرچکا ہے)

ایک نامور درباری اور مستند مؤرخ بخشی نظام الدین احمد ہروی کی بھی سُن لیجئے، طبقاتِ اکبری میں لکھتے ہیں :-

"بُتے راکہ بعوضِ سومنات کہ سلطان محمود شکستہ بود باز برہمنان سومنات معبود خود ساختہ بودند و زآنجا بدہلی آوردہ پے سپر خلائق گردیدند،

(صفحہ ۶۹ نولکشوری)

---

[1] اورینٹل بیاگرفیکل ڈکشنری ص ۱۶۴،

کیا پرانے بُت کے عوض کوئی نیا بنا لیا گیا تھا، ؟ یا یہ کہ وہی بُت اچھی طرح ٹوٹا نہ تھا، محمود کا فولادی گرز اسکو پرزہ پرزہ کرنے مین ناکام رہا تھا، اور سومنات کے پوجاریون نے پھر (باز) اُسی ٹوٹے پھوٹے بُت کو اپنا معبود و مسجود بنا لیا تھا، اسکی پرستش خود ہی تنہا شروع نہین کردی تھی، بلکہ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد مین اس کو دہلی لے آئے تھے، اور گھوم پھر کر خلق اللہ کو دکھاتے اور زیارت کراتے تھے، میرا ذہن اس مختصر عبارت سے صحیح نتیجہ نکالنے سے قاصر ہے،

اِس زمانہ کے بعض انگریز جن کو محمود سے کوئی خصومت خاص نہ ہونی چاہئے تھی، جہان اسکی علم دوستی، ہنر پروری، شعرا نوازی، علماء و اہل کمال کی خدمت کی توصیف و تحسین فرماتے ہین، یہ بھی لکھتے ہین کہ ۱۰۱۱ء[۵۱] مین تھانیسر پر محمود کی لشکر کشی محض دینی جوش کے باعث تھی، ایک مختصر مقابلہ کے بعد یہ پرانا اور دولت مند شہر اس کے قبضہ مین آگیا، اور خوب لوٹا گیا، بے شبہ بُت توڑے گئے، اور مندر اپنے عظیم ذخائر دولت و خزائن کی بدولت غارت کیے گئے[۵۲]، وہ بے شمار زر و جواہر اور سیکڑون لونڈی غلام لے کر گھر کو چلتا ہوا، مگر وہان پہنچکر یہ سارا مال و متاع علوم و فنون کی اشاعت اور صنعت و حرفت کی ترقی پر صرف کیا[۵۳]، وہ محمود کے حملون کی تعداد سترہ تک پہنچاتے ہین[۵۴]،

یادش بخیر، محمود کے سوانح و وقائع کا جامع، ابو نصر محمد بن عبد الجبار عُتبی ایک ممتاز ادیب و انشا پرداز تھا، اسکی تاریخ یمینی ایشیا اور یورپ دونون جگہ وقعت و اعتماد کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، جس کا ترجمہ غیر زبانون مین ہو چکا ہے، اسکی روش احتیاط، سعی راست نگاری،

---

۵۱ یہ حضرات سنین ہجری کو تقویم انگریزی مین تحویل کرتے وقت اکثر غلطی کر جاتے ہین، ۴۰۲ھ ۴ر اگست ۱۰۱۱ء سے شروع ہوتا ہے، لہذا تھانیسر کا محاصرہ ۱۰۱۱-۱۲ء مین ہوا ہوگا ۵۲ لفظی معنی مین ۵۳ ڈی لافوس کی تاریخ ہندوستان مطبوعہ لندن، ۱۹۰۳ء صفحات ۶۶ و ۶۷ ۵۴ ایضاً ص ۶۶

اعتدال پسندی تسلیم کرنے کے باوجود ان کو صفِ مجاہدین سے الگ نہیں کرسکتا، ڈسرکاری مورخ اور درباری مقرب تھا، خود اسکی شانِ مشیخت و تفاخر اسی کی مقتضی تھی، کہ وہ اپنے ولی نعمت کے ہر عمل و ہر فعل میں اسکی عظمت و شوکت کا قابلِ مباہات پہلو نمایان کرتا ہے"

جملہ اختتامیہ، محمود کے متعلق آج کل مخالف و موافق تحریرات آزادی سے نکل رہی ہیں ان میں سے دو خاصکر قابلِ توجہ ہیں، ایک پروفیسر محمد حبیب کی کتاب "سلطان محمود غزنوی" بقول ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ "اس کے دوران میں مصنف نے جا و بیجا موقع و بے موقع یہ رٹ لگائی ہی، کہ محمود لٹیرا اور ڈاکو تھا، وہ ہندوستان کے مندرون کی دولت لوٹ کرلے گیا"[۵] دوسرا ڈاکٹر محمد ناظم کا فاضلانہ، محققانہ و ناقدانہ مقالہ محترم ناظرین ان کے مطالعہ کے بعد خود ہی فیصلہ فرمائیں،

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے، کہ عالمگیر نے بُت نہیں پائے تو بُت خانے تو گرائے ہون گے؟ دو تین شہرون اور مقامات میں اُس نے دستِ تعدی ضرور دراز کیا، مگر اس میں بھی دینداری و خداپرستی کے جاذبہ سے زیادہ ملک داری اور سطوت و حکومت کا شائبہ اس شکست و ریخت معابد کا ذمہ دار اور جواب دہ تھا، ملک گیری کا حوصلہ، سیاست کا نظام، حکومت کا طریق بسا اوقات اس سے بھی بڑھکر کر جاتا ہے، ع

سبحہ را زنار کرد است و کند

مین اس وقت نہ تو محمود کی وکالت کا جامہ (قانونی عدالتون کی زبان مین گون) پہن کر آیا ہون، نہ عالمگیر ایسے متشرع حامی دین کی صفائی پیش کرنے، مجھے تاریخ کشمیر سے چند واقعات کا ذکر کر دینا مدِ نظر ہے، اسکے لئے یہ ابتدائی اجمالی اطلاع ضروری سمجھی،

دوسرے کتاب خانون کا جلانا، بہ صیغہ جمع تو خود اس گناہگار نا آگاہ کا رنے منتیا نہ

۵؎ اورینٹل کالج میگزین، نمبر ۴، اگست ۱۹۴۰ء صفحات ۱، ۲،

شان سے استعمال کر دیا ہے، ورنہ گذشتہ ساڑھے تیرہ سو برس کے اندر مسلمانون کے بے شمار غزوات اور معرکون کے سلسلہ مین سوا ایک اسکندریہ والے کے اور کسی کتب خانہ کا نام بھی آج تک نہین لیا گیا ہی، وہ آغازِ اسلام کا زمانہ اور خلافتِ ثانیہ (رضی اللہ عن صاحبہا) کا بابرکت وقت تھا، وہ قصہ جس زور شور سے گڑھا گیا تھا، اُس سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اسکی تردیدین کی گئین، مقالات اور رسالے یگانہ و بے گانہ نے لکھے، اور شواہد و اسناد سے ثابت کر دکھایا، کہ اسکندریہ کا کتب خانہ اُس مبارک عہد اور فتحِ مصر سے صدہا برس پیشتر رومی عیسائیون کے ہاتھون سے تباہ ہو چکا تھا[۱]، ع:-

این قصہ دراز ست بہ یاران چہ نویسم

کشمیر مین مسلمانون کی چار یا پانچ سو برس حکومت رہی، کم از کم ڈھائی سو سال تو سلاطین

---

[۱] اس الزام کو صحیح ماننے والون مین ہمارے زمانہ کے مسٹر کریل اور جرجی زیدان دو متعصب عیسائی ہین، یہ دونون پُرانے مورخین اور اہلِ قلم ابو الفرج ملطی مسیحی کی تاریخ الدول، قاضی جمال الدین قفطی مسلمان کی تاریخ الحکما نیز اسحاق راہب کی تاریخ الحکما، احوال یحیٰی نحوی کے حوالوں سے دانستہ و نادانستہ اسکی تائید تلاش کر کے لاتے ہین،

بے اصل ثابت کرنے والے علما کی جماعت اس سے زیادہ موقر و وقیع و باخبر ہے، اپنون کو چھوڑیے غیرون مین گبن (انگریز) سا مورخ، ڈریپر (امریکن) سا فاضل، ڈاکٹر مورلانی سا بے باک راست گو، اور اطالوی پروفیسر ڈاکٹر گریفینی سا محقق حضرت عمرؓ کے اوپر سے اس الزام کو دور کرتا ہی، مسٹر بٹلر ایک انگریز تاریخ نگار نے "فتح مصر" کتاب مین ایک پورا باب اسی مبحث کے نذر کیا ہی،

اس بارہ مین مخالف و موافق لٹریچر جس قدر موجود ہے، اور اُسکی جو کچھ نوعیت و اہمیت ہی، اسکے لئے حضرت علامہ شبلی مرحوم کا رسالہ، نیز الندوہ کے اگست ۱۹۱۰ء اور دسمبر ۱۹۱۱ء نمبر معارف کے

اہلِ اسلام ضرور ناظم رہے ہین[۵۱] ان کے تنو سوا سو[۱۲۵] فرمانرواؤن مین ان کے مختلف طور و طریق حکمرانی مین صرف دو عمل ایسے بتائے جاتے ہین، جو مذہبی دلآزاری کی تعریف اور تکلیف دہی مین داخل ہو سکتے ہین، اور یہ دونون فعل ایک صرف ایک بادشاہ سے منسوب کئے جاتے ہین، زیادہ سے زیادہ دو کے ساتھ، خاکہ تو وہی پُرانا اور دُھندلا غزنوی محمود کا رکھا، مگر اس مین رنگ ہمارے افسانہ ساز مورخون نے بھرا ہے، شاعرانہ نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی مضمون آفرینی و صناعی سے اسکو چمکا دیا ہے، تاریخ جیسی روکھی سوکھی، سیٹھی پھیکی چیز مین جب تک نمک مرچ لگا کر کچھ چٹخارا پیدا نہ کر دیا جاتا، تو مزہ کیا آسکتا تھا، بہرکیف مورخین نے اس مدت مدید مین ان مجموعی الزامات یا حسنات و سیآت کے لئے صرف ایک والی یعنی سلطان سکندر بُت شکن کو انتخاب فرمایا ہے[۵۲] کہ اوس نے بتون کو توڑا اور اس کے صلہ مین "بُت شکن" کا شاندار لقب حاصل کیا تھا[۵۳] کہتے ہین کہ اوس نے ہندوؤن کے بہت سے عظیم الشان مندرون کو ویران و منہدم کرا دیا تھا[۵۴] سکندر سے پہلے اوس کا اولوالعزم و باہمت چچا شہاب الدین

(بقیہ حاشیہ ۲۸۶) جون ۲۲ء و مارچ ۱۹۲۵ء کے پرچون کا مطالعہ ضروری ہے، اگر اسقدر زحمت برداشت کرنا منظور نہین ہے تو مولانا سید سلیمان ندوی کی جامع و مانع یادداشت نومبر ۱۹۳۱ء کے معارف مین دیکھ لینے سے کافی تسلی و تشفی ہوجائیگی، [۵۱] ترجمۂ واقعات ص ۱۰۰ [۵۲] سلطان سکندر شاہ میر درویش کا پوتا تھا، جو سلاطین کشمیر کا ابو الآبا مانا جاتا ہے جس نے تخت نشین ہوکر سلطان شمس الدین لقب اختیار کیا تھا، کشمیر مین دین اسلام اسی نے پھیلایا تھا، ترجمہ صفحات ۴، ۵ و ۸۸ و ڈکشنری صفحات ۲۶۲ و ۲۶۴، سکندر اپنے باپ سلطان قطب الدین کی جگہ ۷۹۶ھ (۱۳۹۳ء) مین جملہ امرا و ارکانِ دولت کے اتفاق و اتحاد سے تخت نشین ہوا، مسٹر بیل لکھتے ہین کہ کشمیر پر جن "سب سے زیادہ طاقتور بادشاہون" نے کبھی حکمرانی کی ہے، ان مین یہ سکندر بھی تھا، (ڈکشنری ص ۲۶۱) پونے تیئیس سال سلطنت کرکے ۸۱۹ھ (۱۴۱۶ء) مین اس جہان فانی کو خیرباد کہا، تیمورلنگ اسی کے وقت مین ہندوستان آیا تھا، (ترجمہ واقعات ۱۰۲ و ۱۰۳) [۵۳] ایضاً صفحات ۱۰۱ و ۱۰۲ و اورنٹیل بیاگرفیکل ڈکشنری صفحہ ۲۶۱ [۵۴] صفحہ ۱۰۲ و ڈکشنری ص ۲۶۱،

ایک بادشاہ گذرا ہے جس نے حیلہ وحوالہ سے نہین بلکہ ادِ مردانگی و دلاوری دیکر بُت خانون کو درہم برہم کر دیا تھا[۱۵] لیکن سکندر کی فردِ جرائم مین کچھ اور دفعات بھی ہین، اس نے حضرت میر محمد ہمدانی او رسادات باسعادات کے فرمانے سے اکثر بدعات کو خصوصاً مزامیر یعنی قرنا و کرنا و سرنا کو بالکل بند کردیا تھا، آستانۂ دولت کے سوا شہر اور اُس کے اطراف مین کسی کو ڈھول بجانے کی بھی اجازت نہ تھی، تمام باجے اور مطربانہ ساز جو اس تعریف مین آسکتے تھے، سب یک قلم بند کر دیئے تھے[۲]

دوسرا واقعہ بھی اسی سلطان سکندر کے عہدِ دولت سے متعلق ہے، اس نے شالی مار باغ کی ایک دیوار بنائی تھی، اُس دیوار کی بنیاد کس طرح ڈالی گئی تھی، ! مسلمان مورخ لکھتا ہے کہ پہلے توراجاؤن اور ہندوؤن کی تمام کتابین اور پوتھیان جمع کرائی گئین، انبارِ عظیم (بڑا بھاری ڈھیر) ہوگیا، توان سب کو دیوار کی بنیاد مین دبا دیا گیا، دیوار کی چنائی اس پر شروع ہوئی، ان کتابون کے ساتھ اس حُسنِ سلوک کا سبب وُہی استادِ ازل کا پڑھایا ہوا سبق اوس نے بھی سُنا دیا تھا جس کو معمولاً ایک دوسرے کے مخالف بتاتے رہتے ہین یعنی ان مین تین قسم کی کتابین ہین، ایک توبتون کی پرستش کے متعلق کہ اُنسے عالم گمراہ ہوجاتا ہے، معبودِ حقیقی اور اُسکی عبادت کو بھول جاتا ہے، دوسری نجوم اور جوتش کی جن سے جہلا اور ضعیف العقل انسانون کا ایمان خراب ہوتا ہے، بالکل پنڈتون اور ستارہ بازون کے کہنے پر اعتماد وعمل کرنے لگتے ہین، تیسری، تواریخ، ان کی حالت و پٹن ہر نہ سر پیر کا ٹھکانا نہ حالات کا ٹھکانا تمام مبالغہ اور فضول گوئی سے مملو، خرافات و لغویات کا ذخیرہ[۳]

اس الزام یا اتہام یعنی کتابون کے زیرِ زمین دفن کر دینے کی نسبت یہ بندۂ ہیچمدان جو کچھ اب تک تلاش و تفتیش کرسکا اور جو کچھ اس کے بعد تحقیق کر پائے گا، اس پر ایک جداگانہ مقالہ جلد سے جلد موقع پر قدرشناس قاریون کے حضور مین پیش کریگا، توفیق ربانی رفیق و یاور ہو،

---

[۱۵] ترجمہ صفحات ۹۵، و ڈکشنری صفحہ ۲۴۴ [۲] ایضاً ص ۱۰۵ [۳] ترجمہ واقعات کشمیر صفحات ۱۰۵ و ۱۰۶

ایک بیدار دل عزیز جو کشمیر کے متعلق خود راقم الحروف سے زیادہ واقفیت و خبر رکھتے ہیں پوچھتے ہیں کہ "ان سلاطین کے عہد یا زیادہ وسیع واحاطہ کن معنی مین مسلمانون کی حکومت کے زمانہ مین کشمیر کے دفاتر کس زبان مین رہتے تھے، ہندی، سنسکرت یا فارسی مین"؟ وقت کا سوال ہے، اسی سلسلہ مین تفصیل سے جواب عرض کرونگا،

بہ ہر رو، وقائع نویس قلم انہی دو باتون کو حوالۂ کاغذ کر دینے پر اکتفا نہین کرتا، بلکہ سلاطین کشمیر کے متعدد ایسے سوانح تحریر کرنا چاہتا ہے جو غیر معمولی ہین، عجائب و غرائب (افعال) کے تحت مین آتے ہین، جن سے اُن کی خدا پرستی، خدا ترسی اور دین داری و راسخ الایمانی ثابت ہوتی ہے،

کشمیر کا بادشاہ سلطان قطب الدین سادات کرام کا بالخصوص حضرت میر سید علی ہمدانی کا نہایت معتقد اور سچا پیرو تھا، شریعتِ اسلامی مین بہ یکوقت دو بہنون کا کسی ایک مرد کی زوجیت مین رہنا منع و حرام ہے، حلّت و حُرمت کی تفصیلات کی ناواقفیت سے قطب الدین ایسا کر چکا تھا، مرشد نے آگاہ کیا تو فوراً ایک کو طلاق دیدی کشمیر مین اس وقت تک مسلمانون کو تمامی مسائل شرعی سے واقفیت نہین تھی، جیسا کہ مصنفِ اعظم لکھتا ہے "نواہی و اوامر اور دیگر احکام دینی کی پوری اشاعت ہی نہین ہونے پائی تھی، رواج کے مطابق بادشاہ بھی ہندوؤن کا سا پہناوا پہنتا تھا، بتایا گیا تو یہ بھی موقوف کیا، پوشاک بدلی گئی، ہندوؤن اور مسلمانون کے لباس مین اُسی دن سے فرق کر دیا گیا"[۵۱]

کشمیر کے دیندار و نصفت شعار بادشاہون مین سے ایک غازی شاہ بھی تھا، (تخت نشینی ۹۶۲ھ مطابق ۱۵۵۴ء) استعفائے سلطنت ۹۷۱ھ ۱۵۶۳ء وفات ۹۶۹ھ م ۱۸۶۱ء)

---

۵۱ صفحات ۹۰۹، ۹۰۸،

اس کے بیٹے حیدر خان نے کہین سے دو چار بیر بلا اجازت یا زبردستی اٹھالئے، ابھی ان کو منہ مین بھی نہین ڈالا تھا، کہ غازی شاہ کو خبر ہوگئی، عدل و انصاف سے حدِ شرعی جاری کی فرزند دل بند کا ہاتھ کٹوا دیا، حیدر خان کا یہ اذیت و رنج اٹھانا پھر باپ سے جدائی اختیار کر لینا مقتضائے جبلت بشری تھا، حیدر خان کا خالو محمد ملک بھی اس کو نصیحتین کیا کرتا تھا، اس نے بُرا مانا، اور اس جہان کو خالو جان سے خالی کر دیا، حیدر خان سوار ہو کر چل دینے کو تیار تھا، کہ ماں نے قسمین دلا دلا کر روکا، الٹا پھرا، غازی شاہ کی آتشِ غضب اور بھڑکی، عید گاہ کی راہ مین منظرِ عام پر اسکو سولی دلادی "اُولادُ نا اکبادُ نا" کا اثر یہ تھا کہ عید گاہ کے راستہ سے جب کبھی گذرتا تو منہ پھیر لیتا تھا، جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا[۱]،

کشمیر کے چک حکمران خاندان والون مین بعض بعض بڑے شجاع و تہمتن گذرے ہین، انہی مین سے ایک ملک دولت چک تھا، جو تیر اندازی، طاقتِ جسمانی و تنومندی مین اپنا جواب نہین رکھتا تھا، اس کا تیر دو کوس کے فاصلہ تک جاتا تھا، ایک روز ایک شہتیر کو جو چالیس گز لمبا اور دو گز مدوّر تھا، سو آدمی اپنی مجموعی طاقت سے چھت پر چڑھانے کے لئے کھینچ رہے تھے، اتفاقاً شہتیر ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ملک کے سر پر آیا، ملک فوراً سنبھلا، بایان ہاتھ زمین پر جمایا اور داہنے ہاتھ سے شہتیر کو سنبھالا، اس مین جلدی سے رسّے باندھ دیئے گئے، دیکھنے والے گواہ ہین کہ ملک کا بایان ہاتھ زمین مین آدھ گز گھس گیا تھا، جب اوس نے شہتیر کو سنبھال پایا تھا، وہ جس وقت کھڑا ہوتا تھا، تو اوس کے دونون ہاتھ زانون تک پہونچتے تھے، ایک مرتبہ شیر خان سُوری کے حضور مین ہاتھی کی دم پکڑ لی تھی، ہاتھی مست تھا کسی کوچہ سے گذر رہا تھا، ملک نے اپنے دونون پاؤن اس زور سے جما دیئے تھے کہ ہاتھی ہل بھی نہ سکا[۲]،

---

[۱] صفحات ۱۴۹ و ۱۵۰، [۲] صفحات ۱۴۳ و ۱۴۴،

منتخب تنقیح الاخبار[۵۱] مین راجہ کندن لال اٰسکی میر منشی سلطنت اودھ نے کشمیر کا بھی تھوڑا سا حال تحریر کیا ہے لیکن والیانِ کشمیر کی جو جدول تیار کردی ہی، وہ پوری اور لائق اعتماد ہے، حوالہ یا مراجعہ کے لئے مفید و کارآمد ہے، البتہ بعض راجاؤن کے نام کی صحت مین یہان بھی ویسی ہی دشواری پیش آتی ہے، راجہ صاحب نے ایک نئی بات لکھی ہی، جو کشمیر کی کسی اور فارسی تاریخ مین نظر سے نہین گذری، دلنواز جو پچاس سال فرمانروا رہا تھا، ۲۰۰۷ء مین سانپ کی صورت مین مسخ ہو گیا، اور مسند خالی کی، ولایت کشمیر مین اونتیس (۲۹) مسلمان بادشاہ ہوئے جن کی مدت سلطنت مجموعاً ۲۳۲ سال ہوتی ہے، آلِ تیمور مین سے گیارہ شہنشاہون نے ایک سو اکیاون برس تک حکمرانی فرمائی، ان کے بعد چار کس مرزبانانِ افاغنہ کا نام آتا ہی، ۸۰۰ھ (۱۳۹۷ء) مین تیمور سے سکندر نے صلح کر لی تھی،

ابھی کچھ اور تاریخون کا پتہ چلانا باقی ہی، مگر مین ڈزریلے (Disraeli) کا ہم آہنگ و ہم نوا نہین، اس کا قول تھا کہ انسان حالات اور اتفاقات کا بندہ نہین ہی بلکہ حالات اور اتفاقات انسان کے بندے ہین، اسی کا ایک ہم وطن و ہم خیال دانشمند ڈاکٹر جانسن کہا کرتا تھا کہ ہمت اور فتح لازم و ملزوم ہین، مجھ ایسے ضعیف و منکوس انسان کو ان سب عطایائے فطرت کے عوض بڑھاپا صرف مقہور "بڑھاپا" ملا ہے، یہ اسی کا فیضانِ خاص ہی کہ جو کچھ اوپر حوالۂ قلم کیا گیا ہے، سراسر بے سلسلہ و بے ربط ہے،

عرضِ مکرر:-

من بہ سرمنزل عنقا نہ بخود بُردم راہ
قطع این مرحلہ با مُرغ سلیمان[۵۲] کردم

---

۵۱ مطبوعہ ۱۲۶۷ھ، چھاپاخانہ حاجی ولی محمد، شہری سلطان المطابع، صفحات ۲۴۴ و ۲۴۵، ۵۲ معارف

تلخیص و تبصرہ

مغل حکمرانون کی بادشاہت کا تخیل

مندرجۂ بالا عنوان سے ڈاکٹر بنارسی پرشاد ام۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (الہ آباد یونیورسٹی) کا ایک مقالہ صوبہ متحدہ کی ہسٹاریکل سوسائٹی کے رسالہ مین شائع ہوا ہے، گو ہم کو اس مقالہ کے اکثر خیالات سے اتفاق نہین ہے، لیکن مغلون کے تصور بادشاہت کے متعلق ایک ہندو اہل قلم کی دماغی موشگافیان معلوم کرنے کے لئے اسکی تلخیص درج کیجاتی ہے،

ہندوستان کے مغل حکمرانون کی بادشاہت کا تخیل سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور ثقافتی پہلوون پر مشتمل تھا، اور اس تخیل مین حالات اور زمانہ کے لحاظ سے غیر معمولی ترمیم اور تنسیخ ہوتی رہی، کیونکہ مغلون نے ہندوستان مین تقریباً دو صدی تک حکومت کی، اور اس مدت مین بہت اہم انقلابات ہوئے جن سے مغلون کی بادشاہت کا تخیل بھی وقتاً فوقتاً متاثر ہوتا رہا، اسلئے ان بادشاہون کی حکمرانی کے تخیل کا صحیح مطالعہ کرنے کے لئے اس عہد کی سیاست، معاشرت، ثقافت اور مذہب کے چارون پہلوون پر ایک ساتھ عمیق نظر ڈالنے کی ضرورت ہے،

بابر جب ہندوستان مین داخل ہوا تو یہان کی سیاسی فضا مین گویا بجلی کوند رہی تھی شمال مین لودیون کی قوت و قیادت اور راجپوتون کے نظام جاگیرداری مین اقتدار کی جنگ جاری تھی، جنوب مین بہمنی خاندان کی شاخین زوال پذیر و جیانگر سے متصادم تھین، پانی پت کے فاتح کے

سامنے یہ تمام حقائق تھے، جن کو وہ نظرانداز نہین کرسکتا تھا، لودیون کی قوت اور قیادت پر تو اوس نے ضرب کاری لگائی، لیکن راجپوتون پر اسکی یورش کامیاب نہین ہوئی، اور گو آگرہ مین اوس نے اعلان حکومت کردیا، لیکن اسکو خود احساس تھا کہ اسکی حکومت کی بنیاد کمزور ہے، اسکے اردگرد ایسی آبادی تھی، جس کے مقتدر افراد اس کے خلاف ہمیشہ معاندانہ رویہ اختیار کرنے پر تیار بیٹھے تھے، اسکو اپنے حامیون اور سپاہیون پر بھی پورا اعتماد نہ تھا، کیونکہ وہ ہندوستان کی فتح کو صرف اس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہتے تھے، کہ اس مین ان کو زیادہ سے زیادہ مال غنیمت ملے، بابر کے لئے یہ کٹھن وقت تھا، اوس نے اپنے اقتدار اور سطوت کو برقرار رکھنے کی خاطر شراب سے توبہ کرکے غازی کا لقب اختیار کیا، اور پھر اپنی غیر معمولی صلاحیتون کی بنیاد پر کامیابی کی شاہراہ پہ گامزن ہوگیا، اس کو سولہوین صدی کا معمار سلطنت کہا گیا ہے،

بابر نے غیر معمولی فتوحات حاصل کین، اور مطلق العنان بادشاہ ہوا، گو اسکی مطلق العنانی بہتر قسم کی تھی، ہمایون کو ایک بار ۵۲۹ ۱ئہ مین بابر نے لکھا کہ بادشاہت سے زیادہ کوئی اور قید صبر آزما نہین، لیکن اسکی یہ تحریر اس بات کی ضامن نہین ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی بادشاہت کے زمانہ مین رعایا کے حقوق اور فلاح و بہبود کی غیر معمولی ذمہ داری محسوس کرتا تھا، اس کے سامنے بادشاہت کا ایک خاص تخیل تھا، جس کی قید وبند کا اظہار اس نے مذکورۂ بالا الفاظ کے ذریعہ کرنیکی کوشش کی، اور یہ تخیل اوس زمانہ کے حالات کے مطابق تھا،

بابر کے ذہن مین موروثی بادشاہت کا تخیل تھا، جس مین مذہبیت کا کوئی شائبہ نہ تھا، لیکن ضرورت کے وقت اوس نے مذہب سے بھی فائدہ اوٹھایا، اوس نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا، جس سے یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ اس نے حکمرانی اور بادشاہت کے تخیل مین کوئی نیا عنصر پیش کرنے کی کوشش کی، لیکن دراصل اوس نے کوئی نئی بات پیش نہیں کی، وہ ایرانیون کی تقلید مین لقب

اختیار کرنا چاہتا تھا اسلئے شاہ کے بجائے پادشاہ کا لقب اختیار کرلیا، اس لقب سے بادشاہت کے نظریہ مین کوئی سیاسی تغیر ظہور پذیر نہین ہوا، بابر ہندوستان مین ایک سپاہی اور فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا، اسکی زندگی زیادہ تر میدان جنگ مین گذری، اس کے لئے اتنا موقع ہی نہ تھا کہ وہ بادشاہت کے نئے تخیل کے متعلق غور و فکر کرتا، چنانچہ اسکی بادشاہت مطلق العنان رہی لیکن ضرورت کے وقت اپنے امرار کو مطمئن کرنے کے لئے ان کے مشورون کے سامنے سرِ تسلیم بھی خم کردیتا تھا،

ہمایون مین اپنے باپ کی بادشاہت کے تخیل کو ترقی دینے کی صلاحیت مطلق نہ تھی، وہ اپنے امرا کی رائے کا احترام بہت زیادہ کیا کرتا تھا، بابر نے اس کو ایک بار نصیحت کی تھی، کہ وہ اپنے قول عمل میں اپنے بہی خواہون کے مشورون کا ضرور لحاظ رکھے، اس نصیحت پر وہ برابر عامل رہا، اس کے بہی خواہون مین زیادہ تر امرا رہی تھے، بابر کے زمانہ مین بادشاہت مطلق العنان ہو رہی تھی، لیکن ہمایون نے اپنی سلطنت کے ٹکڑے کرکے اسکو بھائیون مین تقسیم کردیا، پھر انہی بھائیون نے اس کے خلاف جارحانہ اور معاندانہ روش اختیار کی، ان دو باتون سے اسکی مطلق العنان بادشاہت پر ایک شدید ضرب لگی، لیکن یہ کہا جاسکتا ہی کہ ہمایون نے اپنی بادشاہت مین انسانیت کی عناصر بھی شامل کئے، ایک موقع پر اس نے کہا کہ مین اپنے کو ہلاک کر ڈالون گا لیکن ایسی مصیبت کا باعث نہ ہونگا، اس سے ظاہر ہوتا ہی کہ اسکے ذہن مین ایسی بادشاہت نہ تھی، جو انسانیت کے تصور اور تخیل سے عاری ہو، اس لحاظ سے اوس نے بادشاہت کے تخیل مین جدت ضرور پیدا کی کہ اسکو آفتاب سے تشبیہ دینے کی کوشش کی، چنانچہ اپنے درباری ملازمون کو منطقۃ البروج کے بارہ نشانات کی طرح بارہ حصون مین تقسیم کیا، خوندمیر اس کو جامع سلطان حقیقی و مجازی اور حضرت پادشاہ ظل الٰہی کے لقب سے یاد کرتا ہی گو بادشاہ ظل الٰہی کا تخیل ہندوستان کے لئے نیا نہ تھا، مغلون

سے پہلے بعض سلاطینِ دہلی الامام الاعظم خلیفہ رب العالمین قطب الدنیا والدین جیسے القاب اختیار کر چکے تھے،

اکبر کا تخیلِ بادشاہت بالکل سیاسی تھا جس مین کچھ مذہبی افسانویت کا رنگ بھی شامل تھا، اس زمانہ مین خلافت ایک سیاسی اور مذہبی ادارہ کی حیثیت سے مردہ ہو چکی تھی، اکبر کے پیشرو خلیفہ کی سیادت سے منہ موڑ چکے تھے، ایران مین صفوی خاندان کے حکمران مذہب اور سیاست مین کسی کی تقلید نہین کرتے تھے، اور اپنے کو کسی سے فروتر نہین سمجھتے تھے، ہندوستان کے چغتائیون نے بھی یہی رویہ اختیار کیا، بابر اور ہمایون تو اسکی ابتدا نہ کر سکے لیکن اکبر نے اسکی طرف قدم بڑھایا، اکبر کی سیاسی فتوحات اور اس عہد کے علمار کی بے اعتدالیان اس کے حصولِ مقصد مین معاون ہوئین جس سے گو پوری سلطنت مین ایک انتشار پیدا ہو گیا، لیکن اکبر نے اپنے مقاصد کی تکمیل کر لی، وہ بادشاہ کے ساتھ اپنے کو خلیفہ بھی تسلیم کرانا چاہتا تھا، اس کے اس تخیل کی تشریح ابو الفضل نے اکبر نامہ اور آئین اکبری مین جا بجا کی ہی، وہ بادشاہت کو کبھی ایک نور کہتا ہی جو اللہ کی طرف سے ودیعت ہوتا ہی اور کبھی اسکو وہ آفتاب کی شعاع کہتا ہی جس سے کائنات روشن ہوتی ہی، اسی بنا پر اکبر کے تخیلِ بادشاہت مین بنی نوع انسان کی بادشاہت تھی، جس کے ماتحت ہندو اور مسلمان یکسان حیثیت رکھتے تھے لیکن یہ سوال کیا جا سکتا ہی، کہ جب وہ اپنی قوت وشوکت کے ذریعہ سے بہ آسانی مسلمانون اور ہندؤون کا سیاسی بادشاہ ہو سکتا تھا، تو اوس نے اپنی بادشاہت کو پیچیدہ اور مغلق بنانے کی کوشش کیون کی، اس کا جواب یہ ہی کہ اکبر اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے صرف دنیاوی جاہ و جلال ہی کو کافی نہ سمجھتا تھا، بلکہ اپنی مطلق العنانی کو جائز قرار دینے کے لئے اخلاق اور فلسفہ کی آڑ مین بھی پناہ لینا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے اپنے خیالات اور گذشتہ روایات اور زمانہ کے واقعات مین تطبیق دینے کی کوشش کی، اسی لئے کہا جاتا ہی کہ اکبر

کی بادشاہت مین خیالات کے تین دھارے ملے ہین، یہ دھارے مسلمانون، مغلون اور ہندوؤن کے خیالات کے ہین جن مین آمیزش کے رجحانات پیدا ہو رہے تھے، اکبر نے ان کو ملا کر مغل حکمران کی بادشاہت کا ایک بلند تخیل پیش کیا،

جہانگیر نے اکبر ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی، گو وہ اکبر کے تخیل بادشاہت مین کسی قسم کی ترقی نہین دیسکا، اسکی تزک مین ایسے خیالات ہین، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو خدا کی جانب سے اس بات کے لئے مامور سمجھتا تھا، کہ دنیا مین امن و امان قائم رکھے، ایک بار پرویز نے ایک خط مین اسکو مظہر الہی لکھا، تو اس پر اس نے کوئی اعتراض نہین کیا، بلکہ تزک مین اس کو خاص مسرت و انبساط کے ساتھ نقل کرتا ہے، اپنی بادشاہت کو نیم مذہبی رنگ دینے کے لئے تخت نشین ہونے کے بعد نور الدین کا لقب اختیار کیا، اس لقب سے انہی جذبات کا اظہار ہوتا ہے، جو اکبر کی اللہ اکبر اور جل جلالہٗ سے ظاہر ہوتے تھے، لیکن سولھوین صدی کے اختتام پر جہانگیر کی بادشاہت مین غیر مذہبی رنگ پیدا ہو گیا، کیونکہ اس زمانہ مین ملک مین مذہب کا استیلا بڑھ گیا تھا، اسی کیساتھ علما کے اقتدار مین روز افزون ترقی ہونے لگی تھی، اکبر نے اپنے زمانہ مین علما کو مغلوب کر رکھا تھا اور ان کو نظر انداز کرنے کے خیال سے اوس نے خلیفہ کا لقب اختیار کر لیا تھا، لیکن جہانگیر کے زمانہ مین انھون نے پھر رسوخ حاصل کر لیا اور انہی کی کوشش سے دربار مین سجدہ کرنے کی رسم بند ہو گئی،

جہانگیر کے تخیل بادشاہت کو اسکی سیاسی ناکامیون سے بھی صدمہ پہنچا، وہ ملکی فتوحات مین بھی اکبر کے نقش قدم پر چلنا چاہتا تھا، مگر دونون مین فرق یہ تھا کہ ایک اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا، دوسرا تھوڑی سی کامیابی پر مطمئن اور قانع رہنا پسند کرتا تھا، جہانگیر نے اکبر کی طرح دکن اور میواڑ پر متعدد حملے کئے، لیکن اس کی ساری لڑائیان جوش اور سرگرمی سے بالکل خالی نظر آتی ہین، دکن مین تو ملک عنبر کو وہ آخر وقت تک مغلوب اور پسپا نہ کر سکا، وہ اپنے آبا و اجداد

کے اصلی وطن ماوراء النہر کو بھی تسخیر کرنا چاہتا تھا، تزک مین اس خیال کا اظہار بار بار کرتا ہی لیکن صرف اس کے جذبات تھے، جن کو باوجود غیر معمولی ذرائع کے عمل مین لانے سے قاصر رہا، جہانگیر کے تخیل بادشاہت مین ایک بات بہت ظالمانہ پیدا ہو گئی، اس کے خلاف جب خسرو نے علم بغاوت بلند کیا، تو اسکی تنبیہ کے لئے اس نے ہر قسم کی سزا کو جائز قرار دیا، حالانکہ بابر، ہمایون اور اکبر نے اپنے بھائیون کے مخالفانہ رویہ کے خلاف کوئی ایسا طرز عمل اختیار نہین کیا، جو انسانیت سے دور ہو، خسرو کے ساتھ جہانگیر نے ناروا سلوک کی جو مثال قائم کی، اس سے بہت سے مہلک نتائج پیدا ہوتے رہے، جہانگیر کی مطلق العنانی پر اس کے امراء نے بھی ضرب لگائی، وہ امراء ہی کی مدد سے تخت نشین ہوا تھا، اس لئے اخلاقی طور پر اپنے حامیون اور مددگارون کو بہت سی ایسی مراعات عطا کین، جن کا لحاظ ان کو خود کرنا پڑتا تھا، وہ زیادہ محنت اور جفاکشی کا بھی عادی نہ تھا، اسلئے امراء کی قوت روز بروز بڑھتی گئی،

شاہ جہان اپنے تمام حریفون کو تہ تیغ کر کے تخت پر بیٹھا، اور شہزادگی کے زمانہ کی کامیابیون سے مخمور ہو کر "صاحبقران ثانی" کا لقب اختیار کیا، جو اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اپنے اسلاف کو اپنے کارنامون سے تاریکی مین ڈالدینا چاہتا تھا، وہ شاہ ایران سے کچھ مشکوک اور خوفزدہ بھی تھا، اس لئے ایران کو مرعوب کرنے کے لئے اوس نے پُر تمکنت لقب اختیار کیا، اسکی طبیعت مین شان شوکت اور شکوہ کے تمام عناصر موجود تھے، اس لئے یہ لقب اوس کے تخیل بادشاہت کے مطابق تھا، وہ دکن کی ریاستون کو بھی جو اکبر اور جہانگیر کی قوت اور سطوت سے زیر نہ ہو سکی تھین اسی لقب کی آڑ مین مغلوب کرنا چاہتا تھا، کیونکہ بہمنی خاندان کا ایک حکمران صاحبقران تیمور کے سامنے سر تسلیم خم کر چکا تھا، معاصر مورخون نے شاہ جہان کو ایک اعلیٰ قسم کا مسلمان بادشاہ لکھا ہی اسکی وجہ یہ بتائی جاتی ہی، کہ اوس نے سنہ الٰہی اور رسم سجدہ کو موقوف کر دیا، مذہبی پیشواؤن کی

سرپرستی کی، سیاست اور تدبر کو مذہب پر کسی حال مین فوقیت نہین دی، وہ رعایا کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا، وغیرہ، لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ شاہجہان کی بادشاہت مین کوئی مذہبی تخیل نہ تھا، گو یہ تخیل مذہب کے اثر سے خالی نہ تھا، اپنی حکومت کے ابتدائی پچیس سال مین وہ اپنی راے ہی کو اپنا رہنما سمجھتا تھا، اور اپنی تحکمانہ شخصیت اور گوناگون تجربات کی بنا پر حکومت کے تمام کامون پر حاوی رہتا تھا، لیکن آخری زمانہ مین مجبورِ محض ہو کر رہ گیا تھا، اس مین اقدام کرنے کی صلاحیت باقی نہین رہ گئی تھی، اس لئے امراء کے مشورون کا محتاج رہتا تھا، اور ان ہی کی حمایت اور مخالفت پر سلطنت کے اہم امور کی کامیابی اور ناکامیابی کا انحصار ہو گیا تھا، چنانچہ شاہجہان کے آخری ایام حکومت مین بادشاہت مطلق العنان تو ضرور تھی، لیکن اسکی اصلی اسپرٹ مفقود ہو گئی تھی، مغلون کی شاہانہ سطوت ختم ہو رہی تھی، اورنگزیب انہی حالات مین تخت نشین ہوا،

اورنگزیب نے تمام حالات کا مطالعہ کرکے اپنی بادشاہت کے تخیل کو ترتیب دیا، گذشتہ عہد کی خوش حالی نے ایک طرف لوگون کو عیش پسند اور کاہل بنا دیا تھا، دوسری طرف بعض فرقون مین آزادی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا، اور وہ اپنے حصولِ مقصد کے لئے موقع کے انتظار مین تھے، اس لئے جانشینی کی جنگ کے سلسلہ مین بہت سی جماعتین ابھر آئین، ہر جماعت کو اپنے امیدوار سے ہمدردی تھی، ان امیدوارون مین دارا سب سے زیادہ ہر دلعزیز تھا، وہ آزاد خیال اور اعتدال پسند تھا، لیکن اس مین اس کی صلاحیت مطلق نہ تھی، کہ اپنے حامیون کو اپنا ہم نوا بنا سکے، اس لئے اس کی جماعت مین اعتدال پسندی اور آزاد خیالی پیدا نہ ہو سکی، اورنگزیب دارا اور اس کے عقائد کی بیخ کنی چاہتا تھا، لیکن وہ واقعات پر بھی نظر رکھتا تھا، اوس کو احساس تھا، کہ امراء وقت پر دھوکا دے سکتے ہین، اسکے سامنے اُن کے ساتھ اسکی فوج کی غداری کی بھی مثال تھی، اس مسموم فضا مین اپنی بادشاہت کو برقرار

رکھنے کی خاطر اوس نے مذہب کی آڑ مین پناہ لی، چنانچہ اوس کے تخیل بادشاہت مین مذہبی رنگ محض حالات و واقعات پر مبنی تھا، حالانکہ وہ اکبر سے زیادہ شہنشاہیت پسند تھا، اکبر مطمئن تھا کہ شمالی ہند ایک سلسلہ مین منسلک ہو کر اوس کے ماتحت ہو گیا ہے، راجپوت اور دکنی بھی اسکی قوت و سطوت کو تسلیم کرتے ہین، لیکن اورنگ زیب تمام ہندوستان کو اپنے زیر نگین رکھنا چاہتا تھا، وہ کسی ایسی ریاست کو برداشت نہین کر سکتا تھا، جہان نظام جاگیرداری ہو، اپنی شہنشاہیت کی تکمیل مین وہ ہندؤن کو بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا، اور یہ صحیح تھا۔ ہندو مختلف مرکزون مین تقسیم تھے، اس لئے انکی قوت پر کاری ضرب لگانا آسان نہ تھا، اور اب ان مین معاشرتی مذہبی اور ذہنی نہضت کا آغاز ہو رہا تھا، اس لئے ان کی مخالفت اورنگ زیب کے لئے بیحد پریشان کن تھی، دکن کی لڑائیون کی وجہ سے شیعون کا رویہ بھی اس کے خلاف تھا، ان حالات مین اورنگ زیب کا اعتماد اور بھروسہ صرف سنیون ہی پر رہ گیا تھا، اس لئے ان کو خوش کرنے کے لئے اس نے وہ تمام حقوق اور مراعات دیدیئے، جن سے حکومت مین ایک قسم کا مذہبی رنگ پیدا ہو گیا، اور ہندوؤن کے خلاف خود بخود ایک جارحانہ طرز عمل کا آغاز ہو گیا، وہ اب تک "زندہ پیر" اور "پیر دستگیر" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک مسلمان حکمران تھا، حالانکہ یہ صحیح نہین، وہ اپنے اسلاف ہی کی طرح ایک سیاسی حکمران تھا، ایک موقع پر اس نے ایک درخواست پر یہ تحریر کیا، کہ دنیاوی معاملات کا تعلق مذہب سے نہین ہوتا، نظام حکومت کو قائم رکھنے کے لئے تعصب کو دخل نہین دینا چاہئے، ہر شخص اپنے مذہب مین آزاد ہے، ایک اور موقع پر تحریر کیا، کہ "اگر اس روش پر قائم ہو جاؤن تو سارے ہندو راجاؤن کا استیصال کرنا پڑے، جو اس کے خیال مین مناسب نہ تھا،

اسکی حکمرانی کے صحیح جذبہ کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ایک جنگ مین چار مسلمان

اور نو ہندو قید ہوئے تو اوس نے قاضی سے ان کے متعلق فتوی طلب کیا، قاضی نے حنفی فقہ کے مطابق یہ فیصلہ صادر کیا، کہ ہندوؤں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، اور مسلمانوں کو تین سال تک قید میں رکھا جائے، مگر اورنگزیب کو اس سے تشفی نہ ہوئی، اوس نے کہا کہ فقہ کو شیعون کے مسلک کی طرح سخت نہیں ہونا چاہیئے، چنانچہ اسکی خواہش کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفتیون نے "فتاوی عالمگیری" سے یہ فتوی دیا کہ ہندو اور مسلمان دونون تہ تیغ کر دیئے جائیں، اورنگزیب نے اس پر اپنی رضامندی ظاہر کی،

مذکورۂ بالا تفصیلات سے مغلون کے تخیلِ بادشاہت کا اندازہ ہوگا، یہ تخیل محض زمانہ کے حالات و واقعات پر مشتمل تھا، اور اس میں محض دنیاوی رنگ تھا، اور کبھی کبھی مذہب کا جزو بھی شامل ہوجاتا تھا، اسکی نمایان خصوصیت شہنشاہیت تھی لیکن موجودہ دور کی شہنشاہیت کی طرح اس کا مقصد محض فائدہ اٹھانا نہ تھا، مغل بادشاہ مطلق العنان ضرور تھے، لیکن اپنے قول کے سچے تھے، وہ جو کہتے تھے، ان کو عمل مین لانے سے پرہیز نہیں کرتے تھے، رفتار زمانہ سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے، کہ فرمانروائی اور اقتدار لازم ملزوم ہین، اور پھر ایک ہی فرد کے ہاتھون سے دونون کو تسکین ہوتی ہے، اس لحاظ سے مغلون کی مطلق العنانی کو حق بجانب کہا جاسکتا ہے،

"ندص ع"

تاریخ الہ آباد جلد اول

مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی کے قلم سے الہ آباد کی یہ محققانہ تاریخ ہے اس جلد مین الہ آباد کی وجہ تسمیہ اسکی قدیم تاریخ شہزادہ خسرو اور خسرو باغ کی تعمیر اس کے مقابر و مآثر اور اسکے آسودگان خاک کے حالات کی تفصیل ہے مغلون کے عہد کے اور بہت سے مفید اور قیمتی معلومات آگئے ہین اسلئے یہ کتاب شاہجہانی اور جہانگیری عہد کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے، قیمت للعہ ر

پتہ مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی یحیی پور، الہ آباد "منیجر"

اخبار علمیہ

سندھ کی جامعہ عربیہ

سندھ کے چند سربرآوردہ علما، اور قومی کارکنون کی متحدہ کوششون سے کراچی مین ایک جامعہ عربیہ قائم ہوئی ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان طلبہ کو مذہبی تعلیم کیساتھ صنعت وحرفت کی بھی تعلیم دیجائے، تاکہ وہ موجودہ زمانہ کے مطابق کامیاب زندگی بسر کرسکین، صنعت وحرفت کے نصاب مین نجاری، آہنگری، خیاطی، جوتا سازی، جلد سازی، بنائی، رنگائی، اور زراعت کی تعلیم شامل ہے، زراعت کیلئے وسیع پیمانے پر زراعتی فارم بھی کھولا جارہا ہے، جہان طلبہ فرصت کے اوقات مین کام کرین گے، کارکنانِ جامعہ کے پیش نظر ایک تبلیغی ادارہ کا قیام بھی ہے، جس مین عیسائی مبلغون اور پرانے مسلم داعیون کے اصول پر مسلمان مبلغین تیار کئے جائین گے، قدیم اور جدید کتابون کی طباعت اور اشاعت کے لئے جامعہ مین طباعت کا بھی انتظام ہوگا اور اس سے متعلق ایک کتبخانہ بھی ہوگا، جس مین عربی فارسی اور سندھی زبان کے قلمی نسخون، نادر تصانیف اور دوسری نئی اور پرانی کتابون کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ ہوگا، تصنیف وتالیف کا بھی ایک ادارہ ہوگا، جو یونیورسٹی، اس سے ملحق مدارس اور عام لوگون کی واقفیت کے لئے مفید کتابین تیار کریگا، اس جامعہ کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ یہان ایسے نوجوان مسلمان پیدا کئے جائین جو ذہنی اور روحانی اعتبار سے اس قابل ہون کہ اپنی قوم کو مختلف خطرون سے بچا سکین، گویا یہ یونیورسٹی

مسلمانون کی تنظیم کا مرکزی ادارہ ہوگا، جو مسلمانون کو ہر طرح سنوارنے کی کوشش کریگا،

اب تک اس جامعہ سے چونتیس مدارس ملحق ہو چکے ہین، اور نئے مدرسے قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اسکی مدتِ تعلیم سولہ سال ہو گی، جس مین ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم سب شامل ہے، اس کا معیار علی الترتیب بمبئی یونیورسٹی کے میٹرک، بی اے اور ایم اے کے برابر ہوگا، اس کا نصاب اس کے مدرسون مین اپریل ۴۲ئ؁ سے جاری ہو جائے گا، اس نصاب کو کامیاب بنانے کے لئے استادون کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا جا رہا ہے، جہان ایسے اساتذہ تیار کئے جائین گے، جو قرآن اور اسلام کی بنیادی تعلیم سے پوری واقفیت رکھتے ہون، یہ بھی خیال ہے کہ جب جامعہ مالی حیثیت سے مستحکم ہو جائے گی تو سائنس کے شعبہ کا بھی اضافہ کیا جائے گا،

مجلسِ تاریخِ اسلام کا پہلا اجلاس

چند اربابِ علم نے اس سال مجلسِ تاریخِ اسلام کے نام سے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی ہے، اس کا پہلا اجلاس اسلامیہ کالج لاہور مین ڈاکٹر سر ضیاء الدین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کی صدارت مین ہوا، اسمین حسب ذیل مقالات پڑھے گئے:-

(۱) "ہندوستان کی تاریخ کو از سر نو لکھنے کی ضرورت ہے" ڈاکٹر مہدی حسین آگرہ کالج (۲) "پہلی صدی ہجری مین مسلمانون کا علمی رجحان" مولانا سعید احمد اڈیٹر برہان دہلی (۳) "ریاضی اور مسلمان" ڈاکٹر ضیاء الدین پنجاب یونیورسٹی (۴) "ہندوستان کے اسلامی عہد مین تعلیم" مجددی صاحب سنٹرل ماڈل اسکول لاہور (۵) مسلمانون کا نظامِ تعلیم، ڈاکٹر تصدق حسین پنجاب یونیورسٹی (۶) "خلافت اور سلطنت" ڈاکٹر امیر حسن صدیقی علی گڈھ (۷) "اسلامی سلطنت کے خلاف بغاوت کے نظریات" پروفیسر محب الوطن صاحب ایم اے، او کالج امرتسر (۸) "۱۷۹۵ء تا ۱۷۹۹ء مین پنجاب پر مسلمانون کا حملہ" ڈاکٹر گپتا، ایف سی کالج لاہور (۹) "علاء الدین خلجی" پروفیسر خواجہ صفدر علی

سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور (۱۰) "ابن جبیر اور اسکی سیاحت" ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ گورنمنٹ کالج لاہور (۱۱) "فقیر عزیز الدین" پروفیسر لاجپت رای دیال سنگھ کالج لاہور (۱۲) "مغل بادشاہوں کا نظام عدالت" محمد اکبر صاحب ایم اے

بعض نفسیاتی تجربات

یورپ کا ایک ماہر نفسیات پروفیسر سائرل برٹ (Cyril Burt) عورتون اور مردون کا نفسیاتی مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہی کہ عورتین مردون سے زیادہ ذکی الحس ہوتی ہین، اس کا خیال ہی کہ اگر ایک عورت کے بازو پر ایک انچ مین دو جگہ سوئی چبھوئی جائے، تو وہ اوس کے فاصلہ کو محسوس کریگی اس کے مقابلہ مین اگر مرد کے چبھوئی جائے تو وہ اسوقت تک تمیز نہ کر سکے گا، جبتک کہ اس کا فاصلہ دو انچ نہو

اس کا یہ بھی تجربہ ہی کہ اگرچہ عورتون کو کھانا پکانے اور خوشبوؤن کے استعمال کا خاص ذوق ہوتا ہی، مگر مرد کھانے کا ذائقہ اور مختلف خوشبوؤن کی تمیز مین عورتون سے برتر واقع ہوئے ہین، مردون کے مقابلہ مین عورتون کی نگاہ دور اور نزدیک کی چیزون کے دیکھنے مین کمزور ہوتی ہی اور انھین چشمہ کی ضرورت پڑتی ہی لیکن ہزار مین شاید ہی ایک عورت ایسی ہوگی جو رنگون کی نابینا ہوگی، برخلاف اس کے تیس مردون مین ایک مرد رنگون کا نابینا ضرور ہوتا ہی،

جہانتک ذہانت کا تعلق ہی عورتین مردون سے زیادہ ذہین ہوتی ہین، ایسی عورتین بہت کم نظر آئین گی، جو احول ہون، یا ان کی زبان مین لکنت ہو، وہ بین تھی بھی شاذونادر ہی ہوتی ہین، اس مین شک نہین، کہ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ اکثر اہم تاریخی شخصیتون مین مشکل سے پچیس عورتین نمایان نکلین گی، لیکن اگر ملزمون مجنونون اور ضعیف العقل لوگون کی تعداد پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا، کہ ان مین عورتین کم اور مرد زیادہ ہین،

"اس"

ادبیات

جذبِ مجذوب

از

جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب پنشنر انسپکٹر مدارس یوپی

دیکھا نہ زمانہ میں مجذوب سا مستانہ فرزانہ کا فرزانہ دیوانہ کا دیوانہ
ہو نور سے پُر ساقی ہستی کا سیہ خانہ کر دیدہ و دل روشن لا شیشہ و پیمانہ
اللہ تری قدرت مسجد میں ہی میخانہ صورت مری سنجیدہ سیرت مری رندانہ
مسجد سے چلے آئیں سب جانبِ میخانہ لے بعد اذان اے دل اک نعرۂ مستانہ
ہو آمد و رفت اپنی اوس بزم میں رندانہ اک در درِ توبہ ہے اک در درِ میخانہ
جی میں ہی چڑھا جاؤں میخانہ کا میخانہ ہاں ساقیٔ دریا دل پیمانہ پہ پیمانہ
کہتا ہوا پھرتا ہے محشر میں یہ دیوانہ یارب مرا ویرانہ یارب مرا ویرانہ
اتنی تو پلا ساقی اب اس سے بھی کیا کم ہو لب ریز تو ہو جائے یہ عمر کا پیمانہ
ساقی نے بدل ڈالی دنیا مری ہستی کی آنکھیں ہیں کہ میخانے دل ہی کہ پریخانہ
بس تاؤ نہ دے اتنا کر آنچ ذرا ہلکی تیزی پہ ہے مے ساقی اڑ جائے نہ میخانہ

مجذوب کو جب دیکھا محفل کی طرف آتے
گھبرا کے پکار اُٹھے دیوانہ ہے دیوانہ

بیانِ حقیقت

از

مولٰنا قمر نعمانی سہرامی

شکستہ خاطر نہ ہو مسافر اگر کوئی رہنما نہیں ہے / بلا کی تاریکیاں ہیں لیکن چراغِ دل تو بجھا نہیں ہے

کسی طرح اور کسی جگہ بھی تمھارا جلوہ چھپا نہیں ہے / جدھر بھی اٹھتی ہیں میری نظریں کہیں کوئی دوسرا نہیں ہے

یونہی سہی تم یہی سمجھ لو کہ اب کوئی مدعا نہیں ہے / تمھیں ہے کیوں اضطراب آخر جو میرا نالہ رسا نہیں ہے

یہ تیری ہی کم نگاہیاں ہیں کہ تنگ ہے اپنی بندگی سے / مگر تو فطرت کی بے نیازی سے آج تک آشنا نہیں ہے

وہ بے نقاب و حجاب آنا وہ طور پر بجلیاں گرانا / ابھی ہیں سب یاد وہ مناظر مری نگاہوں میں کیا نہیں ہے

بہت کیا اس پہ غور میں نے مگر سمجھ میں کبھی نہ آیا / اگر یہ دنیا ہے مری دنیا تو مجھ سے کیوں آشنا نہیں ہے

مجھے تو شکوہ نہیں بتوں کے ستم کا لیکن خیال یہ ہے / کہیں کوئی مجھ سے یہ نہ پوچھے کہ تیرا کوئی خدا نہیں ہے

ہزار زحمت ہزار آفت ترا تغافل ہے اور قیامت / مگر یہ اپنا ہے ظرف ابتک کہ ایک آنسو گرا نہیں ہے

مرا جنونِ وفا سلامت، رہی نہ سود و زیاں کی کاوش / وفا کئے جا رہا ہوں دل سے سرِ مآلِ وفا نہیں ہے

زیادہ اس سے تلاش اسکی اب اور کیا سازگار ہوگی / میں ایسی منزل میں آگیا ہوں جہاں فنا و بقا نہیں ہے

ہے کوہ گل پوش، سبزہ وادی، چھڑا ہوا ہے ربابِ فطرت / مگر نہ ہونے سے اک تمھارے فضا مسرت فزا نہیں ہے

ہوئے ہیں کچھ تجربے بھی ایسے تری کرم سے بھی کانپتا ہوں / نہو تباہی کا جس میں ساماں وہ کوئی تیری ادا نہیں ہے

قمر یہ ہستی ہے غم کی بستی اثر نہ لے اسکی گردشوں کا

کوئی بھی تجھ کو ملا ہے ایسا جو مبتلائے بلا نہیں ہے

بَابُ التَّقْرِیْظِ وَالْاِنْتِقَاد

"تاریخ اسلام کے فیصلہ کن لمحے"

DECISIVE MOMENTS IN THE HISTORY OF ISLAM

مصنف :- محمد عبد اللہ عنان مصری ضخامت ۲۹۴ صفحے کاغذ اور چھپائی بہتر قیمت :- للعہ

ملنے کا پتہ :- شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور

از مولانا مسعود عالم ندوی کتب خانہ اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

محمد عبد اللہ عنان مصر کے ایک ممتاز معاصر اہل قلم ہیں، اور علمی اور تاریخی موضوعوں پر ان کی تحریریں برابر نکلتی رہتی ہیں، عام مصری مصنفوں کے برخلاف ان کی کتابوں میں تحقیق اور چھان بین کی روح نمایاں ہوتی ہے، گو زبان کے لحاظ سے ان کی عربی تحریروں کی کوئی خاص حیثیت نہیں،

خوشی کی بات ہے کہ اب ایک ہندوستانی ناشر کے زیر اہتمام ان کی دو کتابیں انگریزی میں منتقل ہو کر منظر عام پر آئی ہیں، زیر قلم تحریر میں ان ہی دونوں کتابوں کا تعارف کرانا مقصود ہے، مترجم کا نام کہیں درج نہیں، شاید خود مصنف ہی نے ان کتابوں کو انگریزی کا لباس پہنایا ہے، بہرحال مترجم کوئی بھی ہو، ہمیں تو موضوع اور مواد سے بحث ہے،

زیر نظر کتاب میں مؤلف نے تاریخ اسلام کے فیصلہ کن واقعات اور لڑائیوں کا جائزہ

لیا ہے اور غالباً اس حیثیت سے یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے، مصر ہی کے ایک معاصر عیسائی اہل قلم حنا خباز نے المعارك الفاصلة فی التاریخ لکھ کر ایک مثال تو ضرور قائم کی تھی لیکن اس کوتاہ نظر کو دنیا کی پوری تاریخ میں ایک بھی ایسی فیصلہ کن جنگ نہیں ملی، جس میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا ہو، برخلاف اس کے زیر نظر کتاب کے مصنف نے گو اپنا جائزہ اسلامی تاریخ تک محدود رکھا ہے لیکن مسلمانوں کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے بیان کرنے میں اوس نے جانبداری سے بالکل کام نہیں لیا ہے، بلکہ الٹا خود اپنی بعض خوبیوں کو وہ اچھی طرح اجاگر نہیں کر سکے ہیں جہاں تک اجمالی رائے کا تعلق ہے، کتاب اچھی، مفید اور پر معلومات ہے، عربی اور مغربی مآخذ پر مصنف کو پوری دسترس حاصل ہے، اس لئے ان کے بیان میں ایک حد تک جامعیت اور ہمہ گیری کی شان پائی جاتی ہے، گو طرز بیان حد سے زیادہ علمی اور غیر جانبدارانہ ہے، پھر بھی کہیں کہیں "عربیت" اور "مسلمانیت" نہیں چھپ سکی ہے، کسی مصنف کی ہر تحقیق و نتیجہ سے تو اتفاق کرنا بہت دشوار ہے، پھر بھی جہاں تک راقم کی حقیر معلومات کا تعلق ہے، مصنف کے بیانات صحیح نظر آئے، معمولی فروگذاشتیں کہاں نہیں ہوتیں، ؟ فروگذاشتوں کے کچھ نمونے ابھی نظر آئیں گے،

کتاب کے دو حصے ہیں، دونوں حصوں میں متعدد "فیصلہ کن واقعات" کا ذکر ہے، اور پھر "متفرق مطالعے" کے تحت میں مختلف اچھے علمی اور تحقیقی مضمون ہیں، اور ان دونوں حصوں سے پہلے مبادی کے طور پر "عربوں کی فتح کا سیلاب" (...) اور عربوں کی مذہبی پالیسی پر دو فصلیں ہیں، (ص۳۶) "عربوں کی مذہبی پالیسی" کے سلسلہ میں ذمیوں کی حیثیت پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، یوں تو پوری بحث کھٹکتی ہے، لیکن یہ کہنا بالکل صحیح نہیں کہ

"ان کی حالت (ذمیوں کی) مختلف لحاظ سے یہودیوں کی اس حیثیت سے ملتی جلتی تھی، جو انھیں قرون وسطیٰ کے یورپ میں حاصل تھی، یا اب بھی ان ملکوں میں ہے جہاں

سامیون کے خلاف عناد کا جذبہ کار فرما ہے، (ص ۱۹)

یہ بیان اپنی آپ تردید کر رہا ہے، اس پر کسی اظہارِ خیال کی ضرورت نہین، مغربی مآخذ پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ ہم غیرون کی عینک سے دیکھنے کے خوگر ہو جاتے ہین اور بدقسمتی سے مصر کے فضلاء ابھی اُس دور سے نہین نکل سکے ہین، جسے مسلم ہندوستان ایک نسل پیلے پیچھے چھوڑ چکا ہے، فیصلہ کن واقعات کے پہلے حصہ مین دو تو واقعی فیصلہ کن واقعے تھے،

(۱) قسطنطنیہ کا محاصرہ (۲) معرکہ بلاط الشہداء،

باقی بحثین (۱) مسلمان، سمندر کے مالک (اور اس کی ذیلی بحثین) (۲) روم پر مسلمانون کا حملہ (۳) یونانی آگ (Greek Fire) اس کا آغاز و ارتقار (۴) ساتوین صلیبی جنگ کے متعلق فرانسیسی مورخ De Joinville کی یادداشت "فیصلہ کن واقعات" سے تعلق نہین رکھتی،

ان تمام بحثون مین مصنف کی شانِ تحقیق پوری طرح نمایان ہے، لیکن افسوس کہ جابجا ان کے خیالات ہماری نگاہون مین کھٹکتے ہین، بحرِ روم کے جزیرون مین مسلمانون کی فتوحات کو انھون نے موجودہ یورپی "آبادکاری" (Colonization) سے تشبیہ دینے مین (ص ۵۷) انتہائی ناانصافی سے کام لیا ہے، مسلمانون کے مفتوحہ علاقے اپنی مستقل حیثیت رکھتے تھے، اکثر و بیشتر تھوڑی ہی مدت بعد مرکزی اقتدار کا جوا اتار پھینکتے تھے، انکے یہان چار ہزار میل دور کبھی نوآبادیات کا دفتر نہین رہا، اور نہ اصلی باشندون کی زمینین چھین کر انھین ملکیت کے حقوق سے محروم کیا گیا،

مصنف کو ایک اور غلط فہمی یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانون کے درمیان بالکل فرق نہین کرتے، یہ روح تو پوری کتاب مین کارفرما ہے، لیکن "صلیبی جنگون کا تخیل" مین تو انھون نے مسلمانون کی ملک گیری کی تمام لڑائیون کو "اسلام" کے سر تھوپ دیا ہے، (ص ۹۶) جو کسی طرح صحیح نہین، اس سوا انکا

نہین کہ مسلمان بادشاہون مین بہتیرے خداترس اور اسلامی احکام کے پابند رہے ہین، لیکن یہ بھی واقعہ ہو کہ ان کی بڑی تعداد امور سلطنت مین احکام الٰہی سے انتہائی بے اعتنائی برتتی رہی ہو، اسلئے "اسلام اور مسلمان بادشاہون" کے ایک ہونے کا تخیل اب ختم ہوجانا چاہئے،

"متفرق مطالعے" کے تحت "اسلام مین ڈپلومیسی" کی بحث زیادہ تر قیاس آرائیون پر مبنی ہو "قرون وسطیٰ مین غلامی" تحقیقی مضمون ہے، مگر یہان بھی اسلامی نقطۂ نگاہ کے پیش کرنے مین مصنف کو ناکامی ہوئی ہے، (ص ۱۵۹) فروسیت" (Chivalry) کی تاریخ، اصول اور روایات" علمی حیثیت سے پُرمعلومات مضمون ہے لیکن مسیحی یورپ کی "فروسیت" کو عربون اور پھر "اسلام" مین ثابت کرنا "یورپ زدگی کا نتیجہ ہے، (ص ۱۶۲) عرب جاہلیت مین بھی قرونِ وسطیٰ کے مسیحی یورپ کے "شہسوارون" اور سورماؤن" کا کوئی خاص نظام نہین تھا، اور نہ ان کے لئے "افلاطونی محبت" ضروری شرط تھی، جنگ جو عربون کے ہان سورماؤن اور نائٹون (Knights) کا کوئی خاص طبقہ نہین تھا، اسلام کے بعد توخیر فخر ومباہات کا بُت بھی چورچور کردیا گیا، وہان اس "ارستقراطیت" کی کہان گنجایش تھی، ہر کسی مسلم سوسائٹی مین "بہادری" کسی خاص طبقہ کا ٹھیکہ نہین رہی، اندلس کے متعلق جو کچھ مصنف نے لکھا ہے (ص ۱۷۳) ہمین اس کا ثبوت نہین ملتا،

دوسرے حصہ مین بھی اسی طرح پہلے "فیصلہ کن واقعے" ہین، اور پھر متفرق مطالعے، سقوط طلیطلہ، جنگ زلاقہ، اور سقوط غرناطہ تو واقعی تاریخ کے فیصلہ کن واقعے تھے، (ص ۲۲۳-۱۷۷) لیکن "اندلس مین عربی تمدن کا زوال" (ص ۲۳۸-۲۲۴) اور "اسکوریال مین مسلم اسپین کا علمی ترکہ" (ص ۲۴۷-۲۳۹) ذیلی بحثین ہین لیکن پرمغز اور پرمعلومات،

"اندلس مین عربی تمدن کے زوال" کے آخر مین" (ص ۲۳۷) مصنف نے ابوالبقاء صالح بن شریف رندی کے جن اشعار کا ذکر کیا ہے، وہ اصل مین سقوط طلیطلہ ۴۷۸ھ ۱۰۸۵ء کے موقع پر کہے گئے تھے، سقوط

غرناطہ (۸۹۷ھ ۱۴۹۱ء) اور اندلس مین مسلمانون کے انقراض سے بہت پہلے رندی وفات پاچکا تھا جو نکہ رندی کے یہ اشعار بہت موثر ہین، اس لئے غالبًا بعد مین اس مین پیوند لگتے رہے، اور غرناطہ و زوال اندلس کے مرثیہ کے طور پر زبان زد ہوگیا، (نفح الطیب: ۲ ص۵۹۵)

"متفرق مطالعہ" کے تحت مین مارکوپولو (ص ۲۵۱) ابن بطوطہ (صفحہ ۲۶۵) پر دو مضمون ہین، اور دونون پر معلومات، ابن بطوطہ والے مضمون مین بعض معمولی فروگذاشتین ہوگئی ہین، مدینہ منورہ مین بیت الحرام (Bait. ul. Ha ram: ص۲۶۶) کا ذکر تعجب خیز ہے، غالبًا مترجم کو حرم کے لفظ سے غلط فہمی ہوئی، سفرنامہ مین یہ الفاظ ہین :-

"وفی عشی ذلک الیوم دخلنا الحرم الشریف وانتھینا الی المسجد الکریم"

(رحلۃ ابن بطوطہ ج ۱ ص۲۶۱)

اسی طرح اسماعیل البخاری (ص۲۷۲) کو محمد بن اسماعیل البخاری؟ سلطان احمد شاہ (ص۲۷۳) کو سلطان محمد شاہ، اور المقتصم (ص۲۶۸) کو المستعصم ہونا چاہئے، کتاب کا آخر باب "ان مذہبی اساطیر" (Legends) سے متعلق ہے جنکا تاریخ کی تشکیل مین کافی اثر رہا ہے، اور انہی اساطیر مین احادیث مہدی کا ذکر بھی ہے۔ ع کوئی تبلاؤ کہ ہم تبلائیں کیا؟

ان احادیث پر نقد کیا جا سکتا تھا، جیسا کہ مصنف کے ممدوح ابن خلدون نے کیا ہے، اور بھی اختلاف رائے کی گنجایش تھی، لیکن سرے سے "اساطیر" سے تعبیر کرنا صریح زیادتی ہے،

کتاب کے اس انگریزی ایڈیشن مین ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اعلام اور اماکن کے صحیح املا کی طرف بالکل توجہ نہین کی گئی، جس سے غیر عربی دان کبھی صحیح تلفظ نہیں کر سکتا، خود مصنف کا نام "(ENAN M. A.) عبد اللہ عنان ہی کیون پڑھا جائے، کتابیات (Bibliography) مین بھی کتابون کے نام یونہی درج کر دیئے گئے ہین، اب بتایئے کہ Bughiat

کو بُغیۃ کون پڑھ سکتا ہی؟ اسے (Bughyat) ہونا چاہئے اسی "بغیۃ الملتمس" کے مصنف کا نام Al. Dabbi لکھا گیا ہی اسے الضبی (Ad. Dabbi) کس طرح سمجھا جائے؟ وعلم جوا پوری کتاب کا یہی حال ہے،

علمی کتابون مین صحیح املا اور Transliteration کے قواعد کا برتنا ضروری ہی، کہین کہین اسما اور اماکن کے ضبط مین بھی چوک ہو گئی ہے، جیسے Al. Murrakishi (ص ۲۱۲) کو Al. Marrâkushi (بفتح میم اور بضم کاف) اور Al. Rasafah (ص ۲۶۸) کو Al. Rusafah (بضم را) ہونا چاہئے، مجموعی طور پر کتاب مفید اور قابل قدر ہے،

ابن خلدون (انگریزی)

از محمد عبد اللہ عنان مصری حجم ۲۲۰ صفحے کاغذ اور چھپائی عمدہ قیمت ہے، پتہ :- شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور،

عمرانیات پر ابن خلدون کا مقدمہ پہلی جامع کتاب ہے، دوستون اور دشمنون تمام حلقون مین اب یہ بات مان لی گئی ہی، ابن خلدون سے پہلے مفکرون اور فلسفیون کی کتابون مین "عمرانیات" پر اشارے ملتے ہین لیکن کسی نے اس فن کا احاطہ نہین کیا، اس لئے اس تونسی مفکر کو بجا طور پر "عمرانیات" یا Sociology کا بانی کہا جاتا ہے،

ابن خلدون اس دور مین پیدا ہوا جب دنیاے اسلام پر فکری انحطاط شروع ہو چکا تھا، اور نظر و فکر کے دروازے بند ہو چکے تھے یا ہو رہے تھے، آٹھوین صدی ہجری مین اس بالغ نظر عالم کا پیدا ہونا زمانہ کے عجائب مین شمار کیا جا سکتا ہی، اسلامی اور عربی دنیا مین "مقدمہ"

لے Ibn Khaldun his life and works.

کے پایہ کی کتاب نہ اوس سے پہلے لکھی گئی، اور نہ اوس کے بعد، اس لئے آج تک اسکی برتری قائم ہی، اور اہلِ علم و نظر کو درس و مطالعہ کی دعوت دیتی ہے، موضوع اور مواد کو چھوڑ کر نفس زبان اور اسلوب و انشار کے لحاظ سے بھی یہ "مقدمہ" اچھوتی چیز ہے، اور عربی زبان مین علمی موضوعون پر لکھنے والون کے لئے اس سے بہتر نمونہ نہین مل سکتا،

نئے اثرات کے ماتحت عربی حلقون مین جہان اور علمی و ادبی سرگرمیان پیدا ہوئی ہین، وہان اسلاف کے علمی کارنامون کے احیار کا شوق بھی پیدا ہوگیا ہے، مشہور مصنفون اور شاعرون کی برسی منائے جانے کا رواج ہوگیا ہے، چند سال ہوے متنبی کی ہزار سالہ برسی دمشق مین منائی گئی، صلاح الدین ایوبی اور یوم حطین کی یاد تازہ کی جا چکی ہے، اسی سلسلہ مین ابن خلدون کے فکری ترکہ کے نمایان کرنے کی کوشش جاری ہی، تونس مین عرصہ سے جمعیۃ خلدونیہ قائم ہی، جو قابلِ تعریف تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہی، ۱۹۳۲ء مین وفات پر چھ سو برس گذرنے کی تقریب سے ابن خلدون کی یاد تازہ کی گئی، اور اس کے علمی کارنامون اور نظریون پر خطبے اور مضامین پڑھے گئے اور لکھے گئے، زیرِ نظر تالیف بھی اسی موقع پر عربی مین لکھی گئی تھی، اور "حیاۃ ابن خلدون و تراثہ الفکری" کے نام سے شائع ہو چکی ہے، (قاہرہ: ۱۹۳۳ء) گو جدید عرب کی طرف سے ابن خلدون کے حضور مین یہ پہلا خراجِ عقیدت نہین، شیخ محمد الخضر حسین التونسی (استاذ جامعہ ازہر) کی کتاب "حیاۃ ابن خلدون و مثل من فلسفتہ الاجتماعیۃ" سب سے پہلے ۱۳۲۳ھ مین نکلی، اس کے بعد طہٰ حسین کی کتاب، La Philosophie Sociale d'Ibn Khaldoun (ابن خلدون کا اجتماعی (عمرانی) فلسفہ پیرس ۱۹۱۷ء) نکلی جس کا عربی ترجمہ محمد عبداللہ عنان نے کیا ہی (۱۳۴۳ھ ۱۹۲۵ء) ایک دوسرے شامی اہلِ قلم محمد صبحی محمصانی نے "ابن خلدون کے اقتصادی افکار" (Les Idées économiques d'Ibn Khaldoun ۱۹۳۲ء) پر توجہ کی،

زیر نظر کتاب ۲ حصّوں مین بٹی ہوئی ہے، پہلے حصّہ مین ابن خلدون کے سوانحِ حیات بیان کئے گئے ہین، (ص ۱۱۱-۱) اور دوسرے مین "عقلی اور اجتماعی ترکہ" سے بحث کی گئی ہی، سیرت کا حصّہ جامع اور مستند ماخذ پر مبنی ہی، شمالی افریقہ مین ابن خلدون کی کشمکش اور الٹ پھیر کی زندگی کی وجہ سے مصنف نے اُسے ابن الوقت (Opportunist) کہا ہی (ص ۲۴، ۴۴، ۴۴) ہماری رائے مین اُس زمانہ کی ہر آن بدلتی ہوئی سیاست کے پیشِ نظر ابن خلدون کو سراہا نہین، تو معذور ضرور رکھا جاسکتا ہی لیکن یہ تو پھر بھی غنیمت ہی، میکیاویلی (Machiavelli) اور ابن خلدون کو ایک صف مین بٹھا کر تو مصنف نے غضب کر دیا ہی، (ص ۴۴) آٹھوین اور نوین صدی ہجری مین علمائے مصر کے جھگڑون پر مؤلف نے بہت خوب لکھا ہے، ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) سخاوی (م ۹۰۲ھ) اور سیوطی (م ۹۱۱ھ) جیسے فضلائے روزگار کو مبتلائے آزار پا کر سخت الجھن ہوتی تھی، مصنف کے بیان سے اس الجھن مین کمی ہوگئی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (ص ۱۰۴-۸)

کتاب کا دوسرا حصہ (ص ۲۱۲-۱۲۱) نہایت مفید اور معلومات سے لبریز ہے، اس مین پانچ فصلین ہین :-

(۱) ابن خلدون کا بیان کردہ نظریۂ عمرانیات،

(۲) ابن خلدون سے پہلے سیاست اور جہانبانی کے نظام، (Forerunners)

(۳) کتاب العبر اور التعریف

(۴) ابن خلدون اور جدید نقد و نظر،

(۵) ابن خلدون اور میکیاویلی،

مصنف نے پہلی فصل مین مقدمہ کے ابتدائی حصّہ پر بھی نظر ڈالی ہی، اور ابن خلدون کی کمزور بحثون کی طرف اشارے کئے ہین، ضعف دلائل کے لحاظ سے "جعفر و عباسہ کی داستان" (ص ۱۲۵)

(ص ۴-۱۲۵)

اور "جانبداری" کے لحاظ سے مصر کے عبیدی (فاطمی) خلفا کی "فاطمیت" کی تائید مثال میں پیش کیجا سکتی ہے، عربون پر ابن خلدون کے نامناسب اور غیر معقول حملوں کا بھی مناسب جواب دیا ہے (ص ۱۵، ۱۲۹، ۱۲۸)

ہم نے ابھی کہا ہے کہ یہ دوسرا حصہ انتہائی پر معلومات ہے "ابن خلدون اور جدید نقد و نظر" (ص ۱۶۸-۱۰۱) کے تحت میں مصنف نے ان تمام کوششوں کا جائزہ لیا ہے، جو مغرب نے ابن خلدون کے سمجھنے اور سمجھانے کے سلسلہ میں اب تک کی ہیں، مختلف یوروپی زبانوں کی واقفیت کی وجہ سے وہ اس کے اہل بھی تھے، پوری کتاب میں سب سے کمزور بحث "ابن خلدون اور میکیاویلی" (ص ۲۰۴-۱۸۹) ہے، گو مصنف نے ابن خلدون کو اس "باطل پرست فلارنساوی" پر ترجیح دی ہے، اور مغربی سیاست کے اس سرچشمہ کی گندگیوں کی طرف بھی اشارے کئے ہیں، لیکن ہماری نگاہ میں دونوں کو ملانے اور اطالوی بازیگر کو تونسی مورخ کا خوشہ چین بنانے کی کوشش ہی یکسر بے سود ہے، اس سلسلہ میں مصنف کی دور از کار قیاس آرائیاں بے نتیجہ اور بے دلیل ہیں،

آخر میں کتاب العبر کے مختلف نسخوں، طباعتوں اور ترجموں وغیرہ کا مفصل جائزہ ہے، جو مقدمہ اور تاریخ کی اہمیت جتلانے کے لئے ضروری تھا، انگریزی کتابوں کے دستور کے مطابق خاتمہ پر کتابیات اور اشاریہ بھی دیئے گئے ہیں،

املا کی صحت کا خیال اس کتاب میں بھی نہیں یحییٰ کو *Yahia* (ص ۱۴) اور ہجرۃ کو (*Hijra*) (ص ۱۵) لکھا گیا ہے حالانکہ علی الترتیب (*Yahya* اور *Hijrah*) ہونا چاہئے تھا، اسی طرح *Mu'jam al-Udaba* کو *Mujam al-Udabba* اور *Al-Ghazali* (ص ۱۲۳) کو *Al-Gazzali* ہونا چاہئے، املا کی غلطیاں بہت ہیں، یہ نمونہ کے طور پر ذکر کیا گیا، اور املا کے اصول و قواعد تو کہیں نہیں برتے گئے،

بہر حال ان معمولی اور جزوی فرو گذاشتوں کو چھوڑ کر کتاب ہر لحاظ سے اچھی ہے اور قابلِ مطالعہ

مطبوعات جدیدہ

ایران بعہد ساسانیان مترجمہ جناب ڈاکٹر محمد اقبال پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور، تقطیع بڑی، ضخامت ۷۷۰، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، غیر مجلد عہ، پتہ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی،

ایران کی ساسانی حکومت اپنے عہد کی دنیا کی عظیم الشان حکومتوں میں تھی، جس نے تقریباً چار سو سال تک بڑے جاہ و جلال کے ساتھ حکمرانی کی، اور ایسے بلند تمدن کی بنیاد ڈالی، جو صدیوں تک مشرق کے بڑے حصہ پر چھایا رہا، بلکہ اسلام کے بعد بھی بنی عباس سے لیکر ہندوستان کے مغلوں تک مشرق میں جتنی اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں ان سب میں اس تمدن کی کچھ نہ کچھ جھلک موجود تھی، دوسری زبانوں کا کیا ذکر، خود فارسی میں بھی اس عظیم الشان حکومت کے شایان شان اسکی کوئی ایسی تاریخ نہیں ہے، جس سے اسکی سیاسی اور تمدنی عظمت کا صحیح اندازہ ہوسکے، ایک فاضل مستشرق آرتھر کرسٹن سین پروفیسر کوپن ہاگن یونیورسٹی ساسانیات کے بڑے عالم ہیں، ان کی ساری عمر اسی موضوع پر مطالعہ اور تلاش و تحقیق میں گذری اور انھوں نے اس پر بہت سی مضامین اور مستقل کتابیں لکھیں، زیر نظر کتاب فرنچ زبان میں ساسانی حکومت کی تاریخ پر انکی نہایت محققانہ و مبسوط تالیف ہے، اس میں ساسانی حکومت کے قیام اوس کے عروج و زوال نظام حکومت، تہذیب و معاشرت، مذہب، علوم و فنون، صنعت و حرفت، آثار و باقیات کے متعلق معلومات کا نہایت بیش قیمت ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے، مواد کی تلاش و تحقیق میں فاضل محقق نے جو

محنت اٹھائی ہے، اور جس طرح انھون نے ایک ایک دانہ چن کر معلومات کا یہ ذخیرہ جمع کیا ہے، اس کا اندازہ صرف اہلِ نظر ہی کر سکتے ہین، ایشیا اور یورپ کی زندہ زبانون کے علاوہ قدیم یونانی، سُریانی، لاطینی اور چینی ماخذون اور ساسانی آثار و باقیات سے بڑی محنت و جانفشانی سے سرمایہ فراہم کیا گیا ہے، اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ساسانی تاریخ پر کسی زبان مین ایسی مبسوط و محققانہ کتاب نہین مل سکتی، ساسانی حکومت کے پس منظر کے طور پر اسکے پہلے کے ایرانی تمدن کا مختصر خاکہ بھی دیدیا گیا ہے، یہ کتاب اس لائق تھی کہ اردو مین اس کا ترجمہ کیا جاتا، پروفیسر محمد اقبال صاحب شکریہ کے مستحق ہین، جنھون نے اس اہم کتاب کو اردو مین منتقل کرکے اس کے ذخیرہ مین ایک قابلِ قدر کتاب کا اضافہ کیا، ترجمہ بہت سلیس و روان ہے، ساسانی آثار کے بہت سے فوٹو بھی ہین اور آخر مین اسماء و اعلام کا انڈکس بھی دیدیا گیا ہے،

اقبال کا مطالعہ از جناب سید نذیر نیازی صاحب، تقطیع اوسط ضخامت ۲۶۴ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ اردو بک اسٹال بیرون لوہاری دروازہ، لاہور،

سر اقبال کی شاعری، ان کا فلسفہ اور ان کے خیالات دوسرے شعراء فلاسفہ اور مفکرین کے خیالات اور فلسفہ سے بالکل مختلف حیثیت رکھتے ہین، ان کا فلسفہ ابداعی ہے جس کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر ہے، اس حقیقت کو سمجھے بغیر کلام اقبال کی قدر و قیمت اور اسکی روح کا صحیح اندازہ نہین کیا جا سکتا اور اس کے متعلق مختلف قسم کے شکوک و اوہام پیدا ہو سکتے ہین، جناب نذیر نیازی صاحب جنھون نے کلامِ اقبال کا اچھا مطالعہ کیا ہے، اس کتاب مین کلامِ اقبال کی اسی روح سے بحث کی ہے، اس مین چار مضامین ہین، اقبال کا مطالعہ، اقبال اور حکمائے فرنگ، اقبال کی عظمتِ فکر اور اقبال کی آخری علالت، پہلے مضمون مین کلامِ اقبال کی بنیادی روح اور اسکی غرض و غایت پر بحث کرکے اسکی قدر و قیمت دکھائی گئی ہے، دوسرے اور تیسرے مضمون مین اس خیال کی تردید

کی گئی ہے، کہ اقبال کے خیالات حکماے فرنگ سے ماخوذ ہیں، اور نطشے، برگسان، میک ٹے گرٹ اور اوسپنگلی سے اقبال کے فلسفہ کا موازنہ دونوں کے اختلافات اس پر اقبال کی تنقید کی تفصیل پیش کرکے ان کے مقابلہ میں اقبال کے فلسفہ کی عظمت واضح کی گئی ہے، ضمناً موجودہ دور کے بعض مسائل کے متعلق اسلامی تصورات بھی زیر بحث آگئے ہیں، اردو زبان میں کلامِ اقبال کے متعلق مضامین کی کمی نہیں لیکن یہ مضامین کلامِ اقبال کے مطالعہ کے لئے اصولی ہدایت کی حیثیت رکھتے ہیں، آخری مضمون اردو کے اقبال نمبر میں نکل چکا ہے،

تاریخِ وطنیت از جناب شبلان تقطیع بڑی ضخامت ۱۸۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت مجلد عہ، پتہ ادارہ تجدید علم حیدرآباد دکن،

اس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ایشیا اور یورپ کے مختلف ملکوں فرانس جرمنی، اٹلی، انگلستان، آئرستان، چین، جاپان اور اسلامی ملکوں میں وطنیت کی تحریک کی ابتداء اور اس کے ارتقاء کی تاریخ بیان کی گئی ہے، اور اس تحریک کے نشو و نما میں فلاسفہ و مفکرین کے اثرات، وطن پرستوں کے مساعی اور سیاسی انقلابات کی پوری سرگذشت آگئی ہے، ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ نسبتہً زیادہ تفصیلی ہے، آخر میں وطنیت کے پیدا کردہ نظام اور اس کے مفاسد پر مختصر تبصرہ ہے، مسلمانوں کی وطنیت کے بارہ میں لائق مؤلف کا نقطۂ نظر خالص اسلامی ہے، اور انکی حمیت غیر قوموں کی شرکتِ غم بھی گوارا کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے، تاریخی واقعات کے حوالہ بھی دیدیئے گئے ہیں،

نا تسیت، مولفہ جناب شاہد حسین صاحب رزاقی ایم اے عثمانیہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۶۰ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی، نمبر ۳،

آج کل نازیت کی اصطلاح ہر شخص کی زبان پر ہے لیکن اسکی تاریخ اور اسکی حقیقت سے کم لوگ واقف ہیں، عام طور پر اسے ہٹلر کے دماغ کی پیداوار سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اسکی تاریخ بہت قدیم ہے، اسکے بنیادی تخیل کو جرمنی کی سیاسی پراگندگی نے آج سے کئی صدی پیشتر پیدا کیا تھا، اس کے پہلے قائد فریڈرک اعظم اور بسمارک تھے، ان کے بعد جرمن مفکرین فلاسفہ اور سیاسیین مختلف زمانوں میں اسکی تبلیغ اور اس کو عمل میں لانے کی کوشش کرتے رہے، جرمنی کے سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ اس تحریک نے بڑھتے بڑھتے موجودہ شکل اختیار کی، اس کتاب میں اس کی ابتدئی اسباب ارتقاء، موجودہ نازیت، اس کا مقصد و مدعا غرض و غایت، جنگ عظیم کے بعد سے اس کی تاریخ نشو و نما نظام اور نتائج وغیرہ کی پوری تفصیل پیش کی گئی ہے، کتاب پڑھنے کے لائق ہے،

حیوانی دنیا کے عجائبات، مؤلفہ جناب عبد البصیر خان صاحب تقطیع بڑی، ضخامت ۱۵۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عار، پتہ :- انجمن ترقی اردو ہند دہلی

عام طور سے حیوانات کو ایک بے شعور جاندار سے زیادہ حیثیت نہیں دیجاتی، حالانکہ وہ اپنے اندر عجائبات کا حیرت انگیز عالم رکھتے ہیں، موجودہ علمی دور نے اس کو مستقل فن بنا دیا ہے، مسلمانوں نے بھی اپنے زمانہ میں اس پر کتابیں لکھی تھیں، جاحظ اور دمیری کی کتابیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، عبد البصیر خان صاحب شعبۂ حیوانیات مسلم یونیورسٹی نے اس کتاب میں حیوانوں کی دلچسپ خصوصیات، حیرت انگیز عجائبات اور ان کے متعلق مختلف قسم کے مفید اور دلچسپ معلومات پیش کئے ہیں، دلچسپی کے لئے جابجا تصویریں بھی دے دی ہیں، اردو میں ایسی کتابوں کی بڑی ضرورت ہے،

آثارِ دہلی، مترجمہ جناب اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم اے پی ایچ ڈی، پروفیسر سنیٹ سٹیفنز کالج دہلی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ اصفحے کاغذ کتابت و

طباعت بہتر قیمت ؏، پتہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی کلکتہ مدراس،

دہلی کا چپہ چپہ آثار قدیمہ کا مخزن ہی، سب سے پہلے سرسید احمد خان مرحوم نے ان کے حالات مین آثار الصنادید لکھی، لیکن اس کا معیار کسی قدر بلند ہے، اور اب وہ کمیاب بھی ہی، ٹی جی پی سپیئر صاحب ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر سینٹ سٹیفنز کالج دہلی نے اس موضوع پر طلبہ کیلئے انگریزی مین یہ دوسری کتاب لکھی ہے، اس مین ہندؤن کے عہد عتیق سے لیکر مغلون کے زمانہ تک دہلی کے تمام حکمرانون کی تعمیری آثار، طرز تعمیر اور ان کے متعلق تاریخی واقعات کا حال ہی آخر مین انگریزی عہد کے آثار، نئی دہلی کا تذکرہ اور ہر دور کی تعمیری خصوصیات پر تبصرہ ہی جناب اشتیاق حسین قریشی نے عام فائدہ کے لئے اردو مین اس کا ترجمہ کر دیا ہی، گو یہ کتاب طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے، لیکن معلومات کے لحاظ سے طلبہ اور غیر طلبہ دونون اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہین،

خطابیات حصہ دوم مؤلفہ جناب شیخ رحیم الدین کمال صاحب ظہیر آبادی،
تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۱۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲ر، پتہ:-
ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن،

اس کتاب کا پہلا حصہ اس سے قبل شائع ہو چکا ہی، اس دوسرے حصہ مین مختلف ملکون مین تقریر کے ارتقار کا ذکر، اسکی اثر اندازی کے وسائل و ذرائع، مقرر کی قائدانہ خصوصیات، مباحثون اور تقریرون کے مختلف اقسام مثلاً نثری تقریرون، سیاسی سامون، دواعی اور تعزیتی تقریرون کے اصول و طریقے بتائے گئے ہین، اور اسکی مثالین دی گئی ہین، اور ہندوستان کے بعض پرانے مشہور خطیبون کی تقریرون کے نمونے دیئے گئے ہین، تقریر کا ملکہ بڑی حد تک فطری ہوتا ہی لیکن علم و اکتساب کو بھی اس مین دخل ہی، اس لئے نومشق مقررون کے لئے اس کتاب مین بہت سی مفید ہدایتین ہین،

"م"

جلد ۴۹ ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۴۲ء عدد ۵

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	
شریعت اسلام اور موجودہ ہندوستان میں کاشتکارون کے حقوق،	مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی،	۳۲۵-۳۳۰
تیموری شاہزادیوں کا علمی ذوق،	سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب (علیگ) رفیق دارالمصنفین،	۳۳۸-۳۵۶
بیدل اور تذکرۂ خوشگو،	جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر پٹنہ	۳۵۷-۳۷۶
عورت اور مرد کا نفسیاتی مطالعہ	"ا۔ س"	۳۷۷-۳۸۱
اخبار علمیہ	"ض ع"	۳۸۲-۳۸۴
"خنداں"	جناب آل احمد صاحب سرور لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی	۳۸۵-۳۹۵
مطبوعات جدیدہ	"م"	۳۹۶-۴۰۰

بہادر خواتین اسلام

اس مین متعدد مسلمان خواتین کے جنگی واقعات اور شجاعت و بہادری کے کارنامے مؤثر الفاظ مین لکھے گئے ہین، قیمت ۱۲؍ ضخامت ۸۰ صفحے،

منیجر

شذرات

انجمن عربی صوبۂ متحدہ الٰہ آباد (جس کا مقصد صوبہ کے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے مسلمان طالب علموں میں عربی زبان کی تعلیم کا شوق پیدا کرنا اور ان میں سے ہونہار طالب علموں کو مناسب مالی امداد دے کر ان کی مشکلوں کو حل کرنا ہے) بحمداللہ اپنا کام مستعدی اور خوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہے، انجمن کے سکریٹری پروفیسر نعیم الرحمان صاحب مبارکباد کے قابل ہیں جنھوں نے بڑی تندہی اور محنت سے اپنے کام کو انجام دیا ہے،

یہ معلوم کرکے بھی خوشی ہوئی کہ نواب صدر یار جنگ بہادر اس کو چار برس سے برابر پچاس روپیہ ماہوار کی امداد دے رہے ہیں، اس کے علاوہ صوبہ کے کورٹ آف وارڈس نے پچھلے دو برسوں میں اسکو پانچ پانچ سو روپیے دیئے ہیں، اور دوسرے مخیر حضرات بھی اس کو ماہانہ اور سالانہ عطایا دیتے ہیں، انجمن کی کوششوں سے عربی خواں انگریزی طالب علموں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے، اس اضافۂ شوق کو دیکھ کر ضرورت ہے کہ معطیوں کی تعداد میں بھی ترقی ہو جس کے لئے ہم احساس مند مسلمانوں کو اس کی امداد کی طرف متوجہ کرتے ہیں،

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن جس سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ اپنے کاموں کو انجام دے رہا ہے اس پر اس کے مخلص کارکنوں کو مبارکباد دینا زبان کے ہر خادم کا فرض ہے، ادارہ نے اپنے کاموں کے شعبوں میں مزید ترقی کی ہے، ایک طرف علوم عالیہ میں وہ اردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کی مہم پر غور کر رہا ہے، اور دوسری طرف چھوٹے بچوں کے لئے مفید و صالح لٹریچر کی اشاعت میں بھی دلچسپی لے رہا ہے، اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس نے اپنی کم عمری میں مختلف عنوانوں پر جتنی کتابیں شائع کی ہیں، شاید ہی اس ملک کا

کوئی ادارہ ہمین اسکا مقابلہ کرسکے، گو اس میں کتابیں ہر نوع کی ہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ ہر ڈھیر میں جواہر ہی جواہر ہوتے ہیں،

علی گڈھ ہسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جس کو قائم ہوئے دو ہی تین سال کا عرصہ ہوا ہے، اپنا کام خاصی مستعدی سے کررہا ہے، اس کا سہ ماہی انگریزی رسالہ بہت سے اچھے مضامین شائع کررہا ہے، کتابوں کے سلسلہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کے آئین و طریق عدالت پر جو کتاب شائع ہوئی ہے اس نے ہندوستان کے تاریخی معلومات میں بہت بڑی کمی پوری کی ہے، ضرورت ہے کہ بادشاہوں کے جنگ و جدال کے قصوں کے بجائے اسی قسم کے مختلف عنوانوں پر انگریزی میں ایسی کتابیں لکھی جائیں جن سے معلوم ہو کہ مسلمانوں نے ہندوستان کو کیا دیا ہے،

بمبئی میں اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کے نام سے جو علمی انجمن ۱۹۳۳ء میں قائم ہوئی تھی اور جس کے لائق سکریٹری جناب آصف فیضی صاحب ہیں وہ برابر اپنے فرائض کے انجام دینے میں مصروف ہے اس زمانہ میں وہ متعدد کتابوں کی اشاعت کرچکی ہے جن کا ذکر معارف میں وقتاً فوقتاً آتا رہتا ہے، اب اس کے کارکنوں نے اس کی دہ سالہ خدمات کی یادگار میں یہ طے کیا ہے کہ اسلامی مباحث پر لائق ارباب قلم کے محققانہ مضامین کا ایک مجموعہ تیار کرایا جائے اور اس سال کے آخر تک اس کو شائع کیا جائے،

لکھنؤ کے بعض نوجوان مسلمانوں نے مل کر ادارۂ اقبال کے نام سے ایک مجلس قائم کی ہے جس کا مقصد اقبال کے فلسفہ کی اشاعت اور نوجوانوں میں اُن کی تعلیمات کی تبلیغ ہے، ۸- اپریل کو لکھنؤ گنگا پرشاد میموریل ہال میں نواب بہادر یار جنگ بہادر حیدرآباد دکن کی صدارت میں اس کا ایک کامیاب اجلاس ہوا، اس اجلاس کی خصوصیت

یہ بھی کہ بوڑھے کارگذار بھی نوجوانوں کے پہلو بہ پہلو تھے،

آجکل ڈاکٹر اقبال کے نام سے متعدد رسائل نکل رہی ہیں اور مجلسیں قائم ہیں، یہ سب کو معلوم ہے کہ اشخاص بھی بتدریج ترقی کرکے منزلِ مقصود کے احاطہ میں داخل ہوتے ہیں، اور ان کے خیالات بھی اسی تدریج کے ساتھ کمال کے مرتبہ کو پہنچتے ہیں، اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ ہر شے جو ڈاکٹر اقبال کے کلام کے فائل میں نکل آئے وہ ان کی تعلیم ہے تو وہ سراسر غلط ہوگا، بلکہ وہی چیزیں ان کی تعلیمات کے عناصر ہوں گی، جن پر ان کے قلم نے ایک مدت کی تلاش کے بعد آرام کی سانس لی، اور جس منزل پر پہنچکر ان کے خیال کے مسافر نے اقامت اختیار کی، اس بنا پر آجکل رسالوں کے کارخانوں میں جو مال بھی تیار ہوتا ہے، اور اس پر ڈاکٹر اقبال کے نام کا مارکہ لگا کر جو دکانداری کی جا رہی ہے وہ ہمت افزائی کے لائق نہیں،

کبھی فرصت سے سُن لینا بڑی ہے داستاں میری

شائقین سیرۃ نبوی کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ مولانا شبلی مرحوم کی سیرۃ نبوی کا ترجمہ مرہٹی زبان میں ہو رہا ہے، میر منشی محمد اسماعیل بھالدار صاحب جو مرہٹی کے ادیب ہیں یہ ترجمہ کر رہے ہیں، اس کی پہلی جلد عنقریب پریس میں جانے والی ہے، اس مرہٹی ترجمہ کی اشاعت کی سعادت بھی سرکار نظام ہی کے حصہ میں آئی،

مقالات

شریعتِ اسلام

اور

موجودہ ہندوستان مین کاشتکارون کے حقوق

از مولنا عبدالصمد صاحب رحمانی

زمینداری اور کاشتکاری کے موجودہ قوانین کی مشکلات اور دقتون کے پیشِ نظر گذشتہ اکتوبر سنہ ۴۱ئہ کے معارف مین کاشت کارون کے شرعی حقوق کی نسبت ایک استفتا اور اس کے بارہ مین مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب داناپوری، مولینا کفایت اللہ صاحب اور مولنا محمد عمیم الاحسان صاحب مفتی جامع مسجد ناخدا کلکتہ کے کے جوابات شائع کرکے علماے کرام سے اس مسئلہ پر شرعی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالنے کی استدعا کی گئی تھی، اس سلسلہ مین مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی کا یہ مضمون موصول ہوا ہے، جسے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔

"م"

کاشتکارون کے حقوق کے متعلق معارف کے نمبر ۴ جلد ۴۸ مین ایک استفتا مع چند جوابات کے شائع ہوا ہے، اسکی ابتدا مین علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا نوٹ ہے، اس مین مولانا ممدوح نے یہ تحریر فرمایا ہو کہ

"اتفاق وقت سی چند مہینے ہوئے کہ کلکتہ سے ایک استفتا موصول ہوا، جس پر بعض علما کے جوابات تحریر تھے، اسی سلسلہ مین خیال ہوا کہ اسی استفتاء کو بنیاد بنا کر تحقیق کا دروازہ کھولا جائے اور علمائے کامین سے استصواب کیا جائے، اور درخواست کیجائے کہ وہ اسکے متعلق پوری دیانت اور متانت سے تحریر فرمائین"

اس سلسلہ مین اپنے قصور علم کے ساتھ مجھکو سید صاحب کے الفاظ مین اس کا بھی احساس ہو کہ

"کسانون اور کاشتکارون کے حقوق، عام متداول کتب فقہ مین یہ مسائل پوری تفصیل سے نہین ملتے، جستہ جستہ علما کے اشارات اور اجتہادات ہین، اور ایک شخص کا تنہا شریعت کے کسی ایسے مسئلہ پر جس مین اجتہاد و اختلاف کا دروازہ کھلا ہو، ذمہ داری کے ساتھ لکھنا مشکل ہے، اور لکھا بھی جائے، تو اس کا قبول عام حاصل کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے"

اس لئے اس مسئلہ کے متعلق ہم جو کچھ لکھین گے، اوس کی حیثیت قول فیصل کی نہین ہوگی، بلکہ اِن اصبت فمن اللہ وانّ اخطات فمن نفسی وَمَا اُبرّئ نفسی عن سُوءٍ،

استفتاء

کیا فرماتے ہین علمائے دین مسائل ذیل مین:

(۱) کاشتکاری پر جس کو عرف مین موروثی کہتے ہین، زمیندار کو قانوناً یہ حق حاصل ہو کہ خود اس زمین مین کاشت کرے، یا کسی دوسرے سے کاشت کرائے، اور پیداوار کو اپنے تصرف مین لائے، اور جو لگان سرکاری طور پر مقرر ہو چکا ہے، وہی لگان زمیندار کو ادا کرے، زمیندار کو اس مین سوائے لگان مقررہ کے اور کوئی حق نہین، نہ وہ کھیت نکال سکتا ہی، نہ لگان ہی زیادہ کر سکتا ہی، تو کیا یہ کاشتکاری شرعاً درست ہی یا نہین؟

(۲) ان اطراف مین موروثی کو رہن بھی رکھتے ہین، اور روپیئے سے اپنا کام چلاتے ہین

اس قسم کی موروثی رہن رکھنا شرعاً جائز ہے یا نہین ؟

(۳) اگر کسی کاشتکار کا انتقال ہو جائے، اور تین لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑے، تو اسکی کاشتکاری سے وراثت جاری ہو گی یا نہین ؟ بصورت اول تخریج کس طرح ہو گی،

الجواب

سوالون کے نمبر وار جواب سے پہلے دو چیزین قابلِ لحاظ ہین، ایک تو سید صاحب کے الفاظ ہین یہ امر کہ

"دائمی استمراری بندوبست صرف بنگال و بہار اور یو پی کے دو تین مشرقی اضلاع مین ہے، مدراس مین اراضی حکومتِ وقت کی براہ راست ہین، جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے"

دوسرا امر یہ کہ مختصر الفاظ مین پہلے یہ معلوم کر لیا جائے کہ آئینِ اسلامی کی رو سے کاشتکار کے ساتھ کاشت کی زمین کے تعلق کی عام صورتین کیا ہین ، ؟ اور ان کے لئے شریعتِ اسلامی کے احکام کیا ہین ؟ اسکے بعد موجودہ ہندوستان کے کاشتکارون کے حقوق کے متعلق غور کیا جائے کہ آئین اسلامی کی رُو سے اُن کی حیثیت کیا ہے، اور ان کے متعلق شرعی احکام کیا ہین ؟

شریعتِ اسلام مین کاشتکارونکے ساتھ زمین کے تعلق کی عام صورتین

(۱) کسی ملک کو امام نے اپنی قوت و اقتدار اور قہر و غلبہ سے فتح کیا اور اس کی زمین کو مسلمانون پر تقسیم کر دیا، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر مین کیا،

ہدایہ مین ہے :-

وَاِذا فتح الامام بلدۃً عنوۃً ای قہراً فہو بالخیار ان شاء قسمہا	اگر امام کسی ملک کو غلبہ سے فتح کرے تو اوس کو اختیار ہے، اگر چاہے تو اسکو

بین المسلمین کما فعل رسول اللہ علیہ السلام بخیبر"

مسلمانون پر تقسیم کردے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر مین کیا،

اس صورت مین یہ زمین عُشری ہو گی، اور کاشتکار کی ملک ہو گی، عُشری ہونیکے متعلق یہ تصریح ہے کہ

فقد قال ابو یوسف فی کتاب الخراج وھٰذہ الارضون اذا قسمت فھی ارض عُشر ان ترکھا الامام فی ایدی اھلھا الذین قھروا علیھا فھو حسن (ردّ المحتار جلد ۳ ص ۳۹۳ (ط) باب العشر):

امام ابو یوسف نے کتاب الخراج مین فرمایا کہ یہ زمینین اگر تقسیم کر دی جاًئین تو عشری ہین، اور اگر امام انکو لوگون کے ہاتھ مین چھوڑ دے جس پر غلبہ پایا ہے، تو اچھا ہے،

کاشتکار کے مالک ہونے کی تصریح اور اس بنا پر اس کے بیع کرنے، وقف کرنے اور اس مین وراثت جاری ہونے کی تصریح ردّ المحتار کی حسب ذیل عبارت مین ہے،

ارض الخراج مملوکۃ وکذلک ارض العشر یجوز بیعھا وایقافھا وتکون میراثاً کسائر املاکہ، (جلد ۳ ص ۳۹۶)

خراجی زمین مملوکہ ہے، اسی طرح عشری زمین بھی، اس کا بیچنا اور وقف کرنا جائز ہے، اور اسمین اسکی دوسری جائدادون کی طرح میراث جاری ہوگی،

(۲) کسی ملک کو امام نے اپنی قوت اور سطوت کی بنا پر فتح کیا، اور زمین کے سابق مالکون کو برقرار رکھا، اوران کی زمین پر خراج (مالگذاری) مقرر کر دیا، جیسا کہ حضرت عمر رضؓ نے عراق وغیرہ کے علاقہ مین کیا، ردّ المحتار مین کتاب الخراج امام ابو یوسف رحؒ سے یہ تصریح ہے،

فان المسلمین افتتحوا ارض العراق

مسلمانون نے عراق، شام اور مصر کی زمینونکو

والشام و مصر ولم یقیموا شیئاً	فتح کیا، اور ان مین سے کچھ بھی تقیسم
من ذٰلک بل وضع عمر علیھا	نہین کیا، بلکہ اس پر حضرت عمرؓ نے
الخراج الخ (ج ۳ ص ۲۹۳)	خراج مقرر فرمایا،

اس صورت مین یہ زمین خراجی ہوگی، اور کاشتکار اس کا مالک ہوگا، اور اس کو بیع اور وقف کا پورا اختیار ہوگا، اور اس مین وراثت بھی جاری ہوگی، سند اسکی ردالمحتار کی عبارت مین گذر چکی ہے،

(۳) کسی ملک کی فتح اس طور پر ہوئی کہ وہان کے لوگون سے مصالحت ہوگئی، اور ان کی زمین پر امام کی جانب سے خراج تشخیص کردیا گیا، اس صورت مین بھی صاحب زمین اپنی زمین کا مالک ہوگا، ردالمحتار مین ہے،

کل ما فتح عنوۃً واقرّ اھلہ علیھا	جو کچھ کہ قہر اور غلبہ سے فتح ہوا، اور
او صولحوا و وضع الخراج علیٰ	وہان کے باشندون کے قبضہ مین رہنے دیا گیا
اراضیھم فھی مملوکۃ لاھلھا	یا ان سے صلح کی گئی، اور ان کی زمینون
درد منتقی،	پر خراج مقرر کیا گیا، تو یہ ان باشندون
(جلد ۳ ص ۲۹۳)	کی ملکیت ہے،

(۴) امام کی طرف سے کسی کو بطور انعام کے ہمیشہ کے لئے زمین دیگئی، تو یہ زمین انعام پانے والے کی ملکیت ہوگی، اور اس مین بیع ہبہ اور توریث سب نافذ ہوگی، احکام الاراضی مین ہے:-

الانعام المخلد والمؤید بمنزلۃ	انعام مؤید اور مخلد بمنزلہ ملک کے ہے،
الملک یجوز بیعہ وشراءہ علی الصحیح	اس کا بیچنا اور خریدنا جائز ہے، اسی طرح

(درایضاً) الانعام المخلد یدخل فی	انعام مخلد ملک میں آجاتا ہے اور بیع، ہبہ اور
الملک فیباع ویوھب ویورث	میراث جائز ہے،

(۵) "اراضی مملکہ" یعنی ایسی زمین جس کا مالک مرگیا ہو، اور وارث نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیت المال میں حکومتِ اسلامیہ کے داخل کر لی گئی ہو، یا ایسی زمین جسکو امام نے اپنی سطوت و قوت سے فتح کیا ہو، اور اس کو قیامت تک کے لئے مسلمانون کے لئے رکھ چھوڑا ہو) زراعت کیلئے خراج یا غلہ پر دیگئی، تو اس صورت مین مزارع سے جب تک وہ خراج یا غلہ ادا کرتے رہین گے، ان سے زمین نہین لیجائیگی، لیکن اوس کو نہ تو اس ارضِ مملکت کی بیع کا حق ہوگا، نہ اوس کے مرنیکے بعد اس مین وراثت جاری ہوگی، ردّ المحتار مین ہے،

ثم اعلم ان اراضی بیت المال	بیت المال کی زمینین جو اراضی مملکت کہلاتی
المسماۃ باراضی المملکۃ والحوز	ہین، جب وہ کاشتکارون کے ہاتھ مین ہونگی
اذا کانت فی ایدی زُرّاعھا	توجب تک وہ اس کا حق ادا کرتے رہین
لاتنزع من ایدیھم ما داموا	ان سے زمین نہ لی جائے گی، اس مین نہ
یؤدّون ما علیھا ولا تورث	ان کی وراثت جاری ہوگی، اور نہ
عنھم اذا ماتوا ولا یصح بیعھم	ان کے لئے اس کی بیع جائز ہوگی،

(ج ۳ ص ۳۹۵)

لیکن ردّ المحتار مین اسی کے بعد یہ بھی تصریح ہے، کہ "دولت عثمانیہ" مین باپ کے مرنے کے بعد یہ زمین اس کے بیٹے کی طرف بغیر کسی قسم کی رقم ادا کرنے کے مفت منتقل ہوجاتی ہے، اور اگر مرنے والے کے وارثون مین اور لوگ ہوتے، جیسے بیٹی، یا سوتیلا بھائی، تو وہ اس زمین پر "اجارہ فاسدہ" کے طور پر قبضہ کر لیتا تھا، "عمالِ حکومت" کو اس کا اختیار نہین ہوتا تھا، کہ وہ ایک کاشتکار سے لیکر دوسرے

کاشتکار کو دیدیں جب تک خود سلطان یا نائب سلطان سے حکم نہ حاصل کر لیا جائے، ہاں تین سال یا اس سے زیادہ زمین کو غیر آباد رکھے گا، تو لے لیا جائے گا،

ولکن جری الرسم فی الدولة العثمانیة ان من مات عن ابن انتقلت الیه مجانا والا فلبیت المال ولو له بنت او اخ لاب له اخذها بالاجارة الفاسدة وان عطلها متصرف ثلاث سنین او اکثر بسبب تفاوت الارض تنزع منه وتدفع لآخر ولا یصح فراغ احد منهم عنها لآخر بلا اذن السلطان او نائبه کما فی شرح المنتقی (جلد ۲ صفحہ ۳۹۶ باب العشر والخراج)

دولت عثمانیہ میں یہ رسم جاری ہے کہ اگر کوئی کاشتکار بیٹا چھوڑ کر مرے تو زمین اسکے بیٹے کی طرف مفت منتقل ہو جاتی ہے، اگر بیٹا نہیں ہوتا ہے، تو وہ بیت المال کی ملک ہو جاتی ہے، اور اگر اوس کے لڑکی یا سوتیلا بھائی ہوتا ہے، تو اسکو اجارہ فاسدہ سے لیتا ہے، اور اگر اس زمین کو تین سال یا زیادہ تک بیکار چھوڑ دے تو زمین اوس سے لیکر دوسرے کو دیدیجاتی ہے، سلطان یا اوس کے نائب کی اجازت کے بغیر کسی کو اختیار نہیں ہے کہ ایک کاشتکار خود زمین چھوڑ کر دوسرے کو دیدے،

(۶) زمین کے مالک سے نقدی لگان یا بٹائی پر کاشتکاری کرنا جیسا کہ عہد نبوت اور صحابہ میں ہوتا تھا، بخاری میں ہے:-

عن رافع رض عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال انما یزرع ثلثة رجل له ارض فهو یزرعها ورجل منح

حضرت رافع رض فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین قسم کے آدمی کاشت کرتے ہیں، ایک وہ جو خود زمین کا مالک ہے

ارضاً فھو یزرعھا و رجل استکریٰ ارضاً یذھب او فضۃٍ،

اور خود ہی کاشت کرتا ہے، دوسرے وہ جو کسی کو مفت زمین دے اور وہ کاشت کرے، تیسرے وہ جو نقد لگان پر زمین دوسرے سے (۲- ج ۲ ص)

صحابۂ کرام کی عملی زندگی کی تصویر بخاری میں یہ ہے کہ

قال ابوجعفر رض ما بالمدینۃ اھل بیتِ ھجرۃٍ الا یزرعون علی الثلث والربع وزارع علی و سعد بن مالک وعبد اللہ بن مسعود و عمر بن عبد العزیز والقاسم و العروۃ وآلِ ابی بکر وآل عمر وآلِ علی و ابنِ سیرین رضی اللہ عنھم،

حضرت ابوجعفر باقر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مدینہ منورہ میں کوئی مہاجر گھرانہ ایسا نہیں تھا جو تہائی اور چوتھائی کی بٹائی پر کاشت نہ کرتا ہو حضرت علی، سعد بن مالک، عبد اللہ بن مسعود، عمر بن عبد العزیز، قاسم اور عروہ، آل ابوبکر، آل عمر، آل علی و ابن سیرین رضی اللہ عنہم نے کاشت کرائی،

اس صورت میں بٹائی کرنے والا یا نقدی لگان پر کاشت کرنے والا زمین کا مالک نہیں ہوتا ہے، فقہ کی کتابیں ایسی جزئیات سے معمور ہیں، صحابۂ کرام کے عہد میں بھی نقدی لگان پر کاشتکاری کرنے والا مالک نہیں سمجھا جاتا تھا، موطا امام مالک رضہ میں حضرت عبد الرحمن بن عوف کا واقعہ ہے کہ

"ان عبد الرحمن بن عوف تکاریٰ ارضاً فلم تزل فی یدیہ بکراء حتی مات. قال ابنہ فما کنت اراھا الا لنا من طول ما مکثت

حضرت عبد الرحمن بن عوف رضہ نے ایک زمین نقدی لگان پر لی، جو ہمیشہ ان کے قبضہ میں مرتے دم تک رہی، ان کے بیٹے نے کہا کہ ہم اس کو اپنی ملک سمجھتے تھے اسلئے

فی یدہٖ حتی ذکرہا لنا عند	کہ وہ ایک مدت سے ہمارے والد کے پاس
موتہ فامرنا بقضاء شئ	رہی یہان تک کہ اپنے انتقال
کان علیہ من کرائہا من ذھب	کے وقت انھون نے ذکر کیا اور کرایہ
او ورق،	(جو سونا یا چاندی تھا) ادا کرنے کا حکم دیا؛

(۷) ایسی زمین جس کو کاشتکار نسلاً بعد نسلٍ کاشت کر رہا ہو، مگر اس کو یقینی طور پر یہ معلوم نہ ہو، کہ ابتدأ تعلق یا بندوبست کی کیا صورت تھی، تو ایسی صورت مین بھی وہ کاشتکار شرعاً زمین کا مالک ہوگا، ردّ المحتار مین ہے؛

وقد قالوا ان وضع الید والتصرف	ان لوگون نے کہا کہ قبضہ اور تصرف
من اقوی ما یستدل بہ علی	ملک کی بہت قوی دلیل ہے اس لئے اسکو
الملک ولذا تصح استشھادۃ	ملک کی شہادت مین پیش کرنا صحیح ہے؛
بانہ ملکہ (ج ۳ ص ۳۹۶ باب العشر والخراج)	

پھر اس کے بعد اراضیِ مصر اور شام کے متعلق علامہ سبکیؒ کا قول نقل کرتے ہوے جن کا خیال ہے کہ یہان کی زمین "وقف علی المسلمین" ہے) یہ تصریح کی ہے، کہ زمین کا مالک وہی ہوگا، جس کے قبضہ مین وہ ہے؛

ثم قالوا من وجدناہ فی یدہٖ	ہم جس کے قبضہ یا ملک مین زمین کا کوئی
او ملکہ مکانا منھا، فیحتمل انہ	حصہ پائینگے تو اسمین اسکا احتمال ہے کہ اس نے اسکا
احیا او وصل الیہ وصولًا	احیا کیا ہو، یا اوس کو صحیح طریقہ سے
صحیحًا، (ج ۳ ص ۳۹۷ ر ر)	پہونچی ہو،

اس کے بعد علامہ محقق ابن حجر مکی نے شیخ الاسلام امام نووی کا اقلیمِ مصر کے متعلق یہ

واقعہ نقل کیا ہے کہ حکومت کی طرف سے جب یہ واقعہ پیش آنے کو تھا، کہ مالکانِ زمین سے زمین کی ملکیت کے متعلق وثائق طلب کئے جائین، اور جن کے پاس وثائق نہ ہون، ان کی زمین بحقِ بیت المال ضبط کر لی جائے، تو اس وقت شیخ الاسلام نے اسکی شدت کے ساتھ مخالفت کی، اور یہ فتوی دیا کہ جس کے قبضہ مین جو زمین ہے، وہ اس کا مالک ہے، اس پر نہ کسی کو اعتراض کا حق ہے، نہ دلیل و ثبوت طلب کرنے کا،

وقد اطال رحمہ اللہ تعالیٰ فی ذلک اطالۃً حسنۃً رداً علی من اراد انتزاع اوقاف مصر و اقلیمها وادخالها فی بیت المال بناءً علی انها فتحت عنوۃً وصارت لبیت المال فلا یصح وقفها، و قال سبقہ الی ذلک الملک الظاهر بیبرس فانه اراد مطالبۃ ذوی العقارات بمستندات تشهد لهم بالملک والا انتزعها من ایدیهم متعللاً بما تعلل به ذلک الظالم فقام علیه شیخ الاسلام الامام النووی واعلمه بان ذلک غایۃ الجهل والعناد وانه لا یحل عند

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے ان لوگون کی رد مین بہت اچھی اور طویل بحث کی ہے جنھون نے مصر کے اوقاف اور اسکی اقلیم کو اس بنیاد پر انکے مالکون کے قبضہ سے نکال کر بیت المال مین داخل کرنے کا ارادہ کیا، کہ وہ بقوت فتح کی گئی ہے، اس لئے بیت المال کی ملک ہے، اور اس کا وقف صحیح نہین ہے، اور فرمایا کہ اس سے پیشتر ملک ظاہر بیبرس نے اہل جائداد کو وثائق طلب کرنیکا ارادہ کیا تھا، کہ وہ اپنی ملکیت کا ثبوت دین، ورنہ اُن کی جائدادین ضبط کر لیجائین گی، اور اسکا سبب وہی تبلایا جو اس ظالم نے تبلایا، اس پر شیخ الاسلام نووی نے سخت مدافعت کی اور ان کو بتایا کہ یہ انتہا درجہ کا جہل اور عناد ہے

أحدٍ من علماء المسلمين بل من	کسی عالم کے نزدیک یہ جائز نہین ہو بلکہ جس
في يده شئ فهو ملكه لا يحل	کے قبضہ مین جو چیز ہو وہ اسی کی ملک ہو،
لأحدٍ الاعتراض عليه ولا	کسی کو اس پر حق اعتراض نہیں ہو، اور نہ
يكلف اثباته ببينة ولا زال	اوس سے اس کا ثبوت طلب کیا جا سکتا ہو،
النووي رحمة الله عليه يشنع	امام نووی برابر سلطان کو اس پر ملامت
على السلطان ويعظه الى ان	اور نصیحت کرتے رہے یہانتک کہ وہ اس
كف عن ذلك فهذا الخبر الذي	ارادہ سے رک گیا، پس وہ خبر جس کے قبول
اتفقت علماء المذاهب على قبول	نقل اور اسکی تحقیق وفضل پر تمام علمائے مذہب کا
نقله والاعتراف بتحقيقه و	اتفاق ہے، اجماع علماء کی نقل ہے،
فضله نقل اجماع العلماء على	کہ جس کے قبضہ مین زمین ہو، اوس سے کسی وثیقہ
عدم المطالبة بمستندٍ عملاً باليد الظاهر	کو طلب نہ کیا جائیگا، اور اسکا ظاہری قبضہ
فيها انها وضعت بحقٍ (جلد ۳ ص ۳۹۶)	اس کے قبضہ کی صحت کے لئے کافی سمجھا جائیگا،

علامہ شامی، غیر حنفی علماء کے اس فتوی اور اس اجماع کی نقل کے بعد حنفی مسلک کے اصول پر اپنی رائے لکھتے ہین، کہ زمین کا مالک کاشتکار ہی ہوگا،

قلت فاذا كان مذهب هؤلاء	مین کہتا ہون کہ جب ان اکابر کا مسلک یہ ہو
الاعلام ان الاراضي المصرية والشامية	کہ مصر اور شام کی زمینین جو اصل مین مسلمانون پر وقف
اصلها وقف على المسلمين او لبيت	ہین، یا بیت المال کی ملک ہین اس کے باوجود
المال ومع ذلك لم يجيزوا مطالبة	یہ اکابر علماء کسی کو اسکی اجازت نہین دیتے کہ وہ ان پر ملکیت کے
احد يدعي شيئا انه ملكه بمستندٍ	مدعی محض اس احتمال پر ملکیت کے ثبوت کی سند

يشهد له بناءً على احتمال انتقاله	طلب کرے کہ ممکن ہے یہ زمین اسکے پاس صحیح
اليه بوجه صحيح فكيف يصح على	طور پر پہونچی ہو، پس ہمارے مذہب کی رو سے اس زمین
مذهبنا، بانها مملوكة لاهلها	کے متعلق جو اسکے مالک کی ملک ہے جسکے خراج کا
اقروا عليها بالخراج كما قدمناه	انھوں نے اقرار کیا ہے، جیسا کہ ہم پہلے بیان
انه يقال انها صارت لبيت المال	کر چکے ہیں، یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ وہ زمین
وليست مملوكة للزراع لاحتمال	بیت المال کی ہوگئی، کاشتکار کی ملکیت نہیں رہی،
موت المالكين لها شيئاً فشيئاً	محض اس احتمال کی بنا پر کہ اس کے مالک ایک
بلا وارث فان ذلك يؤدي	ایک کرکے بغیر وارث کے مرگئے ہوں کیونکہ یہ
الى ابطال اوقافها، وابطال	چیز تو ان کے اوقاف کو باطل کر دیتی ہے، اسی طرح
المواريث فيها وتعدي الظلمة	میراث کو باطل کرتی ہے اور ایسا کہنا ان مالکوں پر
على ارباب الايدي الثابتة المحققة	جن کا حق اور قبضہ بغیر کسی جھگڑے کے مدتوں
في البلاد المتطاولة بلا معارض	سے ثابت ہے ظالموں کی تعدی ہوگی،
ولا منازع (جلد ۳ ص ۳۹۵)	

اس کے بعد علامہ شامی قول فیصل یہ لکھتے ہیں کہ اس زمین کے سوا جس کا دلیل شرعی سے بیت المال کے لئے ہونا معلوم ہو، تمام زمین چاہے مصر کی ہو یا شام کی، یا اسی طرح کی دوسری جگہ ہو، سب کا مالک کاشتکار ہوگا،

والحاصل في الاراضي الشامية	حاصل یہ ہے کہ شام مصر یا اسکے مثل دوسرے مقامات
والمصرية ونحوها ان ما علم منها	کی اراضی میں جس کے متعلق یہ معلوم ہو کہ
كونه لبيت المال بوجه شرعي	وہ شرعی طریقہ سے بیت المال کی ملک ہے

فحکمہ ما ذکرہ الشارح عن الفتح وما لم یعلم فھو ملک لاربابہ والمأخوذ منہ خراج لا اجرۃ لانہ خراجی فی اصل الوضع فاغتنم ھذا التحریر فانہ صریح الحق الذی یعض علیہ بالنواجذ الخ (جلد ۳ ص۳۹۵ ایضاً)

وہ حکم ہے جو شارح نے فتح سے نقل کیا ہی، اور جس کے متعلق علم نہ ہو، وہ ان کے مالکوں کی ملک ہی اور ان سے خراج لیا جائے گا، نہ کہ اجرت، کیونکہ وہ اپنی اصلی وضع میں خراجی ہے، اس تحریر کو غنیمت سمجھو یہ ایسا کھلا ہوا حق ہے جس کو مضبوطی سے پکڑنا چاہئے۔

بہر حال ایسی زمین جو کاشتکار کی کاشت میں بذریعۂ وراثت یا خریداری وغیرہ کے مدت سے چلی آرہی ہو، اور اس کے قبضہ میں ہو، اور بیع و شرا کا عمل اس میں جاری ہو، اور وہ اس کا خراج (لگان) ادا کر رہا ہو، وہ اس کا آئین اسلامی کی روسے مالک ہوگا، اور اس کے حق ملکیت کے خلاف کوئی دعوی بغیر قوی دلیل کے قابلِ لحاظ نہیں ہوگا، اور نفس مخاصمت کے مقابلہ میں کاشتکار کا دعوی ملکیت ہی قابلِ قبول ہوگا، ردالمحتار میں ہے،

فاذا ادعی واضع الید الذی تلقاھا شراءً او ارثاً او غیرھما من اسباب الملک انھا ملکہ وانہ یودی خراجھا فالقول لہ وعلی من یخاصمہ فی الملک البرھان ان صحت دعواہ علیہ شرعاً واستوفیت شروط الدعوی (ج ۳ صفہ ۳۹۶)

پس اگر وہ قابضِ زمین جس نے اس زمین کو خرید کر یا میراث سے یا دوسرے اسبابِ ملک سے حاصل کیا ہے، یہ دعوی کرے کہ یہ اسکی ملک ہی، اور یہ کہ وہ اس کا خراج ادا کرتا ہے، تو اسکی بات مانی جائیگی اور جو شخص اسکی ملک میں مدعی ہوگا اگر اسکا دعوی شرعی حیثیت سے صحیح ہی اور اسمیں صحت دعوی کے شرائط پائے جاتے ہیں، تو اس پر ثبوت پیش کرنا ضروری ہوگا۔

تیموری شاہزادیون کا علمی ذوق

از

سید صباح الدین عبدالرحمن (علیگ) رفیق دار المصنفین

ہندوستان کے شاہان تیموری کی علم دوستی اور حسنِ مذاق کا یہ نمایان ثبوت ہے کہ جہان انھون نے حکومت کا نظم و نسق سنبھالنے اور ملک داری کے لئے اپنے شہزادون کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا، وہان انھون نے شہزادیون کو بھی اس سے محروم نہ رکھا، اور نہ صرف ان کے دربارون مین علم و فن کی مجلسین قائم تھین، بلکہ ان کے خلوتکدون مین بھی علم وادب کی بزم آراستہ تھی، یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ فتوحات کی معرکہ آرائیون اور جنگِ جانشینی کی خون آشامیون کے باوجود تیموریون نے جلوت اور خلوت دونون کو علم و ہنر کی شمع سے منور رکھا چنانچہ علمی حیثیت سے تیموری شاہزادون کے ساتھ ایسی تیموری شاہزادیان بھی ملتی ہین جن کی ذات پر اربابِ علم و فضل کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے،

گلبدن بیگم تیموری شاہزادیون کی علمی بزم مین سب سے پہلے گلبدن بیگم پر نظر پڑتی ہی، جو بابر کی بیٹی تھی، بابر کے لڑکون مین ہمایون کامران ہندال اور عسکری نے میراث مین علم، ادب، اور شعر و شاعری کا ذوق پایا، اسی دودمانِ فضل و کمال کے گہوارہ مین گلبدن بیگم نے بھی پرورش پائی، اور اپنی اعلیٰ تعلیم و تربیت کی بدولت ترکی اور فارسی زبان کی قابلِ قدر انشاپرداز اور شاعر ہوئی، فارسی زبان مین اوسکی ایک مستقل تصنیف ہمایون نامہ ہے، جو اپنے طرزِ انشا

کے لئے ایک بے مثل کتاب اور بابر و ہمایون کے عہد کے تمدنی، معاشرتی اور تاریخی واقعات کے لئے ایک قیمتی ماخذ ہی،

یہ کتاب دراصل اکبر کے حکم سے اکبر نامہ کی ترتیب و تدوین کے وقت بابر اور ہمایون کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لئے لکھی گئی تھی لیکن اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر ایک اہم تالیف ہوگئی، یہ کتاب عرصہ تک پردۂ گمنامی مین پڑی تھی، لیکن انگلستان کی ایک علم دوست خاتون نے اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے اور اس کو بڑی محنت و کاوش سے اڈٹ کرکے ۱۹۰۲ء مین لندن سے شائع کیا، اس کے دیباچہ مین خاتون مذکور نے گلبدن بیگم کی مفصل سوانح عمری لکھی، اور کتاب مین بیگمات کے جتنے نام آئے ہین، اُن سب کے بھی حالات قلمبند کئے، اس کے علاوہ جابجا جو ترکی الفاظ استعمال کئے گئے ہین، ان کی تحقیق کی، اور پھر فارسی متن کے ساتھ انگریزی ترجمہ بھی منسلک کیا، اس کتاب کی اشاعت پر مولانا شبلی مرحوم کو بڑی خوشی ہوئی تھی، اور اس پر الندوہ جلد ۵ نمبر ۳ مین ایک مفصل ریویو لکھا تھا، جس سے بہتر ریویو آج بھی کوئی اہل قلم نہیں لکھ سکتا ہے، مولنا مرحوم نے اس کتاب کی جو خصوصیات اور خوبیان بتائی ہین، ہم اس مضمون مین ان کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کرتے ہین، تاکہ ایک عدیم المثال ادیب اور مورخ کی تحریر کی روشنی مین اس کتاب کی ادبی اور تاریخی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے،

اس کتاب کی انشاپردازی کے متعلق مولانا مرحوم رقمطراز ہین :-

"فارسی زبان مین سادہ اور صاف واقعہ نگاری کا عمدہ سے عمدہ نمونہ تزک جہانگیری اور رقعاتِ عالمگیری ہین، اور اس مین شبہہ نہین کہ یہ کتابین سادگی اور لطافت کے لحاظ سے اس قابل ہین کہ ہزارون ظہوری اور وقائع نعمت خان ان پر نثار کر دی جائین لیکن انصاف یہ ہو کہ ہمایون نامہ کچھ ان سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے، اس کے چھوٹے

چھوٹے فقرے، سادہ اور بے تکلف الفاظ، روزمرہ کی عام بول چال، طرز ادا کی بے ساختگی دل کو بے اختیار کر دیتی ہے۔"

عبارت کی سادگی اور طرز ادا کے بے ساختہ پن کی مثالیں بکثرت ہیں، ہم طوالت کے خیال سے ان کو یہاں پر نقل نہیں کرتے ہیں، مولانا شبلی نے نمونے کے طور پر چند اقتباسات پیش کئے ہیں، جو مقالات شبلی جلد چہارم میں پڑھے جا سکتے ہیں، البتہ مولنا مرحوم نے جو روزمرہ کے محاورے کتاب سے چن کر جمع کئے ہیں، ان میں سے بعض ملاحظہ ہوں:

پاے می داد (ہار جاتا تھا) طرفگیہا می کرد (شوخیاں کرتا تھا) بیائید تا یکدیگرم را دریابیم (آؤ گلے لگیں) خفتن شد (سونے کا وقت آیا) سر حضرت شوم (آپ پر قربان ہوں) روستای گری (گنوار پن) وغیرہ وغیرہ، مولنا شبلی کا بیان ہے کہ اس قسم کی روزمرہ کی زبان اس عہد کی تصنیفات میں بہت کم ملے گی،

مولنا شبلی رقمطراز ہیں کہ تاریخی حیثیت سے اس کتاب کی قابل قدر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اس عہد کے تمدن، شائستگی، معاشرت اور خانگی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کر کے دکھایا گیا ہے، مثلاً وہ کسی شادی یا جلسہ کی تقریب کا حال لکھتی ہے، تو اس کی ہوبہو تصویر کھینچ دیتی ہے، عورتوں کے متعلق وہ بہت سے نئے معلومات فراہم کرتی ہے، مثلاً عورتیں لکھنے پڑھنے کے علاوہ فنون سپہگری سے بھی خوب واقف ہوتی تھیں، سفر اور سیر و شکار میں عموماً گھوڑے پر سوار ہوتی تھیں، بعض اوقات وہ مردانہ لباس بھی پہنتی تھیں، مہرانگیز بیگم (یعنی مظفر حسین مرزا بیگرہ کی بیٹی) کے بارہ میں لکھتی ہے کہ وہ مردانہ لباس میں ملبوس رہتی تھی، اور مختلف ہنر مثلاً نگیر تراشی، چوگان بازی، تیراندازی اور ساز بجانے میں ماہر تھی، ہمایوں جب ایران گیا تو اسکی ایک بہن ہمیشہ ایک گھوڑی پر سوار اسکے عقب میں چلتی تھی، خاندان کے آدمی جب ایک

جگہ مل کر بیٹھتے تھے، تو عورتیں خود بھی گانے میں شریک ہوتی تھیں، لیکن یہ احتیاط رہتی تھی، کہ اس وقت کوئی بیگانہ آدمی نہ ہو، عورتوں کا نہایت احترام کیا جاتا تھا، بابر کی بیوی ماہم بیگم کابل سے ہندوستان آئی، تو بابر دو کوس تک پیدل استقبال کو گیا، ملکی معاملات میں عورتوں سے بھی مشورے لئے جاتے تھے، اور ہر قسم کے امور میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی وغیرہ وغیرہ، مولانا شبلی مرحوم نے اس کتاب کی ایک اور تاریخی خصوصیت یہ بتائی ہے، کہ گلبدن بیگم تاریخی واقعات لکھنے میں اس بات سے بخوبی واقف ہے، کہ کس واقعہ کو سمیٹ کر اور کس واقعہ کو پھیلا کر لکھنا چاہیئے وہ خوب جانتی ہے کہ کون سا واقعہ کیا اثر رکھتا ہے، اور اس لئے اس کے اسباب و علل سے کہاں تک بحث کرنی چاہیئے،

ریاض الشعراء (قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی) اور مخزن الغرائب (قلمی نسخہ دارالمصنفین) میں گلبدن بیگم کا نام بھی شعرا کی فہرست میں درج ہے، لیکن دونوں تذکروں میں اس کا صرف مندرجۂ ذیل ایک شعر منقول ہے، مسز بیورج نے اسی شعر کو ہمایون نامہ کے دیباچہ میں میر مہدی شیرازی کے تذکرۃ الخواتین سے نقل کیا ہے،

ہر پری رُوے کہ او با عاشقِ خود یار نیست   تو یقین میدان کہ ہیچ از عمر برخوردار نیست

گلرخ بیگم بابر کی ایک دوسری لڑکی گلرخ بیگم صالحہ سلطان بیگم کے بطن سے تھی، وہ بھی شعر و شاعری سے ذوق رکھتی تھی، اور اشعار موزون کرتی تھی، صبحِ گلشن مؤلفہ نواب علی حسن خان مرحوم میں اسکی شاعری کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :-

"بہ گلرخی و شگفتہ روئی و سلیقہ شاعری سر آمد زمرۂ نسوان غنچۂ دہانش بہ نسیم اشعار لطیف می شگفت"

ریاض الشعراء، مخزن الغرائب اور صبحِ گلشن میں اسکی طرف یہ شعر منسوب ہے :-

ہیچگہ آن سرو گل رخسار بے اغیار نیست راست بودہ است آنکہ در عالم گلِ بے خار نیست

سلیمہ سلطان بیگم | یہ بابر کی نواسی اور گلرخ بیگم کی بیٹی تھی، پہلے خانخانان بیرم خان سے بیاہی گئی، اوس کے انتقال کے بعد اکبر کے حبالۂ عقد مین آئی، سیاسی واقعات مین اس کا نام نمایان اُس وقت ہوا، جب شہزادہ سلیم نے اکبر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، سلیمہ سلطانہ ہی کی مساعیِ جمیلہ سے اکبر اور سلیم مین مصالحت ہوئی، اس سلسلہ مین اکبر نامہ منتخب التواریخ اور لب التواریخ مین اس کا ذکر بار بار آتا ہے، جہانگیر اس کی علمی قابلیت کا معترف ہے اس کے انتقال پر تزک جہانگیری (ص۱۲۴ نولکشور پریس) مین لکھا ہی:

"بہ جمیع صفاتِ حسنہ آراستگی داشتند، در زنان این مقدار ہنر و قابلیت کم جمع می شود"

اسکو شعر و شاعری سے بھی زیادہ مناسبت تھی آئین اکبری (بلاخ من ص۳) اور ماثر الامرا (جلد اول ص۳) مین ہی کہ اس کا تخلص مخفی تھا، لیکن مخزن الغرائب کے مؤلف کا بیان ہے کہ اُس کا تخلص مخلص تھا، تذکرون مین صرف اس کا حسبِ ذیل ایک شعر نقل کیا گیا ہی،

کاکلت را من زمستی رشتۂ جان گفتہ ام مست بودم زین سبب حرفِ پریشان گفتہ ام

مخزن الغرائب (ورق ۲۶۰) مین فیضی کے مرثیہ پر حسب ذیل رباعی درج ہے، جو ایک خاتون کاملہ بیگم کے ذکر مین نقل کی گئی ہے، کاملہ بیگم کے حال مین کسی قسم کا کوئی تعارف نہین مگر تذکرہ نگار نے رباعی سے پہلے یہ بھی تحریر کیا ہی کہ بعض نسخون مین رباعی سلیمہ بیگم کی طرف بھی منسوب ہے،

فیضی مخور این غم کہ دلت تنگی کرد بابائے امید عمر لنگی کرد،
نیخو است کہ مرغ روح بندیُرخ دوست زین واسطہ از قفس شتابنگی کرد

مورخین سلیمہ بی بی کی کتب بینی کے شوق کے بھی معترف ہیں، اسی شوق کی تکمیل کے لئے اس کے پاس ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا،

ماہم بیگم | یہ بیگم دودمان تیموری کی چشم و چراغ تو نہ تھی، لیکن ہندوستان کے سب سے بڑے تیموری بادشاہ یعنی اکبر بادشاہ کی مرضعہ تھی، اس لئے اس کا ذکر اس سلسلہ میں بیجا نہ ہوگا، ماہم بیگم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھی، اسی لئے علم و فضل کی ترویج کی خاطر اس نے دہلی میں ایک اعلیٰ پیمانہ کا مدرسہ خیر المنازل کے نام سے قائم کیا، سر سید احمد خان نے آثار الصنادید میں اس مدرسہ کا ذکر کیا ہے، یہ مدرسہ پرانے قلعہ کے پاس واقع تھا، اسکی عمارت اب منہدم ہو گئی ہے، اس پر جو کتبہ منقوش تھا اس کو سر سید احمد خان نے اپنی کتاب (باب اول ص، ۴) میں نقل کیا ہے، اور وہ یہ ہے،

بدوران جلال الدین محمد | کہ باشد اکبر شاہان عادل
چو ماہم بیگم عصمت پناہی | بنا کرد این بنا بہر افاضل
دلے شد ساعی این بقعہ خیر | شہاب الدین احمد خان باذل
زہے خیریت این خیر منازل | کہ شد تاریخ او "خیر المنازل"

اس مدرسہ کے ساتھ طلبہ کے لئے ایک بہت ہی حسین مسجد بھی تھی، ایک انگریز ماہر آثار قدیمہ نے اس مسجد کو دیکھکر اس کا تحسین آمیز نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے

"مسجد پانی سے گھسے ہوئے نوکدار پتھروں کی بنی ہوئی ہے، جہاں نقش و نگار ہیں، وہاں سرخ پتھر اور گرانیٹ لگائے گئے ہیں، پھاٹک گو اب مسمار ہو چکا ہے، لیکن بہت ہی خوبصورت ہے، مسجد کا اندرونی حصہ رنگین پلاسٹر اور چمکدار اینٹوں سے مزین ہے، عمارت کا رخ اور پھاٹک رنگین تمغوں اور ترشے ہوئے پتھر کے پھولوں سے منقش ہیں ان میں رنگ نیلے، زرد، سرخ، ارغوانی، سپید، سبز اور سیاہ استعمال کئے گئے ہیں،

اس مسجد میں صرف ایک گنبد ہے، جس کی گردن نیچی ہے، اس کا کنگرہ بہت ہی عجیب و غریب ہے، جو مسجد قلعۂ کونہ کے کنگرے سے مشابہ ہے، مسجد کی دیواریں عمودی ہیں، لیکن مینارے ڈھلوان ہیں، موتی مسجد کی طرح چھجے سامنے نکلے ہوئے ہیں، اس مسجد میں حجرے ہیں جو اور مسجدوں میں نہیں دیکھے گئے، (ارکیالوجی آف دلی، مولفہ سی اسٹیفن بحوالہ پرومونٹن آف محمڈن لرننگ مرتبہ این این لا، ص ۱۶۶)

یہ مسجد جس فیاضی اور فراخدلی سے طلبہ کے لئے بنائی گئی تھی، وہ ماہم بیگم کی تعلیمی دلچسپی کی بڑی دلیل ہے،

نورجہان بیگم نورجہان بیگم بھی نسلاً تیموری نہ تھی، لیکن ایک تیموری حکمران کی بیوی بن کر شاہی حرم اور حکومت کے لئے باعث رونق و زینت بنی، اس لئے یہ مضمون تشنہ رہے گا، اگر اس کا ذکر ان صفحوں پر نہ کیا جائیگا،

نورجہان نے شاہی محل میں داخل ہوتے ہی اپنے جمالیاتی ذوق سے حرم کی عورتوں کا سارا مذاق ہی بدل دیا، پہننے اوڑھنے، بناؤ سنگار، فرش فروش اور زیور و آرائش کی چیزوں میں اتنی جدتیں پیدا کیں، کہ سارے ملک میں یہی رنگ غالب آگیا، اس حسن مذاق کے ساتھ قدرت نے نورجہان کو علم و ادب کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا، ایک علم پرور باپ کی بیٹی اور ایک اعلیٰ ادیب و انشاپرداز اور شاعر کی بیوی تھی، اس لیے باپ کی وراثت اور شوہر کی رفاقت سے اسکی علمی صلاحیت اور لیاقت کو اتنی جلا ہوئی کہ اب تک اسکی استعداد علمی اور سخن سنجی کی داد دی جاتی ہے، مراۃ الخیال کے مؤلف کا بیان ہے:-

"در بذلہ سنجی و سخن گوئی و شعر فہمی و حاضر جوابی از نساے زمان ممتاز بود" (ص ۱۲۵)

ید بیضا مؤلفہ آزاد بلگرامی (قلمی نسخہ دارالمصنفین) میں ہے:-

"در وادی شعر بسیار خوش سلیقہ است"[۱]

اسکی تصدیق منتخب اللباب اور مآثر الامراء سے بھی ہوتی ہے، نورجہان کی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی کے لطیفے آج کل کی علمی مجلسون مین مشہور ہین، مگر پھر بھی اس مضمون مین ان کا اعادہ شاید دلچسپی اور تفریح سے خالی نہ ہوگا،

ایک روز جہانگیر نے لباس تبدیل کیا جس کا تکمہ "لعل بے بہا" کا تھا، نورجہان نے اسکو دیکھتے ہی فوراً یہ شعر پڑھا:-

ترانہ تکمۂ لعل است بر قبائے حریر شدہ است قطرۂ خون منتِ گریبان گیر

ایک موقع پر جہانگیر نے عید کا چاند دیکھ کر یہ مصرع موزون کیا،

ہلالِ عید براوجِ فلک ہویدا شد

نورجہان نے فی البدیہہ دوسرا مصرع پڑھا،

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

مفتاح التواریخ (مؤلفہ سر طامس ولیم بیل) مین نورجہان کی بدیہہ گوئی کی کچھ اور مثالین منقول ہین، ایک مرتبہ جہانگیر نورجہان سے کئی روز کے بعد ملا، ملنے کی خوشی مین نورجہان کی آنکھون سے آنسو روان ہوگئے، جہانگیر نے اس کیفیت کو دیکھکر یہ مصرع پڑھا،

گوہر ز اشک چشم تو غلطیدہ می رود

نورجہان نے فوراً دوسرا مصرع فی البدیہہ کہا،

آبے کہ بے تو خوردہ ام از دیدہ می رود

ماہ محرم ۱۰۲۰ھ مین ایک دم دار ستارہ نظر آیا، نورجہان نے اوس کو دیکھکر یہ شعر موزون کیا:-

---

[۱] تذکرۂ سرخوش، قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال و خافی خان جلد اول ص ۲۷۰، و مراۃ الخیال ص ۱۲۹،

ستارہ نیست بدین طول سر برآوردہ فلک بشاطری شہ کمر برآوردہ

ملک الشعرا طالب آملی ایک بار شاہی عتاب میں پڑکر محبوس ہوگیا، حالتِ حبس میں نورجہان کے پاس یہ شعر لکھ کر بھیجا،

ز شرم آب شدم آب را شکستے نیست بحیر تم کہ مرا آبروے از چہ شکست

نورجہان نے فوراً یہ لکھکر جواب دیا، "یخ بست و بشکست"[1]

مآثرالامرا کے مؤلف کا بیان ہے کہ نورجہان کا تخلص مخفی تھا،[2] مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ تیموری شہزادیوں میں جس کسی نے شعر و شاعری میں طبع آزمائی کی، اسکی طرف یہی تخلص منسوب کیا گیا، مرآۃ الخیال[3] منتخب اللباب[4] اور مآثرالامرا[5] کے مؤلفین نے نورجہان کے یہ اشعار اپنی کتابوں میں نقل کئے ہیں

دل بصورت ندہم تا نشد سیرت معلوم بندۂ عشقم و ہفتاد و دو ملت معلوم

زاہدا ہولِ قیامت مفگن در دلِ ما ہولِ ہجران گذرانیدیم قیامت معلوم

مفتاح التواریخ میں یہ دو رباعیاں بھی نورجہان کی طرف منسوب ہیں،

کشادِ غنچہ اگر از نسیم گلزار ہست کلید قفلِ دلِ ما تبسمِ یار ہست

نہ گل شناسد و نہ رنگ و بو نہ عارض و زلف دل کسے کہ بحسن دادہ گرفتار ہست

دیگر

چو بر دارم ز رخ برقعہ ز گل فریاد برخیزد زنم بر زلف اگر شانہ ز سنبل داد برخیزد

باین حسن و کمالاتے چو در گلشن گذر سازم ز جانِ بلبلان شور مبارکباد برخیزد[6]

---

[1] یہ تمام روایتیں میری نظر سے مفتاح التواریخ (ص ۲۴۱) کے علاوہ کسی اور تاریخ اور تذکرے میں نہیں گذریں [2] مآثرالامرا، جلد اول ص ۱۳۲ [3] مرآۃ الخیال ص ۲۲۵ [4] منتخب اللباب از خافی خان جلد اول ص ۲۷۰ [5] مآثرالامرا، جلد اول ص ۱۳۴ [6] یہ رباعیاں کسی اور تذکرہ میں میری

نورجہاں شعراء کی بھی سرپرست تھی، مراۃ الخیال کے مؤلف کا بیان ہے کہ "دانش آموز سخن دان نواب قاسم خان" شاعر کی حیثیت سے نورجہاں ہی کی سرپرستی اور قدردانی سے ممتاز ہوا، نواب قاسم خان نورجہاں کی حقیقی بہن منیجہ بیگم کا شوہر تھا، نورجہاں کی وساطت سے جس طرح قاسم خان کو شعر و شاعری میں فروغ حاصل ہوا، اس کا حال مؤلف تذکرۂ مراۃ الخیال اس طرح لکھتا ہے، (ص ۱۲۹)

" نورجہان بیگم را قاسم خان مناظرہ و مشاعرہ بسیار دست می داد، او در فن شعر مسلم نمی داشت تا آنکہ طرح غزلے تازہ درمیان آمد و شعرائے پایۂ تخت ازان در ماند و قاسم خان این سہ بیت نوشتہ نزد بیگم فرستاد، و ازان ہنگام زور طبعش در سخنوری قبول نمود ابیات این است:

گر شوی سایہ نشین روئے بخت باغبان　　　سایہ بر خورشید اندازد درخت باغبان
فاختہ چون دید بے گل باغ را نالید و گفت　　　از چہ رو با گل نرفت این جان سخت باغبان
جشن نوروز است و فراش بہار از فیض طبع　　　طرح کرد از سبزہ و گل تاج و تخت باغبان

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۶) نظر سے نہیں گذرین تعجب ہے کہ مفتاح التواریخ میں مندرجۂ ذیل شعر نورجہاں ہی کا بتایا گیا ہے،

نورجہان گرچہ بصورت زن است　　　در صف مردان زن شیر افگن است

ید بیضا (قلمی نسخہ دار المصنفین) میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے نورجہاں کی بدیہہ گوئی کی ایک مثال میں یہ شعر بھی نقل کیا ہے،

بقتل من اگر شاہا دلت خوشنود می گردد
بجاں منت دے تیغ تو خون آلود می گردد

اسی کے ساتھ ایک غیر سنجیدہ روایت بھی منقول ہے،

نورجہان نے ے کلال کو جس طریقہ سے شاہی دربار مین روشناس کرایا، اسس کا ذکر "جہانگیر کے علمی ذوق" مین کیا جاچکا ہی، نورجہان کی مصاحبت مین بعض ایسی عورتین بھی تھین جو شاعری مین کافی دسترس رکھتی تھین، ان ہی مین ایک مہری ہروی تھی جس کے بارے مین مراۃ الخیال کا مولف لکھتا ہی:

"مسماۃ مہری ہروی خورشید طلعتی بود کہ کرشمۂ جمالش عروسان بہشت را جلوہ گری آموختے وازتاب عذارش آفتاب عالمتاب درآتش غیرت سوختے، بااین ہمہ حسن ورعنائی بالماس فکر بکر دُرہاے مضامین آبدار سفتے وسخن رابسیار نازک گفتے"

مراۃ الخیال مین مہری ہروی کا ایک دلچسپ لطیفہ درج ہے، نورجہان مہری ہروی کے ساتھ محل کے بالانشین پر بیٹھی تھی، کہ مہری ہروی کا شوہر خواجہ حکیم نیچے نظر آیا، نورجہان نے ہروی کو اسکے شوہر کو اوپر بلالینے کا حکم دیا حکم پاکر خواجہ حکیم نے اضطراب اور عجلت مین حاضر ہونے کی کوشش کی، مگر گھبراہٹ مین اس کے پاؤن لڑکھڑائے، اس اضطراب، عجلت اور گھبراہٹ کی حرکتون کو دیکھکر نورجہان نے مہری ہروی کو ان کیفیات پر اشعار موزون کرنے کی فرمایش کی، مہری ہروی نے خواجہ حکیم کو مخاطب کرکے کہا :-

مرا با تو سر یاری نماندہ سر مہر و وفاداری نماندہ

ترا از ضعف پیری قوت زور چنانکہ پای برداری نماندہ

نورجہان ہنس پڑی، اور مہری کو اس صلہ مین نقد وجنس کی صورت مین انعام دیا،[۱]

---

[۱] مراۃ الخیال ص ۱۳۲ ۵ مہری کی ایک غزل ملاحظہ ہو،

حل ہر نکتہ کہ بر پیر خرد مشکل بود از مو دیم بیک قطرۂ مے حاصل بود

گفتم از مدرسہ پرسم سبب حرمت مے در ہر کس کہ زدم بیخود ولایعقل بود

ممتاز محل شاہجہان کی محبوب بیوی ارجمند بانو بیگم الملقب بہ ممتاز محل بھی زیورِ علم و فضل سے آراستہ تھی، اور وہ نہ صرف سخن فہم، بلکہ سخن سنج بھی تھی، اس کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے، کہ ایک بار شاہجہان جمنا کے کنارے بیٹھکر دریا کے مناظر دیکھ رہا تھا، کہ اوسکی موجون کی طرف اشارہ کرکے ممتاز محل سے کہا،

آب از برائے دیدنت می آید از فرسنگہا

ممتاز محل نے اوس کا دوسرا مصرع فوراً موزون کیا،

از ہیبتِ شاہجہان سرمی زند بر سنگہا[1]

جہان آرا بیگم شاہجہان اور ممتاز محل کی بیٹی تھی، جو سیاسی واقعات کے لئے بھی اپنے عہد مین بہت نمایان رہی، ممتاز محل کی گود اور نور جہان کی صحبت اور شاہجہانی عہد کی اعلیٰ علمی فضامین رہکر علم و فضل کے لحاظ سے بھی مشہور ہوئی، بچپن مین تعلیم ستی النساء خانم سے حاصل کی جو ملک الشعراء طالب آملی کی بہن اور حکیم رکنا کاشی کے بھائی کی بیوی تھی، یہ خاتون حافظہ تھی اور اپنی زباندانی ادب شناسی اور علم قرأت و تجوید مین امتیازی حیثیت رکھتی تھی، ممتاز محل اور شاہجہان دونون اس کے قدردان تھے، ممتاز محل کی مہردار تھی، اور اس کے انتقال کے بعد محل کی "صدارت" اسی کو سپرد ہوئی، اسکی وفات کے بعد شاہجہان نے تیس ہزار روپیے خرچ

(بقیہ حاشیہ ۳۴۸) خواستم سوز دل خویش بگویم باشمع | داشت او خود بزبان آنچہ مراد دل بود

درچمن صبحدم از گریہ و زاری من | لالہ سوختہ خون در دل و پا در گل بود

آنچہ از بابل و ہاروت روایت کردند | سحر چشم تو بدیدم ہمہ را شامل بود

دولتے بود تماشای رخت مہری را | حیف و صد حیف کہ این دولت مستعجل بود

[1] یہ روایت بعض اردو کی کتابون مین منقول ہی مگر فارسی تذکرون اور تاریخون مین میری نظر سے نہین گذری،

کر کے اس کا مقبرہ بنوایا، جو روضۂ تاج گنج میں ہے، جہان آرا بیگم نے اسی خاتون کے زیر تعلیم رہکر قرأت اور تجوید سیکھا[۱۵] اور یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے، کہ جہان آرا بیگم نے اعلیٰ قسم کی تعلیم پائی، کیونکہ وہ مصنف بھی ہوئی اور شاعر بھی، جب وہ صرف چھبیس سال کی تھی تو اوس نے ۱۰۴۹ھ میں مونس الارواح لکھی جس میں حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے سلسلہ کے اکابر خلفاً مثلاً شیخ حمید الدین ناگوریؒ حضرت قطب الدین کاکیؒ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ حضرت نظام الدین اولیا اور حضرت چراغ دہلویؒ کے بہت ہی عقیدتمندانہ احوال مندرج ہیں جس سے اوس کے مذہبی اور صوفیانہ ذوق کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے، اس کتاب کی تالیف میں اوس نے بڑی احتیاط کی ہے، چنانچہ ایک جگہ وہ رقمطراز ہے،

"احوالِ این بزرگانرا کہ مقربان درگاہ صمدیت اند از کتب و رسائل معتبرہ با حتیاط تمام بیرون آوردہ بقید تحریر آوردہ شد، واعتقاد این ضعیفہ انچہ درین رسالہ ثبت گردید صحتِ تمام دارد، امید کہ خوانندگانرا فیض و بہرۂ تمام ازان حاصل آید"

اس احتیاط کے علاوہ کتاب کی دو اور خصوصیات ہیں، ایک تو یہ کہ یہ بہت ہی ادب اور احترام کے ساتھ لکھی گئی ہے، حضرت معین الدین اجمیریؒ کے ذکر کی ابتدا ان اشعار کے ساتھ کرتی ہے

آن شہنشاہ جہانِ معرفت — ذاتِ او بیرون زادراک و صفت
خسرو ملکِ فنا بے تخت و تاج — از خود و از غیر خود بے احتیاج
غرقِ بحرِ عشق از صدق و صفا — از خودی بیگانہ با حق آشنا
کرد مرغِ ہمتش زا وجِ کمال — بیضۂ افلاک را در زیر بال
اخترِ برجِ سپہرِ لم یزل — گوہرِ درجِ کمالِ بے بدل

---

[۱۵] مآثر الکرام جلد دوم ص ۹۲-۱۹۱،

آن معین دین و ملت بے نظیر فارغ از دنیا بملک دین امیر

در ثنای او زبانم را چہ حد فیض او باید کہ فہم ماید مدد

وہ جب حضرت معین الدین چشتیؒ کے مزار مبارک کی زیارت کے لئے گئی، تو وہاں کے جن تاثرات کو قلمبند کیا ہے، ان سے بھی اس کی والہانہ عقیدتمندی اور اخلاص کا اظہار ہوتا ہے،

"می گوید نقیرۂ حقیرہ جہان آرای کہ چون از یاوری بخت و فیروزی طالع از دار الخلافہ اکبرآباد در خدمت والد بزرگوار خود متوجہ خطۂ پاک حضرت اجمیر بے نظیر شدم از تاریخ ہژدہم ماہ شعبان المعظم سنہ یکہزار و پنجاہ و سنہ ہجری تا تاریخ جمعہ ہفتم ماہ رمضان المبارک کہ داخل عمارات کنار تال انا ساگر گشتم، موفق شدم باین معنی کہ ہر روز و ہر منزل دو رکعت نماز نافلہ ادا می کردم و یکبار سورہ یٰسین با فاتحہ از کمال اخلاص و عقیدتمندی خواندہ و ثواب آنرا بروح پر فتوح مطہر منور حضرت پیر دستگیر خواجہ معین الحق والدین رضی اللہ عنہ نثار می نمودم و چند روز کہ در عمارات مذکورہ توقف واقع شد، از نہایت ادب شبہا بر پلنگ نخوابیدم و بطرف روضۂ متبرکہ حضرت پیر دستگیر پا دراز نساختم، بلکہ پشت بآنجانب نکردم و روزہا در زیر درختان می گذرانیدم .... و در مسجد سنگ مرمر کہ پدر بزرگوار حق شناس این حقیرہ راست کردہ اند، رفتہ نماز ادا کردہ و باز در گنبد مبارک نشستہ سورۂ یٰسین و فاتحہ بروح پر فتوح خواندم تا وقت نماز مغرب و در آنجا بودم و شمع بارواح آنحضرت روشن کردہ، روزہ باب جالرہ افطار کردم عجب شامی دیدم آنجا کہ بہتر از صبح بود، اگرچہ اخلاص و محبت این فانیان تقاضائے آن می کرد کہ باین قسم جای متبرک پرفیض گوشۂ عافیت رفتہ باز بخانہ بیایذ اما چہ چارہ ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اگر اختیار میداشتم ہمیشہ در روضۂ حضرت کہ عجب گوشۂ عافیت است دمن عاشق گوشۂ عافیت

ہستم بسر می بردم وبہ سعادت طواف نیز مشرف می شدم ناچار بچشم گریان ودل بریان بصد

ہزار افسوس ازان درگاہ رخصت شدہ بخانہ آمدم وتمام شب طرفہ بے قراری درمن بود"

مونس الارواح کا سنہ تالیف ۱۰۴۹ھ ہے، لیکن یہ عبارت ۱۰۵۳ھ مین بطور ضمیمہ لکھی گئی،

جو دار المصنفین کے قلمی نسخہ مرقومہ ۱۰۶۸ھ مین ہی،

اس کتاب کی دوسری خصوصیت اس کا طرز انشا رہے، مولنا شبلی مرحوم نے اسکی عبارت کو نہایت "صاف اور شستہ" بتایا ہے،[1] جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے بھی معلوم ہوگا،

مونس الارواح کا نسخہ چھپ گیا ہے، مگر اس کا ایک بہت ہی خوشخط نسخہ دار المصنفین مین ہی، یہ نسخہ جہان آرا نے دربار کے مشہور خوشنویس عاقل خان سے وصلیون پر لکھوایا تھا، اور تمام کتاب کو طلائی نقش ونگار اور زرین افشان سے مزین کرایا تھا، اس پر سنہ کتابت ۱۰۶۸ھ مرقوم ہی یعنی تصنیف کے اونیس سال کے بعد اور جہان آرا کی عمر کے ۴۴ وین سال مین یہ نسخہ لکھوایا گیا، جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے، کہ کتاب مین جن بزرگون کے حالات ہین، اُن سے جہان آرا کی عقیدت و ارادت سن کہولت مین بھی بدستور قائم تھی، اس قلمی نسخہ کا سائز ۱۰ × ۲ ہے، ہر صفحہ مین گیارہ سطرین ہین، اور کل صفحات کی تعداد ۱۴۴ ہے، مولنا شبلی مرحوم نے اوس کو ایک بڑی رقم مین خریدا تھا، اور اپنی قلمی کتابون کے ذخیرہ مین اوس کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے، (الندوہ، اپریل ۱۹۱۱ء) یہ کتاب خطاطی کے اعلیٰ نمونہ کے طور پر لندن کی نمایش منعقدہ مئی ۱۹۱۱ء مین بھی بھیجی گئی تھی،"

جہان آرا کے علمی مشاغل مین زیادہ تر صوفیاے کرام کے حالات کا مطالعہ ہی رہا کرتا تھا، مونس الارواح مین ایک جگہ لکھتی ہی،

---

[1] الندوہ اپریل ۱۹۱۱ء

این ضعیفہ راجیہ بعد از ادائے فرض و واجبات و تلاوتِ قرآن مجید ہیچ امرے شریف تر از ذکر حالات و مقامات اولیائے کرام قدس اللہ ارواحہم نمی داند، بنا بران خلاصۂ اوقات خود بمطالعۂ کتب و رسائلے کہ مشتمل بر احوالِ سعادت مآل بزرگانِ دین و اکابر صاحب یقین ست صرف می نماید"۔[۱]

جہان آرا شاعر بھی تھی، مونس الارواح مین جا بجا اس کے اشعار درج ہین، نمونہ کے طور پر حمد کے اشعار ملاحظہ ہون،

آنجا کہ کمال کبریاے تو بود
عالم نمے از بحر عطاے تو بود

مارا چہ حدِ حمد و ثناے تو بود
ہم حمد و ثناے تو سزاے تو بود

(دیگر)

اے بوصفت بیان ما ہمہ ہیچ
ہمہ آن تو آن ما ہمہ ہیچ

---

[۱] جہان آرا بیگم کے ایک سوانح نگار نے اسکی تالیفات مین ایک سیاحت نامہ اور ایک مثنوی بھی بتائی ہی، مگر میری نظر سے ان دونون کتابون کے نام کسی مستند تذکرہ اور تاریخ مین نہین گذرے، ۱۹۳۱ء مین لندن سے ایک انگریزی کتاب ایک انگریز خاتون Andrea Butenschon نے The life of a Mogul princess Jahan Ara Begum کے نام سے شائع کی ہی خاتون مذکور نے اس کتاب کے دیباچہ مین لکھا ہی کہ وہ آگرے کے قلعہ کو دیکھنے مین معروف تھی، کہ ثمن برج کے ایک شکستہ پتھر کے نیچے کچھ مسودے ملے، مسودے کو پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ جہان آرا کی خود نوشتہ تحریرین ہین جن کو اوس نے شاہجہان کے حبس کے بعد قلمبند کیا تھا، وہ بھی شاہجہان کے ساتھ قید تھی، اس لئے قید ہی کے زمانہ مین اوس نے اپنی پچھلی زندگی کے واقعات لکھنے شروع کئے، اور انکو ثمن برج کے ایک پتھر کے نیچے یہ لکھکر چھپا دیا کہ ثمن برج کا پتھر جب خستہ ہو جائے گا، تو یہ تحریر لوگون کے ہاتھ آئیگی جس سے اسکے اصلی خیالات، جذبات اور حالات روشن ہونگے، تحریرین رومانی اور تمثیلی رنگ بہت غالب ہی اور اسلوب بیان بہت ہی دلکش اور موثر ہی

ہر چہ بیند خیال ما ہمہ ہیچ   ہر چہ گوید زبانِ ما ہمہ ہیچ
ما بکنہ حقیقتِ نرسیم   اے یقین و گمان ما ہمہ ہیچ

جہان آرا بیگم کے اردو سوانح نگار منشی سیل چند مصنف تاریخ آگرہ کے حوالہ سے اس کا ایک مرثیہ بھی نقل کرتے ہیں، جو اس نے اپنے باپ کی وفات کے موقع پر کہا تھا، اس کے تین اشعار یہ ہیں:

اے آفتاب من کہ شدی غائب از نظر   آیا شبِ فراق ترا ہم بود سحر؟
اے بادشاہ عالم و وے قبلۂ جہان   بکشا ے چشم رحمت و برحال من نگر
نالم چنین زغصہ و بادم بود بدست   سوزم چو شمع در غم و دودم رود زسر

جہان آرا بیگم کے ذوق شعری اور اس سلسلہ میں اس کے جود وسخا کی متعدد روایتیں تذکرون

(بقیہ حاشیہ ۳۵۳) چنانچہ اس تحریر کا انگریزی ترجمہ دیدہ زیب لکھائی چھپائی کے ساتھ لندن سے ۱۹۳۱ئہ میں شائع کر دیا گیا ہے، ہم نے اس کتاب کو شروع سے آخر تک بہت ہی غور سے پڑھا، اور اس کو سراسر جعلی اور نقلی پایا، یہ محض ایک نئے اور دلنشین انداز میں جہان آرا بیگم کے اخلاق اور کیرکٹر کو مسخ کرکے دکھانے اور اورنگ زیب کی ذات سے نفرت پیدا کرنے کی کوشش میں لکھی گئی ہے، اس کتاب میں بعض لغو اور لاطائل واقعات ایسے ہیں، جن کی تردید کرنا محض تضیعِ اوقات ہے، مثلاً جہان آرا بیگم راجپوتون کی بہت ہی مداح ہے، وہ ایک راجپوت سردار پر عاشق ہو گئی ہے، وہ شادی اس لئے نہین کر سکتی ہے کہ اکبر نے یہ قانون بنا رکھا تھا، کہ مغل بادشاہون کی لڑکیان رشتہ ازدواج سے محروم رہین، چنانچہ جہان آرا چھپ چھپ کر اپنے محبوب راجپوت سے ملتی ہے، عشق و محبت کی باتین کرتی ہے، اور اپنی یاد تازہ رکھنے کے لئے اسکو کئی تحفے دیتی ہے، جب دارا اور اورنگ زیب میں خانہ جنگی شروع ہوتی ہے، تو جہان آرا کی محبت اور عشق مین راجپوت سردار دارا کی حمایت میں اورنگ زیب کے خلاف لڑتا ہے، جنگ میں راجپوت جہان آرا کے ایک دوسرے عاشق کے ہاتھون

مین پائی جاتی ہین، کلمات الشعرا (سرخوش) ریاض الشعرا اور خزانۂ عامرہ مین ہے کہ جہان آرا بیگم ایک دفعہ باغ کی سیر کو ہاتھی پر برقعہ ڈالے نکلی، میر صیدی طہرانی چھپ کر تماشا دیکھنے لگا، جب ہاتھی اس کے پاس سے گذرا تو اس نے بے ساختہ یہ مطلع پڑھا،

برقع برُخ افگندہ برد ناز بباغش تا نکہتِ گل بیختہ آید بہ دماغش

جہان آرا نے حکم دیا کہ شاعر کو کشان کشان سامنے لائین، وہ آیا تو اس سے بار بار مطلع پڑھوا کر سُنا اور پانچہزار روپیے دلوائے لیکن ساتھ ہی حکم دیا کہ اس کو شہر سے نکال دیا جائے کیونکہ جہان آرا بیگم کو شعر تو پسند آیا لیکن گستاخی پسند نہ آئی، مولانا شبلی مرحوم اپنے مقالہ "زیب النسا" مین اس روایت کو نقل کرکے رقمطراز ہین کہ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ بیگمات کے لئے کس قسم کے آداب مقرر تھے،

کلمات الشعرا، (قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی) مین جہان آرا بیگم کی علمی فیاضی کی ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۴) سے مارا جاتا ہے، مگر اس کا ایک ہار کسی طرح سے جہان آرا کو مل جاتا ہے، جس کو وہ ایک قیمتی یادگار سمجھ کر اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے، اس کتاب مین اسی قسم کی اور بھی خرافات ہین، سب سے مضحکہ خیز بات تو یہ ہے کہ جہان آرا بیگم کا لباس ساری دکھایا گیا ہے، اور وہ ہندو دیوتاؤن سے مثلاً شیوجی اور وشنو وغیرہ سے بڑی عقیدت رکھتی ہے، اسیطرح کی اور بہت سی باتین ہین، جو محض اورنگزیب اور ہندوستان کی مسلمان بادشاہو کی گذشتہ تاریخ کو بدنام کرنیکی غرض سے لکھی گئی ہین، برنیئر منوکی اور اسمتھ وغیرہ جیسے متعصب یوروپین مورخین نے جہان آرا بیگم کی ذات کے ساتھ بہت ہی نازیبا حکایتین منسوب کر دی تھین، لیکن سنجیدہ مورخون نے حقائق کی روشنی مین ان کی تردید کر دی ہے، اب ایک اچھوتے انداز مین پھر اس شہزادی کی ذات پر ناروا حملے کئے گئے ہین، مگر یورپین مورخون کی ہرزہ سرائی اور دشنام طرازی اس قدر عام ہو گئی ہے، کہ ان کی طرف توجہ کرنے کی بھی ضرورت نہین،

اورمثال درج ہے، مرزا حسن بیگ قزوینی نے جوشاہجہانی دربار کا ایک معزز منصبدار اور وہ شاعر تھا، شاہجہان آباد پر ایک مثنوی لکھی، اس شہر کے باغ حیات بخش کی تعریف مین جو اشعار کہے وُجہان آرا کو پسند آئے، اس کے صلہ مین اسنے پانچ سو روپیہ انعام اس کے پاس بھجوائے،

ید بیضا (قلمی نسخہ دارالمصنفین) مولانا غلام علی آزاد لکھتے ہین کہ مرزا محمد علی ماہر نے جہان آرا کی مدح مین ایک مثنوی لکھکر اسکی خدمت مین پیش کی، مثنوی کے اس شعر پر جہان آرا نے اسکو پانچسو روپیہ انعام دیئے،

بذات تو صفات کردگار است کہ خود پنہان و فیضش آشکار است

مگر مولانا غلام علی آزاد اس روایت کو سرو آزاد (ص۱۱۴) مین نقل کرکے لکھتے ہین، کہ شعر ان کی نظر سے نعمت خان عالی کی اُس مثنوی مین بھی گذرا جو اس نے زیب النسا، کے خرگاہ پر لکھی تھی، تذکرۂ مخزن الغرائب (قلمی نسخہ دارالمصنفین) مین ہے کہ مرزا محمد علی ماہر نے نو سو اشعار کی ایک مثنوی زیب النسار کی شان مین لکھی جس مین مذکورہ بالا شعر زیب النسا، کو بے حد پسند آیا، واللہ اعلم بالصواب ؛

جہان آرا کی علم پروری اور اسکے ساتھ مذہبیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آگرہ کی جامع مسجد اسی کی بنوائی ہوئی ہے، اوس نے مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا، جو بہت دنون تک نہایت کامیابی کیساتھ چلتا رہا،

جہان آرا بیگم نے مرنے کے بعد بھی خواجگان چشتیہ سے اپنی عقیدت قائم رکھی یعنی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رکے مزار پر انوار کے ٹھیک پائین مین اپنی خواہش کے مطابق دفن ہوئی، اسکی پرہیز گاری نیکی انکساری اور ذوق شعری اسکے حسب ذیل شعر سے بھی ظاہر ہے، جو اسکی معمولی اور سادہ قبر پر مکتوب ہے،

اس مزار کا کٹہرہ تو سنگ مرمر کا ہے لیکن تعویذ بالکل خام ہے جو ہمیشہ سبزہ سے ڈھکا رہتا ہے،

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا کہ قبر پوش غریبان ہمین گیاہ بس است

بیدل اور تذکرۂ خوش گو

از

جناب قاضی عبدالودود بیرسٹر پٹنہ

اس مضمون کے دو حصے ہین، پہلے حصہ مین خوشگو نے سفینۂ خوش گو مین بیدل کے متعلق جو کچھ لکھا ہی بجنسہٖ نقل کر دیا گیا ہی، دوسرے حصہ مین اس پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، اور خوشگو کے ماخذون کا سراغ لگانے کی کوشش کی گئی ہے، اس غرض سے مین نے بیدل کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہی، اور ہم عصر اور قریب العصر مصنفون نے بیدل کے متعلق جو کچھ لکھا ہی، اس کے معتد بہ حصہ کو پیش نظر رکھا ہی،

بندرابن،[1] خوش گو بندرابن کا رہنے والا تھا، (تکملۃ الشعراء مصنفہ شوق نسخۂ رام پور) لیکن اس کا ذہنی وطن دہلی تھا، آرزو کا شاگرد تھا، لیکن بقول بعض اوس نے بیدل اور سرخوش سے بھی اصلاح لی تھی، (تکملہ) وہ بیدل کا باضابطہ شاگرد ممکن ہی کہ نہ ہو لیکن اس مین شک نہین کہ وہ ان کا بڑا معتقد تھا، خوش گو کا قیام دہلی کے علاوہ، بنارس الہ آباد، عظیم آباد مین بھی رہا ہے، اسکی وفات بقول آزاد[2] بلگرامی عظیم آباد اور بقول شوق بندرابن مین ہوئی، زمانۂ وفات بارہوین صدی[3] کا ساتوان عشرہ ہی، (آزاد)

---

[1] خوشگو کے حالات کی تحقیق مین نے نہین کی، جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس سے بہت زیادہ لکھا جا سکتا ہی [2] و [3] سفینۂ خوش گو کے سرورق پر آزاد کی لکھی ہوئی چند سطرین ہین،

خوش گو نے بیدل کے حالات بڑی تفصیل کے ساتھ لکھے ہین، ابتدائی زمانہ کے حالات زیادہ تر خود بیدل کی تصانیف سے لئے ہین، آخری زمانہ کے حالات چشم دید ہین، خوشگو کا بیان ہی کہ اُسے ہزار بار سے زیادہ بیدل کی خدمت مین حاضر ہونے کا موقع ملا تھا، سفینۂ خوش گو سے بیدل کے متعلق بہت سی نئی باتین معلوم ہوتی ہین، اور بہت سی پرانی غلط فہمیان دور ہوتی ہین اس کا بیان قابلِ اعتبار ہے لیکن دو ایک جگہ اُس سے بھی غلطی ہوئی ہی جس کا ذکر دوسرے حصہ مین آئے گا، سفینۂ خوشگو چھٹے عشرے مین تمام ہوا ہے،

سفینۂ خوشگو کا وہ نسخہ جس سے کاتب نے بیدل کے حالات نقل کئے ہین آزاد بلگرامی کی ملک رہ چکا ہی آزاد نے اُسے اپنے لئے نقل کرایا تھا لیکن اغلاط سے بھرا ہوا ہے، قیاسی تصحیح کی کوشش حصۂ دوم مین کی جائے گی، حصۂ اول میں لفظ کتابت سے تعرض نہین کیا گیا،

آن حضرت از قومِ مغل از مغلانِ ارلاس کہ چہار قسم می باشند، یکے از آنہا مرزا ارلاس ست تورانی الاصل اکبرآبادی الوطن است، آن چہ طاہر نصیرآبادی دراصلِ ایشان نوشتہ کہ لاہوری است، اصلے نہ دارد، والد بزرگوارش میرزا عبدالخالق از اوائل ترکِ ماسوا کردہ، تماشائی خلوت کدۂ وحدت بود، د آخر عمر از صلبِ آن ابو الآبائے بزرگی کہ خالق صوری بیکرش بود، آنحضرت درسال ہزار و پنجاہ و چہار ہلالے سعید و ساعتے مختار قدم بہ بارگاہ شہود گذاشت، و صفتِ کاملۂ بے نشانِ قادریت بہ تقتضائے سیر نزولی کسوتِ آب ورنگ عبدیت پوشید، و موسوم بہ عبد القادر جیلانی گردید، لالا سکھ راج رائے، سبقت ہم درین معنی رباعیے زنظرش گذرانیدہ بود، رباعی:

ہ؟نلب آمد قدرت تنزیہہ مقام	عبد القادر بود التشہش نام (؟)
شد زندہ یکے بہر مسیحائی دین	آمد دگرا کنون پئے احیای کلام

مولنا قاسم درویش کہ از آشنایان پدرش بود، بہ قوت ریاضت بریاضی مستقبل روزگار اطلاع گشت، لفظ "انتخاب" تاریخ ولادت آن جزو زمان یافتہ چندے بمقتضاے طلب آبیاری ریشۂ حیوانی بہ شیر خوارگی گذرانید، وزان حالت خود بیان فرمودہ،

"بر زبان درس روایت ہای موج شیر بود جنبش مژگان بے نم خامۂ تحریر بود"

چون از رضاع برآمد، و قدم بہ پنج سالگی گذاشت زبان را کہ از اعضاے رئیسۂ انسانی است بہ ختم کلام مجید شادابی بخشید و در اواسط ہمان سال میرزا عبد الخالق رخت ہستی بربست و گرد یتیمی بر چہرۂ حالش نشست، در ماتم او وحالت خودمی فرماید،

"خورشید خرامید و فروغے بہ نظر ماند دریا بہ کنارد گرافتاد و گہر ماند"

در سال ششم از حد عمر از خدمت والدۂ ماجدہ حروف تہجی آموخت، و در ہمان نزدیکی آن مریم مکانی نیز رہ نورد عالم بالا گردید، این معنی مصداق رب المساکین فضل اللہ است کہ با وجود بیکسی ہاے ظاہری کس بیکیانش بجاے رسانید، میرزا قلندر برادر اخیا فی مرید عبد الخالق بار تربیت و پرورش بر دوش گرفتہ بر تحصیل علوم صرف و نحو رہنمونش شد،

بہر حال مرزا جوانے شاہ زور وصالح و مرتاض و شجاع و بدیگر اوصاف موصوف بود،

اوائل نوکری سرکار شاہ شجاع پسر دوم شاہجہان بادشاہ است و نوبت ریاضتش اکثر باربعین کشیدے، و در ہفتہ بیک جام شیر قناعت نمودے طرفہ این کہ در سایۂ وے عقرب را تاب حرکتے نماندے، واکثر از وے امتحان نخط زیر سایہ داشتے، ناچار بہ سوراخ عدم خزیدے و دیگر تفعاے شدیدآہنی را باشارۂ سبابہ اش جز کشایش چارہ نبود، چون ازین ہر دو کیفیت پرسیدند فرمودند نخستین ازلی است وثانی عملی کہ بمواظبت اسم فتاح نصیب شدہ بود و در حالت عارضۂ تپ قریب بہ پنج سیر پختہ روغن شیر گرم نوشیدے، و در وقت درد چشم مقدارے

فلفل سرمۂ دلا در چشم کشیدے و بے ارتکاب این ہر دو عمل امراضش بصحت بگر دیدے، چنانچہ برخے از حالاتِ او در عنصر اول کتاب چہار عنصر بے دلی نگاشتہ کلک جواہر سلک او شدہ۔

بہر حال آنحضرت در سال عاشر کتاب کافیہ با تمام رسانید و شروع شرح ملا نمود، روزے ہمراہ مرزا قلندر در مدرسہ نشستہ بود و طالب علم را دید ند کہ ہنگامۂ بحث ضَرَبَ یَضْرِبُ گرم داشتند بعد در دسر بسیار یکے الزام یافت و دیگرے گردن رعونت تارک ارتافت، مرزا قلندر منع درس عزیلش فرمود، و گفت اگر فائدۂ علم ہمین است خاک بر فرق جہل نباید انداخت، چہ در ہر دو صورت جواہر انسانیت گداختہ میشود اگر ملزم است لزوم رعونت چہ بلاست، و اگر ملزم انفعال الزام چہ قیامت از آن وقت از کسب علوم عربیہ باز آمدہ صحبت فقرائے صاحب کمال، و مطالعۂ اشعار ارباب حال و قال اختیار فرمود، و نیز علوم ادعیہ و نقوش و حفظ اسمائے الٰہی از کاملان این فن آموخت و در نیمۂ سال عاشر مکتب از بہار مقدمش رشک گلستان و بوستان بود، یکے از ہم سبقان نو خط قرنفل زیر زبان گذاشتن، و ہنگام تکلم انفاس موشش تخم رائحہ در دماغ سامع کاشتے، چون طبیعت باو مالوف بود بحسب موزونی ازلی رباعی انشا فرمود، بے نقابی فیض حقیقی تماشا کردنی ست، و آن رباعی را چہار رکن بنائے موزونی خود دانست،

یارم ہرگاہ در سخن می آید، بوئے عجبش از دہن می آید

این بوی قرنفل است یا نکہت گل یا رائحۂ مشک ختن می آید

برائے نظام سلسلہ صورت با وجود آنکہ شعرائے عالی فطرت شاگردان معنوی حق تعالیٰ اند از جناب مولینا کمال نامی صاحب کمال استفادہ کسب شعر نمود، و رمزی تخلص مقرر فرمود تا مدتے بدین تخلص متخلص بود، روزے سیر دیباچۂ کتاب گلستان می نمود، چون باین مصرع رسید ع

"بیدل از بے نشان چہ گوید باز"

اهتزاز و رقص رو داد، واز روح پرفتوح قبلهٔ شیراز استمداد جسته، لفظ "بیدل" را تخلص مبارک قرار داد و معنی این تخلص که بفهم اکثر در نمی آید، آنست که چون دل را خاطر گفته اند چه این همه خطرات و عوارض از آنجا، حادث میشود، پس صفتے باشد، که حرکت بوے خطره از نتائج اوست، واز آنجا که در نفی صفت به "بے" مستعمل فارسیانست، چنانچه بے شور و بے کمال بخلاف نفی موصوف که لفظ "بالاے آن می آید، مثل ناموزون و ناهموار لهذا و تخلص اختیار نفی دل که صفتے بیش نیست آمده بعضے موسوم صفات قلب است ندارد، واز آن بیدل است، و بیدل خطاب مستطاب عاشقان هم آمد،

بهرحال چون بهار جوانی در بوستان سرائے وجودش دمیدن آغاز کرد، بحکم رفعت استعداد و تحصیل اسباب معاش ملازمت بادشاه زاده عالیجاه محمد اعظم شاه دریافت و باندک فرصت معزز و مقبول گردید، در ترکی و فارسی همزبان گردید، و منصب پانصدی بخدمت داروغگی کو فنگر خانه امتیاز یافت، بیست سال درین شغل مشغول بود و آن وقت مشق سخن در خدمت شیخ عبدالعزیز عزت می گزرانید بعد ازان چون جذبه در رسید، تمارض نموده از خدمت شاهی مستغنی گردید، به هندوستان رسید پادشاه زاده از روے کمال قدردانی نشانے بدستخط خاص نوشته فقیر خوش گو بجنسه در قلمدان ایشان دیده اینجا نقل مسوده می نویسد:

نشان دستخط خاص پادشاهی

الحمدلله والمنة که هنوز قواے بدنی آن رفعت و شجاعت دستگاه بحال خود است، باوجود برقراری حواس از خدمت عالی شاهی تقاعد ورزیدن شرط ایفاے حقوق اخلاص نیست، تا حال هم هیچ نرفته آنچه ضروریات را در کار باشد، به بیوتات دارالخلافه امر نفاذ یافته سرانجام کرده خواهد داد، زود مستعد ملازمت گردد، انتهی ایشان در جواب عریضهٔ بالقاب خداوندی مرقوم نموده

کہ تمام آن در رقعات داخل است یک رُباعی نوشتہ می آید،

از شاہ خود آنچہ این گدا می خواہد افزونیٔ منصب رضا می خواہد
تا ہمت فقر ننگ خواہش نہ کشد، سرخیل لشکر دعا می خواہد

و بیاد آوری حقوق نمک غزلے در آن عریضہ نگاشتہ بودہ کہ این دو بیت از آنست،

اگر خورشید گر دونم و گر خاک سر راہم گدائے حضرت شاہم گدائے حضرتِ شاہم
قبولے داشتم در بارگاہ عرشِ تعظیمش زکسب آن سعادتہا کنون مقبول اللّٰہم

پس آنحضرت بطریق سیاحی رو بمشرق نہاد عزیمت فرمودہ مدتے در حدود ممالک بنگ و بہار و اڑیسہ بآزادگی و بے تقیدی بسر بردہ و دشت و بیابانہا پیمودہ عجائب قدرت الٰہی تماشا نمودہ اکثر از خصوصیات آن ہنگام در چہار عنصر نگاشتہ قلم راست رقم اوست و ہم در آن ایام بسیارے از نعمت درویشی نیز نصیب او گردید، از انجا بتکلیف پیر کامگار ہندوستان رسیدہ چندے بہ بلدہ اکبرآباد اقامت ورزید و باز بدار الخلافہ شاہجہان آباد رسیدہ کنج عزلت گزیدا نواب شاکر خان و نواب شکر اللہ خان بیرون دہلی دروازہ شہر پناہ در محلہ کھیکریان بر کنار گذر گھاٹ لطف علی حویلی مبلغ پنجہزار روپیہ خریدکردہ نذر نمودہ و دو روپیہ یومیہ مقرر کردند کہ تا روز مرگ ایشان می رسید، بقیہ عمر در آن مکان بفراغ سی و شش سال اوقات عزیز بسر برد، و بحسب ظاہر رشد تمام پیدا کرد، و تاہل گزید، چہار حرم در حریم داشت، و این جا اتفاق خوردن زرنیخ کشتہ اش افتاد، در وقت جوانی غایت گرسنگی قریب ہفت و ہشت سیر بودہ اکثر بہ سبب فرمایش فقر بطوع و رغبت فاقہ ہم می کشید، درین وقت کبر سن کہ فقیر خوشگو ہر روز بخدمتش میرسید، خوردن دو نیم سیر سہ سیر طعام بچشم خود دیدہ، و در عالم شباب اگرچہ بشرب شراب ارتکاب کردہ لیکن در پیریہا مزاج مبارکش گوارا نمی آمد، لہذا از جمیع کیفات و مغیرات بیگانگی

نمودہ بنگاہ بہ اختیار فرمودن آن را باسم موجی یاد می نمود، و در فصل زمستان معجونے مرتب می ساخت و آن را اوجی نام میگذاشت، شعرے ازین عالم گفتہ،

شادم کہ نظر تم نیست تریا کی تعین ده که می فروشم بنگ است گاه گاه است

نفس عاجز نوا نکتے بتوصیف زور مندیش سرمایۂ قوت رستم بہم می رسانید، بنا ے لفظ و معنیٰ زانہ آشفتگی بنیاد آن حضرت را از بدو شعور توجہ بر کسب زور بیشتر بود، چنانچہ شمار بیام ہر روزہ کہ بوجود فیض آمود می نمودہ چہار ہزار واکثر بہ پنج ہزار کشیدے وبسکہ در کشتی کردن و مصارعہ جستن حریفان را بہر دو دست برداشتہ بزمین زدے ہیچ کس را تاب پنجہ آرائی و زور آزمائی او نبود لاجرم سوار ہمت شد، براسپ بالاے پشتۂ کلانے برآمد، بقوت تمام با اسپ بہم پیچیدے و آن را بزمین انداختے، واسپ خود پیچا خوردہ ازان پشتہ بزمین آمدے، و چون این چنین عمل بچند نوبت کشیدے خاطرش آسایش یافتے، نوبتے در عالم تعلق گوشہ خاطرش بسوئے موتر مش پسرے میلے داشت، اتفاقاً حرکتے ازوے صادر شد کہ بر طبع نازکش گران آمد طپانچہ بر رویش زد کہ و مار از روزگارِ او برآمد، و در طرفۃ العین با خاک برابر گردید، و شبے پاے فرقدین فرسایش لغزشے کرد بحکم اتفاق دست بدیوارے خورد خواست کہ متوسل بدیوار شود ناگاہ دیوار تاب نیاوردہ از ہم بخیت فقیر این دو رباعی در وصفِ زور ایشان گفتہ،

اے زور تو دندان شکن اہل سخن خوشگوے ضعیف را چہ یارا چہ دہن

گر زور کند بیک دو حرفِ تعریف حقا کہ شود زبان رستم الکن

زور تو دلِ فلک گداز د چون برف وین بادہ ز بس نگنجد در ظرف

کز خامہ بوصفِ او نویسد ورقے گردد صد ریزہ استخوان بندی حرف

شبے نقل می فرمود کہ در بلدہ پٹنہ تاجرے اسپ عراقی نژاد آوردہ دبعوض ہزار روپیہ

بفروختن برآورد، طبیعت مائل بخریدکردنش گردید، گفتم اگر اسپ تو دریک و دو با من برابری کند، در ہزار روپیہ بدہم واگرپس ماند مفت بگیرم تاجراین شرط قبول نمود، وخود برآن اسپ سوار شد، درمیدان وسیعے عنان سرداد ازین طرف من دامن بہ کمرزدہ شاطرانہ دویدم تا نگاہے بیفگنم اسپ وسوار بقدر یک تیر از من پس تر ماندہ بودند چون گوی شرط از میدان ربودم مروت ندیدم اسپ باد باز دادم، دعصاے خوردے از این در دست داشتن کہ وزن آن سی وشش سیر شاہجہانی بود، وآن عصا را بو لاہی نام میفرمود کہ معنیش بزبان ہندی شاخ باریک باشد آن را بروز عرس ایشان بپہلوے قبر می گذارند قوی پنجگان بہر دو دست بزور تمام برمیدارند لکن کسے حمل براغراق ومبالغہ کند باید کہ بیاید وبچشم عبرت بین ملاحظۂ قدرت قادر قوی نماید ع

بیا بسم اللہ اینک گوے ومیدان

بیان حلیۂ مرزا | بالاے والایش درطول میانہ بود، وعرض پہناوری بسیار گشت، جماے داشتہ بود ہیز تنگ کمال، باچشمہاے خجستہ وابروان کلید درہاے بستہ تختۂ پیشانی وسیعے داشتہ کہ گوئی قلم تقدیر جمیع کمالات انسانی بروے مرتسم کردہ مقدار شش کوہ بود، کہ ہرگز بروئی افتاد، ہنگام تکلم سخن بسیار آہستہ ودراجدا میفرمود گویا گہرباری میکند، یا گلفشانی مینماید وآہستگی کلامش بہ حدے کہ صف نشینان موخر کم می شنیدند، یک غلامے داشتند مضمون نام چنانکہ فقیر گفتہ،

بیدل کہ تختگاہ فصاحت مقام اوست

معنی کنیز او شد ومضمون غلام اوست

اکثر غلام را براے تازہ کردن چلم قلیان یا امرے دیگر طلبیدے، باوجود قرب بانگ بلند

برداشتہ دو ستک دادے واکثر کلام بقیدانہ برزبان آوردے اما شعر را بصلابتے وصابتے خواندے کہ گوش مستمعان بار شدے واز بیرون دروازہ در کوچہ معلوم شدے کہ آنحضرت شعر میخوانند ومقرر آن کردہ بود کہ تمام روز اندرون محل بہ تنہائی وتجرد نشستہ با سخن صحبت میداشت وسر شام بدیوانخانہ تشریف آوردہ تا نیم شب نشستے واقسام حکایات وامثال کارآمدنی درمیان آوردے۔ فقیر ملفوظاتے نوشتہ کہ اکثر مذکوراتِ آن صحبت ہا درو داخل است واکثر اوقات در گپ زدنہا یادگذشتن فرمودے کہ یاران الحال باید، ذکر خداے کہ کنایہ از شعر خوانی باشد، درمیان آید۔ کلیات دیوان خود کہ دریک جلد چہار مصراعے نویسانیدہ مرتب فرمودہ بود، طلبیدے ومجلس گرم داشتن ونوبت بنوبت حاضران را خطاب کردے، از اشعار خود عنایت فرمایند۔ مرزاے از سر زیبایش مبارید، بیباکے تمام داشت، وضع تراش ریش وبروت تراشیدہ بود، چنانچہ وقتے در اکبرآباد عبدالرحیم نامی کہ طبع موزون داشت این بیت نوشتہ در پالکی انداخت،

چہ خطا در خط استادِ ازل دید آیا ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ کہ باصلاحِ غرر ریش نیاز افتاد است

ایشان ہمان وقت جواب نوشتہ دادند،

مختصر کن بتغافل ہوسِ جنگ وجدل ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ مد بر رشتہ تحقیق دراز افتاد است

روزے یکے از منشیانِ آنجناب از صحبتِ میر جملہ ترخان بخدمتش حاضر شد وگفت ہمین وقت نواب میر جملہ می فرمود کہ من امروز میرزا بیدل را کہ قطب الملک سید عبداللہ خان بارہا بدعوت طلبیدہ بود، دیدم انسان کامل بنظر آمد اما عیبے داشت واشارہ بطرفِ ریش وبروت کرد کہ مبرا است۔ آنحضرت بعد استماع در جواب فرمودند آرے درمیان ما وایشان تفاوت مقدار پشمے است، کہ ایشان دارند وما نداریم، واین بیت از اشعارِ خود یاد کردے

بروت تا فلفت گربہ شانے ہوس است

بریش مردہ شدن بزرگانے ہوس است

یکے از خواجہ سرایان بخدمتش التماس کرد، می خواہم کہ دستارے رنگ کنم، بہر رنگ کہ صاحب تجویز فرمایند، فرمود بیرنگ صبغۃ اللّٰہی براے نوع شما ہمین دو رنگ ایجاد کردہ صندلی و بادامی طبع غیور آنقدر داشتہ کہ شبے جعفر زٹلی کہ یکے از ہجویان و فحش گویانِ عصر بود، مثنوی در تعریف او گفتہ آورد، ہمین کہ مصرع اول خواند،

ع چہ عرفی چہ قیصر بہ پیش تو ہیش

فرمود شما مہربانی کردید کہ تشریف آوردید، ما فقیر بدلیم ما را شنیدن امثال این حکایت کہ در حق استادان می شد نمی رسید دو اشرفی از کیسہ برآوردہ بمداح بخشید، و خاموش ساخت، حاضران مجلس خصوص فقیر خوشگو ہر چند عرض نمودیم کہ آنحضرت اگر حکم شود مصرعِ ثانیش بخواند تا معلوم گردد کہ قافیہ لفظِ ہیش چہ آورد، قبول نہ اُفتاد،

و استقلال ذاتی بحدے داشت کہ در عمر شصت و پنج سالگی فرزندے قدم بہ بیت الشرف او گذاشت، از ین عنایت غیر مترقبہ شادیہا کرد و صدقہا داد، چون چہار سالہ بعدم شتافت بہ شگفتگی پیشانی موافق دین و آئین تجہیز و تکفین نمودہ، مدفون ساخت، و تا دروازہ با نعش مشایعت کرد، مردم کہ بعزا پرسش می آمدند گریہا و زاری می کردند، وے غم ہمگنان می خوردہ می گفت، یاران جاے تعجب است کہ فرزند من بمیرد و گریہ شما را می آید مخمسے در ماتم پسر گفتہ کہ خواندن آن بے اختیار رقت می آرد، این دو بند از آن است،

ہیہات چہ برق پرفشان رفت کآشوب قیامتم بجان رفت

گر تابے بود و ور توان رفت طفلم ز زمین کہنہ خاکدان رفت

بازی بازی بر آسمان رفت

هر که دو قدم خرام می کاشت از انگشتم عصا بکف داشت

یارب چه علم بوحشت افراشت دست از دستم چه گور برداشت

بے من راه عدم چنان رفت

در متاخرین هیچ شاعرے باین عزت و آبرو بسر نبرده که او داشت، قطب الملک سید عبداللہ خان که وزیر اعظم و پادشاه نشان بود، دو سه مرتبه که طلبیده است همین که نظرش بر میرزا افتاد، از کرسی می خاست، و بپیش دویده معانقه می کرد، و تکیه و مسند می گذاشت، و نواب نظام الملک آصف جاه که وکیل مطلق هندوستان بود، از دوستان ایشان است دیوانے بمشورت ایشان ترتیب داده و دیگر اکثر خورد و بزرگ شهر سر شام بخدمتش میرفتند و انواع فیضها بر می داشتند محمد فرخ سیر پادشاه شهید اول استمزاج کرد، بعد ازان چون معلوم نمود که او بملاقات نه خواهد آمد. دو هزار روپیه و زنجیر فیل رعایت کرد، زر نقد خود بخدمتش رسید، چون وکیلے از طرف ایشان برآے آوردن فیل نرفت متصدیان بحکم بنده بخلق فرو بردند و شاه عالم بهادر شاه به منعم خان خانخانان اکثر فرمود که میرزا بیدل تکلیف نظم شاه نامه نموده شود خانخانان که آشنائے قدیم بود تا پنج و شش بار در کتابت نوشت میرزا قبول نه نمود، عاقبت جوابے بدرشتی نگاشت که اگر خواه مخواه مزاج پادشاه برین پایه است من فقیرم جنگ نه میتوانم کرد، ترک ممالک محروسه نموده بولایت میروم، وقتے عالمگیر پادشاه این بیت ایشان در فرمان پادشاه زادهٔ معظم در مقدمهٔ تسخیر حیدر آباد نوشته،

من نمی گویم زیان کن یا بفکر سود باش

اے ز فرصت بے خبر در هر چه باشی زود باش

واین بیت باعظم شاہ مکرر نگاشتہ:

بترس از آہ مظلومان کہ ہنگام دعا کردن — اجابت از در حق بہر استقبال می آید

ونیز بر عرضی شخصے کہ زیادطلبی میکرد این مقطع مشہور ایشان دستخط پادشاہ شد،

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہان
انچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

آنحضرت در فہم معنی توحید و معارف پایہ بلند داشتہ علم تصوف خوب ورزیدہ بود و مسائل آنرا از تحمل این فن بتحقیق کمال رسانیدہ، درین مقدمہ جنید و بایزید وقت خود بود، بسا مقدماتے کہ مولوی روم در مثنوی و شیخ ابن عربی در فصوص الحکم بیان کردہ آنہمہ را بشرح وبسط تمام باتشبیہات تازہ در یکے بے اندازہ در کلام خود بستہ، چون نمک جمیع اقسام سخن شور انگیز توحید است، در سخن طرز بلندی اختیار فرمودہ کہ اگر بالفرض شعر بہ تمام کسے می گفت سررشتہ توحید از کف نمی دادند، در ہمہ اشعارش این رعایت منظور است، واو درین فن از استادانیست کہ صاحب طرز خاص شدہ اند، و از زمانیکہ بسخن آشنا شد، این طرز مخصوص بدست کسے نیفتادہ، کارہائے کہ او کردہ مقدور کسے نیست اکثر بے انصاف ہائے زمانہ از روے حسد حرفے چند ناسزا در حق جناب کرامت مآب وے میسازند کہ میرزا بیدل غلط گوئی مقرری است و حال آنکہ خود غلطہایش نرسیدہ اند، تا بکارہائے کہ از وبظہور پیوستہ چہ رسند واین محض جہل و بغض کہ مخمر آنفریق است ہرچہ حضرت گلشن می فرمود کہ میرزا بیدل پایہ دارد کہ این غلطہایش را بعد صد و دو صد سال اہل لغت و فرہنگہا بطریق سند خواہند آورد، و ما فرض کردیم کہ ترکیب سازی و لفظ تراشی کہ نامش غلط گذاشتہ اند در تمام اشعارش پانصد یا ہزار بیت خواہد بود جواب بقیہ شعرہایش کہ ہم بزعم مدعیان صحیح و درست باشند کہ می تواند داد، آخر تمام صد ہزار بیت خود غلط

نیست، آدمی را باید که در هر وقت منصف احوال خود باشد، تا بآن درجه برسد، یا از اندازۂ گلیم خود دراز نکشد، والا مطعون ارباب خرد گردد،

ز خاکے که بر آسمان افگنی سر و چشم خود را زیان میکنی

مشهور است که روزے ناظم خان فارغ مصنف تاریخ فرخ شاهی آنحضرت را بدعوت طلبیده، بعد فراغِ طعام ناظم خان بطریق الزام پیش آمد، وگفت، میرزا صاحب درین شعر سرکار روزمره بسیار تازه است،

تونگرے که دم از فقر میزند غلط است بوے کاسۂ چینی نمد نمی بافند

میرزا در جواب فرمود، من آن احمق نیستم، که طعن صاحب را در یافت نکنم، خان مکرر گفت که بالله این روزمره اختراع صاحب است، فرمود که شما در شعراے قدیم کدام کس را مسلم معتبر از عسجدی و فرخی و معزی و مسعود سعد سلمان و خواجه سلمان و دیگر استادان در صحت روزمره نمد بافی گذرانیده، ناظم خان حیران ماند، و ببانگ بلند گفت، والله هرکه در استادی این عزیز شک آرد بے شک کافر باشد" تا زیست معتقد او بود، از آنجا که این کم تتبعان استقرا نداشته اند حمل بر غلط می کنند، و فقیر خوشگو در عمر خود زیاد از هزار مرتبه بخدمتش مستفید شده باشم گاہے ندیدم که کسے ازین جماعت که غلط گویش میگویند بحضور او رفته حرفِ سبز کرده باشد، روزے یکے از شعراے عصر که نامش نمی توان برد با مثنوی بخدمتش رسید، چون باین بیت رسید ؎

بیا ساقی که چشم بے قرار ست چو گل خون شد ز زخم انتظار ست

آنحضرت فرمود که اضافت "چشم بیقرار ست" از عالم صفت و موصوف معلوم یعنی چشم که بیقرار ست و حال آنکه ارادۂ شاعر اضافت لامی است یعنی چشم عاشق تو که خود را باسم بیقرار بر آورده شاعر را باش

کہ ازین چنین گفتگو احتراز نماید کہ ادادہ چیزے دارد و چیزے دیگر برآید، آن عزیز گفت کہ زلالی بستہ است، آنحضرت فرمود کہ شما زلالی را موقوف دارید، از خود حرف زنید، این ازان عالم است کہ کسے درین بیت بستہ ؎

هر کہ سویت بچشم بد بیند چشمش از کلۂ تو بیرون باد

آن مثنوی گو کاو کاو کرد، آنجناب فرمود ہمی نقسم شعرے در مدح مرزا الغ بیگ گفتند،

چندا مرزا الغ بیگ دے دشمنانت کلهم کہ میخوری

در حین حیاتش مدعیان این نوع خفت ہا می کشیدند، اکنون کہ از قضاے ایزدی آن آفتاب اوج معنی سر بگریبان مغرب فنا بردہ است، خفاش طینتان از سوراخہا برآمدہ بال و پری افشانند،

بے خبر کز دستگاہ یک دو لفظ مستعار بیش نتوان برد با معنی سیاہان ہمسری

بہرحال فقیر از معتقدات آنچہ دیدہ ام سطرے چند بے ادبانہ نگاشتہ ام اگر کسے را بمذاق خوش نیاید، مختار است، باید کہ این اوراق را از مطالعہ موقوف نماید قسم بجان سخن کہ جان من است و بہ خاکپاے ارباب سخن کہ ایمان من است کہ فقیر درین مدت عمر کہ پنجاہ و شش مرحلہ طے کردہ با ہزاران مردم ثقہ برخوردہ می باشم لیکن بجامعیت کمالات و حُسن اخلاق و بزرگی و ہمواری و شگفتگی و رسائی و تیز فہمی و زود رسی و انداز سخن گفتن و آداب معاشرت و حسن سلوک و دیگر فضائل انسانی ہیچ ادے ندیدہ ام، واز کسے کہ او را بسیار و کم دیدہ است انصاف میخواہم اما بشرطیکہ منصف باشد نہ متعصب،

بالجملہ آنجناب از الٰہیات و ریاضیات طبیعیات کم و بیش چاشنی بلند کردہ بود، و بطبابت و نجوم و رمل و جفر و تاریخ دانی و موسیقی بسیار آشنا بود و تمام قصۂ مہابھارت کہ در ہندیان ازان معتبر تر

کتابے نیست بیاد داشت، و در فن انشا منشی بے نظیر، چنانچہ چہار عنصر و رقعات او برین دعوی دلیل ساطع است و در نثر چیزیکہ عیان است چہ محتاج بیان است و می فرمود حضرت حق جل و علیٰ قدرت پرگوئی و قوت سخن طرازی آنقدر کرامت فرمودہ کہ اگر قلم بر داشتہ متوجہ فکر تازہ می شوم نہایت روزی پانصدی است برسد لیکن محتاج بہ نظر ثانی خواہد بود،

رباعی گفت در جواب آدم الشعرا حکیم رودکی تا حال ممتنع الجواب بود، ایشان بعد صدسال از عہدہ جواب آن برآمدند، واحق گفتگوے واقع شدہ، خان صاحب آرزو منداں ازآن بسیار محظوظ اند، فقیر خوشگو نیز لنگ لنگا پسر منزل جواب آن رسیدہ ہرسہ نگارش می یابد

رودکی:-

آمد بر من کہ یار کی وقتِ سحر
ترسید زکہ زخصم خصمش کہ پدر
دادمش چہ بوسہ بر کجا برلب دُر
لب بُد نہ چہ عقیق چون بُد چو شکر

بیدل:-

دی خفت کہ ناقہ در کجا خفت
کردم چہ فغان ارچہ زیاد منزل
داد از کہ زخود چرا ازسعی باطل
کافتاد چہ بار از کہ سر بر لہ بدل

فقیر خوشگو:-

رفتم بکجا بباغ کے فصل بہار
دل تنگ چنان چو غنچہ چون بے دلدار
دیدم چہ شکستہ گلے ازچہ زبوی
گل بد نہ چہ بد نامہٗ از کہ از یار

پوشیدہ نماند کہ در رباعی حکیم رودکی و میرزاے مغفور با وجود صنعت توافق قوافی بکار رفتہ کہ ہر چہار مصرع مقفیٰ است، فقیر ازان معاف ماندہ صنعت مخصوصہ را در مصراع سیوم ایزادے کردہ، چنان بر ذہن سلیم واضح می گردد، وآن حضرت ترجیع بندے از ہزار است

زیادہ در جواب ترجیع بند فخرالدین عراقی کہ بسیار مشہور است و بندآن این است،

کہ بجہان دل مبین جز دوست   هرچه بینی بدان که مظهر اوست

چون عراقی گفتگوے سالکانہ کردہ کہ ہمہ اشیا را مظاہر قرار دادہ و عقیدۂ عارف این است کہ اشیا را عین ذات دانند ایشان عارفانہ گفتند، ؎

کہ جہان نیست جز تجلیِ دوست   این من و ما اضافت اوست

روزے چوبدستے مضبوط کہ در ہندی لٹھ گویند، بدست کردہ از خانہ برآمدند شیخ کبیر کہ از آشنایان و ہم صحبتانِ دیرین ایشان بود تا مدت سی سال متواتر بلا ناغہ از دیدار ایشان کامیابی داشت، ذکر عصا بر زبان آورد، آنحضرت پنج فقرہ مقفیٰ در تعریف عصا فرمودند ''زینت الانبیا، زینت الصلحا، مونس الاعمیٰ، ممد الضعفا، دافع الاعدا'' بعد ازان فرمودند کہ براے دفع شر اعدا چوب مضبوط باید،

قصہ مختصر در سال ہزار و صد و سی سوم در ایامے کہ ابوالفتح ناصرالدین محمد شاہ پادشاہ غازی بر ساداتِ بارہہ مظفر و منصور شدہ و استقلالِ سلطنت یافتہ بدارالخلافہ شاہجہان آباد تشریف آورد حضرت میرزا بیدل را در ماہ محرم عارضہ تپ رو داد، چہار و پنج روز بحرارت گذشت بعد ازان تپ مفارقت کرد ایشان غسل فرمودند، روز دوم از غسل بتاریخ سوم صفر روز چہار شنبہ وقت شام حرارت عود کرد، و تمام شب ماند، نواب غیرت خان بہادر صلابت جنگ، کہ از یاران آنحضرت و آن شب بخدمت ایشان حاضر بود نقل صحیح است کہ شب گاہے با فاقت و گاہ بغش گذشت و در وقت افاقت بے اختیار خندہ از ایشان سر می زد، بمصداق این بیت : ؎

جانان بقمارخانہ رندے چند   بر نسیہ و نقد ہر دو عالم خندند

بہر حال آثار یاس بنظر آمدن گرفت و تا صبح حال دیگر گون شد، یوم پنجشنبہ چہارم ماہ صفر شش گھڑی روز برآمدہ ہمای روح پرفتوح آن زندہ بیتش سرمدی از آشیانہ تن بال و پر افشاندہ بر ساکنانِ عرش معلی سایہ انداخت و بوصالِ حقیقی کامیاب گردید، رحمۃ اللہ علیہ، در ہمان حویلی اقامت گاہ کہ چبوترہ برای قبر خود از مدت دہ سال راست کردہ بود بخاک سپردند، غزلی در باعیہ نوشتہ زیر بالین گذاشتہ بود، بعد برداشتن مردۂ ایشان کاغذ مذکور برآمد، واشتہار یافت، فقیر خوشگوی بجنسہ آن کاغذ، روز سوم مرگِ ایشان پیش مرزای مرزا محمد سعید ولد مرزا عباداللہ کہ خال آنحضرت و صاحب این شعر است،

برنگی دوخت بلبل چشم بر گل — کہ شد پیراہنِ گل چشمِ بلبل

و مرزا محمد سعید خلف ارشد اوست و الحال سجادہ نشین و مجلس آرای عرس آنجناب است دیدہ بود، نقل آن برداشتہ می شود،

بشبنم صبح این گلستان فشاند جوشِ غبار خود را — عرق چو سیلاب از جبین رفت و تا نکردیم کار خود را
زپاسِ ناموسِ ناتوانی چو سایہ ام ناگزیر طاقت — کہ ہر چہ زین کاروان گران شد بہ دوش افگند بار خود را
بہ عمرِ موہوم فکر فرصت فزود صد پیش و کم ز غفلت — تو گر عیارِ امل نہ گیری نفس چہ داند شمار خود را
قدم بہ صد دشت و در کشادی ز نالہ در گوشۂ فنای — عنان بہ ضبطِ نفس نہ دادی طبیعت ذ سوار خود را
بلندی سر بہ جیبِ پستی ست اعتبار جہان ہستی — چراغِ این بزم تا سحرگاہ زندہ دارد مزار خود را
ز شرم ہستی قدح نگون کن و داغِ مستی بہ ہم خون کن — تو ای حباب از طرب چہ داری پر از عدم کن کنار خود را
بخویش گر چشم می کشودی چو موج دریا گرہ نبودی — چہ سحر کردار زود گوہر کہ غنچہ کردی بہار خود را
اگر دلت زنگِ کین زداید خلافِ خلقت بہ پیش آید — صفای آئینہ شرم دارد کہ خوردہ گیرد دو چار خود را
تو شخص آزاد پر فشانی قیامت است این کہ غنچہ مانی — فزود خود داریت بہ رنگی کہ تنگ کردی حصار خود را

وداعِ آرایش نگین کن نہ شرم دامانِ حرص چین کن
مزن بہ سنگ از جنون شہرت چو نام عنقا وقار خود را

بہ در زن از مدعا چو بیدل زالفتِ وہم و پیچ بگسل
برآستانِ امید باطل خجل مکن انتظار خود را

رباعی بیدل،

بیدل کلفت سیاہ پوشے نشوی
تشویش گلوے نوحہ کوشے نشوی

بر خاک بمیرد ہمچنان رو بر باد
مرگت سبک است بار دوشے نشوی

خانصاحب آرزمندان تاریخ وفاتش بطریق تعمیہ یافتہ در قطعہ بستہ اند،

رفت بیدل زغم آباد فنا

فقیر خوش گوی این فقرہ تاریخ وقوع یافتہ یوم پنجشنبہ چہارم ماہ صفر و این رباعی نیز نظم کردہ ؎

افسوس کہ بیدل از جہان روی نہفت
وآن جوہر پاک در تہ خاک بخفت

خوشگو چو زعقل کرد تاریخ سوال
از عالم رفت میرزا بیدل گفت

ہر سال بروز عرس ایشان مجمع شعرا میشود و جمیع نازک خیالان شہر جمع شدہ اول غزلے از کلیات ایشان خواندہ ہر یک جوہر خود را عرض می دہد، مجلس خوبے منعقد می گردد چشم بد نفر ازان مجمع رنگین دور باد، کلیاتے ازان حضرت یادگار است کہ شمار تمامی ابیات آن نود وہ ہزار بیت است و آنرا در حین حیات خود چہار مصراع نویسانیدہ اوراق وزن کردہ چہار دہ سیر متعارف بوزن در آمد، در پلۂ دوم میزان برابر آن اکثر فلزات و جواہرالات داشتہ خیرات نمودہ و دران وقت فرمودہ کہ اہلِ ہند اولاد خود ہا را وزن کردہ تصدق می دہند، ازانجا نتیجہ بیدلان ہمی نتائج طبع می باشد، من ہم خیریت آنہا از خدا خواستم، امید کہ قبول شود ازان جملہ یازدہ ہزار بیت نسخہ عرفانست در بحر حدیقۂ حکیم سنائی کہ بر آن مثنوی ناز

میکرد، چنانچہ اکثر از زبان مبارکش شنیدہ ام کہ انچہ ما داریم نسخۂ عرفانست و آن را در مدت سی سال باتمام رسانید، سراسر گفتگوے تصوف و معارف وارد این مصرع آخر آن در تاریخ اتمام گفتہ ع

ہدیۂ ذوالجلال والاکرام

و آخر آن سُرخی کہ سرِ سخن است ہم بیت موزون قرار دادہ این مطلع است سر بیت سخن،

عقل و حس سمع و بصر جان جسد — ہمہ عشقست ہو اللہ احد

عشق از منت خاک آدم ریخت — آن قدر خون کہ رنگ عالم ریخت

و دیگر چہار ہزار بیت مثنوی طلسم حیرت در بیان امتزاج روح بامزاج و شہر خصوصیات عالم صغیر حبد عبارت ازانست در بحر یوسف زلیخا کہ مطلعش این ست،

بنام آنکہ دل کاشانۂ اوست — نفس گرد متاع خانۂ اوست

درہمین بحر سہ ہزار بیت مثنوی طور معرفت در احوال سیر کوہستان و خصوصیات ولایت ہرات کہ ہمراہ شکر اللہ خان فوجدار آنجا تشریف بردہ بودند، و این لطیفہ از آنجاز بانہا است،

شبے بر تیغ کوہے بود جایم — زبیتابی بسنگے خورد پایم

توانائی بطاقت گشت معزد — کہ از راہش بجرأت افگنم دو

ندا آمد کہ اے محرومِ اسرار — خرابات نزاکت ہاست کسار

مبادا اینجا زنی بر سنگ دستے — کہ مینا در بغل خفتہ است مستے

و دو ہزار بیت ساقی نامہ مسمی بمحیط اعظم سرجوش خستانِ فکر ہاے اوست، ملا ظہوری ساقی نامہ شاعرانہ گفتہ، و ایشان ہمہ موحدانہ، و یک ہزار بیت دیگر مثنوی تنبیہ المہوسین در مذمت کیمیا کہ ہرگز معتقد آن نبودند، و ہزار بیت ترجیع بند جواب فخر الدین عراقی و ہفت ہزار بیت در قصائد و ترکیب بند و مقطعات و تواریخ و مخمسات و مربع و مستزاد و اشعار صنائع و سہ ہزار بیت ہزلیات و ہشت ہزار

بیت چہار ہزار رباعی کہ بقول شاہ گلشن "رباعی گوئی حق اوست" و مقدار دہ ہزار بیت نثر چہار عنصر و بقیہ پنجاہ و چند ہزار بیت غزلیات و اقسام بحور و زمینہاے شگفتہ و طرح کہ از عہدۂ برائی ہر یک کار ہمت بلند اوست بلکہ گمان غالب آنکہ ہیچ بحرے از بحور در رسائل عروض از گفتن نہ ماندہ باشد، چون از فکر ہمہ آنہا طبیعت راسیر یافت بہ ہمانقدر اکتفا نکردہ، بحر یتیم سواے آن نوزدہ بحر عروض ایجاد کردہ و در آن غزلہا سرانجام داد، چنانچہ چہار بیت از و غزل بیاد بود،

سے و نغمۂ مسلم حوصلہ کہ قدح کش گردش سر نشود
سہل است سبک سری انقدرت کہ دماغ جنون زدہ تر نشود

چہ بود سر و کار غلط سبقان در علم و عمل بفشاندن
ز غرور دلائل بے خردی ہمہ تیر خطا بہ نشانہ زدن

مژۂ تو قع کار جہان بہم آرد و غبار ہوس بنشاندن
نکشودن چشم طمع نتوان صف حلقۂ مہر در خانہ زدن

عقبات جہنم و رنج ابد نرسد بعذاب نفاق حسد
تو امان طلب از در خلد و در آب تغافل از اہل زمانہ زدن

بیاضے بدستخط خود از اشعار غزلیات انتخاب فرمودہ نوشتہ آنرا بہ فقیر عنایت کردہ اند

گل رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد کے اردو شعراء کے صحیح حالات، اور ان کے منتخب اشعار۔ اردو میں شعراء کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے جس میں آب حیات کی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی سے لیکر اکبر و حالی تک کے حالات،

قیمت:۔ للعہ ضخامت ۵۴۴ صفحے، طبع سوم

"منیجر"

تلخیص تبصرہ

عورت اور مرد کا نفسیاتی مطالعہ

اسٹیٹسمین سنڈے اڈیشن مین ایک یورپین خاتون کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے، اس مین عورتون اور مردون کا نفسیاتی مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ذیل مین اس مقالہ کی تلخیص درج کیجاتی ہے،

چند توہمات ایسے ہین جو عورتین اپنے مردون کے متعلق رکھتی ہین، جن کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بالکل غلط ثابت ہون، ان توہمات کی ذمہ دار خود عورتین ہین، کیونکہ وہ ان کو بار بار دہراتی رہتی ہین، اور جب ایک ہی بات بار بار کانون مین پڑتی ہے تو باوجود غلط ہونے کے اس پر خواہ مخواہ یقین آجاتا ہے، مردون کے متعلق عورتون کے عجیب و غریب خیالات ہین، جن مین بیشتر اپنی شہرت کی وجہ سے صحیح تسلیم کرلئے گئے ہین، مثلاً یہ خیال کہ مرد طبعاً سیدھے سادھے اور ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہین، عورتین ان کی ساری باتین ایک ہی نظر مین معلوم کرسکتی ہین، برخلاف اس کے عورتین بہت گہری، پیچیدہ اور ناقابل فہم ہوتی ہین، تقریباً تمام عورتون کا یہی خیال ہے لیکن سمجھ مین نہین آتا کہ یہ خیال پیدا کیونکر ہوا، اس کی تائید مین ایک شہادت بھی نہین ملتی، یہانتک کہ قلوپطرہ (Cleopatra) اور ٹرائے کی ہیلن جیسی مشاہیر خواتین بھی پیچیدہ طبیعت نہین رکھتی تھین بلکہ عام عورتون کی طرح تھین، اگر ان کے افعال اور کردار پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا، کہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے انھون نے وہی ذرائع اختیار کئے جنھین ایک سیدھا سادھا مرد اختیار

کرسکتا تھا، عورتین اور مرد نہ صرف اپنی روزانہ زندگی مین مکاری، ہوشیاری اور چالاکی کے یکسان نمونے پیش کرتے ہین بلکہ عشق و محبت مین بھی دونون کی خصوصیات یکسان ہوتی ہین، حالانکہ عموماً یہ خیال ہے کہ محبت کی کیفیات مین دماغ صحیح کام انجام نہین دیتا، جس وقت ایک عورت خیال کرتی ہے کہ وہ مرد کے دماغ کے مد وجزر کو سمجھ رہی ہے، اسی وقت غلط راستے پر پڑجاتی ہے، اگر عورتون سے پوچھا جائے کہ ان کے شوہر کیا حقیقت مین بھی ویسے ہی ثابت ہوئے، جیسا وہ انھین شادی سے پہلے خیال کر رہی تھین تو اس سوال کے جواب مین اگر وہ سچائی سے کام لین، تو دس مین سے نو عورتون کو یہ ماننا پڑے گا، کہ شادی کے بعد انھین بہت سی نئی باتون کا تجربہ ہوا، طویل ازدواجی زندگی کے بعد بھی فریقین کو یہ معلوم ہوتا رہتا ہے کہ بہت سے افعال ان کے خیال و گمان کے برخلاف ظہور پذیر ہو رہے ہین،

جب کوئی عورت پریشانی اور تذبذب مین مبتلا ہوتی ہے، تو درحقیقت اسکی کوئی اہم وجہ نہین ہوتی، بلکہ کسی خاص وہم کی بنا پر وہ پریشان خاطر رہتی ہے، مرد بیچارے دن رات اپنے کام مین مشغول رہتے ہین، عورتون کے مقابلہ مین وہ زیادہ دماغ سوزی اور جانفشانی سے روزی کماتے ہین، عورتین جب کسی سنجیدہ کام مین مشغول نہین رہتین، تو انکا ذہن ہر بات کی جستجو اور اسکے تجزیہ مین منہمک رہتا ہے، اس طرح وہ خیالات کا ایک گھروندا بناتی رہتی ہین، کوئی عورت اگر ایسی مل بھی جائے جو گھریلو کام مین لگی رہتی ہو تو یہی یقین رکھئے کہ اگرچہ اس کا ہاتھ کام کرتا رہتا ہے، لیکن دماغ بالکل کام نہین کرتا، اور اس کے ہاتھ پاؤن تو تھکتے اور آرام پاتے رہتے ہین، لیکن اسکی دماغی قوت اپنی جگہ پر ہمیشہ قائم رہتی ہے، اسلئے کسی نے کوئی غیر معمولی بات کہی، اور اسکی کرید شروع کردی، مردون کے پاس اس قسم کی فضول باتون کے لئے وقت نہین ہوتا،

دوسری اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات جو کہ پہلی سے زیادہ مشہور ہے، یہ ہے کہ عورتون کی ذات بہت نازک ہوتی ہے، ان کی دیکھ بھال اور حفاظت مردون کا فرض ہے، اسی لئے ان کو صنفِ نازک بھی کہا جاتا ہے، عورتون کا عام خیال ہے کہ مرد بڑے بچے کے مانند ہین، اگر مرد واقعی ایسے بچے کے مانند سادہ لوح ہوتے ہین، تو پھر عورتین ان سے حفاظت کی کیون امید رکھتی ہین،؟ دراصل یہ خیال بھی حقیقت پر مبنی نہین ہے، دونون صنفون مین سے جس کو بھی جسمانی اور روحانی اطمینان حاصل ہوگا، اس کا نازک ہونا لازمی ہے، پہلے زمانہ مین جب کہ عورتون کا رتبہ مردون سے کم تھا، تو وہ ہر قسم کے مکرو فریب کو اپنے مقصد کے حصول کا ذریعہ بناتی تھین، اور ان تدبیرون سے مردون کے جذبات واحساسات کو ابھار کر انھین یہ سمجھنے پر مجبور کر دیتی تھین کہ وہ ایک راز ہین، جس کی پیچیدگی کو کوئی نہین سمجھ سکتا، اس راز سے واقفیت کا واحد ذریعہ شادی ہے لیکن شادی کے بعد وہ اور بھی پیچیدہ تر نظر آتی ہین، عورتون کے مندرجۂ بالا خیال کی کوئی اصلیت نہین، اگر عمیق نفسیاتی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا، کہ عورتون اور مردون مین ذرا بھی فرق نہین، دونون پر خوف وحسد اور طاقت واقتدار کا یکسان اثر ہوتا ہے، جس ماحول مین رہکر عورتین، نزاکت، فریب اور حیلہ سازی کی خوگر بنجاتی ہین، مردون کو بھی اگر اسی ماحول مین چھوڑ دیا جائے، تو ان مین بھی وہی ساری خصوصیات پیدا ہوجائین گی، عورتین مردون کے دوش بدوش نازک سے نازک اور سخت سے سخت کام بالکل اسی طرح کر سکتی ہین، جس طرح مرد کرتے ہین، صرف سوال ماحول کا ہے، جس طرح یہ خیال گمراہ کن ہے، کہ مرد کی جسمانی کرختگیون کے باوجود اس کے سینہ مین ایک بڑا اور نازک سا دل ہوتا ہے، اسی طرح یہ بھی صحیح نہین کہ عورتین اپنی ظاہری نزاکت، اور پیچیدہ طبیعت کے باوجود وہ اندر سے ایسی سخت ہوتی ہین، جیسے تخن کا اندرونی حصہ، یا جو آدمی بظاہر بہت سخت گیر معلوم ہوتا ہے، تو یہ ضروری نہین کہ اسکی فطرت بھی ویسی ہی سخت ہو

یا اگر ایک مرد کی شکل ایک نازک اور معصوم بچے کی جیسی ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اسکی فطرت بھی ویسی ہی سادہ اور نرم ہو، عورتوں اور مردوں کا صحیح اندازہ ان کی ظاہری صورتوں سے نہیں کیا جا سکتا، جس فضا میں جس کی پرورش ہوتی ہی، اسکی ویسی ہی فطرت آخر وقت تک باقی رہجاتی ہی،

مذکورۂ بالا خیال جو طرفین کے دل مین جاگزین ہے، اسے فوراً نکال دینا چاہئے، کیونکہ اسکی وجہ سے دونون ایک دوسرے کے سامنے اپنے کردار کی غلط تصویر پیش کرتے ہین، جس سے زندگی مین ناہمواری پیدا ہوتی ہے، ڈی۔ ایچ لارنس (D. H. Lawrence) کا خیال ہے کہ ازدواجی زندگی مین جو جھگڑے پیدا ہوتے ہین، ان کی وجہ یہ ہے کہ عورتین ہمیشہ مردون پر غالب رہنے کی کوشش کرتی ہین، برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) نے اپنے مضمون مین ڈی ایچ لارنس کا حوالہ دیتے ہوے لکھا ہے، کہ یہ چیز جھگڑے کی ابتدا ہے، پھر سوال یہ ہے کہ آخر یہ جھگڑا پیدا ہی کیون ہوا؟ پرانے زمانہ مین عورتین چونکہ مردون سے کمتر سمجھی جاتی تھین، اس لئے مرد ہمیشہ ان پر وہی نظر رکھتے تھے، جو بڑے اپنے چھوٹون پر رکھتے ہین، گذشتہ جنگ عظیم کے زمانہ سے نقطۂ نظر مین تبدیلی شروع ہو گئی ہے، اکثر سننے مین آتا ہے، کہ انگلستان مین ٹریموے چلانے والی لڑکیون کو وہی مزدوری ملتی ہے، جو مردون کو دیجاتی ہے، اور وہ مردون ہی کی طرح جانفشانی اور محنت سے کام کرتی ہین، اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے، کہ عورتین نازک نہین ہوتین، موجودہ اطبّا کی بھی یہی رائے ہے، کہ عورتون مین مردون سے کم قوتِ برداشت نہین ہوتی،

روس کی موجودہ جنگ اس کا ثبوت ہے، کہ عورتین بھی جنگ مین مردون ہی کی طرح کارآمد ہو سکتی ہین، وہ کارخانون اور میدانِ جنگ مین مردون ہی کی طرح جوش و خروش سے کام کر رہی ہین، اس لئے ان کی نزاکت کا مسئلہ خود بخود غلط ہو جاتا ہے، اگر ایک مرد کسی تھیا

سے وہ دشمنون کو مار سکتا ہے، تو کیا ایک عورت دو کو نہین مار سکتی، ؟ اگر بم گرے تو کیا مرد عورتون کو اس سے بچا سکتے ہین، ؟ اگر ایسا نہین ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ دنیا کی دوسری عورتون کو نزاکت اور کمزوری کا پیکر سمجھا جائے، موجودہ جنگ عورتون کی حیثیت کو بالکل بدل دیگی، اور امید ہے کہ جنگ کے بعد زندگی کا ایک نیا کامیاب اور خوشگوار دور شروع ہوگا، اس مین ان فریب کاریون کو قطعی دخل نہ ہوگا، عورتین مردون کو نہ بھولا بھالا بچہ سمجھین گی، اور نہ مرد عورتون کو ایک راز پیچیدہ کردار اور عجیب و غریب خصلت کی مخلوق، دونون کی زندگی کا ایک ہی نصب العین ہے جس کی تکمیل دونون کو ملکر کرنا ہے، باہم ایک دوسرے کو صرف انسان سمجھنا چاہئے جسمین طرفین کی زندگی ایک دوسرے کیلئے آئینہ ہو،

اگر ہم اس طرح ایک دوسرے کی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرین، تو دونون کی زندگی بہت خوشگوار ہوگی، اس مین شک نہین کہ ہر شخص کی زندگی مین کوئی نہ کوئی گہرائی اور پیچیدگی ضرور ایسی ہوتی ہے، جس کا اسکے قریب سے قریب عزیز اور دوست کو بھی علم نہین ہوتا، لیکن یہ ہر گز نہین سمجھنا چاہئے کہ عورت ایک معمہ ہے جسکو کوئی نہین سمجھ سکتا، اور مرد ایک ایسی کھلی ہوئی کتاب ہے جسکو عورتین ایک نظر مین آسانی سے پڑھ سکتی ہین، ا - س

نفسیات ترغیب

کسی انسان کو کسی کام یا چیز یا تحریک کے لئے ہم کیونکر آمادہ کر سکتے ہین، اور اسکو ترغیب اور شوق دلا سکتے ہین، اس کے نفسیاتی اصول کیا ہین، اس کتاب مین انہی اصول کی تشریح ہے، تجارت، اشتہارات، اور تقریر و وعظ مین ہر جگہ ان اصول کی رعایت کی ضرورت ہے،

ضخامت ۲۱۱ صفحے، قیمت :- ۱۲ عہ

"منیجر"

اخبارِ علمیہ

اورینٹل کانفرنس کا گیارہوان اجلاس

کل ہند اورینٹل کانفرنس کا گیارہوان اجلاس گذشتہ دسمبر مین حیدرآباد دکن مین منعقد ہوا تھا، اسکی تفصیل انگریزی سہ ماہی رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) بابت ماہ اپریل ۴۲ء مین شائع ہوئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ شعبۂ عربی و فارسی کا اجلاس ڈاکٹر محمد حسین نینار (مدراس یونیورسٹی) کی صدارت مین ہوا، اس مین حسب ذیل مقالات پڑھے گئے: (۱) "فارسی ادب پر ایک مختصر تبصرہ" از جناب جمشید کاؤس جی کتراک صاحب بمبئی (۲) "سہ نثر ظہوری" از پروفیسر ٹی ڈی، ورما (پونا) مقالہ نگار نے اس مضمون مین یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عام طور سے جو یہ مشہور ہے، کہ سہ نثر دیباچہ ہے نورس نامہ کا جو ہندی یا دکنی اردو مین لکھا گیا ہے تو یہ خیال صحیح نہین کیونکہ سہ نثر مین بعض اقتباسات ایسے موجود ہین، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ نورس نامہ کی زبان فارسی تھی نہ کہ اردو، نیز نورس نامہ کے مطالعہ سے مطلق یہ نہین معلوم ہوتا کہ سہ نثر اس کا دیباچہ ہے (۳) "بندہ نواز بحیثیت ایک فارسی شاعر" از جناب جی، ڈی رشید صاحب (نظام کالج) (۴) "سائنس کے فضلا اور عربی زبان کے علما مین اشتراکِ عمل کی ضرورت" از پروفیسر محمد عبدالرحمٰن خان، فاضل مقالہ نگار نے اس مضمون مین یہ بتایا ہے، کہ عرب مین بہت سے سائنس کے فضلا پیدا ہوئے، جن کے علمی کارنامے کتابون مین سربمہر ہین، اس لئے اسکی ضرورت ہے، کہ عربی زبان کے علما

اور سائنس کے ماہرین دونون ملکران پوشیدہ خزانون کو عام کرکے مسلمانون کے علوم وفنون کو زندہ کرین، اس سلسلہ مین لائق مقالہ نگار نے ہندوستان کے ارباب علم سے عربی زبان کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی اپیل کی ہے،

شعبۂ اسلامی کی صدارت ڈاکٹر عبدالحق (جامعہ عثمانیہ) نے کی، اس شعبہ مین ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنا اہم اور پُر مغز مقالہ "اسلامی فقہ پر رومی قانون کا اثر" پڑھا، اس مین ڈاکٹر صاحب موصوف نے بتایا ہے کہ اسلامی فقہ مین رومی قانون کا کوئی اثر نہین پایا جاتا، کیونکہ آنحضرت صلعم فقہائے اسلام اور وہ اسلامی ممالک جہان اسلامی فقہ کو فروغ ہوا، رومی قانون سے مطلق آشنا نہ تھے، اور جس زمانہ مین اسلامی فقہ کی تدوین ہوئی، اس وقت تک رومی قانون کی کوئی کتاب عربی مین ترجمہ نہین ہوئی تھی، چنانچہ اسلامی فقہ کے مصطلحات مین کوئی ایسی اصطلاح نہین، جو کہین سے مستعار لیگئی ہو یا معرب کیگئی ہو، نیز اسلامی فقہ کی تدوین و ترتیب اور اسلامی عدالتون کی قانونی کارروائیون مین بھی رومی نظام قانون سے کسی قسم کا اشتراک ظاہر نہین ہوتا ہے،

خان بہادر مولوی عطاء الرحمن صاحب نے اپنے مقالہ "اسلامی ثقافت کی روح مین اسلام" کے حسب ذیل تین اصولون کی تشریح کی (۱) انسانی مساوات اور اخوت (۲) رواداری اور آزادی کی روح (۳) فروغ علم، ان تین اصولون کی توضیح کرتے ہوئے یہ بتایا کہ ان ہی اصولون پر تمدن کا انحصار ہے، شیخ عبدالرحمن مینی نے عربی زبان مین "عربون کی بت پرستی" پر ایک مضمون پڑھا، اس مین مقالہ نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ عہد نبوت سے پہلے عرب بتون کی پوجا ضرور کرتے تھے لیکن وہ خدا کی وحدانیت کے کبھی منکر نہ تھے، ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب (عثمانیہ یونیورسٹی) نے اردو زبان مین "فلسفۂ بدی کے بعض رموز و نکات" کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ صوفیائے کرام کا خیال ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نیکی اور بدی دونون کا خالق ہے لیکن ان کا

یہ بھی خیال ہے کہ تخلیق خداوند تعالیٰ کے تجلی کا خارجی منظر ہے، جس کو جوہر اشیا بھی کہتے ہین، یہ جواہر عالم تخلیق مین آتے ہی صورت اختیار کرلیتے ہین، جس کے بعد ان مین صفات خداوندی باقی نہین رہتی ہین، اور اسی سے بدی پیدا ہوتی ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے ابن عربی کے نظریۂ علم" پر اردو مین ایک مضمون پڑھا جس مین انھون نے یہ بتایا کہ ابن عربی کے نزدیک علم ایک یزدانی نور ہی جس کا ظہور خاص حالات مین صوفیون کے دلون مین ہوتا ہی، ڈاکٹر محمد عبد المعید خان نے اپنے مقالہ مین کلام پاک کی تفسیر کی ایک قاموس کی تدوین سے متعلق بعض مفید تجویزین پیش کین، ڈاکٹر صاحب موصوف کا مشورہ ہی کہ تیرہ سو برس مین کلام پاک کی آیتون کی جتنی تفسیرین لکھی گئی ہین، ڈکشنری آف بائبل مرتبہ ہیسٹنگ کے اصول پر ان کو ترتیب دیکر ایک جگہ جمع کر دیا جائے، تاکہ مختلف تفسیرون کے معانی و مطالب مطالعہ کرنے والون کے سامنے آجائین، اس قاموس مین قرآن کی آیتون کی ترتیب وتنظیم حروف تہجی پر راغب اصفہانی کی مفردات القرآن اور علی زادہ کی فتح الرحمٰن کے اصول پر ہو، اگر یہ کام انجام پاگیا تو بہت ہی اہم اور مفید ہوگا،

کلام پاک کے ترجمے

چین کی قومی اسلامی مجلس مین یہ طے ہوا ہے کہ کلام پاک کا ترجمہ چینی زبان مین کیا جائے، چین مین مسلمانون کی تعداد کئی کرور بتائی جاتی ہے لیکن اب تک چینی زبان مین کلام پاک کا کوئی اچھا ترجمہ نہین تھا، جس کی وجہ سے چین مین اسلام کی اشاعت و ترقی صحیح طور پر نہین ہورہی تھی، مذکورۂ بالا ترجمہ چین کے علما کی ایک جماعت کی نگرانی مین ہوگا،

قرآن مجید کا ترجمہ تلیگو زبان مین بھی ہو رہا ہے، اب سے کچھ سال پہلے ایک غیر مسلم نے کلام پاک کے انگریزی ترجمہ سے تلیگو مین ناقص ترجمہ کیا تھا، لیکن اب اندھرا یونیورسٹی کے ایک مسلمان گریجوایٹ نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا ہی، اسکی پہلی قسط انجمن تلیگو حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوئی ہی، "ص ع"

باب التقریظ والانتقاد

خندان

(یعنی رشید احمد صاحب صدیقی کی کتاب خندان پر ایک تبصرہ)

از

جناب آل احمد صاحب سرور لکچرار اردو، مسلم یونیورسٹی

ایک شاعر کا قول ہی کہ جہان کوئی حسین عورت ہی میری رشتہ دار ازلی ہے، شاعر تو صرف حسن کا قدردان ہے، لیکن حسن اور بدصورتی اخلاق اور بداخلاقی، خلوص اور ریاکاری، بلند و پست سب سے دلچسپی رکھنے والا اور ہر سکوت کو ہنگامہ اور ہر ہنگامہ کو سکوت بنانے والا طنز نگار و مزاح نگار کے سوا کوئی نہین، وہ کبھی زندگی کی کڑوی کسیلی باتون مین شہد کی شیرینی پیدا کرتا ہے، کبھی شیرین اور خوش آیند نغمون مین زہر کی تاثیر بھر دیتا ہے، وہ کتون کے شور مین شاعرے کے آداب اور ارہر کے کھیت مین ہائڈ پارک کے نظارے دیکھتا ہے، روزمرہ واقعات کے جلوۂ بے رنگ مین قوس قزح کی دھاریان پیدا کرنا، اور رنگینیون کے ہجوم مین سادگی کی یاد تازہ رکھنا طنز و ظرافت کا کمال ہے، شاعری کی طرح یہ بھی پیغمبری کا جزو ہے، اور جب سارے پند و نصائح اور اخلاقی درس بیکار ہو جاتے ہین، تو طنز کا ایک ہلکا نشتر اپنا کام کر جاتا ہے،

کچھ عرصہ ہوا اردو کے مشہور مزاح نگار اور طنز نگار رشید احمد صدیقی کی اُن تقریرون کا

ایک مجموعہ خنداں کے نام سے شائع ہوا ہے، جو گذشتہ کئی سالوں میں ریڈیو پر سنائی گئی تھیں، کتاب کے شروع میں جو مقدمے، دیباچے، پیش لفظ اور تعارف وغیرہ ہوا کرتے ہیں، وہ عام طور پر قابل اعتنا نہیں ہوتے، کیونکہ ان میں سوائے مصنف کے قصیدے اور قوم کے مرثیے کے اور کچھ نہیں ہوتا لیکن اس مجموعہ میں ناشر یا پبلشر کی طرف سے جو کچھ لکھا گیا ہے، پڑھنے کے قابل ہے، انھوں نے طنز و ظرافت کی مثال پرانے زمانہ کے جادو یا عملیات سے دی ہے، جن کے بارے میں مشہور ہے کہ اگر ان میں کہیں بھی خامی رہ جائے، تو دشمن کے بجائے خود عامل ان کا شکار ہو جاتا ہے،" اچھی طنز و ظرافت کا معیار کمال یہی ہے، کہ وہ کبھی خالی نہ جائے" اس کے لئے لکھنے والے کو پوری پوری آزادی اور سننے والے میں کچھ نہ کچھ صلاحیت ہونی چاہئے، اور بعض وقت ریڈیو پر یہ دونوں باتیں متوازن نہیں ہونے پاتیں،

کہا جاتا ہے کہ "رشید صدیقی اپنی ظرافت کے لئے خام مواد شعر و ادب سے لیتے ہیں، پطرس نوندون سے اور فرحت اللہ بیگ مُردوں سے" یہ خیال بالکل صحیح تو نہیں، مگر اس سے ہر ایک کی خصوصیت کا اندازہ ہو جاتا ہے، رشید صدیقی کبھی اشعار کے برمحل استعمال سے کبھی اُن میں تھوڑا سا تصرف کرکے اپنا کام نکال لیتے ہیں، پطرس روزمرہ کی چیزوں سے، بچوں کے شور اور بائسکل کی مختلف آوازوں سے لطف پیدا کرتے ہیں، فرحت اللہ بیگ کی وہ قلمی تصویریں بہت کامیاب ہیں جن میں انھوں نے بعض اشخاص کی سیرت کو زندہ کر دیا ہے، ان میں سب سے کم لطف شعر و ادب اور اسکی اصطلاحات میں آتا ہے، کیونکہ سب ان سے واقف نہیں ہوتے، اسلئے صدیقی صاحب کا طنز عام فہم نہیں سمجھا جاتا، دوسرے اُن کے یہاں صفائی رنگ بہت زیادہ ہے، اور جو لوگ علی گڈھ کی اقامتی زندگی، کچی بارک اور پکی بارک کی چپقلش، جہل مرکب اور یونین سے واقف نہیں، وہ طنز کی واقعیت اور گہرائی کو پورے طور پر محسوس نہیں کر پاتے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے طنز میں یکسانیت نہیں، وہ موضوع

سے اکثر دور بھی جا پڑتے ہین، اور ادب، اخلاق، آرٹ اور عورت پر لمبی لمبی بحثین چھیڑ دیتے ہین، انہین اکثر تشابہ لگتا ہے، وہ واحد متکلم کا صیغہ ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے ہین، یہ سب باتین ان کے یہان پائی جاتی ہین، مگر اس کے باوجود ان کی طنز اتنی گہری اور ان کی ظرافت اتنی منفرد ہے کہ وہ اردو کے بہترین طنز نگارون اور مزاح نگارون مین شمار کئے جانے کے قابل ہین، ان کی پہلی کتاب مضامینِ رشید مین ان کی ظرافت کے بڑے اچھے اچھے نمونے ملتے ہین، مگر یہ ظرافت سب کے لئے نہین، خندان خاص و عام سب کے لئے ہے، اس کا طنز زیادہ عام فہم، اس کے موضوع زیادہ ہمہ جہت اور ہمہ گیر، اس کے کردار زیادہ معروف اور اس کے مضامین زیادہ جامع اور مختصر ہین، اس مین چالیس کے قریب مضامین ہین، جو خاص خاص عنوانون کے تحت مین رکھے گئے ہین، ادھر ادھر کی دنیا مین ریڈیو سننے والے، ہوٹل مین ریڈیو، سفر، دعوت، شراب کی ممانعت، امتحانات، باغ، قابلِ ذکر ہین، چند معروف وغیر معروف ہستیون مین سے استاذ خندان، شیخ پیرو، ایڈیٹر، مقرر، لیڈر، بابو، بیرا، بجرو، ملاح بڑے دلچسپ ہین، مصنف یہان سب سے زیادہ کامیاب ہوئے، ہستی اور نیستی کے مسئلہ پر بھی ہیملٹ کی طرح غور کیا گیا ہے، چنانچہ اس ذیل مین شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے، اور ایم۔ ایل۔ اے، ہونے کے کیا معنی ہین، خصوصیت رکھتے ہین، چند خاکے کانفرنسون، عدالتون، کونسلون اور دوکانون کے بھی ہین، اور آخر مین اردو شاعری مین عاشق، معشوق، رقیب، ناصح، اور دربان کے "تیغ آہنگ" پر بھی طنز ملتی ہے،

اکبر کے بعد اردو مین طنز یاتی روح سب سے زیادہ رشید صدیقی کے یہان ہے، ان کی سوجھ بوجھ بہت اچھی ہے، اور ان کا تخیل موجد ہے، وہ معمولی باتون مین مضحک پہلو بہت جلد دیکھ لیتے ہین، وہ قول محال (Paradox) کے ماہر ہین، اور الفاظ کے الٹ پھیر سے خوب کام لیتے ہین، ان مین بیک وقت سوئفٹ کی تیزی، برنارڈ شا کی بت شکنی، چسٹرٹن کی طباعی

تینون کے نمونے ملتے ہین، انھون نے سجاد انصاری کے اسلوب فکر اور اسلوب بیان دونون سے فائدہ اٹھایا ہے، وہ اپنے مضامین مین اکثر قصے بیان کرتے ہین، قصے نئے نہین ہوتے، مگر ان کا انداز بیان قصون کو دلچسپ بنا دیتا ہے، وہ بہت سے کردار تراشتے ہین، جذبات کی خوب خوب مصوری کرتے ہین، وہ جزئیات مین بہت زیادہ نہین جاتے، چند گہرے اور شوخ چھینٹون سے اپنی تصویرین بناتے ہین، اور ان تصویرون کو اس طرح سجاتے ہین، کہ منہ سے بول اٹھتی ہین، وہ واقعات مین تسلسل اور غیر متعلق چیزون مین ربط پیدا کر لیتے ہین، ان کی تشبیہات نادر اور پُر زور ہوتی ہین، وہ باوجود شہری ہونے کے گاؤن والون کی معاشرت ان کے ماحول، ان کے مزاج کی بہت سچی تصویرین پیش کرتے ہیں، انھین گاؤن کی چیزون سے صرف ہمدردی ہی نہین محبت معلوم ہوتی ہے، ان کی نثر پختہ اور روان ہے، اس مین کہین کہین عظمت و جلال کی جھلک آجاتی ہے' انھین، اشخاص کی ذاتی کمزوریون سے اتنی دلچسپی نہین، جتنی قومی اور اجتماعی خامیون سے، وہ صرف ہنسوڑ نہیں، بلکہ ہنسی ہنسی مین ایسی باتین کہہ جاتے ہین، جنکی خلش عمر بھر نہ جائے، کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس ظاہری شگفتگی، اور زندہ دلی کی تہ مین ایک ذہنی کرب، ایک دلی اذیت چھپی ہوئی ہے، اڈیٹر مین آج کل کے اخبارون اور ان کے جاہل اڈیٹرون پر طنز ایسی گہری اور تیز ہے، کہ اس مین ایک المیہ رنگ پیدا ہو گیا ہے،

اکبر کے متعلق کسی نقاد کی رائے یہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے بہترین تمدنی نقاد ہین، آجکل کے مزاح نگارون مین سب سے زیادہ یہ چیز انکے شاگرد رشید مین ملتی ہے، پطرس کو تمدنی مسائل سے زیادہ دلچسپی نہین، وہ اشخاص کے نشیب و فراز کو دیکھتے ہین، ان کا صرف ایک مضمون لاہور کا جغرافیہ ایسا ہے جس مین وہان کے محکمہ حفظانِ صحت اور شہریت کے عجیب و غریب نظریون کی پردہ دری کی گئی ہے، فرحت اللہ بیگ کسی فقرے یا برجستہ محاورے سے کام لیتے ہین، ان کی زبان

کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے، دونوں کی ظرافت اعلیٰ قسم کی ہے، شوکت تھانوی کے یہاں معاشرت پر تنقیدیں بہت ہیں، مگر ان میں صحافتی رنگ زیادہ ہے، ادب العالیہ کی شان کم، مگر ان کی طباعی میں شک نہیں، رشید احمد صدیقی، مزاح نگار سے زیادہ طنز نگار ہیں، انھوں نے اس دور کی ہر خصوصیت پر رائے زنی کی ہے، اور جہاں انھیں اونچ نیچ یا افراط و تفریط نظر آئی، اسے ہموار کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً اخبار ہی کو لے لیجئے، صدیقی صاحب کے الفاظ میں "آج کل اخبار نویس کو اس اصول پر چلنا چاہئے کہ اخبار سے کسی کو فائدہ پہونچے یا نہ پہونچے، اخبار کو برابر فائدہ پہنچتا رہے، اخبار نویسی شروع اس طرح کرنی چاہئے، جیسے دین خطرے میں ہے، قوم فنا ہو رہی ہے، حکومت ناشدنی اور گردن زدنی ہے، لیکن ختم یوں کرو گویا تم نے دین کی خاطر یا قوم کی حمایت میں یا حکومت کی مخالفت میں اخبار بند کر دیا، اور بنک میں حساب کھول دیا"۔

ہماری زندگی کا ایک دوسرا جز جلسے ہیں، جلسے کرکے ہم اس قدر خوش ہوتے ہیں، گویا دنیا کا بہت بڑا مرحلہ طے ہو گیا، تقریریں کرنا اور تقریریں سننا ہماری فطرت میں داخل ہے، دوسرے کام کرتے ہیں، ہم باتیں کرتے ہیں، اگر محض لطف سخن سے دنیا میں کچھ ہو سکتا، تو ہم سب کچھ کر لیتے، ایک جلسے کا سین دیکھئے، "نظمیں پڑھی جانے لگیں، تالیاں بجنے لگیں، ہار پھول پہنائے جانے لگے کہ ایک قلفی والے نے آواز لگائی، ایک صاحب کا بچہ مچل گیا، انھوں نے مجمع کے اندر ہی سے قلفی والے کو آواز دی، صدر نے قلفی والے کو ڈانٹا، بچہ کے والد نے سمجھا کہ یہ ان کی قلفی حاصل کرنے کی آزادی میں خلل اندازی تھی، للکار کر بولے، یہ جلسہ آزادوں کا ہے، آزادی پر جان دینے والوں کا ہے، مجمع نے نعرہ لگایا بے شک بے شک، آزادی خطرہ میں ہے قلفی ضرور کھائی جائے گی، دغابازوں کا ستیاناس ہو، وغیرہ وغیرہ،

آج کل لیڈری کے جو خواہاں نظر آتے ہیں، اُن پر تبصرہ دیکھئے، "دلمیں خوب سمجھتے ہیں کہ

عقل نہین ہے، قابلیت نہین ہے، روپیہ نہین، فرصت نہین، ہمت نہین، صورت دیکھکر عورتین ہنستی ہین، بچے تالیان بجاتے ہین، بوڑھے گردن جھکا لیتے ہین، بھلے مانس دل بہلاتے ہین، ایماندار کتراتے ہین، نقیر ڈراتے ہین، مرغیان کٹ کٹ کرتی ہین، لیکن کیا کیجئے، جاہ کی ہوس، نصیبے کے کچھن، فلان شخص بڑا کہلاتا ہے، ہم کیون نہ بڑے کہلائین"۔

مقررون کی واہ واہی ہوتی ہے، اوران کی خبر بھی لیجاتی ہے، کوئی مشہور واعظ یا خطیب بڑے ارمانون سے بلایا جاتا ہے، اس کا استقبال اس طرح ہوتا ہے، اسٹیشن پر گنوارون کا ہجوم، نعرون کی صدا، پٹاخون کا چھوٹنا، گیندے کے پھولون کے ہار پہنائے اور پھول برسائے جاتے ہین، کسی نے ہاتھ چومنا شروع کئے، کسی نے سجدہ کرلیا، کوئی رونے لگا، کوئی شعر پڑھنے لگا، کسی نے زور سے نعرہ لگایا، کسی نے اسٹیشن ماسٹر پر دھول جمادی، اور قلی کی پگڑی چھین لی، ایک نے چپکے سے مہمان کی جیب کترلی، تقریر ختم کرنے کے بعد مقرر کو دست بوسی اور سلامت روی کے سلسلہ مین باہر نکلنے میں دیر ہوتی ہے "اب جو دیکھتے ہین، تو نہ کوئی آگے ہے نہ پیچھے، ہر طرف اندھیرا ہے اور یہ مسکین بیچارہ"۔

اس زمانہ کا سب سے اہم کارنامہ لیڈری ہے، لیڈری کا بھی فن بن گیا ہے، صدیقی صاحب کا خیال یہ ہے کہ جس طرح ہندوستان کے امراض کا کوئی احاطہ نہین کرسکتا، اسی طرح لیڈرون کے اقسام بھی معلوم کرنے مشکل ہین، تاہم انھون نے فصلی، ذیلی، گشتی، مادرزاد، اللہ واسطے، بابائی، شکمی، اشتہاری، خاموش بہت سی قسمین گنائی ہین، جس طرح برسات مین کھیرے، ککڑی، پھوٹ اور بھٹے پیدا ہوتے ہین، اسی طرح خاص خاص فصلون مین فصلی لیڈر پیدا ہوتے ہین، مثلاً بقرعید، محرم، دسہرے، دیوالی کے زمانہ مین ہر جگہ مارنے مرنے کے لئے لیڈر رونما ہو جاتے ہین، ذیلی لیڈر ہار پہننے مین لیڈر کے ساتھ اور نعرہ لگانے مین مجمع کے ساتھ ہوتے ہین، اور جب لیڈر جیل خانہ جاتا ہے، تو یہ اپنے گھر آجاتے ہین، مادرزاد لیڈر اندھے کے مانند ہوتا ہے، اُسے کچھ نہین

معلوم ہوتا ہے کہ صورت حال کیا ہے، وہ صرف "ہونا چاہئے" کے درپے ہوتا ہے، خاموش لیڈر گفتگو نہین کرتے، صرف انٹرویو دیتے ہین"۔

لیڈر کو پبلک کے مفاد کا ہر وقت خیال رہتا ہے، ایک پبلک کا نقشہ تو آپ دیکھ چکے، جسے اپنے حقوق کے تحفظ کا اس قدر خیال ہے، دوسری پبلک تھرڈ کلاس کے ٹکٹ گھر کے سامنے نظر آتی ہے، "ہر شخص اس کے درپے ہے، کہ اُسے سب سے پہلے ٹکٹ مل جائے، سر پر گٹھری اور بغل مین بستر ہے، کاندھا الگنی کا کام دے رہا ہے انگلی بچے کے ہاتھ مین ہے، شلوکے کے بندسے بوی بندھی ہوئی ہے، کوئی ہانپ رہا ہے، کوئی کانپ رہا ہے، عورتین کوس رہی ہین، مرد ہاتھا پائی کر رہے ہین، بچے بلبلا رہے ہین"۔

عورتین کوس رہی ہین، مرد ہاتھا پائی کر رہے ہین، بچے بلبلا رہے ہین، یہ ہندوستان کی سماجی زندگی کی سچی تصویر ہے، یا نہین، اسی کے دوسرے رُخ کو بجرو دادا کی زبانی سنئے، جو جوانی مین ڈاکا مارتے تھے، اور بڑھاپے مین ایک گاؤن کے سردار بن گئے تھے، گاؤن کے بے فکرون نے اُن سے شہری زندگی اور اس کی برکتون کی تفصیل معلوم کرنی چاہی، بجرو دادا پہلے تو چپ رہے، پھر تمباکو کا ایک نہایت آبدوز قسم کا کش لیکر چلم کو دوسرے کے حوالہ کیا اور کہنے لگے کہ شہر ونکا عجیب حال ہے، ان کے مکانات بڑے مضبوط، بڑے خوبصورت اور بڑی ہی تکلیف دہ ہوتے ہین، ان کو کھلی ہوا اور روشنی میسر نہین آتی، بڑے بڑے چوڑے راستے ہین لیکن ہر روز ان مین کوئی نہ کوئی کچل کچلا کر مر جاتا ہے، جتنا کام نہین کرتے، ان سے زیادہ دل بہلانے کی کوشش کرتے ہین"۔

بجرو نے عورتون کی تین قسمین بتائی ہین، بعض تو ایسی ہین، جنھون نے سورج اور آسمان بھی نہین دیکھے ہین، گھرون مین بیٹھی رہتی ہین، فاقہ کرتی ہین، بچے پالتی ہین، اور چکی پیستی ہین، یہانتک کہ ایک دن در و دیوار کی چکی خود انھین میں ڈالتی ہے، بعض ایسی ہین جو صرف پان کھاتی ہین، چھالیا

کرتی ہین، شوہر کو گالی دیتی ہین، اور اپنے میکے والون کی پرورش کرتی ہین، لیکن اب ایک قسم اور بھی پیدا ہوگئی ہے، یہ انگریزی بولتی ہین، ساڑی پہنتی ہین، اور سینما دیکھتی ہین، شوہران کی خدمت کرتے ہین، اور یہ قوم کی خدمت کرتی ہین، اکبر اس خطرے سے پہلے ہی آگاہ تھے، ایک جگہ لکھتے ہین، :-

تعلیم کی خرابی سے ہوگئی بالآخر　　شوہر پرست بیوی، پبلک پسند لیڈی

موجودہ تعلیم کی خرابیون پر اکبر کی نظر بھی تھی، وہ اسے محض بازاری اور سرکاری سمجھتے تھے لیکن اسکی جس خرابی پر رشید صدیقی کی نظر گئی ہے وہ بنیادی ہے، وہ نظام تعلیم جو افراد کی صلاحیتون کو نہین دیکھتا، بلکہ سب کو ایک ہی قسم کی تعلیم دیتا ہی اور جس کا مقصد کسی خاص منزل کی طرف طالب علمون کی ایک بھیڑ کو ڈھکیل دینا ہے، ناقص اور ادھورا ہے، ہر فرد کی صلاحیت کو علٰحدہ علٰحدہ پرکھنا، اور اسے زیادہ سے زیادہ ترقی دینا، تاکہ وہ ایک اجتماعی کوشش سے ہم آہنگ ہوسکے، ضروری ہی، بحر دوادا اس عجائب خانہ کا ذکر کرتے ہین جس کو شہریون نے اسکول، کالج، یونیورسٹی، اور بورڈنگ ہاؤس کا نام دے رکھاہے "یہان یہ ہر ایک کو ایک قسم کا منتر پڑھاتے ہین، اور ایک ہی قسم کے سانپ سے کھیلنا سکھاتے ہین، ایک ہی قسم کا راتب دیتے ہین ایک ہی قسم کے کام لیتے ہین، تسکار پر گزران کرنے والے کو مردار کھلاتے ہین، کھیت جوتنے والے کو گورکنی سے واقف کراتے ہین، ہرن پر گھاس لادتے ہین، نقش نگینے کا کام کرنے والے سے مگدر ہلواتے ہین، ہندوستان مین پیدا ہونے والے کو یورپ کا خواب دکھاتے ہین، سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہین، اور ایک راستہ پر چلاتے ہین" مخصوص صلاحیتون کا اس طرح جو خون ہوتا ہے، اس پر اقبال کی طنز بھی اتنی گہری نہین، اگرچہ یہ بھی وہین کا فیضان ہے،

دوسرے الفاظ مین رشید صدیقی کی ظرافت محض زندہ دلی ہی نہین، ایک سنجیدہ مقصد بھی رکھتی ہے، یہ مقصد ان کے یہان سب سے زیادہ اہم ہے، اس کے بعد اُن کے آرٹ کا نمبر ہے،

یہ آرٹ عجیب و غریب چیزون کو باہم مربوط یا ہم رشتہ کر دینے کا آرٹ ہے، ندی اور عورت دونون کا ایک ہی بیوہار ہے، دونون طاقت اور رفاقت پسند کرتی ہین، یہی ندی جب طغیانی پر آجائے تو آج کل کے نوجوانون کی مانند ہو جاتی ہے یعنی ہر قید و بند سے آزاد، پولیس اور یونیورسٹی، دونون تحقیقات پر ایمان رکھتے ہین، یہ اور بات ہے، کہ ایک سزا دلواتی ہے، دوسری کونسد دیتی ہے، اکبر نے شیخ جی کے دونون بیٹون کے باہنر ہونے کی داد شاید، یہی سوچکر دی تھی، رشید صدیقی کی تشبیہات بھی نہایت چست اور جاندار ہین، شیخ پیرو کا قد ایک مضبوط نیم سوختہ، ببول کے تنے کی مانند ہے، صدر کرسی صدارت پر اس طرح رونق افروز ہین، جیسے ڈیوٹ پر بھالو، شراب کی بوتل جیب سے اس طرح برآمد ہوتی ہے، جیسے دلہن حجلۂ عروسی سے نکلے، یا بہادر کی تلوار نیام سے باہر آئے، یا شباب کا خواب مجسم ہو جائے، سرشار کی طرح یہ بھی کردارون کا ایک نگارخانہ پیش کرتے ہین مختلف قسم کے لوگون کی وہ بھیڑ ہے، کہ تصویر گڈمڈ ہو جاتی ہے، اس تصویر مین کچھ لوگ ایسے بھی ہین جو ذہن مین محفوظ ہو جاتے ہین، شاعر جو اس طرح شعر پڑھتے ہین، گویا غزل کے معنی عورتون سے باتین کرنے کے نہین بی اکس انجنون پر دانت پیسنے کے ہین، مہمان جن کی داڑھی چادرون کی مالا ہے، اور شور با گنگا جمنی خضاب کی بہار دکھا رہا ہے، گویئے جن کا گانا ہسٹریا معلوم ہوتا ہے، خندان جو ہمیشہ اظہار تخلص کرتے رہتے ہین، بہرے جو معلوم ہوتا ہے مرچین کھائے ہوئے ہین، اور بیوی کے قتل کے منصوبے کر رہے ہین، روشن خیال اور مہذب انسان جو اپنی نیک بخت کو حالی کی مسدس اور دوسرون کی جوان بخت کو حافظ کی غزل قرار دیتے ہین، ہوٹل مین ریڈیو سننے والے، جو ہر وقت یہ سوچتے رہتے ہین، کہ گھر والی دانت پیس رہی ہو گی، اور ہمسائی گرم مسالہ مانگنے اور چغلی کھانے آئی ہو گی، یا بو جن سے جنگ کرنے مین کوئی خطرہ نہین، لیکن جن سے صلح ___ ت کا پیغام ہے، ملّاح جو رات کو ڈاکا ڈالتے ہین، اور دن کو چپو چلاتے ہین، بزرگ قوم جو جھوٹ بولتے ہین، اور ہیٹنگ

کرتے ہین، ہیٹنگ کرتے ہین اور جھوٹ بولتے ہین، غرض یہ اور ایسے ہی بہت سے کردار ہین جو ذرا دیر کے لئے ہمارے سامنے آتے ہین، مگر جب آجاتے ہین، تو سورج چمکتا رہتا ہی، اور غم پاس نہین پھٹکتا،

الڈس ہکسلے (ALDOUS HUXLEY) نے ایک جگہ لکھا ہی کہ اس دور مین ذہن تیز اور قواے جسمانی مضمحل ہوگئے ہین، جتنے پچھلے بت تھے، ہم نے توڑ ڈالے لیکن چونکہ نئے بت نہ بنا سکے، اسلئے زندگی مین ایک خلا ہی محسوس کرتے ہین، بت شکنی اس دور کی خصوصیت ضرور ہے مگر ساتھ ساتھ بت گری بھی برابر جاری ہے، پہلے مابعد الطبیعات تصوف، اخلاقیات وغیرہ کے بُت بنے ہوے تھے، اب ارتقا، مادیت، اضافیت کے بُت ہین، شاعر، فلسفی، سائنس دان یہ سب نئے نئے بت بنانے مین مصروف ہین، طنز نگار ان کو توڑنے مین اس مین کوئی شک نہین، کہ اس دور کی روح زیادہ تر طنز یاتی ہے، ہمارے ادب مین اس کا عکس سبسے زیادہ رشید صدیقی کے یہان ملتا ہی،

اس مجموعہ کی سب تقریرین ایک سی نہین ہین، یہ ہو بھی نہین سکتا تھا، انشا کے لطیفون کی مثال پیش نظر رکھئے، تو معلوم ہوگا، کہ یہ کام کس قدر مشکل ہے، کہین کہین تمہید اتنی لمبی ہوگئی ہی کہ اصل عنوان کے لئے گنجایش ہی نہین رہی، امتحانات اسکی نمایان مثال ہیں، ریڈیو والون پر جو توجہ صرف کی گئی ہے، اس کے وہ ہرگز مستحق نہین ہین، بعض مضامین مثلاً ریڈیو کا مستقبل، یا اگر میں فاونٹن پن ہوتا، یا اگر مین چور ہوتا، دلچسپ نہین ہوسکے، کبھی کبھی شعر اچھا نہ ہونے کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ مصرعۂ طرح مہمل ہوتا ہے،

اپنے ایک مضمون مین انھون نے ساری دنیا جہان کے گوبڑ دکھائے تھے، انکے بھی کو بڑ ہین، عورت اور باغ سے انھین بڑی دلچسپی ہے، چاہے باغ کی وجہ سے عورت سے یا عورت کی وجہ سے باغ سے، الفاظ سے یہ بھی کھیلتے ہین، اس سے وہ اچھا کام بھی لیتے ہین، مثلاً جاپان کی تہر

سستی ہی، سوائے اسکی وشمنی کے مگر بعض وقت یہ رعایت لفظی "گھا گھیت" ہو کر رہ جاتی ہی، اردو کے ایک مشہور نقاد نے ان کے متعلق لکھا تھا، کہ "یہ زندون سے ڈرتے ہین، اور مردون مین شیر ہین، مگر یہ بات تو حالی کی تنقیدون مین بھی ہے، جہان معاصرین کی تعریف مین بے حد غلو کیا گیا ہے، مقامی رنگ کی کثرت ضرور ان کے حلقہ کو محدود کرتی ہی، مگر اس سے ان کی تصویرون مین زندگی زیادہ آجاتی ہے، پطرس کی ظرافت ان کے مقابلے مین بڑی زود ہضم اور ہلکی پھلکی ہی، اس کی مثال ڈاکلیٹ کی سی ہے، جس سے خون بڑھتا ہے، اور چہرہ روشن ہو جاتا ہے، رشید صدیقی کی ظرافت مین زیادہ وزن ہے، اور اسی وجہ سے کہین کہین ثقالت بھی، پطرس دوسرون پر ہنسکر اپنے لطف زندگی مین اضافہ کرنا چاہتے ہین، رشید صدیقی اس لئے ہنستے ہین کہ اس طرح دوسرون کا کام چلتا رہے، خود ایک جگہ کہتے ہین، کہ "میرا مقصد آپ کی معلومات مین اضافہ نہین تاثرات مین تنوع پیدا کرنا ہے" دلچسپ فقرون، دلکش کردارون، گہری طنز اور وقیع ظرافت کے علاوہ ان کے یہان نثر کا ایک منفرد اسلوب بھی ملتا ہے جس مین اقبال کے اشعار اور ابوالکلام کی عظمت جھلکتی ہے، یہ عظمت ظرافت کی وجہ سے عام طور پر دب گئی ہے، مگر بعض جگہون پر نمایان ہو ہی جاتی ہے،

نقوشِ سلیمانی

یہ مولانا سید سلیمان ندوی کی ہندوستانی اور اردو زبان و ادب سے متعلق تقریرون تحریرون، اور مقدمون کا مجموعہ ہی، جو انھون نے بعض ادبی کتابون پر لکھے،

ضخامت ۵۰۰ صفحے، قیمت :-

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

غلامانِ اسلام حصہ دوم، از مولانا سعید احمد صاحب ایم اے تقطیع بڑی ضخامت ۵۴۲ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت:۔ مجلد صہ، بے جلد للعہ، پتہ:۔ ندوۃ المصنفین قرول باغ، نئی دہلی،

یورپ نے اسلام کی جائز کردہ غلامی کے خلاف جو پروپگنڈا کیا ہے، اس کے جواب مین مولنا سعید احمد صاحب نے یہ کتاب لکھی ہے، اسکا پہلا حصہ "اسلام مین غلامی کی حقیقت" کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے، اس پر معارف مین ریویو بھی ہو چکا ہے، اس مین دوسرے مذاہب اور اقوام مین غلامی کی تاریخ، اوسکی حیثیت اور اسکی بدترین شکلون کو دکھا کر اس کے مقابلہ مین غلامی مین اسلام کی اصلاح اور غلامون کو اس کے عطا کردہ حقوق کی تفصیل پیش کیگئی تھی، جسکے بعد غلامی محض نام کی غلامی رہجاتی ہے، درحقیقت اسلام نے غلامون کو جو مساویانہ حقوق اور جس طرح انھین ہر طرح کی ترقی کے مواقع عطا کئے، اس کا یہ مین ثبوت ہے، کہ فقر و درویشی کے بوریہ سے لیکر علم وفن کی مسند اور تخت وتاجِ فرمانروائی تک دینی اور دنیوی ترقی کا کوئی ایسا شعبہ نہین ہے جس مین انھون نے کمال نہ حاصل کیا ہو، ان مین بڑے بڑے اہل اللہ اور عارفِ حق بھی ہوئے، علماء اور ائمہ بھی فاتح اور کشور کشا بھی، اور صاحبِ تاج ونگین بھی، مسلمانون کی تاریخ غلامون کے کمالات اور ان کی عظمت سے بھری ہوئی ہے، اس حصہ مین انہی باعظمت غلامون مین سے چھتر غلام صحابہ، تابعین تبع تابعین، صوفیاء، اور علمائے شعروادب کے حالات لکھے گئے ہین، یہ تعداد نمونہ از خروارے ہے

بھی کم ہے، اس میں صرف چند شعبوں کے صاحب کمال غلاموں کا ذکر ہے، ورنہ ان کی فہرست اتنی طویل ہے، کہ اگر صرف ان کے نام گنا دیے جائیں، تو بھی ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے تاہم اس کتاب میں جسقدر حالات ہیں، وہ اسلام کے غلاموں کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہیں، اس کتاب میں جن بزرگوں کے حالات لکھے گئے ہیں، ان میں سے ۴۲ یعنی نصف سے زیادہ کے حالات دارالمصنفین کی سیر الصحابہ اور تابعین میں مفصل نکل چکے ہیں،

ایک معلم کی زندگی حصہ اول و دوم، مرتبہ جناب عبد الغفار صاحب مدہولی استاذ جامعہ ضخامت ہر دو جلد تقریباً ایکہزار صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد صہ پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ قرولباغ نئی دہلی،

مؤلف کتاب جامعہ کے ان اساتذہ میں ہیں، جنھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے، ارباب جامعہ کو عموماً، اور مدہولی صاحب کو خصوصاً ایسے نئے نئے تعلیمی تجربوں کی دھن ہے، جو تعلیم و تربیت کے ساتھ طلبہ کے سارے نظام اوقات اور مشاغل زندگی پر حاوی ہوں اور جس میں ان کی سیر و تفریح اور کھیل کود کا نظام بھی ایسا رکھا جائے، اور ان کے لئے ایسے مشاغل پیدا کئے جائیں، جو تفریح اور دلچسپی کے ساتھ تعلیمی فوائد سے بھی خالی نہ ہوں اور ان کی آیندہ عملی زندگی میں مفید اور کار آمد بن سکیں، ایک معلم کی زندگی اسی قسم کے بیس سالہ تعلیمی تجربوں کی روداد ہے، اس میں جستہ جستہ جامعہ ملیہ کے اہم حالات بھی آگئے ہیں، یہ کتاب عام لوگوں کے لئے دلچسپ اور طلبہ و معلمین کے لئے مفید ہے،

فن شاعری مترجمہ جناب عزیز احمد صاحب بی اے آنرز لندن، استاذ انگریزی جامعہ عثمانیہ تقطیع بڑی، ضخامت ۱۱۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ پتہ:- انجمن ترقی اردو ہند، دہلی،

بوطیقا (Poetics) فن شاعری اور ڈراما پر ارسطو کی بڑی مشہور اور معرکۃ الآرا تصنیف اور ادبی تنقید کی قدیم ترین کتابوں میں ہے، اس میں شاعری اور ڈراما کے اقسام اور اجزاء پر فنی حیثیت سے بحث کی گئی ہے، کتاب پانچ حصوں میں تقسیم ہے، شاعری پر ایک عام اور بالموازنہ نظر، ٹریجڈی، رزمیہ شاعری، نقادوں کے اعتراض اور ان کے جواب دینے کے اصول، ٹریجڈی رزمیہ شاعری سے افضل ہے، ان میں سے ہر ایک پر بڑی اور جامعیت اور خوبی کیساتھ تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے، ارسطو کی دوسری تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی انکی ابداع اور نکتہ سنجی کا نمونہ ہے، اگرچہ اس کا مذاق مغربی ہے لیکن عام شاعری اور ڈراما کے متعلق بھی اس میں مفید معلومات اور فنی نکتے موجود ہیں، دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، اور اسکی شرحیں لکھی جا چکی ہیں، جناب عزیز احمد صاحب نے اردو میں منتقل کیا ہے، ترجمہ بہت سلیس ہے، کتاب کے شروع میں فاضل مترجم کے قلم سے ایک مقدمہ ہے، جو بجائے خود کتاب کے مباحث پر مفصل تبصرہ ہے،

آج کا مصر از جناب محمد حسن الاعظمی و خورشید عبد السلام صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ اردو اکیڈمی لاہور،

ہندوستان اور مصر کے گوناگوں تعلقات کے باوجود، عموماً ہندوستانیوں کو وہاں کے سیاسی حالات کے علاوہ اور دوسرے حالات سے کم واقفیت ہے، جناب محمد حسین صاحب اعظمی جنھوں نے کچھ دنوں مصر میں تعلیم حاصل کی ہے، جناب خورشید عبد السلام صاحب کو وہاں کے مختلف حالات قلمبند کرائے تھے، انھوں نے اسکو مرتب کرکے ایک مفید کتاب بنا دی، اس میں مصر کی مختصر قدیم تاریخ، وہاں کے سیاسی تعلیمی اور معاشرتی حالات، مختلف سیاسی سرکاری اور غیر سرکاری پارٹیوں، ازہر جدید، جامعہ مصریہ، اور دوسرے تعلیمی اداروں اور مصر کی ممتاز شخصیتوں کا مختصر حال ہے،

دینِ اسلام (حصہ اول) مولفہ مولنا لطف الرحمن صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت معلوم نہین۔ پتہ :- مکتبہ ترجمان القرآن شہر بالدہ، صوبہ بنگال،

مصنف نے اس کتاب مین اسلام کے بنیادی عقاید، توحید، رسالت، ایمان، آخرت جزا و سزا عبادات اور ارکانِ اسلام کو دلنشین انداز مین بیان کیا ہے، اور اس کے مقابلہ مین کفر و شرک اور مشرکانہ اعمال و اقوال بتائے ہین، آخر مین انسانی زندگی کی دوسری ضروریات مثلاً کھانے پینے، لباس، نکاح و طلاق، شادی و غمی، اور میراث اور عام اخلاق کے متعلق اسلامی تعلیمات کو پیش کیا ہے، کہین کہین ان کی حکمتین اور مصلحتین بھی بیان کر دی ہین،

انشاے داغ مرتبہ جناب سید علی حسن صاحب مرحوم مارہروی تقطیع بڑی، ضخامت ۱۶۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ پتہ :- انجمن ترقی اردو ہند دہلی،

جناب احسن مارہروی مرحوم نے اپنے استاد داغ دہلوی کے خطوط بڑی تلاش و جستجو سے جمع کرکے مرتب کئے تھے، جسے ان کی وفات کے بعد انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے اس مین والیانِ ریاست، حکام، امرا اور داغ کے احباب و تلامذہ کے نام ان کے ۱۲۹ خطوط ہین، ان مین ادبی حیثیت سے کوئی خصوصیت نہین ہے، لیکن اس حیثیت سے مفید ہین کہ ان سے داغ کے حالات اور اس زمانہ کے بعض واقعات پر روشنی پڑتی ہے، اس کی اشاعت سے ایک باکمال استاد کی نثر کا نمونہ بھی نگاہون کے سامنے آگیا، "م"

The Indian Constitutional Tangle

(ہندوستان کی آئینی پیچیدگی) مؤلفہ جمیل الدین احمد لکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ و طباعت بہتر قیمت ۸؍ پتہ :- شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور،

اس مختصر رسالہ مین موجودہ جنگ کے آغاز سے اپریل ۱۹۴۱ء تک ہندوستان کے آئینی الجھاؤ کے مختلف پہلوؤن پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سلسلہ مین کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاسی جدوجہد دونون جماعتون کی چشمک اور ان کے طرز عمل سے برطانوی حکومت کی پالیسی مین وقتاً فوقتاً جو تبدیلیان ہوتی گئی ہین، ان پر بھی بحث کی گئی ہے، اسی کے ساتھ کانگرس کے سوراج کے تخیل، مجلس دستور ساز کے مطالبہ مسئلۂ اقلیت، عارضی قومی حکومت، وائسرا ے کا اعلان اگست ۱۹۴۰ء، وزیر ہند کے مختلف بیانات، مسلم لیگ کے مطالبات، خصوصاً پاکستان کی اسکیم پر خوش اسلوبی سے تبصرہ کیا گیا ہے، مولف مسلم لیگی ہین، اسلئے لیگ کے طرز عمل اور مطالبات کو واقعات اور حقائق کی روشنی مین سراہنے کی کوشش کی ہے، اور پاکستان کو ہندوستان کے آئینی اور فرقہ وارانہ اختلافات کا واحد حل قرار دیا ہے، ممکن ہے کسی کو مؤلف کی راے سے اختلاف ہو لیکن تحریر کی متانت و سنجیدگی کے اعتبار سے یہ رسالہ ہندوستان کی سیاست سے دلچسپی رکھنے والون کے غور و مطالعہ کے لائق ہے،

نغمۂ توحید، از جناب سعید تقطیع اوسط، ضخامت ۵۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، پتہ :- شرف الدین الکتبی واولادہٗ ۲۹، محمد علی روڈ بمبئی، نمبر ۳،

نغمۂ توحید ساز سعید کا اسم با مسمیٰ نغمہ یعنی توحید، اصلاح عقائد، صحیح دینی تعلیمات اور دوسرے مفید مذہبی موضوعون پر نظمون کا مجموعہ ہے، یہ نظمین شاعری کی زبان مین وعظ و درس کی حیثیت رکھتی ہین، البتہ کہین کہین شاعری کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے جس سے اس قسم کی نظمون مین بچنا بہت دشوار ہے،

"م ع"

جلد ۴۹ ماہ جمادی الاول ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۲ء عدد ۶

مضامین

شذرات،	سید سلیمان ندوی،	۴۰۲-۴۰۴
شریعت اسلام اور موجودہ ہندوستان میں کاشتکاروں کے حقوق،	مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی،	۴۰۵-۴۱۴
مناقب ذوالنورینؓ،	جناب محمد ابو اللیث صاحب صدیقی ایم اے لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،	۴۱۴-۴۳۰
تیموری شاہزادیوں کا علمی ذوق،	سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب علیگ رفیق دار المصنفین،	۴۳۱-۴۴۴
ہندی ادب کا دور جدید،	جناب گوری سرن لال سری واستو صاحب ایم اے علیگ،	۴۴۵-۴۵۴
فن گفتگو،	"ص ع"	۴۵۵-۴۵۹
چین میں مسلمان،	"ا-س"	۴۶۰-۴۶۱
اخبار علمیہ،	"ص ع"	۴۶۲-۴۶۴
صفۃ المعمورہ علی البیرونی،	جناب سید حسن برنی بی اے ال ال بی علیگ، ایڈوکیٹ بلند شہر،	۴۶۵-۴۷۴
مطبوعات جدیدہ،	"م"	۴۷۵-۴۸۰

شذرات

آجکل گرمی کی شدت سے دارالمصنفین سونا پڑا ہی اکثر رفقا، اپنے گھروں میں ہیں، خاکسار اپنے وطن میں ہو، مولانا مسعود علی صاحب اپنے وطن میں اپنی تعمیر میں مصروف ہیں، حیات شبلی کی چھپائی بھی گرمی کی حدت کے سبب سے روک دی گئی ہی، کوئی چھینٹا پڑے تو پھر کام شروع ہو،

رحمت عالم کی فروخت کا روپیہ جو چار ہزار تھا حسب اعلان دفتر ندوۃ العلما کو بھیجدیا گیا تاکہ وہ ندوہ کے تعمیری فنڈ میں جمع ہو اور اس سے چھوٹے بچوں کا دار الاقامہ بنایا جائے، اس سلسلہ کی مزید خوشخبری یہ ہو کہ ملتان کی ایک تعلیم یافتہ مسلمان خاتون نے جن کا نام مختار بیگم ہے اور جو انگریزی مدارس نسواں کی انسپکٹریس ہیں، ڈیڑھ ہزار روپیہ کا چک اس لئے ہمارے پاس بھیجا ہے کہ ہم اس سے دار العلوم ندوہ میں ان کے نام سے کوئی کمرہ بنوا دیں، اللہ تعالیٰ موصوفہ[1] کو جزاے خیر دے، اور مزید توفیق نیک بخشے،

ہندوستان میں مسلمان اپنی سیاسی خود مختاری کے لئے جد وجہد کر رہے ہیں، لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے کہ نفس سیاسی خود مختاری کی قیمت دنیا کے بازار میں کیا ہے؟ سیاسی خود مختاری اُس وقت تک دل خوش کن خواب سے زیادہ نہیں، جب تک اسکی اساس ایمانی جسمانی، اقتصادی اور تعلیمی طاقتوں کے چار ستونوں پر قائم نہ ہو،

---

[1] یہ تحریر پریس میں جا رہی تھی کہ ملتان سے موصوفہ کی وفات کی خبر موصول ہوئی، اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے، (سلیمان)

انسان صرف اپنی طاقت سے زندہ رہتا ہے، ہماری انفرادی زندگی بھی ہماری طاقت ہی کا نتیجہ ہے، اگر ہمارے جسم و اعصاب اور دل و دماغ کے اندر قوت باقی نہ رہے تو ہم میں سے کسی فرد کی بھی انفرادی زندگی قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح کوئی اجتماعی زندگی بھی کبھی قائم نہیں رہ سکتی، اگر اس کے اندر ایمان کی طاقت، جسم کی طاقت، اقتصاد کی طاقت اور تعلیم کی طاقت نہ ہو،

قرآن پاک نے بنی اسرائیل کے آغاز سلطنت کے قصہ کے ضمن میں یہ بتا دیا ہے کہ حکمرانی کی صلاحیت واستعداد کے لئے دو صفتیں ضروری ہیں، بَسۡطَةً فِی الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ یعنی علم اور جسم کی طاقت، علم کی طاقت کے دائرہ میں ایمان اور تعلیم صحیح دونوں داخل ہیں، اور جسم کی طاقت میں اس کے سپاہیانہ جوہر کی طرف صاف اشارہ ہے، اور جہاد الٰہی کی راہ میں انفاق فی سبیل اللہ کی بار بار تاکید جماعت کی اقتصادی طاقت کو نمایاں کرتی ہے،

لوگ جسمانی و اقتصادی طاقت کی ضرورت کو تو تسلیم کریں گے، مگر ایمانی اور تعلیمی طاقت کے باب میں ہم سے دلیل کے طالب ہوں گے، لیکن ایمان اور تعلیم کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد یہ شک خود بخود زائل ہو جائے گا، انسان جس غرض سے کوئی کام کرتا ہے، اس غرض کی صحت، اس صحت کا یقین اور اس یقین کے لئے جاں فروشی کا جذبہ ایمان ہے، مسلمان کے جہاد کی اصل غرض و غایت، حکومت، تجارت، قومیت اور وطنیت نہیں، بلکہ صرف اعلاء کلمۃ اللہ ہے یعنی ایک اللہ کی حاکمیت علی الاطلاق کے تحت میں انسانوں کی دینی اخوت کا قیام، اور اس مقصد کے حصول کے لئے صحیح طریق و تدابیر کے علم کا نام تعلیم ہے،

اس مختصر تمہید کے بعد یہ عرض کرنا ہے کہ مسلمان اگر اپنی سیاسی خود مختاری کے طلبگار رہیں تو ان کو چاہئے کہ اپنے اندر پہلے ایمان کی طاقت، جسم کی طاقت، جماعتی اقتصاد کی طاقت، اور تعلیم کی طاقت جمع کریں، اور اس کے وسیلہ سے سیاسی طاقت کا خواب دیکھیں،

دنیا میں آج بھی اور پہلے بھی جب کسی قوم نے سیاسی طاقت حاصل کی ہے، ان چار طاقتوں کے حصول کے بعد ہی کی ہے، دنیا کی پچھلی تاریخ تو افسانہ ہے، مگر آج کا پیش نظر قصہ تو ناقابلِ انکار حقیقت ہے، جس قسم کی سیاسی طاقت اور جس غرض کے لئے حکومت کا قیام آج جو قوم کر رہی ہے، غور سے دیکھئے کہ اس کے لئے اس کی ایمانی طاقت، جسمانی طاقت، اقتصادی طاقت، اور تعلیمی طاقت کس کس طرح ہر ہر قدم پر اُس کو سنبھال کر آگے بڑھا رہی ہے،

اقتصادی طاقت کے معنی شخصی دولتمندی کے نہیں ہیں، بلکہ کسی نصب العین کے لئے قوم کی جماعتی مالی حالت کی بہتری اور اس سے زیادہ اس کے لئے ایثار، اور اس کے حصول کی راہ میں ہر انفرادی ضرورت کی قربانی،

مقالات

شریعت اسلام

اور

موجودہ ہندوستان مین کاشتکارونکے حقوق

از مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی

(۲)

موجودہ ہندستان مین کاشتکارون کے حقوق

ان تصریحات کے سامنے آجانے کے بعد موجودہ ہندوستان کے کاشتکارون کے حقوق کے متعلق سب سے پہلی بات یہ ذہن مین رکھنے کی ہے کہ ہندوستان کے تمام صوبون مین چونکہ کاشتکاری کی نوعیت ایک قسم کی نہین ہے، لہذا تمام صوبون کی کاشتکاری پر ایک قسم کا حکم بھی نہ ہوگا،

بنگال اور بہار اور یوپی کے جن مشرقی اضلاع مین بندوبست دائمی او استمراری ہے، وہان موروثی زمین کے کاشتکار آئین اسلامی کی رو سے بلاشبہ زمین کو مالک ہین جسکے مختصر دلائل حسب ذیل ہین،

لیکن وہ صوبے جہان کی اراضی "حکومت وقت" کی سمجھی جاتی ہین، اور ان کی نوعیت آئین اسلامی کی رو سے اراضی مملکت یا اراضی حوز" کی کہی جاسکتی ہے وہ قابل بحث ہین، اور جب تک

اس صوبے کے حالات اور رعایا اور حکومت کے تعلقات کی پوری نوعیت سامنے نہ ہو، نہ اُن پر رائے دیجاسکتی ہے، اور نہ آئین اسلامی کو ان پر منطبق کیا جاسکتا ہے، اس لئے ذیل مین ہم جو کچھ لکھین گے، اس کا تعلق صرف صوبہ بہار اور بنگال اور یو پی کے ان اضلاع سے ہوگا، جہان دائمی استمراری بندوبست ہی کیونکہ دوسرے صوبہ کے حالات کی مجھکو صحیح اطلاعات نہین ہین،

بنگال و بہار کے متعلق جہان تک میرے معلومات کا تعلق ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کو مغل حکومت نے کمپنی کو جب اس شرط پر دیوانی عطا کر دی کہ وہ ۲۶ لاکھ سالانہ دہلی دربار مین داخل کیا کرے، اور ۵۰ لاکھ روپیہ نواب مرشدآباد کو سلطنت کے فوجی اخراجات وغیرہ کے لئے ادا کیا کرے، تو اس وقت یہان کی زمین رعایا کے ساتھ بندوبست تھی، چاہے اسکی شکل شاہی وقت سے نمبر اسے لیکر نمبر ۳ تک کی ہو، یا نمبر سات کی ہو، ان کل صورتون مین رعایا مالک ٹھہرتی ہے، اور آئین اسلامی کی روسے بحیثیت مالک کے ان کو اس کا حق حاصل تھا، کہ وہ بیع کرین، بارہن رکھین، اجارہ پر دین، یا وقف کرین، اور مورث کے مرنے بعد اپنے قانون ارث کے مطابق اوس کو تقسیم کردین،

برطانوی ہند کی حدود مین "انعام مخلد" کی حیثیت مغل حکومت کی جانب سے بہار و بنگال کے زمیندارون کو کسی زمین پر حاصل تھی یا نہین؟ یہ میرے علم مین نہین ہے، اگر ایسا ہو تو انعام مخلد کے محدود رقبہ مین مالکانہ حیثیت ان کی شرعًا ثابت ہوگی، اور اس انعام مخلد کی حیثیت والی زمین کو ان سے لیکر جس نے کاشتکاری کا حق حاصل کیا ہوگا، اسکی حیثیت نمبر ۲ کی ہوگی، اور وہ مالک اس زمین کا نہین ہوگا، جیسا کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے معلوم ہو چکا ہی، کہ نقدی لگان پر دوسرے کی زمین مین کاشتکاری کرنے سے وہ کاشت کا مالک نہین ہوتا ہی،

رہی نمبر ۵ کی زمین جس کو شرعی اصطلاح مین "اراضی مملکت" یا اراضی حوز" کہتے ہین یعنی

حکومت کی زمین جس کی ہمارے صوبہ بہار میں ایک صورت "خاص محال" کی ہے، حکومت اس کو بقید مدت بندوبست کرتی ہے، اور ختم مدت پر پھر اسکا بندوبست یا تو سابق شخص کے ساتھ کرتی ہے، یا دوسرے کو دیدیتی ہے، اس صورت میں رعایا کی ملکیت کا فتوی نہیں دیا جاسکتا، ہمان شرعی اصول پر یہ کہا جاسکتا ہے، کہ حکومت کو بندوبست کی تجدید اسی کے ساتھ کرنی چاہئے، اور اس سے زمین لے کر دوسرے کو دینا نہیں چاہئے،

بہرحال آج جن زمینوں کو صوبہ بہار میں موروثی کہا جاتا ہے ۱۷۶۵ء میں یہ سب کی سب رعایا کے ہاتھ میں بائی نوع کان خراجی حیثیت سے تھیں، اس بنا پر وہ سب کی سب رعایا کی یعنی کاشتکار کی ملکیت تھیں جس میں شرعاً اس کو ہر طرح کے مالکانہ تصرف کا حق تھا کمپنی رعایا سے مالگذاری وصول کرتی تھی، اور وصول کرکے حق مقررہ کو ادا کرتی تھی، باقی سے خود منتفع ہوتی تھی لیکن عملاً کمپنی کو مالگذاری کی وصولی میں مشکلات اور دقتوں کا سامنا رہتا تھا، اور اکثر خسارہ اور گھاٹا ہوتا تھا، اور کمپنی کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا،

اس سلسلہ میں کمپنی نے مختلف اوقات میں مختلف کوششیں کین لیکن اکثر و بیشتر عملاً کمپنی کو مالی نقصان ہوتا رہا، یا اگر مالیہ بالکلیہ اور پورا پورا کبھی وصول بھی ہوا، تو نہایت تشدد اور ظلم وعدوان کے ساتھ ہوا، اس بناپر کمپنی نے مناسب سمجھا کہ زمینداری سسٹم قائم کیا جائے اور زمینداروں کو اس کا پٹہ دیدیا جائے، چنانچہ کمپنی نے متعدد مرتبہ اس کا تجربہ کیا، اور زمینداروں کے ساتھ محدود مدت کے لئے پٹہ کیا، پھر لے لیا، پھر پٹہ کیا، پھر انقضاے مدت پر لے لیا، تاآنکہ زمینداروں کے ساتھ انتہائی مالگذاری پر ۱۷۹۳ء میں آخری پٹہ اور بندوبست اس اصول پر کیا گیا، کہ ایک سو دس روپیہ جو شاہی مالگذاری رعیت کے اوپر ہے، اس میں سے زمیندار دس روپیہ اپنا حق وصولی لے کر ایک سو روپیہ زمیندار گورنمنٹ کو دے گا،

یہ آخری تجربہ کامیاب ثابت ہوا، اور زمینداروں کے ذریعہ کمپنی کو پورا مالیہ وصول ہونے لگا، تو کمپنی نے پارلیمنٹ سے استصواب کرکے پورے دس سال کے بعد ۱۷۹۳ء مین اس بندوبست کو دائمی اور استمراری کرنے مین فائدہ سمجھا، چنانچہ اس کے متعلق ۱۷۹۳ء مین اس بندوبست کے دائمی اور استمراری ہونے کا اعلان کیا گیا، اور زمینداری سسٹم بنگال و بہار مین ہمیشہ کےلئے مضبوط بنیاد پر قائم ہوگیا، اور حکومت کے اس اقرار کی وجہ سے کہ "حکومت نے اس وقت جو مالگذاری مقرر کی ہے، اس مین آیندہ اضافہ نہین کرے گی، اور نہ ان کو اب آیندہ اس بندوبست سے بے دخل کرے گی، ہان زمیندارون کو یہ لازم ہوگا، کہ وہ وقت پر مقررہ مالگذاری ادا کیا کرین، ورنہ ان کی زمینداری نیلام کر دی جائیگی" زمیندارون کو اطمینان ہو گیا،

اس اعلان مین جہان زمیندارون کے متعلق یہ اقرار تھا، رعایا کے متعلق بھی یہین ایک دفعہ یہ تھی، کہ حکومت کو اختیار رہے، کہ رعایا کے حقوق کی حفاظت کے لئے جب ضرورت سمجھے گی، قانون بنائے گی

جہان تک میرے معلومات کا تعلق ہے، زمیندارون سے رعایا کے متعلق اس امر کا معاہدہ بھی تھا، کہ زمیندار رعایا سے ان حقوق کو سلب نہین کرین گے، جو ان کو شاہی زمانہ سے حاصل ہین اس بنا پر موروثی کاشت جس کا خراج کاشتکار ادا کرتا ہے، بلاشبہ وہ اس کا مالک ہے کیونکہ آئینِ اسلامی کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے، کہ خراجی اور عشری زمین کا کاشتکار مالک ہوتا ہے، وہ اسکو بیع کرسکتا ہے، وقف کرسکتا ہے، یعنی وہ سارے تصرفات جو مالک اپنی مملوکہ چیز مین کرتا ہے، وہ اس زمین مین کرسکتا ہے، تاآنکہ اس کے مرنے کے بعد اس مین وراثت بھی جاری ہوسکتی ہے،

ارض الخراج مملوکة وکذلك ارض	ارض خراج مملوکہ ہے، اسی طرح عشری
العشر یجوز بیعھا وایقا فھا وتکون	زمین بھی اسکی بیع اور وقف جائز ہے

میراثاً۔ کسائر املاکہ (شامی جلد ۳ ص ۳۹۶ باب العشر و الخراج)، اور وہ دوسری جائدادون کی طرح میراث ہوگی،

اور غالباً اسی دفعہ اور معاہدہ کی بنیاد پر ۱۸۵۹ء اور ۱۸۸۵ء مین بنگال مین اور ۱۹۳۷ء و ۱۹۳۸ء مین بہار مین رعایا کے حقوق کی حفاظت کے لئے قانون بنایا گیا ہے، اور ان کے حقوق کو منضبط کیا گیا ہے، اور اسی وجہ سے آج تک زمیندارون کو ان قوانین کے متعلق جن کا تعلق کاشتکارون کے حقوق سے ہی، کوئی اعتراض نہین ہوا ہے، ہان حکومت بہار کے زرعی ٹیکس پر البتہ زمیندارون کو اعتراض ہوا ہے، اور غالباً ان کا مقدمہ اس وقت فیڈرل کورٹ مین درپیش ہے جس مین زمیندارون کی جانب سے یہ اعتراض کیا گیا ہی کہ یہ بندوبست دوامی کے خلاف ہی،

بندوبست دوامی کی اگر یہ تصویر صحیح ہے، اور زمینداری کی تاریخی نوعیت وہی ہے جو اوپر عرض کی گئی ہو تو اس سے نہ رعایا کے حقوق پر کوئی اثر پڑتا ہی نہ اس کی ملکیت پر، کیونکہ زمیندارون کو کمپنی سے جو کچھ ملا، وہ وہی ملا، جو مغل حکومت نے ان کو دیا تھا، اور مغل حکومت نے کمپنی کو اپنا حق مالیہ دیا تھا، نہ کہ رعایا کی ملکیت، پس کاشت کی ملکیت جس طرح مغل حکومت مین کاشتکارون کو حاصل تھی، وہ کمپنی کے عہد مین بھی باقی رہی، اور زمینداری سسٹم کے وقت مین رہی، واللہ اعلم بالصواب،

بہرحال صوبہ بہار اور بنگال کے کاشتکارون کے حقوق کے سلسلہ مین آئینِ اسلامی کی رُو سے کاشتکار زمین کا مالک ہے، اور غالباً جناب مولٰنا ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب قادری دانا پوری نے موروثی کاشت کے متعلق جو فتوی دیا ہے، اور کاشتکار کو مالک قرار دیا ہے، وہ صوبہ بہار اور بنگال اور ان مقامات سے متعلق ہے، جہان دوامی اور استمراری بندوبست کا قانون ہے، اور حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مدظلہ نے موروثی کاشت کے متعلق جو فتوی دیا ہے، اور رعایا

کو کاشت کا مالک قرار نہین دیا ہے تو غالبؔ ان کے پیش نظر ان کے اپنے صوبہ کے حالات ہین، اوُ ان دونون بزرگون کے فتوون کا تعلق تمام صوبون کی موروثی اور رعیتی کاشت سے نہین ہی؛

معارف مین ان دونون بزرگون کے فتادے جس طرح شائع ہوئے ہین' بظاہر اُن سے اوّل نگاہ مین یہ مغالطہ ہو سکتا ہے، کہ ایک ہی نوعیت کی زمین پر ان دونون بزرگون کی راے اور اجتہاد مین اختلاف ہی مگر میرا خیال ہی کہ ایسا نہین ہے،

بہرحال بنگال اور بہار کی ایسی زمینون کے متعلق میری راے مولنا دانا پوری دام مجدہٗ کے فتویٰ کے ساتھ ہے، اور مجھکو اس سے اتفاق ہے، مگر اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو، کہ مولنا ممدوح کے استدلال سے بھی مجھکو اتفاق ہے، میرے نزدیک مولنا موصوف جس نقطۂ نظر سے موروثی کاشت کو کاشتکار کی ملکیت قرار دے رہے ہین اس مین ایسی باتین آگئی ہین، جو شرعاً صحیح نہین ہین؛ مثلاً یہ کہ:-

"قانون نے ملک و حقوق کا ایک فیصلہ کیا، ملک کے باشندے بجبر یا بخوشی اس قانون پر رضامند ہو گئے؛"

اس کا مطلب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ جناب مولنا یہ فتویٰ دے رہی ہین، کہ ایسی صورت مین جبکہ حکومت غیر اسلامی ہو، اور اوس کے قوانین کو ہم بدل نہ سکتے ہون، بلکہ بجبر یا بخوشی اس کے ماننے پر مجبور ہون تو ہم کو اوس کے قانون کو تسلیم کر لینا چاہیئے، اور جائز مان لینا چاہیئے،

لیکن ہم ادب سے عرض کرین گے، کہ اگر زمین کے متعلق بغیر لحاظ شرعی قوانین کے موجودہ حکومت کے ہر فیصلہ کو جائز تسلیم کر لینا، اصول ٹھہرا لیا جاے تو اشکال یہ سامنے آتا ہے، کہ موجودہ حکومت کے آئین مین زمین کے متعلق جہان بہت سے دیگر قوانین ہین، یہ قانون بھی ہے، کہ زمین کا مکفول کرنا صحیح رہن بالانتفاع جائز اور درست ہے، زمین کی مالگذاری اگر قسط کے موافق ادا نہ

کیجائے، تو قانونًا سود دینا لازم وغیرہ وغیرہ تو کیا ان سب کو جائز تسلیم کرلیا جائے گا حالانکہ رہن بالانتفاع کو مولینا ممدوح اسی فتویٰ میں ناجائز قرار دیتے ہیں، اور تحریر فرماتے ہیں:-

"رہن جائز ہے، مگر اس سے انتفاع ناجائز ہے"۔

اور اس رہن بالانتفاع کے عدم جواز پر مولینا ہی کے الفاظ میں اس کے جواز پر کوئی یہ عذر پیش کرے، تو غالبًا مولینا اوسکو بے محل سمجھیں گے،

"کیا غیر اسلامی ملک میں جہاں قانون مسلمانوں کے اختیار میں نہ ہو، وہاں یہ فتویٰ دینا جائز ہے، کہ اس ملک کے قانون کے موافق زمین سے کسی طرح کا انتفاع حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے، کیا اس طرح کی کوئی نظیر موجود ہے"!

بہرحال موقع استدلال میں یہ اصول میرے نزدیک صحیح نہیں،

اسی طرح مولنا کے اس استدلال سے بھی مجکو اتفاق نہیں ہے، کہ

"مسئلہ شرعی یہ ہے، کہ غاصب کے فعل سے شیٔ مغصوب میں زیادہ ترقی ہو جائے، اور زیادہ نفع کا ذریعہ بن جائے، تو غاصب اس کا مالک ہو جاتا ہے، اور مغصوب منہ اس کا مالک نہیں رہتا، تو کاشتکار جس نے حکومت اور زمیندار دونوں کی اجازت کے بعد اپنی محنت اور مال سے زمین کو اس قدر ترقی دی ہوا سمیں اسکی ملکیت کیوں نہ ثابت ہوگی"۔

میرے نزدیک یہ قیاس صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ مالِ مغصوب میں ہر قسم کی زیادتی یا ہر طرح کے نفع کی زیادتی سے مالِ مغصوب کا غاصب مالک نہیں ہو جاتا ہے، مثلاً ذیل کی صورتوں میں زیادتی اور نفع ہونے کی بنا پر مالِ مغصوب کا غاصب مالک نہیں ہوتا ہے،

(۱) لو غصب ارضا فیھا زرع	اگر کسی ایسی زمین کو غصب کیا جس میں کاشت
او شجر فسقاہ لغاصب وانفق علیہ	ہریا درخت ہیں پس غاصب نے اسکی آبپاشی کی

حتی انتہیٰ بلوغہ (بدائع صنائع	اور اس پر خرچ کیا، یہان تک کہ وہ
کتاب الغصب (جلد، صـ۱۶۲)	تیار ہوگئی،
(۲) لو غصب من مسلم خمراً	اگر کسی مسلمان کی شراب غصب کر لی اور
فخللها فلصاحبها ان یاخذ الخل	اس کا سرکہ بنا لیا، تو اسکے مالک کو بغیر معاوضہ دیے
من غیر شیٔ لان الخل ملکہ لان	سرکہ لینے کا حق ہے، کیونکہ سرکہ اس کی
الملک کان ثابتا لہ فی الخمر و اذا	ملک ہے، کہ شراب مین اسکی ملکیت ثابت
صار خلا حدث الخل علی ملکہ	تھی، اور جب شراب سرکہ ہوگئی تو یہ سرکہ
ولیس للغاصب فیہ عین مال	اس کی ملک مین ہوگیا، اور اس مین غاصب کا
متقوم قائم لان الملح الملقیٰ	ایسا مال نہین لگا ہے جو متقوم ہو نمک جو
فی الخمر یتلف فیها فصار کما لو	شراب مین ڈالا گیا ہے، وہ اس مین
تخللت بنفسها فی یدہ ولو کان	تلف ہوگیا ہے، تو گویا ایسا ہوا جیسے
کذلک لاخذہ من غیر شیٔ	خود بخود سرکہ ہوگیا، اور ایسی صورت مین مالک بغیر
کذا ھذا (ایضاً)	معاوضہ کے لے لیگا، ایسی ہی یہ صورت ہے۔
(۳) لو غصب ثوبا ففتلہ او	اگر کسی کپڑے کو غصب کیا پس اسکو
غسلہ او قصرہ فلصاحبہ	بٹ دیا، یا دھویا، یا اوس کو برابر کر دیا،
ان یاخذ ولا شیٔ للغاصب	پس اوس کے مالک کو حق ہے کہ اسکو بغیر معاوضہ
لانہ لیس للغاصب عین مال	کے لیلے، کیونکہ اس مین غاصب کا ایسا مال نہین
متقوم قائم فیہ (ایضا)	لگا ہے، جو متقوم ہو،

ہان مغصوب پر زیادتی کی صورت مین غاصب مالِ مغصوب کا مالک اس وقت ہوتا ہے

جب مغصوب مین زیادتی ایسے مال متقوم کی ہو، جس کا عین مغصوب کے ساتھ قائم ہو اور وہ زیادتی مغصو کے تابع نہ ہو، بلکہ بذاتہ اصل کے درجہ مین ہو،

اور یہ ملکیت بھی غاصب کو اُس وقت حاصل ہوتی ہی، جب مالک کو ضمان ادا کر دیتا ہی، ورنہ بغیر ادائے ضمان کے اس سے انتفاع حلال نہین ہوتا ہی،

کاشتکاری کی صورت مین کاشتکار کی محنت اور کھا و وغیرہ سے زمین مین جو زیادتی ہوتی ہے یا اس کی حیثیت جو بڑھ جاتی ہی اس سے کھیت کے ساتھ نہ تو مال متقوم کا عین قائم رہتا ہے، نہ وہ زیادتی اصل کے درجہ مین آجاتی ہی بلکہ اسکی حیثیت ہمیشہ زمین کی تابعیت کی رہتی ہے، لہذا اس صورت مین غاصب کو مالک قرار دینا صحیح نہ ہوگا بلکہ بدائع صنائع کی تصریحات کی بنا پر یہان غاصب کی ملک کا احتمال بھی صحیح نہین ہوگا، کیونکہ کاشتکار کی کاشتکاری کو شابہت قریبہ ان متذکرہ صورتون سے ہے جن مین غاصب مالِ مغصوب کا مالک نہین ہوتا ہی،

بہرحال یہ ضمنی بات تھی، جو بلاضرورت بحث مین آگئی، استفتا کے سوالون کا نمبروار جواب میرے نزدیک یہ ہے،

الجواب

(۱) وہ کاشتکاری جس کو عرف مین موروثی کہتے ہین شرعاً درست ہی، کیونکہ کاشتکار اسکا مالک ہی،

(۲) رہن رکھنا جائز ہی، مگر مروجہ طریق پر جو اس سے نفع حاصل کیا جاتا ہی، وہ شرعاً ناجائز ہے،

(۳) اس مین وراثت جاری ہوگی، اور تخریج کی صورت یہ ہوگی، کہ مورث کے متروکہ کو سات حصے قرار دیکر، دو دو حصے ہر یک لڑکے کو دیئے جائین، اور ایک حصہ لڑکی کو دیا جائے،

نوٹ اس مضمون کی عربی عبارتون کا ترجمہ مضمون نگار کے قلم کا نہین ہی، اس لئے اس کی صحت کی ذمہ داری ان پر نہین ہے،

مناقب ذوالنورین

المعروف بہ

بہارستانِ سخن

از

جناب محمد ابو اللیث صاحب صدیقی ایم اے لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

مجھے عرصہ سے اردو کی پرانی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابین جمع کرنے کا شوق ہی اسی تلاش مین کبھی کبھی عربی و فارسی کی بھی بعض اچھی چیزین نظر آجاتی ہین، کبھی تو یہ نوادر ذاتی کتب خانون مین ملتے ہین جہان یہ بیشتر اپنے مالکون کی بد مذاقی پر مرثیہ خوان نظر آتے ہین، اور کبھی کباڑیون اور ردی بیچنے والون کے وسیلہ سے ان تک رسائی ہوتی ہی، مجھے حال مین فارسی کی ایک ضخیم قلمی مثنوی ملی ہی، جو کئی حیثیتون سے بہت اہم ہی، یہ کتاب مجھے سید عبد الحلیم صاحب (رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی) کی عنایت سے ملی جس کیلئے مین ان کا شکر گذار ہون،

یہ مثنوی جس کا نام مناقب ذو النورین ہے گیارہ سو اسی قلمی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اور ہر صفحہ مین پندرہ شعر ہین، اس حساب سے اس مین سترہ ہزار سات سو اشعار شامل ہین، کتاب کا نام بہارستان سخن بھی ہی، جو کتاب کے شروع مین درج ہے، مصنف کے متعلق مین اپنی معلومات آگے عرض کرونگا سنہ کتابت یا کاتب کا نام تحریر نہین، لیکن یہ نسخہ یقیناً مصنف کا اصلی نسخہ ہے، کیونکہ اس مین بکثرت اشعار پر بار بار اصلاح کی گئی ہی، اس مثنوی کا موضوع حضرت عثمانؓ کے سوانح حیات اور ان کے

کارنامے ہین، اور ضمناً ان ملکون کے حالات اور جغرافیے بھی شامل ہین، جو حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت مین مسلمانون کے قبضۂ اقتدار مین آئے،

مثنوی کا سنہ تصنیف غالباً ۱۳۱۴ھ ہے، یہ تاریخ مثنوی مین ہی ایک حاشیہ پر دی ہوئی ہے اور غالباً اس کا تعلق مثنوی ہی سے ہے، اگر یہ تاریخ مثنوی سے کوئی تعلق نہین رکھتی تو کم از کم اس سے یہ تو یقیناً واضح ہو جاتا ہے، کہ اس سنہ مین یہ مثنوی مکمل ہو چکی تھی، یہ وہ زمانہ ہے جب فارسی کا انحطاط شروع ہو چکا تھا، اور شاعرون کی توجہ کا مرکز اردو کی بزمِ سخن بن چکی تھی، اس زمانہ مین ایک ہندی نژاد کا فارسی سے یہ شغف کہ سترہ ہزار سات سو شعر کی ایک مثنوی بڑی جگرکاوی سے لکھے، اور بظاہر اس کا کوئی صلہ بھی اُسے نہ ملے، بہر نوع قابلِ تعریف ہے،

داخلی اور خارجی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا پورا نام عبدالواحد تھا، ان کے آباؤ اجداد سلطان محمود غزنوی علیہ الرحمۃ کے ساتھ محض جہاد کی نیت سے ہندوستان آئے، ان کا اصلی وطن نوح تھا جو بلخ اور بخارا کے درمیان واقع ہے، ہندوستان آکر دوبارہ محمود کے ساتھ واپس نہ گئے، بلکہ اکبرآباد (آگرہ) کے نزدیک قصبہ دیونانہ مین مستقل سکونت اختیار کر لی، اور پھر اٹیھی چلے آئے، انکی آل اولاد اب تک اس مشہور قصبہ مین آباد ہے، عبدالواحد کا شجرۂ نسب ملاحظہ ہو،

ملا عبداللہ

- مولوی محمد شرف صاحب
  - مولوی فائق
    - مولوی عبدالاحد
      - منشی تفضل حسین
        - ولایت حسین
      - حافظ حسین
        - لاولد
- مولوی عظیم صاحب شہید
  - مولوی غلام حسین شہید
    - مولوی غلام حسن
      - مولوی حاجی احمد
        - عبدالواحد
          - عبدالوالی
          - مولوی ابراہیم
          - مولوی یعقوب

ہندی مسلمانوں کی روایتی علم دوستی کا ثبوت بھی اس خاندان مین ملتا ہی، چنانچہ اس شجرہ مین کم ازکم مولوی فائق کا نام ایسا ہے، جو مشہور فارسی کتاب انشاے فائق کی وجہ سے عام طور پر متعارف ہی، عبدالواحد صاحب کا کارنامہ آپ کے سامنے ہی،

عبدالواحد صاحب کے والد حاجی احمد صاحب نے پوروہ ضلع اناؤ مین شادی کی، اور پھر وہین آباد ہوگئے، ان کے نئے رشتہ دارون مین مولوی عبدالکریم تھے، جن کو نوابانِ اودھ کی طرف سے کوراپاپور، عمراپور، کرولی، رسوتیا وغیرہ مواضعات بطور جاگیر ملے تھے، چنانچہ اس جاگیر کا کچھ حصہ عبدالکریم صاحب کی نسبت سے حاجی احمد صاحب کو اور ان کے بعد ان کے بیٹے عبدالواحد صاحب کو ملا، اور یہی جاگیر ان لوگون کے بسراوقات کا ذریعہ تھی،

مثنوی مین اندرونی شہادتون سے پتہ چلتا ہے، کہ انھون نے صرف نواب محمد علی خان صاحب والیِ ٹونک کی ریاست مین کچھ عرصہ ملازمت کی، اور باقی عمر رئیسانہ شان اور وضع سے پوروہ مین ہی گذاردی خارجی بیانات سے یہ بھی معلوم ہوا ہی کہ کچھ دنون راجہ بنارس سے بھی تعلق رہا،

مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ علومِ متداولہ مین اچھی دسترس تھی، فارسی ادب سے خصوصی دلچسپی تھی، جس کا ایک ثبوت خود یہ سترہ ہزار شعر کی ضخیم مثنوی ہے، فتوحاتِ عہدِ عثمانی کے سلسلہ مین جن ممالک کا جغرافیہ نظم اور نثر مین بیان کیا ہے، وہ بھی اس زمانہ کے معلومات کے مطابق اور ان کی وسعتِ علم پر دلیل ہے، فارسی کے علاوہ اردو مین بھی شعر کہتے تھے لیکن اردو شعر و شاعری کا تمام سرمایہ (سواے چند متفرق مرثیون اور قطعات کے) اب ناپید ہے، اور غالبًا تباہ ہوچکا ہی، ان کے صاحبزادے مولوی محمد ابراہیم بیان کرتے تھے، کہ اس ذخیرہ مین ہزارون قصیدے اور غزلین تھین جن سے معلوم ہوتا تھا، کہ اردو مین صبا اور آتش سے مشورہ کیا کرتے تھے،

مثنوی ذی النورین میں حضرت عثمانؓ کی سوانح اور سیرت کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے، جگہ جگہ مسئلۂ خلافت پر بھی اہلِ سنت والجماعت کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے، البتہ بعض مواقع پر انکا لہجہ حد درجہ تلخ ہوگیا ہے، جہاں خلفاء پر تبرا کرنے والوں کا ذکر کرتے ہیں، وہاں ان کا قلم بے اختیار ہو جاتا ہے، واقعات کو روایات کا عنوان دیکر موقع بہ موقع بیان کیا ہے، ان روایات سے قطع نظر حسب ذیل عنوانات علیحدہ علیحدہ قائم کرکے طبع آزمائی کی ہے:

(۱) حمد (۲) نعت (۳) ذکرِ معراج (۴) منقبتِ اصحاب رسول (۵) مدح نواب محمد علی خان بہادر (۶) عرض حال (۷) آغاز داستان و ذکر فردوسی (۸) بیان انساب حضرت عثمانؓ (۹) بیان حلیہ (۱۰) شیفتہ شدن حضرت عثمانؓ بر گلِ گلشن نبوت (۱۱) مناقب و فضائل (۱۲) وجوہات ملقب شدن بہ لقب ذوالنورین (۱۳) ذکر عبادات و کیفیت صوم و صلوٰۃ (۱۴) خریدن بیر رومہ و دادن فی سبیل اللہ (۱۵) بیان اثبات خلافت حضرت عثمانؓ از احادیث جناب رسول اکرم (۱۶) فرق در خلیفہ و بادشاہ (۱۷) روایت دیگر در بیان آنکہ کسے طعن خلافت درشان حضرت عثمانؓ کند گویا طعن در جمیع مہاجرین و انصار کردہ باشد، و دیگر روایات در اثباتِ خلافت حضرت عثمانؓ (۱۸) شہادت حضرت عمرؓ و جلوس حضرت عثمانؓ (۱۹) جمع نمودن قرآن مجید (۲۰) فضیلت حضرت عثمانؓ (۲۱) ذکر شہادت حضرت عثمانؓ (۲۲) ذکر بلاد و امصار مفتوحہ زمان خلافت حضرت عثمانؓ (۲۳) فہرست ممالک و امصار مذکور الصدر (۲۴) فتح ہمدان در سال چہاردہم ہجرت در ابتداے ایام خلافت بیان جغرافیہ ہمدان، فتح رے و جغرافیۂ رے وغیرہ (۲۵) تعریف حضرت معاویہؓ و قول حضرت علیؓ در روایت در مسئلہ خلافت (۲۶) بیان شہادت حضرت عثمانؓ (۲۷) بیان خطبات حضرت عثمانؓ (۲۸) خاتمہ بر مدح نواب محمد علی خان (۲۹) مناجات۔

اب بطور نمونہ مثنوی میں سے بعض عنوانات سے اشعار پیش ہیں:-

حمد:-

بنامِ خداوند پاکِ صمد ‌‌‌‌‌‌ خداوند خلق ازازل تا ابد
خداوند ارض و سما بیگمان ‌‌‌‌‌‌ خداوند ہر شے کہ ہست اندران
خداوند ہر ابتداے کہ ہست ‌‌‌‌‌‌ خداوند ہر انتہاے کہ ہست
خداوند داناے رازِ نہان ‌‌‌‌‌‌ خداوند داراے ملکِ جہان
خداوند اصحاب راز و نیاز ‌‌‌‌‌‌ خداوند ارباب سوز و گداز
خداوند عبادِ مصحف بدست ‌‌‌‌‌‌ خداوند رندانِ بادہ پرست
خداوند شاہانِ فرخندہ فال ‌‌‌‌‌‌ خداوند درویشِ شوریدہ حال
زمین را سکون چرخ را سیر از وست ‌‌‌‌‌‌ زمین و زمان ہر دو در اختیار از وست
کلام خوشش آب و آتش کش است ‌‌‌‌‌‌ سمندر بہ ذکرش در آتش خوش است

مناجات:-

خدایا بہر شے توانا توئی، ‌‌‌‌‌‌ چہ عیب از تو پوشم کہ دانا توئی
سراپا منم عیب و تو غیب دان ‌‌‌‌‌‌ چگونہ ز تو عیب ماند نہان
بجز فعل زشت و رہِ ناقبول ‌‌‌‌‌‌ چہ سر زد شود از ظلوم و جہول
بجرمم گذشتند لیل و نہار ‌‌‌‌‌‌ نکردم پئے آخرت ہیچ کار
بدم لیکن از بندگانِ توام ‌‌‌‌‌‌ یکے از پرستندگانِ توام
تو دانی کہ از شر نفس شریر ‌‌‌‌‌‌ چہ ناکردنی کردہ ام اے خبیر
باظہار آن شرمم آید ہمی ‌‌‌‌‌‌ کہ آگہ زِ رازم شوند آدمی
شکستہ دل و بستہ چشم امید ‌‌‌‌‌‌ ز عصیان سیہ روی و موی سفید

فدایت شوم اے خداے زمین — کہ تشریف اسلام دادی بمن
چہ مسلم کہ از امتِ مصطفےٰ — زہے مصطفےٰ کہ افسرِ انبیاء
شفیعِ دو عالم رسولِ من است — مطیعش زنارِ سقر ایمن است

اس کے بعد نعت، ذکر معراج، مناقبِ اصحاب رسول کے عنوانات ہیں، پھر مدح نواب محمد علی خان کے تحت میں لکھتے ہیں :-

سحابِ گہربار دریا دلا — مہ اوجِ ہمت فلک منزلا
خدا باد یاور بہر کارِ تو — پسندِ خدا باد کردارِ تو
بلندیِ ایوان زکیوان فزون — ترقیِ اقبال از حد برون
دعاے تو بادا بحق مستجاب — بحقِ جنابِ رسالت مآب
ز گنج و زرت خانہ آباد باد — زاولادِ صالح دلت شاد باد
دلم زندہ بر دار خوانِ تو باد — زبان و لبم مدح خوان تو باد
معینِ تو باشد خداے زمان — بحکم کمندِ تو آید جہان
ز علم و عمل نیستم حرف یاد — ہمہ خرمن عمر من شد بباد
نہ از منشیانم نہ از شاعران — بحکم تو می برکشایم زبان
درین صورت این معنیِ دلپذیر — رسد از دلِ من اگر بر حریر
مدان از درستیِ برایم درست — ہمانا کہ از یمن اقبالِ تست
بحکم تو شمشیر کلکم بدست — کہ ملکِ سخن را کنم بندوبست
چو عیبم درین کار ظاہر شود — کہ طبعم ز اصلاح قاصر شود
باصلاحش از عیبہا پاک کن — دلِ خستہ ام را طربناک کن

ولیکن بجائے کہ دارند کار چنین شاعران وقائع نگار
کہ ہریک ازین ہاست سعدی مقام منم ہیچ در نظم و نثر و کلام
دگر مرد سلطان محمود خان کہ ازابر کلک است گوہر فشان
سوم مرد دانشس محمد حسن کہ کلکش بود شمع در انجمن
چو عبد الملک گرم گفتن شدہ بملک معانی ملک آمدہ
دگر عالمے ذوفنون پر حکم مسمی بہ عبد اللہ ذی کرم
کہ گشت آن ملقب بہ مولائے ما سخن زو رسیدہ بہ اوج سما
دگر از ہجوم سخن پروران کہ پر بزم تست از ہنر گستران
بواحد چہ تاب سخن گستری کہ او نابلد ہست از شاعری
ہمہ شعر گوئید از علم خویش منم بذلہ سنج از دل و جان ریش
بآنان خرد گستری رہبر است مرا از جنون حال دل ابتر است
گہربار شد طبع شان متصل دہانم فشاندہ ہمہ لخت دل
زیادہ ازین عذر عجزم مخواہ کہ خود می شناسی بفضل الٰہ
بحکم تو اے خسرو کامگار چون این پیکرے را ببستم بکار
ز چندین کتب ہای بے کم و کاست درین نسخہ بنوشتہ ام راست راست
فتوحات عثمان عالی نژاد قبول دل ہر ہنرمند باد
بیا ساقیا ساغر جانفزا بمن دہ کہ دارم سر تدعا
مگر صدق و اسلام یابد وقوع کنم داستان مبارک شروع

ان اشعار میں نہ ممدوح کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں نہ معاصرین

پر چوٹ کی ہی، نہ اپنے زعم مین اپنی شاعری اور مثنوی کے سامنے شعر و سخن کے شہ کارون کو ملیا میٹ کیا ہی، اور نہ اظہار عاجزی مین خود کو بالکل تحت الثری تک پہنچایا ہے، اور نہ کہین محض طول کی خاطر کسی مضمون کو پھیلا کر بیان کیا ہی، اور نہ کہین اتنے اختصار سے کام لیا ہی کہ پڑھنے والا گھبرا جائے، اس حیثیت سے یہ تمہید اس عہد کی شاعری مین ایک نادر نمونہ ہے،

آغازِ داستان مین حضرت عثمانؓ کے حالات اور واقعات شروع کرنے سے پہلے فردوسی کا ذکر کیا ہی، اور ناظرین مثنوی سے درخواست کی ہی کہ وہ فردوسی کے شاہنامہ کی طرف متوجہ ہون تو اس مثنوی پر بھی ایک نظر ڈال لین، کیونکہ فردوسی

بکاوُسیان مدح گوید بجان زمین کیان را کند آسمان
ز شمشیرِ رستم نفس میزند دم از شورِ بانگِ جرس میزند
کند ناز بر مدحِ گبران فقط بشانِ صحابہ کند رہ غلط

. . . .

بیا اے نسیم سحری فسوس (؟) پیامے ببر بر[1] سخنگوی طوس
کہ داد ی چرا دین بباد این قدر بمدحِ کیان کردی این شور و شر
بآتش پرستان دہی عزّ و شان بگبران غلامی شدی دیرآن
بشانِ صحابہ چنین گفتگو تفو بر تو اے مستِ خذلان تفو
ازین تحفہ روحِ تو خوشنود باد کلامِ تو ہم بر تو مردود باد

. . . .

کتاب کے مضامین بیان کرتے ہوئے لکھتے ہین:۔

---

[1] معارف: بر، بمعنی نزدیک،

ز انساب او گویم اوّل خبر | کہ آمد بپا کی چو سلک گہر
فضائل کنم باز درجِ کتاب | از آن جانشین رسالت مآب
پس گویم از حق پسندیدنش | مشرف باسلام گردیدنش
پس باتو گویم دگر گونہ باز | کہ امر خلافت باو گشت باز
کنم بعد ازان فتحہا بی رقم | کہ در عہد پاکش شدہ یک قلم

اس کے بعد حضرت عثمانؓ کا شجرۂ نسب بیان کرتے ہوئے آپ کا حلیہ بیان کرتے ہیں اس سلسلہ میں متعدد روایات لکھی ہیں، دو روایتیں ملاحظہ ہوں،

روایت

اسامہ روایت کند این چنین | کہ یک بار آن سید مرسلینؐ
بدستم یکے ظرفِ لحم از کرم | فرستاد با لطف و فیضِ اتم
بنزدیکِ عثمانؓ صاحب حیا | کہ چون مہر میداشت رویش ضیا
چو در آمدم پیش آن کانِ جود | بدیدم کہ با زوجہ اش بنشستہ بود
ہمان دخت پیغمبر پاک دین | کہ نامش رقیہ بود بالیقین
ندیدم ازان ہر دو روشن روان | دگر مرد و زن خوبرو در جہان
گہے سوے عثمان کشادم نظر | گہے سوے آن بنتِ خیرالبشرؐ
کہ در حسن میداشت شانِ بلند | چو خورشید بر آسمانِ بلند
چو من باز گشتم از آنجا یگاہ | سوے بارگاہِ رسالت پناہ
بفرمود آن سرور دین طرازؐ | کہ تو پیشِ عثمانؓ برفتی فراز
بگفتم بلے گفت خیرالبشرؐ | کہ زوجین دیدی زشان خوبتر

بگفتم کہ در حسن افزون زسان — نہ زوجین دیدم دگر در جہان

گہے می کشادم در آنجا نظر — بسوے رقیہ خجستہ سیر

گہے سوے عثمانِ والا گہر — کہ احسن از دنیست شوی دگر

ایک دوسری روایت ملاحظہ ہو،

از ابن لبید ست نقل این کلام — کہ روزے بعثمان فرخندہ کام

نگاہم فتادہ دمے کز وقار — ہمین بود بر پشتِ اشتر سوار

فروہشتہ بر چہرہ زلف سیاہ — کہ از پیچ او کفر گشتہ تباہ

یکے جامۂ زرد کردہ ببر — کز وشمس بودہ خجل ہم قمر

ندیدم جمیلے درین چارسو — نکوتر از ان مرد فرخندہ رو

اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے قبولِ اسلام سے متعلق بعض روایات ہیں، پہلی روایت یہ ہے:

ز زید ابن رومان شنو این خبر — کہ مبعوث گشتہ چو خیر البشرؐ

فرستادیزدانش بر کائنات — عیان کردہ بر تشنہ آب حیات

پس این مرسل از کردگار مجید — ہمہ را نکو خواہ آمد پدید

ہمہ را سوئے پاک پروردگار — باسلام می خواند لیل و نہار

نہانی ہدایت ہمہ گفت فاش — چو خورشید بر خلق شد نور پاش

جوان مرد عثمان دولت پناہ — دگر طلحہ آن ابن عبید اللہ

برائے تجارت بعزمِ تمام — بہم رفتہ بودند در سمتِ شام

چو در مکہ واپس رسیدند شاد — خرد مند صدیق فرخ نہاد

از انجا بہمراہ خود بردشان — حضور جنابِ شہ مرسلان

در آن وقت حضرت رسولِ خدا — بشان عرض فرمود اسلام را
سپس خواند قرآن رسولِ ودود — ز حق ہاے اسلام واقف نمود
بشان وعدہ فرمود تکریم را — ز درگاہِ خلاقِ ہر دو سرا
با سلام ہر دو مشرف شدند — بایمان و پاکی معرف شدند
ہمان وقت عثمانؓ فرخندہ دین — حضور نبی کرد عرض این چنین
کہ اے شاہ اقلیم کون و مکان — چو از شام گشتم بدین سو روان
رسیدم بیک منزلِ ناگہان — کہ بدبین ز افساد دیگر معان (؟)
چو خفتم در آنجاے فرحت فزا — شنیدم کہ می کرد ہاتف ندا
کہ اے خفتگانِ با آرام و ناز — بیا ئید (؟) از روے صدق و نیاز
کہ مہرِ نبوت بنور شیوع — نمود است از برجِ مکہ طلوع
جنابِ محمد رسولِ انام — علیہ الصلوٰۃ و علیہ السلام
جہان را بہ مہر و تلطف تمام — بخواند با سلام دار السلام
رسیدم چو در مکہ با عیشِ دل — شنیدم ز خیلِ کسان متصل
کہ حضرت بہ حکم کرم گستری — نمود است دعواے پیغمبری
ہمون وقت آواز ہاتف مرا — بصدقِ نبوت بشد رہنما
کہ در خدمتت آمدم ای رسول — نمودم بصدقِ دل ایمان قبول

اب کتاب کا وہ حصہ دیکھئے جہاں سے فتوحاتِ عہدِ عثمانی کا بیان شروع ہے، پہلے نثر میں ایک مختصر سی تمہید ہے،

"ذکر بلاد و امصار مفتوحہ زمان خلافت حضرت امیر المومنین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کہ فتوح آن بر دست غازیان شہادت گرا دمجاہدین نصرت لوا واقع شدہ آن دو قسم است

قسم اول آن کہ بعد شہادت حضرت فاروق اعظمؓ بعض اہلِ بلدان عہد خود را نقض نمودند،

حضرت ذی النورین در تجدید فتح آن بلاد سعی بلیغ مانند قتال مرتدین در اول زمان خلافت

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتقدیم رسانیدہ آن بلاد را در حیطۂ تصرف اہل اسلام

در آورد و قسم ثانی آن ممالک و اقالیم کہ از قدیم مقبوضہ کفارِ لئیم بودند، غزات اسلام حسب

الفرمان جناب خلافت مقام لشکر کشیدہ بعض را عنوۃً و بعض را صلحاً مفتوح ساختند، اسامی

آن بلاد مفتوحہ کہ اوّلاً در نثر و ثانیاً بہ نظم نوشتہ این است، ہمدان[1]، آذربائیجان[2]، رے[3]، موقان[4]،

ارمینیہ[5]، سمساط[6]، بلنجر[7]، دربند[8]، بنارزواد[9]، خلاط[10]، گارزون[11]، طرابلس[12]، طنجہ[13]، سبیطہ[14]، اصطخر[15]، دارابجرد[16]

شیراز[17]، شہرزور[18]، کرمان[19]، طبرستان[20]، جرجان[21]، فارس[22]، خراسان[23]، سیستان[24]، طبسین[25]، قہستان[26]،

جوین[27]، بحرآباد[28]، بیہق[29]، بازخرز[30]، خواف[31]، اسفرائن[32]، ولایت جہان[33]، ملک ارغیان[34]، اقلیم نسا[35]،

ابیورد[36]، سبزوار[37]، حصار سنجان[38]، طوس[39]، نیشاپور[40]، سرخس[41]، ہرات[42]، بادغیس[43]، بوشنج[44]، مرو شاہجان[45]،

طالقان[46]، فاریاب[47]، غور[48]، غرجستان[49]، بلخ[50]، طخارستان[51]، ذات الصوار[52]، مرات متعلقہ روم[53]،

افریقہ[54]، اسکندریہ[55]، قیروان[56]، اندلس[57]، جزیرہ قبرس[58]، قلعہ سفید[59]، سیرجان[60]، ماژندران[61]، مصیصہ[62]

بلاد مضافات قسطنطنیہ[63]، قرطبہ[64]، حصن وابق[65]، شروان[66]، زرنج[67]، سناروز[68]، قریہ طویلہ رستم[69]،

وازدن بشکنس[70]، کابل[71]، زابلستان[72]، غزنین[73]،

اس کے بعد نظم میں یہی نام لکھے ہیں، لیکن ہر نام کے بعد صراحت کر دی ہے کہ اس کا صحیح تلفظ کیا ہے، اور کہاں واقع ہے،

سب سے پہلے فتحِ ہمدان کا ذکر ہے، ہمدان حضرت عمرؓ کے عہد میں ہی فتح ہو گیا تھا، لیکن ہمدانیوں نے اپنے عہد کو پورا نہیں کیا، اور حضرت عمرؓ کی وفات کے چھ ماہ بعد ہی بغاوت کی، چنانچہ حضرت

عثمانؓ نے مغیرہ بن شعبہؓ کو ان لوگون کی سرکوبی کے لئے تعینات کیا، اور مغیرہؓ نے اسے دوبارہ فتح کیا، اس سلسلہ مین مغیرہ بن شعبہؓ کے بھی خاص خاص واقعات اور حالات نظم کر دیئے ہین، اور ہمدان کا جغرافیہ بھی بیان کیا ہے، اس واقعہ کے بعض اشعار یہ ہین،

زرود اد ہمدان وہمدانیان ۔۔۔ چنان گفت گوئندۂ خوش بیان
کہ مفتوح شد اول آن بوم و بر ۔۔۔ بدستِ حذیفہؓ بعہد عمرؓ
بہ بست و یکم سال ہجرت ورا ۔۔۔ کشادند باتیغ اہلِ غزا
بہ بست و دوم سال بارِ دگر ۔۔۔ زسکانِ ہمدان چو برخاست شر
کہ عہدِ حذیفہ شکستند شان ۔۔۔ بجہد (؟) تمرد نشستند شان
نعیم مقرن کو چیرہ دست ۔۔۔ برفت و سرکبرِ ایشان شکست
بآن جند مخذول کردہ جہاد ۔۔۔ دگر بار آن بلدہ را بر کشاد
سوم بار چون آن گروہ شریر ۔۔۔ در ایامِ عثمانؓ آفاق گیر
کہ شش ماہ مدت شدہ بود سر ۔۔۔ زعہدِ وفاتِ جنابِ عمرؓ
شکستند پیمان و باغی شدند ۔۔۔ براہ تمرد قدم بر زدند
زبزمِ اطاعت برون تاختند ۔۔۔ برزمِ آوری راست افراختند
نہ پنداشتند آن گروہ ضلال ۔۔۔ کہ بشکستنِ عہد آرد وبال

.. ..

بفرمانِ عثمانؓ فیروز مند ۔۔۔ مغیرہ بنؓ شعبہ شد کاربند
چو صرصر روان گشتہ با دین جنود ۔۔۔ رسید اندران شہر و فتحش نمود

اس کے بعد مغیرہ بن شعبہؓ کی زندگی کے حالات ان کی وفات تک تحریر کیۓ ہین، اور

پھر بیان جغرافیۂ ہمدان شروع کیا ہی،

تو اریخ دانان اقلیم دہر | چنان گفتہ اند حال آن طرفہ شہر
که همدانست شهر قدیم البنا | بسیار . ی وخرمی جا نفزا
بنا کردہ ہمدانش اہل فتوح | و ابن علوج ابن سام ابن نوح
ز ہمدان چو بود آن نگارین چمن | ازین رو بنامش سرود انجمن
بگویند بعضے کہ جمشید شاہ | بنا کرد آن را بصد فرو جاہ
ہوایش بود سرد و فرحت نشان | ز بالاے کوہ است آبش روان
توصیف آن کشور چون ارم | چنین گفت داناے فرخ شیم
کہ سکان آن باغ چو طوطیان | بنطق اند شیرین ترین کسان
بخلق اند نیکو ترین انام | ہمہ اہل آن شہر عشرت مقام

. . . .

بگفت است راوی یزدان پرست | کہ اثنا عشر فرسخش دور ہست
ہزار و دو صد چشمہ باشد روان | باطراف آن شہر جنت نشان

. . . .

سخن کوتہ آن شہر برگشتہ عہد | بسعی بن شعبہ فرخندہ جہد
مجد دبتائید حق بالیقین | بشد داخل ملک اسلام دین

اب مین اس کتاب سے صرف ایک اقتباس اور پیش کرونگا، اس سے اندازہ ہوگا کہ روایات کے انتخاب مین مصنف نے صحت کا کس قدر لحاظ رکھا ہی؛ یہ اقتباس واقعہ شہادت حضرت عثمانؓ کے بعد کا ہی؛ اس سلسلہ مین بہت سی روایتین عام طور پر مذکور ہین، مثنوی مین بھی کئی روایات نقل

ان کے متعلق مصنف نے لکھا ہے،

الا اے خردمند دانش نصاب | بانصاف بنیندۂ این کتاب
در احوالِ قتلِ امامِ رشید | سوم جانشینِ رسولِ مجید
من از معتبر نامہ ہاے گزین | روایاتِ چیدہ صداقت قرین
فراہم درین نامہ در کردہ ام | بسا نثر در نظم آوردہ ام
روایاتِ دیگر کہ بودہ ضعیف | بمیزانِ دانش نمودہ خفیف
نکردیم آن را درین نامہ نقل | کہ ناید پسندیدہ نزدیکِ عقل

حضرت عثمانؓ کے کارنامے تاریخوں مین عام طور پر مذکور ہین، نثر مین ان پر کتابین بھی ہین، لیکن کسی ہندوستانی نے اس سے پہلے یا اس کے بعد اپنی زبان یعنی فارسی مین ان تمام واقعات کو اس شرح و بسط کے ساتھ نظم نہین کیا ہے، کم و بیش اٹھارہ ہزار اشعار کا لکھنا جس مین ہزارون تاریخی واقعات، روایات، شہرون اور ملکون کے نام، جغرافیے، تہذیب اور معاشرت کے نکتے، خلافت اور بادشاہت کے قضیے ہین، پھر اس روانی کے ساتھ بڑی جگر کاوی کا کام تھا، جسے عبدالواحد نے اس خیر و خوبی سے انجام کو پہنچایا،

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا عبدالواحد اردو مین بھی شعر کہتے تھے، اسی فارسی مثنوی کے شروع مین ان کے نام سے ایک مرثیہ لکھا ہے، اس کے چند بند یہ ہین،

مرثیہ در بیان شہادت حضرت امام قاسم :-

جب حجلۂ سپہر سے نکلی عروسِ صبح | نوبت بجی سلامی کی، بولے خروسِ صبح
خوانندون کو ہوی دمِ عیسیٰ نفوسِ صبح | اٹھا ہر ایک شخص ہوا جب جلوسِ صبح

گیتی فروغِ نور سے معمور ہو گئی

ٹھنڈی ہوا سے شمع بھی کا فور ہوگئی

پھیلا جو نور چرخ پہ خاتون صبح کا لیلیِ شب کا رنگ دھواں بن کے اڑ گیا
نورِ سحر بھی وقتِ سحر ہو گیا ہوا گل ہو گئے چراغ تو بلبل نے دی صدا
جاگے وہ جس کو شوق ہو منہ ہاتھ دھونے کا
خورشید آفتابہ لے آیا ہے سونے کا

. . . .

نو روز تک تو جشن ہوا جم کے چرخ پر دسویں ہوئی جو ماہِ محرم کی مستقر
برپا بجائے رنگ ہوئی بزم سربسر آخر فساد طول ہوا قصہ مختصر
کھولے علم وغا کے لئے فوجِ شام نے
باندھیں صفیں حسین علیہ السلام نے

وہ صبح کا ظہور وہ خورشید کی ضیاء وہ سبزہ کی نمود وہ میدانِ کربلا
وہ ذرّوں کی چمک وہ سحر وہ خنک ہوا وہ علقمہ کی سیر وہ فوجوں کا جمگھٹا
جلوہ یہ کہہ رہا ہے ہر ایک سنگ وخشت کا
تختہ یہ کربلا کا چمن ہے بہشت کا

تیغیں وہ جن کے سامنے بے نور ہو ہلال ڈھالیں وہ جنکے آگے فلک بھولے چال ڈھال
نیزے وہ جن کی زد پہ نہ رستم چڑھے نہ زال گھوڑے وہ جن کی رو سے نہ آگے بڑھے غزال
اعدا یہ حال دیکھ کے بے حال ہوتے ہیں
چیونٹی کی طرح مورچے پامال ہوتے ہیں

تاریخ گوئی کی بھی خوب مشق بہم پہنچائی تھی، چنانچہ ان کی کہی ہوئی اکثر تاریخیں مشہور ہیں

ذیل کے نمونہ سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے، مولوی عبدالغنی صاحب رئیس اعظم لاہور کی شادی کتخدائی کی تاریخ ہے:۔

شکر للّٰہ کامد پیکِ صبا | باغ را از مقدم گل مژدہ داد
طفلِ غنچہ شیر از شبنم گرفت | گشت از سبزہ زمین مینوسواد
نوعروسانِ بہاری در چمن | جلوہ گر گشتند با دلہاے شاد
قمریان و بلبلان بر سروِ گل | تہنیت گویان کہ حاصل شد مراد
اندرین وقتِ خوش و ہنگام عیش | از ورودِ رحمتِ ربّ العباد
کد خدا شد مولوی عبدالغنی | حسب حکم شرع با صدق و سداد
بست و ہفتم از مہ شوال بود | یوم تولیدِ رسولِ پاک زاد
از پئے تاریخ تزویج چنین | در سنِ ہجری چو واحد دل نہاد

ہاتفے این مصرعہ برجستہ گفت

وصل ماہ و مشتری مسعود باد
۱۳۱۵ھ

اس قطعہ تاریخ سے بھی فارسی شاعری مین ان کے خاص رنگ کا پتہ چلتا ہے۔

شعرالعجم حصہ چہارم

اس حصہ مین تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے، کہ ایران کی آب و ہوا اور تمدن اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر کیا، کیا کیا تغیرات پیدا کئے، اور شاعری کے تمام انواع و اقسام مین سے مثنوی پر بسیط تبصرہ، قیمت:۔ عہ

"منیجر"

تیموری شاہزادیون کا علمی ذوق

از

سید صباح الدین عبد الرحمن (علیگ) رفیق دار المصنفین

(۲)

زیب النسار بیگم | تیموری شہزادیون کے علمی چمنستان کا گل سرسبد زیب النسار بیگم ہے، یہ اورنگ زیب عالمگیر کی سب سے پہلی اولاد دلرس بانو بیگم کے بطن سے تھی، دستور کے مطابق اس کو سب سے پہلے کلام پاک پڑھایا گیا، جس کے لئے عالمگیر کے ایک درباری امیر کی ماں مریم کو مقرر کیا گیا جو کلام پاک کی حافظ تھی[51]، زیب النسار بیگم نے بھی کلام پاک حفظ کیا، مآثر عالمگیری کے مؤلف کا بیان ہے کہ اس سعادت کے صلہ مین عالمگیر نے زیب النسار کو تیس ہزار اشرفیان بطور انعام مرحمت فرمائین[52]، زیب النسار نے عربی اور فارسی کی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، عالمگیر نامہ، مآثر عالمگیری اور مراۃ العالم مین ہے :-

"واز تحصیل علوم عربی و فارسی بہرۂ تمام اندوختہ"

زیب النسار کے معلمون مین صرف ملا محمد سعید اشرف ماژندرانی کا نام تاریخون مین مذکور ہے جو اسکی عمر کے اکیسوین سال مین درسی کتب کے علاوہ، فقہ، اصول فقہ اور علم حدیث کی تعلیم کے لئے مقرر ہوے، زیب النسانے شعر و شاعری مین بھی انہی سے اصلاح لی[53]، اس نے علم کی تکمیل کے لئے

---

[51] مآثر الامرار جلد دوم ص۸۲۹ [52] مآثر عالمگیری اردو ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی ص۳۹۶ [53] ملا محمد سعید اشرف ماژندرانی پر ایک مفصل مضمون معارف نمبر۶ جلد ۱۲ میں ملاحظہ ہو، نیز دیکھو مآثر الکرام جلد دوم ص۱۱۶،

فن خطاطی میں بھی کمال حاصل کیا، مآثر عالمگیری کا مولف رقمطراز ہے، کہ وہ ہر قسم کے خطوط یعنی نسخ نستعلیق اور شکستہ نہایت خوبی کے ساتھ تحریر کرتی تھی[۱]، یہ فن شاید اوس نے ملا محمد سعید اشرف ماژندرانی ہی سے سیکھا تھا کیونکہ وہ نہ صرف ایک ممتاز شاعر اور عالم تھے، بلکہ خطاط اور خوشنویس بھی تھے، زیب النسار کے علم و ہنر کی بنا پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اسکی علمی کاوش اسکی علمی و ادبی تصنیفات مین بھی ظاہر ہوئی ہو گی، مگر وہ اب ناپید ہین، مخزن الغرائب کے مؤلف نے اوسکی صرف ایک کتاب **زیب المنشآت** کا حوالہ ان الفاظ مین دیا ہے:

"زیب المنشآت کہ از تالیف آنجناب است نقیر آن را زیارت نمودہ" (قلمی نسخہ دار المصنفین)

"زیب المنشآت" زیب النسار کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ تھا، اسکی ایک بیاض خاص بھی تھی، جو اس کی ایک خواص ارادت فہم نامی کے ہاتھ سے حوض مین گر کر ضائع ہو گئی، ملا سعید اشرف ماژندرانی نے اسکی معذرت مین ارادت فہم کی طرف سے ایک طویل قطعہ لکھ کر زیب النسار کی خدمت مین پیش کیا،

زیب النسار کے نام سے ایک مرقع بھی منسوب ہے جس مین قطعات، مشہور کاتبون اور خطاطون کے کمالات کے نمونے، ماہر نقاشون اور مصورون کے ہاتھ کی بنائی ہوئی انواع و اقسام کی تصویرین تھین، یہ مرقع ناپید ہے، لیکن اس کا دیباچہ جس کو ایک شاعر و نثار ملا رضا راشد نے لکھا تھا، خدا بخش خان لائبریری میں موجود ہے، یہ دیباچہ ملی جلی نظم و نثر مین لکھا گیا ہے، اس سے زیب النسا کی علمی مجالس کا حال معلوم ہوتا ہے، شاعر مذکور لکھتا ہے کہ بیگم کی علمی مجلسون مین نظم و نثر، صرف و نحو، ہندسہ و نجوم، معانی و بیان اور ہئیت وغیرہ پر علما و فضلا جمع ہو کر بحث و مباحثہ اور تحقیق و تفتیش کیا کرتے تھے:-

---

[۱] مآثر عالمگیری ص ۵۳۹،

نہان بود آنچہ در آثار قدرت | بفعل آوردہ دستِ او ز قوت
ملازم دارد آن علامۃ العصر | ز اہل فضل و حق چون ابو النصر
سوال تسعہ را حاضر جوابی | ز کلیاتِ و انش انتخابی
مقولاتی عشر، عشری ز گفتار | ز علم و ظاہر و باطن خبردار
گہی تفتیش علم صرف می شد | سخن از اسم و فعل و حرف می شد
گہی در مجلسش از نحو مذکور | ز مرفوع و ز منصوب و ز مجرور
گہی از ہندسہ می کرد تعداد | ز قدرِ خط و سطح و جسم و ابعاد
گہی می رفت حرف از علمِ تنجیم | ز اسطرلاب و استخراج و تقویم
گہی می کرد وصفِ علم اعداد | صحیح و کسر و زوج و فرد تعداد
گہ از علم بیان کردی حکایت | ز تلمیح و ز تشبیہ و کنایت
گہ از علم معانی بود گفتار | ز اسناد و ز مسند ہا خبردار
گہ از آثار علوی یاد می کرد | حدیثِ ابر و برق و باد می کرد
بہیئت مطلع از طبعِ دراک | ز تسکین زمین، تحریکِ افلاک
شد از علم مرایا بسکہ آگاہ | بذات شخص بردہ از سایہ اش راہ

اس دیباچہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زیب النساء بیگم طب روحانی کی بھی حاذق تھی،

بعلم طب روحانیہ حاذق | بہ تہذیب است اخلاقش موافق

اور وہ علم موسیقی سے بھی واقف تھی،

ز موسیقی و از الحانش آگاہ | بگوش استماعش لیک اکراہ

بیگم کی انشا پردازی اور علمی کمال کے بارے میں لکھا ہے:۔

بلفظِ مختصر معنی مطوّل | عبارت مجمل و معنی مفصل
بعلم اولیٰ تر از ہر چیز دانی | نہ در اعمال گنجد حرف ثانی

ایک دوسری جگہ رقمطراز ہے،

باہلِ فضل شامل جود خاصش | بعلم و شرع دایم اختصاصش
سخن سنجانِ معنی آفرینان | ز خرمنہاے فضلش خوشہ چینان
سخن فہم و سخن سنج و سخن دان | سخنور را نسنجد جز بمیزان [۱]

شعر و شاعری کی زبان کے علاوہ شاعر مذکور دیباچہ کی نثر میں بھی بیگم کی انشا، خوشنویسی اور شاعری کا ذکر بیان کی جزالت اور الفاظ کی شوکت کیساتھ کرتا ہے، مورخین اور تذکرہ نویس بھی اسکی علمی سرپرستی اور قدردانی کے بیان مین رطب اللسان ہین، مآثر عالمگیری مین ہے کہ علما و فضلا اور خوشنویسون کا ایک گروہ زیب النسا بیگم کی سرکار سے فیضیاب ہوا کرتا تھا، (صفحہ ۵۳۹ ۔ دو ترجمہ) غلام علی آزاد ید بیضا مین لکھتے ہین:-

"ہمت بہ ترقیہ حال ارباب فضل و کمال مصروف می داشتہ و جماعت کثیر از علما و شعرا و منشیان و خوشنویسان بہ سایۂ قدردانی او آسودہ بود، و کتب و رسائلِ بسیار بنام او سمتِ تالیف پذیرفتہ (ید بیضا قلمی نسخہ، دار المصنفین)

بقول مولانا شبلی مرحوم زیب النسا کا دربار حقیقت مین ایک اکاڈیمی (بیت العلوم) تھی اس بیت العلوم مین ہر فن کے علما اور فضلا نوکر تھے، جو ہمیشہ تصنیف و تالیف مین مصروف رہتے تھے، کتابین عموماً اس کے نام سے موسوم ہوتی تھین یعنی ان کتابون کے نام کا پہلا جز زیب

---

[۱] پروفیسر محفوظ الحق (پریزیڈنسی کالج، کلکتہ) نے مرقع کی نقل رسالہ شمع آگرہ، بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۵ء مین شائع کی تھی، یہ اشعار اسی سے لئے گئے ہین،

کا لفظ ہوتا تھا، چنانچہ مآثر عالمگیری کے مؤلف کا بیان ہو کہ ملا صفی الدین اردبیلی نے بیگم کے حکم سے تفسیر کبیر کا فارسی زبان مین ترجمہ کیا، تو اس کا نام زیب التفاسیر رکھا گیا، (اردو ترجمہ ص ۲۹۴) مؤلف مذکور کا یہ بھی بیان ہو کہ اس کتاب کے علاوہ اور دیگر رسائل بھی بیگم کے نام سے موسوم ہوئے (صفحہ ۲۹۴) مگران رسائل کے نام کہین اور راقم حروف کی نظر سے نہین گذرے زیب التفاسیر کا پانچوان حصہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ مین موجود ہے، یہ حصہ ۴۱۶ صفحون مین ختم ہوا ہے، اور خاتمہ کی تاریخ ۱۰۸۷ھ مرقوم ہو، فہرست نگار کا خیال ہو کہ یہ نسخہ خود مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہو،

زیب النسار نے اپنے بیت العلوم کے علمار و فضلار کے استفادہ کے لئے ایک اعلیٰ قسم کا کتب خانہ بھی قائم کیا تھا، مآثر عالمگیری کے مؤلف کا بیان ہو، کہ ہنر پرور اور علم شناس شہزادی ہمیشہ کتابون کے جمع کرنے اور نیز جدید تصنیف وتالیف کو جاری رکھنے مین کوشان رہتی تھی، اس کا کتب خانہ ہر حیثیت سے نادر الوجود تھا، (صفحہ ۲۹۴)

زیب النسار شاعر بھی تھی، مگر اس کی شاعری کے متعلق بہت سی بے سروپا اور بے بنیاد باتین منسوب ہوگئی ہین، ان باتون کی تشہیر غیر مسلم مصنفون نے زیادہ کی ہے، "وزڈم آف دی ایسٹ سیریز" مین لندن سے دیوان زیب النسار کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس مین زیب النسار کی اول پچاس فارسی غزلون کا انگریزی ترجمہ مگن لال اور جیسی ڈنکن ویسٹ برو ک نے کیا ہے، شروع مین ۲۳ صفحے کا ایک مقدمہ ہے، جو موخر الذکر انگریز خاتون یعنی ڈنکن ویسٹ بروک کا لکھا ہوا ہے، یہ مقدمہ بظاہر بہت ہی پُر از معلومات ہو، اور اس مین زیب النسار کے معاشقہ اور اس ضمن مین اسکی بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی کے بہت سے گستاخانہ قصے اور واقعات درج ہین، مگر ان کی تکذیب اور تردید ایک دوسرے غیر مسلم مورخ سر جادوناتھ سرکار کے ایک مضمون سے ہو چکی ہے، [1] جادوناتھ سرکار اورنگزیب عالمگیر کے سب سے بڑے بیجو نگار ہین، اس لئے

---

[1] اسٹڈیز ان مغل انڈیا ص ۹۰-۷۹،

اورنگزیب کی لڑکی زیب النسار کی حمایت مین ان کا کچھ لکھنا بجبر و اکراہ حق و صداقت کا اظہار کرنا ہے، مولانا شبلی مرحوم نے بھی زیب النسار سے متعلق جو مہمل اور لغو روایتین مشہور ہو گئی تھین انکی تردید اپنے مضمون "زیب النسا" مین کر دی ہے[ل۵]

زیب النسار کے عشق و محبت کی طرح اس کا دیوان بھی محض فسانہ بن کر رہ گیا ہے، زیب النسا کا ایک مجموعۂ کلام "دیوانِ مخفی" کے نام سے مختلف مطابع سے چھپ کر بازار مین فروخت ہوتا ہے، مگر ارباب نظر ان متداول نسخون پر اپنے خیالات ظاہر کر کے بتا چکے ہین، کہ دیوان کی اندرونی شہادت کی بنا پر اوسکو کسی طرح زیب النسار کا دیوان نہین کہا جا سکتا ہے، پروفیسر محفوظ الحق (پریزیڈنسی کالج، کلکتہ) نے معارف نمبر ۵ جلد ۱۱ مین یہ بتایا ہے، کہ دیوان مخفی دراصل مخفی رشتی کا ہے جس کا وطن باصطرخ تھا، وہ شاہجہان کے عہد مین خراسان سے ہندوستان طلب منفعت کے لئے آیا، مگر یہان کی ہوا راس نہین آئی، دشمنون کی ریشہ دوانیون سے قید کر دیا گیا، چونکہ شاہی دربار مین اسکی رسائی نہ ہو سکی، اس لئے اس کا کلام اورون کی طرح مشہور نہ ہو سکا، اور ایک حد تک مخفی مگر محفوظ رہا، اس کا دیوان بعض غیر محقق مصنفون کے ہاتھ لگا، اور اسے دیکھے اور سمجھے بغیر غالباً محض مخفی کی رعایت کی بنا پر اس کو بیگم کی جانب منسوب کر دیا،

مستند تذکرہ نویسون مین احمد علی سندیلوی بھی مخزن الغرائب مین زیب النسا کے ذکر مین لکھتے ہین :-

"اما دیوان اشعارش جاے بنظر نیامدہ، مگر در تذکرہ انتخابش بنظر آمدہ لیکن اعتبار را نشاید، سبب آن کہ اکثر شعر اساتذہ صاحب آن تذکرہ بنام بیگم نوشتہ بود"

ل۵ مقالات شبلی جلد پنجم ص۱۰۶ ملاحظہ ہو اورنٹیل پبلک لائبریری کیٹلاگ جلد سوم ص۱۵ ۱، اور پروفیسر محفوظ الحق کا مضمون زیب النسا اور دیوان مخفی، معارف نمبر ۵ جلد ۱۱،

اسی سلسلہ میں احمد علی سندیلوی نے زیب النسا کے قریب پندرہ ایسے اشعار نقل کئے ہیں جو بعض تذکروں میں زیب النسار کی طرف منسوب ہیں لیکن یقین کیساتھ نہیں کہا جا سکتا ہو کہ یہ اشعار واقعی اسی کے ہیں۔ مولنا شبلی مرحوم کا خیال ہے کہ اس کا سارا کلام شاید اس بیاض میں جمع ہو، جو اراد تًا نعم سے ایک حوض میں گر کر ضائع ہوگئی، بہر حال زیب النسار کے شاعر ہونے میں کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ہی، مرقع کا دیباچہ نگار اسکی شاعری کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان ہی،

زخیل طبع و نفس اندیشہ کرد ۔۔۔ پری و دیو را در شیشہ کردہ
ز طبعش موجزن بحر معانی ۔۔۔ بہ بحر شعر آب زندگانی
ز نطقش نشئہ معنی زند جوش ۔۔۔ شود سامع چو صورت محو ندہوش
ز نظم و نثر نطقش آنچہ گفتہ ۔۔۔ در ناسفتہ گوہر ہاے سفتہ

مولانا شبلی مرحوم نے بعض تذکروں کے اسناد پر صرف مندرجۂ ذیل رباعی کو زیب النسا بیگم کی طرف منسوب کیا ہی،

بشکند دستے کہ خم در گردن یاری نشد ۔۔۔ کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد
صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت ۔۔۔ غنچۂ باغ دل ما زیب دستارے نشد

مگر پروفیسر محفوظ الحق نے معارف کے مضمون ہذا میں اس رباعی کو بھی مشکوک بتایا ہی،

زیب النسار کا ذوق شعری اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اس کی خدمت میں شعرا اپنے معروضات اشعار ہی میں پیش کرتے تھے، اوپر یہ ذکر کیا جا چکا ہو کہ زیب النسا کی بیاض اسکی ایک کنیز سے حوض میں گر گئی تھی، زیب النسار کے استاد ملا سعید اشرف ماژندرانی نے کنیز کی طرف سے ایک طویل معذرت نامہ لکھ کر زیب النسار کی خدمت میں پیش کیا، یہ قطعہ مخزن الغرائب میں درج ہے، جس کی پوری نقل مقالات شبلی حصہ پنجم کے مضمون زیب النسار میں بھی ہے، ہم یہاں اس کے صرف چند

اشعار ناظرینِ معارف کے لئے پیش کرتے ہین،

اے ادا فہمے کہ پیشت فاضلانِ عصررا ... شستن مجموعۂ اندیشہ باب افتادہ است

در خُمِ افلاطون زیاد دانشت سرخوش بود ... ہمچو مخموری کہ در فکرِ شراب افتادہ است

ذہن صافت تا علم گردید در دانشوری ... طبع افلاطون زبس در اضطراب افتادہ است

دفتر فرہنگ در چنگش بجز اگنتہ است ... از کفش مجموعۂ دانش در آب افتادہ است

آن بیاضِ خاصۂ شاہی کہ در اطراف آن ... جا بجا افشان نقطہای انتخاب افتادہ است

آن مرصع خوان گہر ریزی کہ باشد جلوہ گر ... در الفاظش بسے باآب و تاب افتادہ است

ماٰثر الکرام مین غلام علی آزاد بلگرامی، ملا سعید ماژندرانی کے ذکر مین لکھتے ہین، کہ ایک بار زیب النسا بیگم نے استاد کی خدمت کے لئے ایک کنیز بھیجی، مگر ملا سعید اس سے خوش نہ رہ سکے، اور اس کی ہجو مین ایک قطعہ لکھکر زیب النسا بیگم کے پاس بھیجا، غلام علی آزاد نے اس قطعہ کا صرف پہلا مندرجۂ ذیل شعر نقل کیا ہے،

قدر دانشور شناسا! نور چشم عالما ... اے کہ ہرگز قدرت ہم چشمیت حور اندا شت

اس کے بعد وہ لکھتے ہین، کہ اس ہجو مین ملا سعید نے کلام پاک کے الفاظ قابَ قوسین اَوْ اَدنیٰ کو بہت ہی فحش طریقہ پر استعمال کیا، مولانا شبلی مرحوم نے بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہی، لیکن ان کو تعجب ہے کہ ملا سعید نے اس قسم کی بے اعتدالی کی جرأت کس طرح کی، کیونکہ شاہی بیگمات کے آداب اور زیب النسا کا زاہدانہ مذاق اس قسم کی جرأت کا متحمل نہین ہوسکتا تھا،

ملا سعید کو زیب النسا کی ملازمت مین جب کافی مدت گذر گئی، تو وطن واپس جانا چاہا اور رخصت کی درخواست ایک مدحیہ قصیدہ مین لکھکر دی، اس قصیدہ کے آخر مین لکھتا ہی،

یکبارہ از وطن نتوان برگرفت دل ... در غربتم اگرچہ فزون است اعتبار

پیش تو قرب و بعد تفاوت نمی کند گو خدمت حضور نباشد مرا شعار

نسبت چو باطنی است چہ دہلی چہ اصفہان دل پیش تست تن چہ بہ کابل چہ قندھار

(مآثر الکرام ص ۱۱۶ جلد دوم)

ریاض الشعراء (قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی) مین زیب النساء کی خدمت مین شاعرانہ معروض کا ایک اور واقعہ منقول ہی، نعمت خان عالی نے جو اس زمانہ کا ایک مشہور شاعر تھا، زیب النساء کے پاس ایک مرصع کلغی فروخت کے لئے بھیجی، زیب النساء نے اسکی قیمت بھیجنے مین دیر کی تو نعمت خان نے یہ رباعی لکھکر پیش کی،

اے بندگیت سعادتِ اختر من در خدمتِ تو عیان شدہ جوہر من

گر جیغہ خریدنی است پس کو زر من ورنیست خریدنی بزن بر سر من

اس رباعی کے صلہ مین زیب النساء بیگم نے پانچہزار روپئے دلوائے، اور کلغی بھی واپس کردی، مولانا شبلی مرحوم نے بھی اس واقعہ کو خزانہ عامرہ سے نقل کیا ہی،

۱۰۹۰؁ھ مین زیب النساء نے ابرک کا ایک بڑا خیمہ بنوایا، جو تمام تر شیشہ کا معلوم ہوتا تھا، نعمت خان عالی نے اسکی تعریف مین ایک چھوٹی سی مثنوی کہی اس کے کچھ اشعار مولانا شبلیؒ نے اپنے مضمون زیب النساء مین بھی نقل کئے ہین، (دیکھو مقالات شبلی جلد پنجم ص ۱۱۷) زیب النساء کے دربار کے شعرو شاعری کے اسی چرچے کی بناپر مولانا شبلی رقمطراز ہین، کہ عالمگیر کی خشک مزاجی سے شاعری اور شعراء کو جو نقصان پہنچا تھا، اسکی تلافی زیب النساء کے حُسن مذاق سے ہوگئی تھی،

اورنگزیب کی دوسری لڑکیان اورنگزیب کی دوسری لڑکیون کا علم و ہنر زیب النساء کی علمی شہرت کے سامنے ماند پڑگیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ گو زیب النساء کی طرح آسمانِ علم و ادب کی مہر تو نہ بن سکین، مگر مختلف قسم کے علوم و فنون سے آراستہ و پیراستہ تھین، مآثر عالمگیری کے

مؤلف کا بیان ہے کہ اورنگزیب کی لڑکیوں میں زینت النساء بیگم نے بھی باپ کی توجہ اور فیض تربیت سے علمی کمالات حاصل کئے، وہ عقائد مذہبی، احکام دینی اور مسائل شرعی سے بخوبی واقف و آگاہ تھی، (مآثر عالمگیری اردو ترجمہ ص ۳۹۵) صبح گلشن میں زینت النساء بیگم کا ذکر ایک شاعرہ کی حیثیت سے بھی کیا ہے، مؤلف کے الفاظ یہ ہیں: (ص ۱۹۲-۱۹۱)

"زینت النساء بیگم ہمشیرۂ زیب النساء بیگم از بنات اورنگزیب عالمگیر بادشاہ است عالمہ و شاعرہ و حافظۂ کلام اللہ بود، زینت المساجد بنا کردہ اش الی الآن در شہر شاہجہان آباد موجود و معمور و بر سنگ مزارش کہ در صحن ہمان مسجد ست این شعر خودش منقوش و منقور است

مونس ما در لحد فضل خدا تنہا بس است سایۂ از ابر رحمت قبر پوش ما بس است

مآثر عالمگیری کے مولف کا بیان ہے کہ اورنگزیب کی ایک اور لڑکی زیب النساء بیگم کی طرح حفظ کلام اللہ کی سعادت اور علوم دینی کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئی، اور ہمیشہ علم کے ساتھ عمل کو بھی ملحوظ رکھا، عالمگیر کی ایک اور لڑکی زبدۃ النساء بیگم کے بارے میں مؤلف مذکور لکھتا ہے، کہ ہمیشہ طاعت و عبادت و تحصیل علم میں عمر بسر کی، اور ذخیرۂ سعادت فراہم کرتی رہی (اردو ترجمہ ص ۳۹۵)

مقالات شبلی حصہ چہارم

مولانا کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ، ضخامت ۱۹۰ صفحے، قیمت:- عہ

"منیجر"

ہندی ادب کا دورِ جدید

از

جناب گوری سرن لال سریواستو صاحب ایم اے (علیگ)

مغربی ادب کا اثر جب ہندی پر پڑا، تو اس کے نئے عہد کا آغاز ہوا، اٹھارہوین صدی مین ادبی قحط کا دور دورہ تھا، لیکن انیسوین صدی کی ابتدا ہی مین سنہرا زمانہ آیا، سیاسی اعتبار سے اس دور کو چاہے لاکھ برا سمجھین، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ادب کا پودا اس زمانہ مین جس قدر سرسبز و شاداب ہوا، ایسا کبھی نہین ہوا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان مین تجارت کرنے آئی تھی لیکن قسامِ ازل نے اُسے ایک بہت بڑی سرزمین کا حکمران بنادیا، لیکن کمپنی بھی یہ محسوس کرنے لگی کہ جن لوگون پر اسے حکومت کرنی ہے، ان کی صلاح و فلاح کے لئے اس پر کچھ ذمہ داریان بھی عائد ہوتی ہین، چنانچہ پارلیمنٹ مین اس مسئلہ پر گرماگرم بحثین ہوتی تھین، سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ کمپنی کی حکومت مین جو لوگ رہتے ہین، ان کی تعلیم کا مناسب بندوبست ہونا چاہئے، خوش قسمتی سے چھاپہ خانہ کی ایجاد نے ہندوستان کی ادبی زندگی مین بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا، ایک طرف دیسی زبانین ترقی کر رہی تھین تو دوسری طرف انگریزی تعلیم باوجود مخالف کے تھپیڑون کے تیزی سے پھیل رہی تھی، اس کا اثر ہندوستانیون کے خیالات پر بہت گہرا پڑا، جس طرح یورپ مین نئے دور (Renaissance) کی آمد سے قومی و ملکی زبانون کا عروج شروع ہوا، اسی طرح ہندوستان مین انگریزی زبان کے رواج نے دیسی زبانون کی ترقی کے لئے ایک نئی شاہراہ کھول دی، مدتون کی بدامنی کے بعد جب اہلِ ہند

کو سکون میسر ہوا، تو ان کے لٹریچر نے بھی ترقی کی، یہی وجہ ہے کہ یک صدی میں ہندی ادب کہیں سے کہیں پہونچ گیا، بول چال کی زبان منجھ گئی، اور ہندی نثر کی بنیاد پڑی، اس سلسلہ میں ہم چند مشاہیر اور بعض اداروں کا نام لیں گے اور انہی کے سلسلہ میں ہندی کی صد سالہ تاریخ پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے،

للوجی لال انیسویں صدی کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کا نظم و نسق، ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے ہاتھوں میں تھا، انھیں خوش قسمتی سے بہت سے مددگار مل گئے تھے، جن میں کپتان ابراہیم لاکٹ (J. Lockett) پروفیسر ٹیلر (Taylor) اور ڈاکٹر ہنٹر (Hunter) قابلِ ذکر ہیں، ان کی کوششوں سے دیسی زبانیں بارآور ہوئیں، انگریز افسروں کے مطلب کی دیسی کتابیں جمع کی گئیں، اور بہت سے ماہرینِ ادب نے مل کر ہندی کے پودے کو سینچنا شروع کیا اگرچہ زیادہ تر کام اردو کی ترقی کے لئے ہوا، لیکن للوجی لال اور سدل مصر نے ہندی کی ترقی کے لئے ہر ممکن طور پر محنت کی، اب تک ہندی کی جو نثر لکھی گئی تھی، وہ معیاری نہیں تھی، لیکن ان دو مصنفوں کی بدولت ہندی نثر کا ایک معیار قائم ہو گیا، للوجی لال گجراتی برہمن تھے، جن کے بزرگ گجرات سے آکر شمالی ہندوستان میں بس گئے تھے، سدل مصر کے ساتھ مل کر انھوں نے ادبی ہندی کا ایک معیار قائم کیا، شمالی ہندوستان میں ہندی کی مختلف بولیاں رائج تھیں، لیکن وہ لوگ جو فارسی نہیں جانتے تھے، ان سب کی زبان اردو تھی، اردو میں زیادہ تر الفاظ فارسی اور عربی سے مستعار لئے ہوئے ہیں، جن کا واسطہ خالص مسلمانوں سے ہے، ہندؤں کے لئے بھی ایک زبان چاہئے تھی، اس لئے انھوں نے اردو میں سے فارسی عربی کے الفاظ خارج کر کے سنسکرت اور خالص آریائی الفاظ شامل کرنا شروع کئے، کھڑی بولی دلی اور میرٹھ کے اطراف کی زبان کا نام ہے، اسی سے اردو کا خمیر بنا ہے، اور اسی پر ہندی زبان کی بھی بنیاد ہے، للوجی لال نے

کھڑی بولی پر ہندی کی عمارت بنائی، ادھر اردو مین نہ صرف عربی فارسی کے الفاظ شامل ہوگئے تھے، بلکہ پنجابی اور راجستھانی بھی گھل مل گئے تھے، اس لئے للوجی لال کی ہندی ہر اعتبار سے اردو سے مختلف تھی، یہی وجہ ہو کہ اسے ایک نئی زبان کہنا نامناسب نہین معلوم ہوتا، لیکن اس سے کسی طرح کی غلط فہمی نہین پیدا ہونی چاہئے، کیونکہ ہندی اردو دونون کا مخرج ایک ہی ہے، بعض لفظی اور معنوی تبدیلیون کے بعد دونون اب بھی ایک ہوسکتی ہین،

ادبی ہندی کی ملک مین بڑی کامیابی سے اشاعت ہوئی، ہندوستان مین اوس کے بولنے والے لاکھون کی تعداد مین پیدا ہوگئے، شاعری اب بھی برج بھاشا اودھی اور دوسری پراکرتون مین ہوتی تھی، کیونکہ کھڑی بولی کے شاعر بہت دنون بعد پیدا ہوئے، اب ہندی نثر مین بے شمار کتابین تصنیف ہونے لگین، یہان تک کہ چند برسون مین ایک بہت بڑا ذخیرہ پیدا ہوگیا، اس زبان کی سب سے پہلی کتاب پریم ساگر ہے، جو بھگوت پران کے دسوین ادھیاے کا ترجمہ ہے، اس سے پہلے چتر بھج مصر نے اس کا برج بھاشا مین ترجمہ کیا تھا، دوسری مشہور کتاب راج نیتی ہے جو ۱۸۰۹ء مین تصنیف ہوئی جس مین ہتوپدیش اور پنچ تنتر کی حکایات جمع کردی گئی ہین، یہ کتاب برج بھاشا مین ہے "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" مین بھی قصے ہین، ان کی زبان اردو ہندی کی عجب انمل کھچڑی ہے، اردو ہندی کی دیگر تصانیف کے علاوہ للوجی لال کی تصنیف "لال چندرکا" بھی بہت مشہور ہے، جو "بہاری ست سئی" کی شرح ہے، برج بھاشا کی نظمون کا ایک مجموعہ بھی انھون نے تالیف کیا تھا، اس کتاب کا نام "سبھا بلاس" ہے، سدل مصر نے "ناسکوت پاکھیان" لکھی جس مین ناچھی کیت کا قصہ درج ہے، اسکی ہندی سلیس اور شیرین ہی،

سرام پور کالج ہندی کی تجدید کے سلسلہ مین ولیم کیرے (Carey) اور ان کے شریک کار مارش مین (Marshman) کا ذکر نہ کرنا ایک اہم فروگذاشت ہوگی، انکی نئی

بائبل اور عیسائی مذہب کی دوسری کتابون کا ہندوستان کی تمام زبانون مین ترجمہ کیا، ہندی ترجمہ کیرے نے خود کیا تھا، سب سے پہلا ترجمہ ۱۸۰۹ء مین شائع ہوا تھا، علاوہ ان ترجمون کے ان عیسائیون نے دیسی زبان کی اور بہت سی کتابین شائع کین جن مین راماین بھی شامل ہے، ۱۸۱۲ء مین سرام پور مین آگ لگ گئی جسکی وجہ سے پریس اور بہت سی کتابون کا ذخیرہ جل گیا، ۱۸۱۸ء مین کیرے نے بنگالی زبان مین سب سے پہلا اخبار نکالا، اس سے پہلے دیسی زبان مین کوئی اخبار نہیں نکلا تھا، آج جو ہندوستان کی مختلف زبانون مین بہت سے اخبارات نکلتے ہین، ان کی ابتدا سرام پور ہی سے ہوئی، کیرے اور اس کے دوسرے رفقا نے جو کام کیا، اس سے دیسی زبانون کو بہت فروغ حاصل ہوا،

راجہ شیو پرشاد للوجی لال نے جس طرز نگارش کی بنیاد ڈالی تھی، وہ خاصی سنسکرت آمیز تھی، اسلئے اہل قلم نے اس پر حرف رکھنا شروع کیا، لیکن حرف رکھنے والے خود سیدھی سڑک پر نہ جا سکے اور ضرورت سے زیادہ فارسی کی طرف مائل ہوگئے، ان دو افراط پسند طبقون کے درمیان ایک تیسرا طبقہ پیدا ہوا، جس کے سرکردہ راجہ شیو پرشاد تھے، ان کی زبان نہ مشکل اردو ہے، اور نہ مشکل ہندی، بلکہ بول چال کی سلیس اور شستہ زبان ہے، پھر بھی یہ جھگڑا کم نہ ہوا، اور رفتہ رفتہ اس نے ایسی پیچیدگی اختیار کر لی، کہ آج اس کو حل کرنے کے لئے ملک کے بڑے بڑے اہل دماغ پریشان ہو رہے ہین،

راجہ شیو پرشاد ہندی کی مشہور شاعرہ بی بی رتن کنور کے پوتے تھے، جوانی مین وہ راجہ بھرت پور کے وکیل تھے، لیکن بعد میں سرکاری ملازمت کر لی، رفتہ رفتہ وہ میر منشی کے عہدہ پر فائز ہوئے، اور پھر ترقی کرکے محکمۂ تعلیمات کے ناظم ہوگئے، سرکار نے خوش ہو کر انھین راجہ کا موروثی خطاب عطا کیا، علاوہ علمی تصانیف اور تراجم کے راجہ صاحب نے اسکولون کے لئے بھی بہت سی درسی کتابین تالیف کین،

پریس دورِ جدید کی سب سے بڑی ادبی خصوصیت یہ ہو کہ اس زمانہ مین نثر کی بہت سی کتابین لکھی گئین، اس کا واحد سبب یہ ہو کہ طباعت کی تمام آسانیان فراہم ہوگئی تھین، پہلے کتابین فورٹ ولیم کالج کے مطبع مین چھپتی تھین، لیکن اس مین اخراجات بہت زیادہ ہوتے تھے، علاوہ اس کے ہندی کا ٹائپ بھی بہت بھدا ہوتا تھا، کیرے کی تصانیف اسی طرح چھپی تھین، ۱۸۳۷ء مین دلّی مین لیتھو پریس (Litho Press) جاری ہوا جب سے برابر ہندی کتابون کی اشاعت بڑھتی رہی اگر سب سے بڑی بات تو یہ ہوئی، کہ ہندی مین اخبارات اور رسالون کی تعداد بڑھنے لگی، اور اب تو ان کی اتنی کثرت ہو کہ شمار مشکل ہی، اب ہندی زبان مین انگریزی کے ترجمے، مذہبی اور تمدنی علوم پر کتابچے، ناول اور درسی کتابین ہر طرح کا لٹریچر شائع ہونے لگا، لیکن ان سب کو معیاری ادب کا مرتبہ نہین دیا جا سکتا، زمانہ خود بتادیگا کہ اس مین کتنا حصہ زندہ رہنے والا ہے، ہندی نثر کا ابھی کوئی معیار مقرر نہین کیا جا سکا ہے، ابھی صرف یہ بتایا جا سکتا ہے، کہ اس کے رجحانات کیا ہین، اس دور کی تصانیف مین کم از کم ایک کتاب یعنی بائبل کا ہندی ترجمہ ہندوستان کے چپہ چپہ مین پہونچ چکا ہی، اس لئے اس کا اثر ملک کی زندگی پر بہت زیادہ پڑا ہے، پریس کی بدولت بہتیری کتابین ملک کے گوشہ گوشہ مین پہنچ چکی ہین،

ہرش چندر ہرش چندر کی شاعری بڑے پایہ کی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ مغربی اثرات نے ہندی شاعری کو نقصان نہین پہنچایا، بلکہ اسے فروغ دیا، ہرش چندر کو بھارتیندو بھی کہتے ہین، جس کا ترجمہ "ہندوستان کا چاند" ہے، یہ کوئنس کالج بنارس مین پڑھتے تھے، سولہ برس کی عمر سے انھون نے شاعری شروع کی، اور اپنی مختصر سی زندگی مین ایک سو چھپتر کتابین لکھین، جن مین اٹھارہ ڈرامے ہین، ہرش چندر کو ہندی ڈرامے کا موجد کہا جاتا ہے، ان ڈرامون کا موضوع خالص قومی اور ملکی ہے، ہندوستان کے روشن مستقبل کے لئے اس مین بہت امید افزا خیالات ظاہر کئے گئے ہین،

ہرش چندر نے مختلف موضوعوں یعنی مذہب، سیاست، تاریخ اور فلسفہ وغیرہ پر کتابیں لکھی ہیں، نثر کے علاوہ نظمیں بھی کثرت سے لکھی ہیں جن میں مزاحیہ نظموں کی افراط ہے، ان کی دو کتابیں بہت زیادہ مقبول ہیں، ایک کشمیر کسم یعنی کشمیر کی تاریخ ہے، اور دوسری کتاب کا نام چتراولی ہو جس میں ہندستان کے بڑے آدمیوں کی سوانحمری درج ہے، ڈرامہ کے بعد ان کی عاشقانہ شاعری بہت قابل قدر ہی ان کا شمار ہندی کے بہترین ادیبوں میں ہونا چاہئے، ان کی زبان برج بھاشا ہے، اگو کھڑی بولی میں بھی یہ بہت خوب کہتے ہیں، انھوں نے اس خیال سے کہ ہندی شاعری کا مذاق عام ہوجائے، ہرش چندر کا نامی ایک ماہانہ رسالہ نکالا، اس رسالہ میں شعروشاعری پر اچھے مضامین اور نفیس منظومات ہوتی تھیں، علاوہ بریں کئی ایک مجموعۂ نظم بھی شائع کئے، جن میں سندری تلک بہت مشہور ہی، اس میں ۹۰ شاعروں کا کلام ہی، یہ تمام دفترِ نظم "سویا" بحر میں ہی، ایک اور کتاب کوی بچن سدھا ہی، جس میں برسات کے موضوع پر نظمیں ہیں،

ہندی اور بہاری ڈراما ہندی ڈراما ابھی حال کی چیز ہے، زمانۂ قدیم میں بھی بعض مصنفوں نے ناٹک لکھے تھے، ان میں دیودت کا ناٹک دیو مایا پر پنچ، نواز کی شکنتلا، اور برج باسی داس کا پربودھ چندر ردے زیادہ مشہور ہیں لیکن ان میں ڈرامائی خوبیوں کا نام ونشان بھی نہیں ہی، سب سے پہلا معیاری ناٹک گوپال چند عرف گردھرداس نے ۱۸۵۹ء میں نوہش ناٹک کے نام سے لکھا، اس میں ہنش کے راجہ کے تخت سے اترنے اور دوبارہ تخت نشین ہونے کا حال مکالمہ کی صورت میں بیان کیا گیا ہی، اس کے بعد راجہ لچھمن سنگھ نے شکنتلا لکھی، جو بہت اچھا اور نفیس ڈراما ہے، پھر ہرش چندر نے ڈراما لکھنا شروع کیا، ان کا پہلا ڈرامہ ودیا سندر ہے، اس دور کے دوسرے تمثیل نگار سری نواس داس، تو تارام، گوپال رام، کاشی ناتھ کھتری، بدری ناتھ، گوپی ناتھ اور لالہ سیتا رام وغیرہ ہیں، سب سے پہلے ہندی ڈرا ۱۸۶۸ء میں اسٹیج کیا گیا،

بہار میں ڈرامے کی بنیاد بہت پہلے پڑی، پندرہویں صدی میں ودیاپتی ٹھاکر ہوئے جنھوں نے دو ناٹک لکھے ہیں، لال جھا جن کا زمانہ ۱۷۸۰ء ہے، گوری پری نے کے مصنف ہیں، انیسویں صدی کے شروع میں بھانو ناتھ جھا نے پربھا وتی ہرن اور ان کے بعد ہرش ناتھ جھا نے اوشاہرن لکھی، بہاری اور ہندی ڈرامے میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ بہاری میں افراد سنسکرت اور پراکرت میں باتیں کرتے ہیں، اور محض گانے میتھلی میں گائے جاتے ہیں، برخلاف اس کے ہندی ڈرامے کی زبان شروع سے اخیر تک ہندی ہی ہوتی ہے،

نظموں کے مجموعے | جس کثرت سے نظموں کے مجموعے اس دور میں شائع ہوئے ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ ہندی ادب سے پبلک کی دلچسپی کتنی سرعت سے بڑھ رہی تھی، اور چھاپہ خانے کی اہمیت کا اندازہ کتنا زیادہ کیا جانے لگا تھا، للوجی لال اور ہرش چندر کے مجموعوں سے قطع نظر سیکڑوں اور مشہور مجموعے شائع ہوئے، راگ ساگر کلپدرم میں دو سو شاعروں سے زیادہ کا کلام ہے، کتاب ضخیم ہے، مؤلف کا نام کرشنا نند ویاس دیو ہے، تاریخ ترتیب ۱۸۴۳ء درج کتاب ہے، ٹھاکر پرشاد ترپاٹھی نے ۱۸۶۳ء میں دو سو بائیس شاعروں کے کلام کا مجموعہ شائع کیا، اور گوکل پرشاد نے جو ریاست بلرام پور ضلع گونڈہ کے کایستھ تھے، وگ بجے بھوشن نامی مجموعۂ نظم شائع کیا، اس میں ایک سو بانوے شاعروں کا کلام ہے، شیو سنگھ سینگر نے شہرہ آفاق مجموعۂ نظم شیو سنگھ سروج تالیف کیا، اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا،

گوکل ناتھ | اس دور کی ایک مفید تالیف مہا بھارت کا ہندی ترجمہ ہے، اس کام کی ابتدا گوکل ناتھ نے کی، جن کا وطن مالوف بنارس ہے، راجہ اودت نرائن نے ان کی بڑی ہمت افزائی کی، اس وقت انھوں نے دو اور کتابیں گوبند سکھ بہار اور چیت چندر کا لکھیں، دوسری کتاب میں انھوں نے اپنے ولی نعمت راجہ چیت سنگھ کے حالات درج کئے ہیں، بہرحال مہا بھارت

کا ترجمہ ان کا شاہکار ہے، اس کام مین انھین اپنے بیٹے گوپی ناتھ اور شاگرد مانی دیو سے بڑی مدد ملی،

درباروں میں ہندی | ہندی مین نئے خیالات آسانی سے رواج نہ پا سکے، بعض جگہ تو ابھی تک پرانے خیالات ہی کا رواج ہی چھاپہ خانہ کی برکتین یک بیک عام نہین ہوئین، اس وجہ سے شاعرون کو درباری کرنی پڑتی تھی، تیا، چرکھاری، ریوان، بنارس اور راجودھیا وغیرہ ریاستون کے راجہ نہ صرف شاعر نواز تھے، بلکہ خود بھی شعر کہتے تھے، جودھپور کے راجہ مان سنگھ نے جن کا زمانہ ۱۸۱۸ئ کے لگ بھگ ہے، راجستھانی مین بہت سی کتابین لکھی ہین، ایک مشہور شاعر چندر سیکھر باجپئی در بھنگہ، جودھپور اور پٹیالہ وغیرہ کئی ریاستون مین رہے، وہ رزم اور بزم دونون کے ماہر تھے، ان کی تصنیف ہمیر ہٹ بہت اچھی ہی، تیا کے مہاراج ہندو پتی نے موہن بھٹ، ادوپ ساہی اور کرن وغیرہ شاعرون کو نوازا، کرن نے فن شاعری پر بھی ایک کتاب لکھی ہے، موہن بھٹ کے بیٹے بدماکر بھٹ تھے، جن کی رسائی بہت سے دربارون مین تھی، چرکھاری کے راجہ کھمان سنگھ، بکرم سنگھ اور رتن سنگھ، ہندی ادب مین بہت مشہور ہین، انھون نے شاعرون کی بڑی حوصلہ افزائی کی، بکرم سنگھ خود بھی بڑے اچھے شاعر تھے، انھون نے بہاری لال کی تقلید مین ست سئی لکھی ہی، ان کے دربار مین بتیال، مان اور بال دیوا یسے عظیم المرتبت شاعر تھے، ان سے پہلے راجہ رتن سنگھ نے بھی ہندی ادب کی بڑی خدمت کی تھی، ان کے دربار مین بہاری لال، اودھیش، راؤ رانا، گوپال اور رام دین ترپاٹھی وغیرہ اچھے اچھے شاعر رہتے تھے،

ریاست بوندی نے بھی ادب ہندی کی تاریخ مین سنہری جگہ حاصل کر لی ہے، دربار کے مشہور شاعر سورج مل نے بنس بھاسکر لکھی، جو ریاست بوندی کی منظوم تاریخ ہے، اور ہندی

ادب کے شہ پارون مین سی ہی، ریوان کے راجہ جے سنگھ اور ان کے لڑکے وشونا تھ سنگھ (۱۹۰۱ء)
دونون شاعرون کی قدر کرتے تھے، وہ خود بھی اچھے ادیب اور شاعر تھے، وشونا تھ سنگھ ہندی
کے علاوہ سنسکرت مین بھی خاصی مہارت رکھتے تھے، کبیر کی بیجک اور تلسی داس کی ونے پترکا
کی انھون نے ہندی مین اچھی شرحین لکھی ہین، ایک اور کتاب "رام چندر کی سواری" بھی انھون
نے بہت اچھی لکھی ہے، ان کے لڑکے راجہ رگھو راج سنگھ بھی شاعر تھے، انھون نے بھگوت پران کا
بہت پاکیزہ ترجمہ کیا ہے، اور ہنومان جی کی جیونی بھی لکھی ہے جس کا نام سندر شتک ہے،
ان والیانِ ریاست کی طرح اجودھیا کے راجہ مان سنگھ بھی شاعر اور شاعر دوست تھے،

فنِ شاعری درباری شاعرون مین زیادہ تر ایسے تھے، جو علم عروض اور فنِ شاعری پر کتابین
لکھتے تھے، ان کی بڑی قدر ہوتی تھی، چنانچہ گردین پانڈے (۱۸۰۳ء) نے کیشو داس کی
کوی پریا کے انداز پر کتاب لکھی، لکھنؤ کے ایک برہمن شاعر بینی پردین باجپئی نے بھی فنِ شاعری
پر چند مفید کتابین لکھین، اسی زمانہ مین پدماکر بھٹ بھی ہوئے، یہ باندہ کے رہنے والے تھے، انکی
قدر بہت سے دربارون مین ہوئی، انھون نے فنِ شاعری پر سات کتابین لکھی ہین، جو بہت
مستند اور معیاری ہین، صنائع بدائع خصوصاً ایہام نگاری مین انھین کمال حاصل تھا، ان کی
سب سے اچھی کتاب جگت ونود ہے، اخیر زندگی مین وہ گنگا جی کی پوجا کرنے لگے، اور گنگا لہری لکھی،
ان کے پوتے گدا دھر بھٹ نے بھی فنِ شاعری پر ایک کتاب لکھی، پدماکر کے ایک ہم عصر گوال
کوی تھے، جن سے ان کی برابر چشمک رہا کرتی تھی، یہ متھرا کے رہنے والے تھے، ان کی ایک تصنیف
جمنا لہری یادگار ہے، اسی دور مین بنارس مین رام سہائے داس اور نیاز میں تیج نیش ہوے،
رام سہائے نے بہاری لال کا اسلوبِ شاعری اختیار کیا، پرتاب سہائے نے رام چندر کے متعلق
نظم لکھی، اور فن پر بھی بہتیری کتابین لکھین، ان کی زبان متی رام کی طرح صاف ستھری ہی، اس عہد

کہ دوسری شاعروں مین بہاری لال ترپاٹھی اور نوین زیادہ قابل ذکر ہین،

ان کے علاوہ اور بہت سے شاعر ہوئے، جن کا فرداً فرداً ذکر کرنا ناممکن ہی، اس لئے یہان محض چند نام گنائے جا سکتے ہین، گنیش پرشاد فرخ آبادی نے نکھ سکھ لکھی ہے، گوپال چند عرف گردھر داس (جن کے لڑکے بھارتیندو ہرش چندر تھے) چالیس کتابون کے مصنف ہوئے ہین، سردار بنارسی نے بہاری ست سئی، کوی پریا اور سورداس کے کلام کی شرح لکھی ہے، سنگار سنگرہ اُن کی مشہور کتاب ہی، جس مین ناشتر کے تمام پہلوؤن پر مبصرانہ نظر ڈالی گئی ہے، ان کے شاگرد نرائن راؤ تھے، جن کا کلام ابھی تک راقم الحروف کی نظر سے نہین گذرا، منسا رام نے رگھوناتھ روپک لکھی، جس کی زبان مارواڑی ہے، یہ انیسوین صدی کی ابتدائی تصانیف مین سے ہے، یہ دراصل عروض کی کتاب ہی، لیکن اس صنعت سے لکھی گئی ہے، کہ اس کے مندرجہ اشعار سے عروض کی مثالون کے ساتھ رام چندر جی کی سوانحعمری بھی مرتب ہوگئی ہے،

مذہبی نظمین | اب تک جن نظمون کا ہم نے ذکر کیا ہے، وہ زیادہ تر مذہب سے تعلق رکھتی ہین، جن کا رواج اب بہت کم ہوگیا ہی، اس مین شک نہین کہ نئی تہذیب کے آغوش مین مذہبی تحریکون کا زور رہا، لیکن ان کا اثر لٹریچر پر زیادہ نہین پڑا، البتہ نثر مین مذہبی خیالات کی تبلیغ اخبارات اور کتابچون کے ذریعہ برابر ہوتی رہی، پھر بھی مذہبی نظم کا تھوڑا بہت ضرور رواج رہا، ۱۸۶۰ء مین جے پور کے راجہ جے چند نے سوامی کارتک منظوم لکھی، جس مین جینیون کے اصول و عقائد کی تشریح کی گئی ہے، ہاتھرس مین بختاور جی نے ایک عجیب و غریب نظم سونیسر لکھی جسمین یہ ثابت کیا ہے کہ خالق و مخلوق وغیرہ کوئی چیز نہین ہین، اور دنیا مین کسی چیز کا وجود ہی نہین،

دو سو برس کے بعد رام بھگتی کا پھر زور ہوا، منی شاعر نے رام راون کی لڑائی، اور رامائن کے مختلف قصے نظم کئے، چندر جھا نے ازسرنو رامائن نظم کی، سہج رام نے رگھو بنس اور ہنومان

ناٹک کا سلیس ترجمہ کیا، رگھوناتھ داس نے رام چندر جی کے ترانے گائے، اور جانکی پرشاد نے رام چندر پر اچھے اچھے گیت لکھے تلسی داس کی تصانیف پر شرحین بھی لکھی گیئن، چنانچہ بندن پاٹھک نے رام چرتر مانس کی شرح مانس سنکا ؤلی لکھی، اور شیو پرکاش سنگھ نے ونے پترکا کی شرح رام تتو بودھنی لکھی، اسی طرح کرشن بھگتی کا بھی زور رہا، رسک گوبند اور للت کشوری وغیرہ کے اشعار زیادہ تر کرشن جی کے کارنامون سے متعلق ہین،

عیسائی مذہب کی اشاعت سے حضرت عیسیٰؑ کے حمد بھی مقبول ہونے لگے، ان مین زیادہ تر انگریزی مذہبی گیتون (Hymns) کے ترجمے ہین، اس لئے ان مین کوئی ادبی حسن وخوبی نظر نہین آتی، لیکن جو اور یجنل ہندی مین لکھے گئے ہین وہ نہ صرف کلیسا مین پسند کئے جاتے ہین بلکہ باہر بھی گائے جاتے ہین، ان مین سب سے اچھے گیت ایک عیسائی جان کرسچین (JOHN CHRISTIAN) کی تصنیف ہین، اس شاعر کی سب سے مشہور نظم مکتی مکتا دہے جسمین حضرت مسیحؑ کی زندگی بیان کی گئی ہے،

زمانۂ حال | دنیا کے لٹریچر کا عموماً، اور ہندی لٹریچر کا خصوصاً یہ حال رہا ہے کہ کبھی نظم کا رواج زیادہ ہوا ہے، اور کبھی نثر کا، ہم نے دور جدید مین ہندی کی ترقی کی جو تاریخ درج کی ہے، اس مین نظم کی ترقی کی داستان غالب ہے، اور واقعہ یہی ہے کہ انیسوین صدی کے اخیر تک نظم کا سرمایہ نثر سے بہت زیادہ رہا لیکن بیسوین صدی کی ابتدا ہی سے نثر کی ترقی ہونے لگی، اور آج ہندی نثر کا ذخیرہ اتنا بڑا ہو گیا ہے، کہ اس کا مقابلہ یورپ کی کسی زبان کے لٹریچر سے کیا جا سکتا ہے نظم نے بھی ترقی کی، ریدکال کی فرسودہ شاعری، اور انیسوین صدی کی مذہبی شاعری سے نجات مل گئی، اور ان کی جگہ سیاسی اور ترقی پسند شاعری نے لی نظم ونثر کی اس ترقی کا حال ہم چند الفاظ مین نیچے بیان کرین گے،

دور حاضر کے سب سے پہلے ادیب بھارتیندو ہریش چندر ہیں، جنھوں نے تقریبًا سوا سو[125] تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، انھوں نے ادب میں حریت پسندی کی بنیاد ڈالی، اور اسے حب الوطنی کے زیور سے سجایا، ان کے بعد سری دھر پاٹھک اور مہابیر پرشاد دویدی کا نام لیا جاتا ہے، انھوں نے نظم ونثر میں کتابیں بھی بہت سی لکھیں اور شاگرد بھی بہت سے چھوڑے، اس طرح گویا لٹریچر کا ایک اسکول بن گیا، اس اسکول کے علاوہ ایک دوسرا اسکول ہے، جس کے بانی پنڈت اجودھیا سنگھ اپادھیا اور پنڈت ناتھو رام شنکر شرما ہیں، یہ لوگ لفظی تراش وخراش کو عام فہم شاعری پر ترجیح دیتے تھے، اسی وجہ سے ان کی شاعری زیادہ مقبول نہ ہوسکی، ان کے بعد بابو میتھلی سرن گپت ہیں، جو آج کل ہندی کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں، یہ حال ہی میں جیل سے چھوٹے ہیں، اس سے ان کی حب الوطنی کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے، انکی تصانیف میں بھارت بھارتی، بہاگیت جسو دراجیدرتھ بدھ وغیرہ عام طور پر پڑھی جاتی ہیں، آج کل کے پرانے شاعروں میں لالہ بھگوان دین اور گیا پرشاد شکل سنیہی ہیں، جن کی زبان اردو آمیز اور بامحاورہ ہے، ان کے پیرووں میں لکھن لال چترویدی اور بال کرشن شرما نے بہت نام پیدا کیا، پنڈت رام چندر شکل جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، شاعر تو بہت اچھے نہ تھے، لیکن تنقید نگاری میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے، یہی حال پنڈت رام نریش ترپاٹھی کا ہے، انھوں نے کوتیا کومدی سات جلدوں میں تالیف کرکے ہندی ادب پر بڑا احسان کیا ہے، مذہبی انداز کے جدید شاعروں میں پریم گھن، ست نرائن شرما اور جگن ناتھ داس رتناکر کا نام لینا ضروری ہے، اس زمانہ کے دوسرے شاعروں میں پنڈت روپ نرائن پانڈے، سیارام سرن گپت، انوپ شرما، گردھر شرما، سری رام شرما، کامتا پرشاد گرو، رام چرت اپادھیا، اور موہن پرشاد پانڈے وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں، گذشتہ دس برس میں بڑے اچھے شاعر پیدا ہوا ہے، جو شاعری کی

دوڑ مین قدیم اساتذہ کے بھی بہت آگے نکل گئے ہین، ان مین جے شنکر پرشاد، سورج کانت ترپاٹھی، سمترانندن پنت، نگینہ ناتھ، دیوگی ہری، ہری کرشن پریمی، سبھدا کماری چوہان، سمترا سنہا، ودیاوتی گوکل اور مہادیوی ورما کے نام سب سے پہلے لئے جاتے ہین،

جدید ہندی نثر کی ابتدا راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند سے ہوتی ہے، انھون نے زیادہ تر درسی کتابین لکھین، ان کی زبان اردو ہے، جو ناگری رسم الخط مین لکھی گئی ہے، کچھ عرصہ کے بعد راجہ لچھمن سنگھ نے شدھ (خالص) ہندی کی بنیاد ڈالی، جس مین زیادہ تر الفاظ سنسکرت کے ہوتے ہین، آخر ان دونون مصنفون کی طرز تحریر کا رواج کم ہوگیا، اور ہریش چندر نے ایک ایسا اسلوب ایجاد کیا، جو ان دونون کی درمیانی صورت ہے، اس اسلوب کو بالمکند گپت نے مانجھ کر صاف کیا، چنانچہ ان کا اسٹائل اور ان کی زبان ہندوستانی کا بہترین نمونہ ہے، ان کے ہم عصرون مین بال کرشن بھٹ، پرتاب نراین مصر، بدری نراین چودھری، ٹھاکر جگموہن سنگھ، سوامی دیانند، بھیم سین شرما اور امبکا دت ویاس وغیرہ اچھے مصنف ہوئے، ان کی متعدد تصانیف ہین،

اسی زمانہ مین ناگری پرچارنی سبھا کی بنیاد پڑی جس نے اب تک نصف صدی کی زندگی بسر کی ہے، اور اس عرصہ مین اس نے ہندی کی بہت خدمت کی ہے، لغات، لسانیات اور ادب پر متعدد بیش قیمت کتابین لکھی گئین، اور مقبول ہوئین، اس سبھا کا سب سے معرکۃ الآرا کام "شبد ساگر" یعنی نہر اللغات کی تصنیف ہے،

ہریش چندر کے بعد اچاریہ دویدی جی پدم سنگھ شرما، کرشن بہاری مصر، پدم لال پنالال بخشی تنقید مین، جے شنکر پرشاد، بدری ناتھ بھٹ، گوبند بلبھ پنت تمثیل نگاری مین، دیوکی نندن کھتری، کشوری لال گوسوامی اور پریم چند ناول مین، جے شنکر پرشاد، پریم چند، جوالا دت، شمبھو ناتھ شرما، کوشک، شیو پوجن سہائے، مہاشے سدرشن، ہردیش بیچن شرما اور چتندر کمار افسانہ نگاری مین

بہت مشہور ہین، ان کی کتابون کا ترجمہ بہت سی دیسی زبانون مین ہو چکا ہی،

آج کل ہندی ادب ترقی پسند ہو رہا ہے، ہندوستانی سیاست کا بہت گہرا اثر ہندی لٹریچر پر پڑ رہا ہے، مارکس کے نظریات بہت عام ہو گئے ہین، روس اور جرمنی کی موجودہ جنگ سے بھی ہندی ادب بہت متاثر ہوا ہی، دوسری طرف ہندی پر گاندھی جی کے اصولون اور عقائد کا بھی بہت بڑا اثر پڑا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ادب مین تھوڑی سی قدامت پرستی آگئی ہی اور رومانیت، فلسفہ اور مذہب ہر ایک نے ہندی مین اپنی مناسب جگہ پائی ہی، ہندی مین ترجمے بکثرت ہین جس کی تفصیل ہم اپنے مضمون "جدید ہندی کا سرمایۂ ادب" مطبوعہ رسالہ اردو بابتہ جنوری ۱۹۴۰ء مین درج کر چکے ہین،

بیس برس سے ہندوستان ستیاگرہ کی لڑائی لڑ رہا ہی، اس سے چالیس سال پہلے وہ حقوق کے لئے لڑتا تھا، اور دو سو برس سے غلامی کی زنجیرون کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہی، ادھر ڈھائی برس سے عالمگیر جنگ ہو رہی ہی، امریکہ جو "چودھری" بن کر قومون مین صلح کراتا تھا، خود لڑ رہا ہی، روس اور چین کی کثیر آبادی جنگ کے شعلون سے بھُن رہی ہے، ہندوستان کے دروازے پر جنگ کا بھوت پہنچ چکا ہی، ان سب کا اثر ہندی ادب پر پڑا ہی، اور پڑتا رہے گا، ایسی حالت مین ہندی کا مستقبل وہی ہوگا، جو ہماری قوم اور سارے زمانہ کی قسمت مین ہی،

نقوش سلیمانی

یہ مولانا سید سلیمان ندوی کی ہندوستانی اور اردو زبان و ادب سے متعلق تقریرون، تحریرون اور مقدمون کا مجموعہ ہی، جو انھون نے بعض ادبی کتابون پر لکھے۔

ضخامت ۵۰۰ صفحے، قیمت مجلد ۔

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

فنِ گفتگو

مندرجہ بالا عنوان سے ایک دلچسپ مقالہ اسٹیٹسمین میں شائع ہوا ہے، اس کی تلخیص ذیل میں درج ہے :-

جب دو صاحبِ مذاق آپس میں ملتے ہیں، تو انکا ذہنی اتصال گفتگو ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے، وہ گفتگو ہی سے ایک دوسرے کے خیالات و جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی لئے گفتگو کو ایک آرٹ کہا گیا ہے، یہ آرٹ ایسے اشخاص کی صحبت میں سیکھا جاسکتا ہے، جو قدرتی طور پر اسکے ماہر ہون گفتگو کی نوعیت اور محاسن ہی سے گفتگو کرنے والے کے کلچر کی خوبی اور اوصاف کا اندازہ ہوتا ہے، اعلیٰ قسم کی گفتگو کا انحصار ذہن کی ذکاوت اور دماغ کی تیزی پر نہین ہے، بلکہ اس کا تعلق موروثی تعلیم اور کلچر پر ہے،

اہلِ مشرق اپنے خالی اوقات مین زیادہ تر لوگون کے ساتھ بیٹھکر بات چیت کرتے ہین اسکوان کی کاہلی اور بیکاری پر محمول نہین کرنا چاہئے، بلکہ اس طرح کی انفرادی گفتگو اور تبادلۂ خیالات سے دماغ کے لئے ایسی غذا ملتی رہتی ہے، جو کتابون کے مطالعہ سے میسر نہین ہوتی، ان کے لئے گفتگو، تعلیم خصوصاً نفسیاتی تعلیم کا ایک بڑا ذریعہ ہے، گو وہ خود عام طور سے اسکی تعبیر اس طرح نہین کرتے ہین،

ارباب فلسفہ اور اصحاب علم کی گفتگوؤن مین ایک خاص قسم کی شگفتگی ہوتی ہے، جو اپنی لذت کی بنا پر ذہنی تربیت کا ذریعہ بنتی ہے، عہد قدیم کے علوم و فنون پر گہری نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے، کہ گفتگو مین سلیقہ اور تربیت ہی پر کلچر کی اعلیٰ ترقی کا انحصار تھا، لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہی کہ کیا موجودہ دور مین یہ آرٹ بالکل نظرانداز کردیا گیا ہے، اگر واقعی نظرانداز کردیا گیا ہی تو اس کا سبب کیا ہی؟ اساسی طور پر موجودہ نسل گذشتہ نسلون سے مختلف نہین، گو بظاہر دونون مین ایک وسیع خلیج حائل نظر آتی ہی لیکن اس سے انکار نہین کیا جاسکتا، ہی کہ موجودہ عہد کے لوگون کی زندگی کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے، ان کی زندگی غیر معمولی مشغولیت کی وجہ سے طوفان خیز ہوگئی ہی، اور ان کو اپنی مشغولیت کے ہجوم مین اتنی فرصت نہین ملتی، کہ وہ گفتگو کو آرٹ کے طور پر سیکھنے اور اخذ کرنے کی کوشش کرین، خصوصًا جب کہ یہ عام طور سے سمجھا جاتا ہی، کہ گفتگو بےکار اور خالی وقت مین کیجاتی ہی، لیکن یہ کوئی معقول وجہ نہین، اس کے اصلی اسباب موجودہ تمدن کے معاشرتی اجزا کا تجزیہ کرنے کے بعد معلوم ہونگے، درحقیقت اس کے دو سبب بتائے جاسکتے ہین، ایک تو تجارت کا وسیع پیمانہ پر فروغ، دوسرے انسان کے جذبۂ خود پسندی کی بے راہ روی، دونون نے مل کر ایک ایسے قلعہ کو مسمار کردیا، جو انسانی ذہن مین تعمیر ہوگیا تھا، اس مین شک نہین کہ خودپسندی کا جذبہ موجودہ دور کی پیداوار نہین، بلکہ اس وقت سے قائم ہے، جب سے انسانی آبادی شروع ہوئی لیکن پہلے خودپسندون کے کچھ افراد پائے جاتے تھے، اور اب ہر جگہ خودپسندون کی قومین پیدا ہوگئی ہین، یہی خودپسند قومین تجارت کے اسلحہ ہاتھون مین لیکر ان تمام چیزون سے برسرپیکار ہین جن سے ان کو مادی اور تجارتی فوائد حاصل نہین ہوتے ہین، ایسی حالت مین فنون لطیفہ کی ترقی کی کیا امید ہوسکتی ہے، چنانچہ ارباب علم کتاب لکھتے وقت بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھنے کے بجائے اپنے ناشرون کو سامنے رکھتے ہین، بہت سے باکمال شعرا محض

اس لئے گمنامی اور غربت کی حالت مین زندگی بسر کر رہے ہین، کہ اس تجارتی دنیا مین شاعری فنِ گفتگو کی طرح محض ایک ذہنی عیاشی سمجھی جاتی ہے، یہ دونون آرٹ تجارت کے دائرہ سے باہر ہین، اس لئے ان کی طرف توجہ کم ہے، لیکن جو ملک یا خطے ابھی تجارتی اور صنعتی بننے سے محفوظ ہین، وہان یہ دونون آرٹ اب بھی مقبول ہین، شہرون کے شور و غوغا سے دور اب بھی یہ منظر دیکھنے مین آتا ہے کہ کچھ لوگ بیٹھکر یا تو منظوم قصے پڑھتے اور سنتے ہین، یا آپس مین میٹھی میٹھی باتین کرتے ہین، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ان کی باتین فضول بکواس ہوتی ہین، کیونکہ ان کی گفتگو زمانہ کی رفتار اور تمدن کی ترقی کے مطابق نہین ہوتی لیکن یہ راے صحیح نہین، گو ان کی باتون مین تجارت اور مشین کی دنیا کی مادیت نہین ہوتی، لیکن ان کی مجلس گفتگو ناگون فوائد پر مشتمل ہوتی ہے، وہ جب اپنی مجلس مین بیٹھکر بات چیت شروع کرتے ہین، تو اس کی لذت سے ان کا تکدر و اضمحلال دور ہو جاتا ہے، اور اسی کے ذریعہ وہ ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہین جس سے وہ اپنی معاشرتی اور اجتماعی زندگی مین قریب تر رہتے ہین، اس طرح ہر شخص کی انفرادیت غیر ارادی طور پر برقرار رہتی ہے،

گفتگو کے دو پہلو ہین، کرنا اور سننا، اچھی گفتگو کرنے والے کی طرح اچھے سننے والون کی بھی کمی ہوتی جارہی ہے، گفتگو سننے والون کے لئے ضروری ہے، کہ وہ حساس ہون، گھنٹون خاموش رہ سکتے ہون، تاکہ صبر و سکون کے ساتھ گفتگو کے معانی و مطالب کو اخذ کر سکین، ان مین عقل سلیم کے ساتھ بیدار مغزی بھی ہو تاکہ گفتگو کو نہ صرف آسانی سے سمجھ سکین، بلکہ اپنے جواب سے گفتگو کرنے والے کی گفتگو مین تنوع پیدا کر سکین، ان کو گفتگو کرنے والے کی طرح ضروری معلومات سے باخبر ہونا چاہئے گو یہ ضروری نہین کہ گفتگو کرنیوالے کی راے سے متفق بھی ہون، سنجیدہ اور مہذب اشخاص کی گفتگو ایک دلچسپ تجربہ کا باعث ہوتی ہے، ان کی گفتگو مین ایسا توازن ہوتا ہے کہ خواہ ان مین کتنا ہی اختلاف ہو لیکن گفتگو مین تلخی اور

ناگواری نہین ہونے پاتی، اچھی گفتگو کرنے والا کبھی اپنی گفتگو کو مذہبی عقیدہ کی حیثیت سے شروع نہین کرتا، کہ اس مین ترمیم اور تبدیلی کی گنجایش نہ ہو، کیونکہ فن گفتگو مین مخاطب کے خیالات کا احترام ملحوظ رکھنا ضروری ہے، گفتگو کرنے والے کو پورا حق ہی کہ وہ اپنی رائے کی حمایت اور مدافعت کرے، اپنے اصول کو واضح اور اپنے فلسفیانہ نقطۂ نظر کو روشن کرے، لیکن اس سے یہ بھی توقع کیجاتی ہو کہ معقول دلائل و براہین سے قائل ہونے مین تامل نہ کرے، اور محض احساسِ کمتری کی بنا پر معقول بات کو تسلیم کرنے سے منکر نہ ہو، کہ اس سے گفتگو کی ساری لذت جاتی رہتی ہے، اور گفتگو محض مناظرانہ بحث مین تبدیل ہو کر رہ جاتی ہی۔

اچھی گفتگو کرنے کے لئے وقت اور جگہ کا لحاظ ضروری ہے، مناسب وقت اور مناسب جگہ مین دماغ گفتگو کرنے اور اس کے سننے کے لئے حاضر رہتا ہی لیکن آج کل کی زندگی مین مناسب وقت اور مناسب جگہ کا تعین کرنا مشکل ہی خالی اوقات زیادہ تر سینما اور ناچ گھرون مین برباد کئے جاتے ہین، سینما اور ناچ گھر کی دلچسپیون سے دماغ کی تفریح تھوڑی دیر کے لئے ضرور ہو جاتی ہے لیکن اس قسم کے مشاغل سے دماغ کی تربیت اور نشو و نما نہین ہوتی، بعض ہوٹلون مین ایسے اشخاص ملتے ہین، جو گفتگو کرنے مین ایسے منہمک ہوتے ہین، کہ ہوٹل کی موسیقی اور سڑکون کا شور و غوغا بھی انکے انہماک مین مخل نہین ہوتا، لیکن ایسی مثالین کم ہین، بہر حال گفتگو کو آرٹ کی طرح سیکھنے والے اشخاص کے لئے شہر کے ہنگامہ خیز ماحول مین بھی مناسب جگہ مل سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اسکے خواہان ہون، عام طور سے چاندنی رات اور گرمی کے موسم کی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا اچھی گفتگو کرنے کے لئے بہت موزون ہوتی ہے، فضا لطیف ہو صحبت پسندیدہ ہو، اور فرصت کے اوقات کا بہترین مصرف لینے کا خیال ہو، تو پھر گفتگو کرنے والون کے لئے ایک نئی دنیا پیدا ہو جاتی ہے،

ملکۂ وکٹوریہ کے زمانہ مین اچھی گفتگو کرنا ایک بڑا معاشرتی وصف سمجھا جاتا تھا، وہ میزبان بہت مقبول ہوتا تھا، جو اپنے مہمانون کی ضیافت اعلیٰ قسم کی گفتگو سے کرسکتا تھا، کھانے کی میز پر اچھے کھانون سے زیادہ اہمیت اچھی گفتگو کو دی جاتی تھی، اس گفتگو کے ذریعہ عورتون اور مردون کی ایسی تعلیم ہو جاتی تھی، کہ وہ اہم سیاسی تجارتی اور اقتصادی مسائل کھانے کی میزون پر طے کر لیتے تھے، گو ایسی گفتگو کو فن کے نقطۂ نظر سے پُر فریب کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اس طرح گفتگو کرنے والون کے اصلی خیالات وجذبات کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا ہے، وہ اپنے مقاصد کو سامنے رکھکر اپنی گفتگو مین مدبرانہ پہلو اختیار کرتے ہین، اس لئے ایسی گفتگو کلچر اور انسان کے ذہنی نشو و نما کیلئے مفید نہین ہوتی، مگر ملکۂ وکٹوریہ کے عہد مین فرصت کے اوقات زیادہ تر گفتگو کرنے مین بسر کئے جاتے تھے، اور یہی ان کا بہترین مصرف تھا، کیونکہ گفتگو ہی کے ذریعہ سے آپس مین اتحاد، اخوت اور یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کیجاتی تھی،

موجودہ دور کے طرز زندگی نے فنِ گفتگو پر کاری ضرب لگائی ہے، قدیم طرز کے گھرون کی قدیم فضا مین یہ فن آسانی سے ترقی کرتا تھا، لیکن جدید زندگی کا نیا مذاق اس کے لئے سنگِ راہ ہو رہا ہے، مثلاً اب گھرون مین ریڈیو ہوتا ہے، اسکی گفتگو سے دماغ کی تفریح تو ضرور ہو جاتی ہے، لیکن اس سے دماغ کی ورزش مطلق نہین ہوتی ہے، اسی لئے یہ کہا جا سکتا ہے، کہ اگرچہ موجودہ دنیا نے سائنس کے فروغ مین نمایان کارنامے انجام دیئے، لیکن آرٹ اور کلچر کی ترقی مین اس کی کامیابیان نسبتہً حقیر ہین، اور جب کبھی معاشرتی زندگی کو اعلیٰ معیار پر لانے کی کوشش کیجائیگی، تو فرصت کے اوقات کا بہترین مصرف زیر غور ہوگا، اس وقت فنِ گفتگو کی اہمیت کا بھی صحیح اندازہ ہوگا،

"ص ع"

چین مین مسلمان

چین مین مسلمانون کی کل آبادی پانچ کروڑ ہے، جو مختلف حصون مین پھیلی ہوئی ہے، ان کی بڑی تعداد سکیانگ (Sikkiang) سیتر چوان، کنیسو اور یناآن کے مغربی صوبون مین ہے، ہوتیچ کے مرکزی اور فکین کے جنوبی حصہ مین بھی اچھی خاصی آبادی ہے، پکین کے جنوب مین جو مسلمان آباد ہین، وہ اس شہر کی کل آبادی کی تہائی سے کم نہ ہون گے، تبت کے بعض باشندون نے بھی جو وہان آباد ہین، اسلام قبول کر لیا ہے،

چین مین مسلمانون کی ابتدار کیونکر ہوئی، اسکی اب تک تحقیق نہ ہو سکی، اس بارہ مین جو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے، اسکی حیثیت قیاسات شواہد سے زیادہ نہین، اسلام ایک سیلاب عظیم کی طرح شمالی افغانستان سے ترکستان تک پھیل چکا تھا، اس کا اثر چین پر بھی پڑا، چودہوین اور سترہوین صدی عیسوی کے درمیان شاہی منگ خاندان کے افراد نے ترکستان سے آئے ہوے مسلمانون کو نہ صرف شمالی مغربی چین مین بسنے کی جگہ دی، بلکہ ہر موقع پر انکی ہمت افزائی کی، لیکن اس سے بھی پہلے تیرہوین صدی مین ٹنگیس اور سنگس کے زمانہ مین فکین چیکا ئنگ کے سواحل پر عرب نوآبادیات تھین، صوبہ چنگھائی مین زرد دریا کے کنارے ایک قوم آباد ہی، جسے "سالار مسلمان" کہا جاتا ہے، یہ لوگ تین صدی پیشتر سمرقند سے آکر آباد ہوے تھے، اس زمانہ سے لیکر اب تک ان کے تعلقات سمرقند سے قائم ہین،

چین کی شاہی حکومت کی طرف سے مسلمانون کو قانون شریعت کی پیروی کی مکمل آزادی تھی، اگر کبھی مسلم اور غیر مسلم مین کسی قسم کا جھگڑا ہو جاتا، تو عام قاعدہ یہ تھا، کہ اس کا فیصلہ مسلمانون کے احکام شریعت کے مطابق ہوتا تھا، موجودہ جمہوری حکومت نے بھی مسلمانون کے شرعی ادر

معاشرتی قوانین کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے،

چینی مسلمان عام طور سے مختلف حصون مین منقسم ہین، ان کی جماعتین کسی مقدس شہر یا مسجد کے چارون طرف آباد ہین، انکا سب سے مقدس مقام ہوچھاؤ ہے، پرانے زمانہ مین ہر امام کے لئے ہوچھاؤ کی تعلیم ضروری تھی، رفتہ رفتہ اسکی مرکزی اور سیاسی طاقت بھی بڑھ گئی لیکن موجودہ زمانہ مین گھٹتی جارہی ہے اور اسکی جگہ سن انگ لے رہا ہے، اب ہر امام کے لئے وہان کی تعلیم ضروری ہے کیفنگ، ہیکہنگ، کنمنگ وغیرہ بھی چینی مسلمانون کے مرکزی مقامات ہین، تقریبًا تمام مسلمان عقیدةً اہلِ سنت ہین، تصوف ایک خاص فرقہ مین ہے جنھین جیبری کہتے ہین، کچھ نوجوان احمدی فرقہ سے بھی تعلق رکھتے ہین، جو اپنی تبلیغ اور تعلیم مین بڑے انہماک کا اظہار کررہے ہین، اور اس مین ان کو کامیابی ہورہی ہے،

چینی مسلمان بہت صالح اور اسلامی جذبہ رکھتے ہین، انھون نے کیومن ٹینگ مین ایک لیگ قائم کی ہے جس کا نام انجمن قومی فلاح وبہبودی مسلمانانِ چین ہے، نیکنگ مین ان کا ایک نارمل اسکول ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اس مین ایسے نوجوان پیدا ہون جو آیندہ قوم کی رہنمائی کرسکین،

ٹسنگ ہے، کینسو اور ننگہسا کی فوج مین تقریبًا اسی ہزار مسلمان سپاہی ہین، مالوفینگ کی زیرِ قیادت انھون نے حملہ آورون (جاپانیون) کو سخت شکستین دین، یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، کہ یہ جنگی مسلمانون پر جو چینی فوجی اسٹاف کے ہین، چیانگ کائی شک کو بڑا بھروسہ ہے، یہ ان لوگون مین ہین جن کے کندھون پر آزاد چین کی فوج کا بوجھ ہے، برما کی سڑک کی تعمیر مین مسلمان مزدورون کی بھی بڑی تعداد تھی، چین کا مکہ معظمہ سے ہمیشہ روحانی تعلق رہا ہے، کچھ عرصہ پہلے تک ہندوستانی حکومت چینی حجاج کی ہر ممکن آسایش کا خیال کرتی تھی، لیکن ادھر کچھ دنون سے ماسعد عبدالرحمن نے جو جامعہ ازہر کے تعلیم یافتہ اور جدہ مین چین کے نائب سفیر ہین یہ فرائض اپنے ذمہ لئے ہین، ابھی حال ہی مین ٹرکی کی چینی سفیر ڈاکٹر جنگ چین و عراق سے دوستانہ تعلقات کے قیام کیلئے بغداد گئے تھے، اہلِ چین کی یہ دلی خواہش ہے کہ چین اور اسلامی ممالک دائمی رشتہ اُخوت مین منسلک ہوجائین،

اخبار علمیہ

لندن کے کتب خانے

لندن کے کتب خانون کی موجودہ تعداد ۱۸۷۰ ہے، جن مین برٹش میوزیم کی مطبوعہ کتابون کی تعداد دنیا کے تمام کتب خانون کی مطبوعہ کتابون کی تعداد سے زیادہ ہے، ان کتب خانون مین کتابین زیادہ تر گذشتہ دوسو سال سے جمع کیجا رہی ہین، گو لندن مین ازمنۂ وسطیٰ ہی سے مخطوطات کے بکثرت کتب خانے موجود تھے، لیکن وہ زیادہ تر خانقاہون مین تھے، جہان سے کتابین فوری طور پر عاریۃً پڑھنے کو دیجاتی تھین، سولہوین صدی مین ان خانقاہون کو متعدد اسباب کی بنا پر سخت نقصان پہنچا، ان کی عمارتین مسمار کر دی گئین جس سے مخطوطات کے قیمتی ذخیرے بھی ضائع ہوگئے، جو کتابین محفوظ رہ گئین انھین جمع کرکے جلد سے جلد مختلف گوشون مین پہنچا دیا گیا، لیکن ۱۶۶۶ء مین لندن کی بڑی آتشزدگی مین کتابون کی ایک بڑی تعداد پھر تلف ہوگئی، سینٹ پال کے گرجے مین عبرانی کتابون کا ایک بے مثل ذخیرہ جمع تھا، اسکی شہرت عالمگیر تھی، یہ ساری کتابین جل کر راکھ ہوگئین اٹھارہوین صدی عیسوی مین ارباب علم کی کوششون سے پھر مختلف کتب خانے قائم ہوتے گئے، آکسفورڈ مین رابرٹ ہارلے نے جو آکسفورڈ کا پہلا ارل تھا، ایک کتب خانہ ہارلین لائبریری کے نام سے قائم کیا، اس مین زیادہ تر مخطوطات تھے، برٹش میوزیم کی جانب بھی زیادہ توجہ کی گئی، چنانچہ ۱۷۵۹ء مین اس کے ساتھ ایک دارالمطالعہ کھولا گیا، اور ہارلین لائبریری کے سارے مخطوطات یہان منتقل کر دیئے گئے، اس وقت اسکی مطبوعہ کتابون کی

تعداد تین لاکھ ہی، دنیا کی ہر زبان کی کتابین اس مین موجود ہین، ہر زبان کے اخبارات بے شمار آتے ہین، اس کو شاہانہ سرپرستی بھی حاصل ہی، جارج سوم نے اس کو بائیس ہزار دو سو پچیس ۲۲۲۵ کتابین عطا کین، جن مین دو ہزار کتابین صرف ۱۶۴۲-۴۹ء کی خانہ جنگی پر تھیں، جارج چہارم نے بکنگھم محل کے کتب خانہ کی پینسٹھ ہزار دو سو پچاس کتابین نذر کین، یہ مجموعہ شاہی کتب خانہ کہلاتا ہے، برٹش میوزیم کا کتب خانہ ثقافتی دولت کی ایک بے مثل کان ہی، اسکی فہرست تیار کرنے مین چالیس سال کی مدت لگی ہے، اور اب بھی ایک پورا اسٹاف نئی کتابون کی فہرست نگاری مین برابر مشغول رہتا ہے، مطبوعہ کتابون کے علاوہ مخطوطات کی تعداد بھی کثیر ہے، جن مین ۵۴ ہزار بہت ہی قدیم نسخے ۸۵ ہزار فرامین ۱۸ ہزار مختلف قسمون کی مہرین، اور ۲½ ہزار یونانی اور لاطینی کاغذات ہین،

اتفاقی ایجادات

ارباب کمال کی بہت سی ایجادین محض اتفاقات کی رہین منت ہین، مثلاً سر آئیزک نیوٹن باغ مین بیٹھا تھا، کہ ایک سیب درخت سے ٹپک کر گرا، اس نے اس ٹپکنے کی وجہ تلاش کی، جس سے کشش ثقل کا علم ہوا، اسی طرح جاذب کی ایجاد بھی عجیب و غریب طریقہ پر ہوئی، گذشتہ صدی کی ابتدا مین برک شائر کے ایک کارخانہ مین ایک مزدور کاغذ بنانے کے مسالے کے تمام اجزا مشین مین دینا بھول گیا، اس لئے جب کاغذ تیار ہوا، تو خلاف توقع بہت ادنیٰ درجہ کا نکلا، اسکی فروخت نہ ہوسکی اور کارخانہ کے مالک نے اس کو اپنے ذاتی کام کے لئے رکھ لیا، ایک دن جب اوس نے اس کاغذ پر کچھ لکھنے کی کوشش کی تو ساری سیاہی اس مین جذب ہوگئی اس وقت اس کاغذ کو جسے ردی سمجھ لیا گیا تھا، جاذب کی حیثیت سے گران قیمت پر فروخت

کیا گیا، بڑی بڑی عمارتون مین لوہے کی جو کنکریٹ (Ferro-Concrete) استعمال ہوتی ہین، اس کے متعلق بھی دلچسپ طریقہ سے معلومات حاصل ہوئین، ایک فرانسیسی باغبان بہت مشتعل مزاج تھا، غصہ اور اشتعال کی حالت مین اپنے گلدانون اور گملون کو توڑ دیا کرتا تھا، اس سے اسکو بڑی مالی زیر باری ہوتی تھی، چنانچہ اس نے خاص وضع کے گلدان بنانے شروع کئے، اور آہنی تارون کے گلدان بناکر اس کے اندر اور باہر سیمنٹ کی تہ جما دی، یہ اس قدر مضبوط ثابت ہوے کہ جب وہ انتہائی غصہ مین بھی ان کو زمین پر پٹکتا تو وہ نہ ٹوٹتے، اسی کے بعد سے یہ ترکیب عمارتون مین استعمال کیجانے لگی،

ایک روز ایک فرانسیسی سائنسدان نے اپنے معمل کی ایک الماری سے ایک خالی بوتل اٹھائی، اتفاقاً وہ بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پختہ زمین پر گر گئی، لیکن بالکل محفوظ رہی، سائنسدان مذکور کو اس کے سبب کی تلاش ہوئی، بالآخر اس کو معلوم ہوا کہ بوتل مین ایک ایسی کیمیاوی دوا تھی، جس کے اثر سے وہ بوتل ٹوٹ نہ سکی، اسی کے بعد شیشون کو محفوظ رکھنے کے لئے کیمیاوی دوائین ایجاد کین،

دنیا کا سب سے بڑا پھول

دنیا مین سب سے بڑا پھول سماترا مین پیدا ہوتا ہے، اس کا قطر ایک گاڑی کے پہیے کے برابر تین فٹ ہوتا ہے، اس پھول کے پانچ پتے بیضاوی شکل اور سپید رنگ کے ہوتے ہین، جو ایک مرکز کے چارون طرف بڑھتے رہتے ہین، اس پھول کا وزن پندرہ پونڈ ہے، اس مین دو گیلن پانی آسانی سے سما سکتا ہے، اسکی کلیان بڑے خاکی کرم کلہ سے مشابہ ہوتی ہین،

"ص ع"

باب التقریظ والانتقاد

صفۃ المعمورہ علی البیرونی

از

جناب سید حسن صاحب برنی، بی اے ال ال بی (علیگ) ایڈوکیٹ بلند شہر

حال ہی میں ہمارے ملک کے محکمۂ آثار قدیمہ نے یہ مجموعہ بطور تذکرہ ([illegible]) نمبر ۵۳ سینے
وعات کے سلسلہ مین شائع کیا ہی، اس مین جامعۂ استنبول کے فاضل استاد تاریخ احمد زکی ولیدی
مان نے ابوریحان البیرونی (متوفی ۴۴۰ھ) کی چار کتابون (۱) قانون مسعودی (۲) تحدید نہایات
ماکن لتصحیح مسافات المساکن (۳) کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر اور (۴) کتاب الصیدنہ سے بعض
ص اور مقامات انتخاب کرکے یکجا جمع کر دیئے ہین، استاد موصوف کو البیرونی کی تصانیف سے خاص
ف ہی اور انھون نے ترکی اور یورپ مین اسکی تصانیف کی جستجو مین کافی وقت اور محنت صرف
کرکے بعض نوادر مثلاً تحدید کا مصنف کے قلم کا لکھا ہوا نسخہ، اور صیدنہ (ع.بی) کا واحد قلمی نسخہ اپنے
ملک کے بیش قیمت ذخائر سے دستیاب کئے ہین، جیسا کہ اس مجموعہ کے مجوزہ نام سے معلوم ہوتا ہی، انھین
استاد موصوف نے البیرونی کی جغرافیائی معلومات کو روشن کرنے کی کوشش کی ہی، وہ اس سے پہلے بھی
اس مبحث پر لکھ چکے ہین، (دیکھو اسلامک کلچر ج ۸ نمبر ۴) اس خاص مجموعہ مین سب سے پہلے قانون مسعودی کے
پانچوین مقالہ کے نوین اور دسوین باب کو لیا گیا ہی، جس مین اجمالی طور پر آبادی، اقالیم اور شہرون کے طول بلاد اور

عرض بلد کا تذکرہ پایا جاتا ہے،

فاضل مدیر کے مختصر انگریزی دیباچہ سے معلوم ہوتا ہی کہ قانون مسعودی کے چند بہترین نسخے ترکی کے کتب خانون مین ملتے ہین، جنسے انھون نے ان ابواب کے مقابلہ و تصحیح مین کام لیا ہی، قانون مسعودی ابھی تک شائع نہین ہوسکی ہے، علی گڈھ مین مدتون سے کام جاری ہی، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ ان نسخون کا ذیل مین ذکر کر دیا جائے ممکن ہی کہ آیندہ ان سے استفادہ کی کوئی صورت پیش آسکے،

(۱) کتب خانہ ولی الدین آفندی کا نسخہ نمبر ۲۲۷۰ (واقع مسجد سلطان بایزید استنبول) جو پانچوین چھٹی ہجری کا معلوم ہوتا ہی۔

(۲) عجائب خانہ جنگی استنبول کا پانچوین چھٹی صدی کا نسخہ،

(۳) کتب خانہ ولی الدین جار اللہ استنبول کا نسخہ نمبر ۱۴۹۸، مکتوبہ ۵۳۱ھ، ۱۱۳۶، ۱۱۳۰،

(۴) رصد خانہ قندلی باسفورس کا نسخہ مکتوبہ ۱۱۴۷ھ

(۵) کتب خانہ یوسف آغا قونیہ نمبر ۹۰، پانچوین چھٹی صدی ہجری کا نسخہ،[1]

استاذ احمد ذکی کی رائے مین نمبر ۱ و نمبر ۵ سب سے اچھے نسخے ہین، ان دونون کا متن نمبر ۱ پر مبنی ہی جس کا مقابلہ دوسرے نسخون سے بھی کیا گیا ہی،

کتاب الجماہر حیدرآباد کے دائرۃ المعارف سے شائع ہو چکی ہی اور اس کا وہ حصہ جو موتیون

---

[1] اس جلیل القدر تصنیف کے پانچ ایسے اچھے نسخون کے پائے جانے سے اس کا اندازہ ہوتا ہی کہ ترکی کے خزانے فی الواقع اسلامی تصانیف کے جواہر پارون سے مالا مال ہین، کتاب التفہیم مطبوعۂ ایران کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہی حال ایران کا ہے، وہان بھی "قانون مسعودی" کے دوسرے نسخے موجود ہین، بہر حال، ما کہ ہندوستان مین قانون مسعودی کا بہترین نسخہ چوری کے ذریعہ سے جرمنی کے کتب خانے برلن مین پہونچ چکا ہی،

ن سے تعلق رکھتا ہی، حال ہی مین ترجمہ ہو کر اسلامک کلچر مین بھی شائع ہوا ہی،

الصیدنہ کا واحد نسخہ بروصہ کے کتبخانہ جامع کرشن لو مین پایا جاتا ہی، جسے ۶۷۸ھ (۱۲۷۹، ۱۲۸۰) مین بمقام قونیہ غضنفر التبریزی نے اپنے قلم سے نقل کیا تھا، یہ بڑے طبیب اور مصنف تھے: انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا البیرونی کا وہ رسالہ الفہرست ہی جس مین اس نے تاریخ اسلام کے نامور طبیب زکریا رازی کی تصانیف کی تفصیل بیان کی ہی، یہ پورا رسالہ یورپ مین شائع ہو چکا ہی، اور اس کا وہ حصہ جو صرف البیرونی کی تصانیف سے تعلق رکھتا ہی، الآثار الباقیہ کے جرمن دیباچہ مین شریک ہی،

الجماہر اور "الصیدنہ" کا جغرافیہ سے براہ راست تعلق نہین ہی، پہلے مین تو جواہرات وغیرہ سے بحث ہے اور دوسری مین ادویۂ مفردہ سے جو طب مین کارآمد ہو سکتی ہین لیکن چونکہ یہ چیزین مختلف ملکون اور مقامون مین پائی جاتی ہین، اس لئے اس سلسلہ مین البیرونی نے بہت سی اپنی جغرافیائی معلومات اور یادداشتین بھی شریک کر دی ہین،

الصیدنہ غالبًا البیرونی کی آخری تصنیف ہی، اور اس کا ناقص فارسی ترجمہ ابوبکر بن علی الکاشانی نے ہندوستان مین شمس الدین ایل تمش کے لئے ساتوین صدی ہجری کے شروع مین کیا تھا، عربی نسخہ ناقص ہونے کے باعث مدیر نے بعض مقامات فارسی ترجمہ سے بھی شریک کر لئے ہین،

اس کتاب کی تصنیف اس طرح ہوئی کہ البیرونی اپنی آخر عمر مین مفردات کے بارہ مین اپنی تحقیقات و معلومات کی یادداشتین لکھنا چاہتا تھا، لیکن کوئی مددگار نہین ملتا تھا، یہانتک کہ استاد شیخ احمد النہشفی اس کام کے لئے تیار ہوا، استاذ موصوف نے اپنے قلم سے مفردات کے نام جمع کئے، اور ان پر البیرونی نے حواشی اور یادداشتین لکھدین، جسے بعد مین غزنہ کے ایک فاضل امام ظہیر الدین ابی المحامد محمود بن مسعود نے ۵۷۹ھ مین بڑی جانفشانی سے اصل مسودہ سے جو بمشکل پڑھا جاتا تھا، کتاب کی شکل مین مرتب کر دیا، بلکہ کچھ مزید حواشی خود بھی بڑھائے، ترکی کا نسخہ اسی سے نقل کیا گیا ہی،

خالص جغرافیائی نقطۂ نظر سے قانون کے بعد اس مجموعہ کا سب سے دلچسپ حصہ تحدید کے انتخابات ہین افسوس ہی کہ فاضل مدیر نے اس کتاب اور "صیدنہ" کو پورا کیون نہ شائع فرما دیا؟ الجماہر طبع ہو چکی ہی، اُس کے انتخابات چھوڑے جا سکتے تھے، اسطرح شائقین کی تشنگی بجاے فرو ہونے کے اور بھی بڑھ جاتی ہے، لیکن بہرحال ہم ترکی کے اس فاضل استاد کے شکرگذار ہین جنکی اس قابلِ قدر علمی محنت سے جو بہترین طریقہ پر انجام دیگئی ہے، ان نایاب جواہر پارون سے روشناس ہونے کا موقع مل رہا ہی،

اطوال البلاد اور عروض البلاد کے متعلق قانون مسعودی کا یہ حصہ بظاہر ایک معمولی جدول ہی جسمین کل ۶۰۲ بلاد کا ذکر کیا گیا ہی اور اس مین کچھ ہندوستان کے مقامات بھی شامل ہین، لیکن اسکی اہمیت کا صحیح اندازہ اُسی وقت ہو سکتا ہی جب ہمین یہ معلوم ہو جائے کہ اُن کی طیاری مین البیرونی کا ذاتی حصہ کتنا ہی، اور اسکے انجام دینے مین اُسکو کس قدر جانفشانی کرنی پڑی ہی، دسوین باب کی تمہید مین خود ہی لکھا ہی، مین نے اس جدول مین جو اطوال و عروض درج کئے ہین، وہ تصحیح کی انتہائی کوشش کے بعد کئے ہین، (بعد الاجتہاد فی تصحیحہا) صرف کتابون کی نقل محض پر اکتفا نہین کی گئی ہی، کیونکہ کتابون مین ان کے متعلق بڑی ابتری پائی جاتی ہی،

اطوال و عروض کے دریافت مین البیرونی کا کیا حصہ ہی، اس کا پتہ تحدید سے چلتا ہی جس مین کہین کہین اوس نے اپنے ذاتی مشاہدات و مسائی کا ذکر کیا ہی، اس کی علمی تحقیقات اور اس علمی بیداری کو دکھانے کے لئے جو اس دور مین علمی مسائل کے متعلق علماے اسلام کی تحقیقات مین عام طور پر نمایان ہے، ہم صرف چند مثالون پر اکتفا کرین گے،

محض عرض جرجانیہ (خوارزم) کو تحقیق کرنے کے لئے کم از کم پانچ جُدا گانہ رصدون کے ذریعہ سے اوس نے مشاہدات کئے، ایک بچپن مین جب کہ وہ بمشکل اٹھارہ برس کا تھا، پھر دوبارہ پانچ چھ برس بعد، چوتھی مرتبہ ۴۰۷ھ مین جب کہ وہ خود جرجانیہ مین اور اس کا مشہور معاصر ہیئت دان

ابوالوفا محمد بن محمد البوزجانی بغداد مین کسوف قمر کی رصد کرتے تھے، اور نتائج کا مقابلہ کرتے جاتے تھے، سب سے اخیر مرتبہ ۴۰۹ھ مین جب کہ اس کی عمر ۴۷ سال کی تھی وہ ایک موقع پر لکھتا ہی:

"اس فصل کے لکھتے وقت یعنی سہ شنبہ غرہ جمادی الآخر ۴۰۹ھ کو مین کابل کے ایک قریہ مین جس کا نام جیفور (؟) ہے، موجود ہون، جہان ان مواضع کے عروض معلوم کرنے کی شدید حرص مجھے کھینچ لائی ہی، اور اسکی بدولت ایسی محنت اٹھا رہا ہون کہ حضرت نوحؑ اور لوطؑ نے بھی برداشت نہ فرمائی ہو گی، اگرچہ فضل ورحمتِ الٰہی کی دستگیری مین اُن کے بعد میسر مجھے بھی تجھے فریاد ہر اس کے احسان کی، (ص۶)

ایک دوسرے مقام پر شہر جرجان کے طول البلد کی تصحیح کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہی :-

"مین نے (مشہور فلسفی وطبیب) ابوعلی الحسین بن عبد اللہ بن سینا کا وہ رسالہ دیکھا ہی جو اوس نے شمس المعالی (والی جرجان) کی صاحبزادی زرین کیش کیلئے اسی کی فرمایش پر جرجان کے طول کی تصحیح کے متعلق لکھکر بھیجا تھا،

جو طریقہ ابن سینا نے اس کام کے لئے اختیار کیا تھا، اس پر اس طرح تنقید کرتا ہی :-

"یہ طریقہ اجتہاد صرف مطلب نکال لینے کے لئے اپنی سہولت اور وقتی امکانات کے لحاظ سے اختیار کیا گیا ہی، ورنہ باوجود ابوعلی کی ذکاوت وفطنت کے وہ ہرگز قابل سند نہین ہے کہ جس پر بھروسہ کرکے مانا جا سکے بالخصوص ایک طالب امر کے لئے" (ص ۶۵)

پھر آگے چل کر ایک جگہ لکھتا ہی :-

"اس بارہ مین ابوالفضل ہروی جو ریاضیات مین ابوعلی پر تقدم رکھتا ہی، زیادہ معتمد ہی، اُس نے عرض جرجان کو دو مرتبہ ۳۴۱ھ و ۳۴۳ھ مین رصد کے ذریعہ سے معلوم کیا تھا، دونون سنون کے نتیجون مین جو فرق ہی، وہ محض آلات کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے ہے، (ص ۶۶)

جہاں اس سے البیرونی کے انتہائی نقد و نظر کا پتہ چلتا ہی، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ اس قسم کے علمی مسائل مین اُس دور کی بعض مسلمان خواتین بھی دلچسپی رکھتی تھین، چنانچہ زرین کیش کی طرح البیرونی کی ایک ہم وطن خاتون ریحانہ بنت الحسن بھی مسائلِ ہیئت و نجوم مین شغف رکھتی تھی، جسے پورا کرنے کے لئے البیرونی نے کتاب التفہیم لکھی تھی،

اور بھی متعدد رصدون کا ذکر ہے، جو مختلف اطوال و عروض سے تعلق رکھتی ہین، اس مجموعہ مین التحدید کا ایک اور دلچسپ مقام شریک نہین ہی، جو دوسری جگہ میری نظر سے گذرا ہے،

عرض غزنہ کا ذکر کرتے ہوئے البیرونی لکھتا ہی:-

"تا این دم صرف عرض غزنہ ہی معلوم کرنے کا موقع ملا ہے، رہا طول تو اُس کے معلوم کرنے کے ابھی تک اسباب میسر نہین آئے، اب اگر اُن چیزون کو بتانے بیٹھون جو مانع رہین تو تم خیال کرنے لگوگے، کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی ظاہری و باطنی نعمتون کا کفران کر رہا ہی، اور اُن نعمتون کا بھی جو ولی النعم (سلطان محمودؒ) کے ہاتھون سے حاصل ہوئی ہین، پس یہی مناسب ہے، کہ اللہ تعالیٰ سے توفیق چاہون، کہ وہ اُن مباحث کو سرانجام دینے کے لئے سہولتین پیدا فرما دے، جس سے مجھے عشق ہی، اور جس کے حصول ہی میرا عزم اُس حالت مین بھی باز رہنا نہین چاہتا، جس مین روح اور بدن کا خطرہ ہو، بلکہ خواہ کیسے ہی خوفناک وقتون مین کیون نہ ہون جلدی کرنا چاہتا ہون، اور فضل ایزدی پر تکیہ کرتے ہوئی دنیا و دین کی بہتری کے لئے امداد مانگتا ہون"

اس سے البیرونی کے اس ناقابلِ شکست عزم و جرأت کا پتہ چلتا ہے، جو اس کی علمی تحقیقات مین ہمیشہ کارفرما نظر آتی ہے، قانون مسعودی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ بعد مین اوس نے غزنہ کی طول البلد کی پیمایش بھی انجام دے لی تھی،

اس کتاب مین اور بھی بہت سے اشارے البیرونی کی علمی زندگی کے متعلق ملتے ہین، اسی کتاب مین طبقات الارض کا وہ اہم نظریہ بھی موجود ہے، جو نباتی اور حیوانی آثار متحجرہ پر غور کرنے کے بعد ثابت کرتا ہی، کہ کرۂ ارض اپنے زمانۂ وجود مین طویل مدتون کے اندر مختلف ادوار سے گذرا ہے، اور ایک عرصہ تک برف و آب کے نیچے رہ چکا ہے، ابن سینا بھی اس نظریہ کا قائل تھا، اور معلوم ہوتا ہی کہ یہ نظریہ حکماے اسلام مین عام طور پر شائع اور مقبول تھا،

یہی اندازِ تحقیق و تدقیق الجماہر اور الصیدنہ مین پایا جاتا ہے، بلکہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اُسکی نظر کی گہرائی، تحقیقات کی پختگی اور بیان کی متانت اور زیادہ ہوتی چلی گئی ہے،

ان کتابون کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ یونانی، عبرانی اور سُریانی سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتا تھا، اسکی مادری زبان خوارزمی تھی، جو معلوم ہوتا ہی اس زمانہ تک مستقل اور جداگانہ حیثیت رکھتی تھی، اس نے لکھا ہی کہ "عربی و فارسی دونون زبانون مین ایک دخیل (یعنی باہر سے آنے والے) کی حیثیت رکھتا ہون، اور انھین بتکلف استعمال کرتا ہون"

ایک دوسرے مقام پر لکھتا ہی:

> بچپن ہی سے مجھے معارفِ علمیہ کی جستجو مین حد سے زیادہ حرص ہے اسکی شہادت کے لئے یہ واقعہ کافی ہوگا، کہ ایک رومی (یعنی یونانی زبان کا جاننے والا) میرے ملک مین آیا، مین اسکے پاس غلہ، نبات، پھل اور پودے وغیرہ لیکر پہنچتا اور اس کا یونانی نام پوچھکر لکھ لیتا تھا، لیکن عربی کتابت مین یہ بڑی دقت ہی کہ بعض حروف کی صورتین آپس مین مشابہ ہین اور ان مین صرف نقطون کا فرق ہی، اور اعراب کی علامتون مین ابتری ہو جانے سے مفہوم ہی مبہم ہو جاتا ہے، اس دشواری پر اگر مقابلہ کرنے مین غفلت یا مقابلہ کی حالت مین تصحیح سے بے پروائی کا اضافہ کر لیا جائے تو گویا ہماری قوم مین کتاب کے عدم اور وجود

کی حالت یکسان ہو جاتی ہے، بلکہ خود علم وجہل کی، اگر یہ آفت نہ ہوتی، تو کتاب دیسقوریدس کے عربی ترجمہ مین جو یونانی نام درج ہین، وہ بالکل کافی ہوتے، لیکن مین ان پر ذرا بھی بھروسہ نہین کرتا"

"ایک طرف اگر رسم الخط پر نکتہ چینی ہے، تو دوسری طرف عربی زبان کی خوبی کے بارہ مین یون رطب اللسان ہے:

"عربی مین مجھے ہجو بھی فارسی کی مدح سے زیادہ پیاری معلوم ہوتی ہے، میرے اس قول کی سچائی وہ شخص جان سکتا ہے، جو کسی علمی کتاب کے فارسی ترجمہ پر غور کرے، کہ کس طرح اس کی رونق جاتی رہتی ہے، اور وہ پر شکستہ اور روسیاہ ہو کر رہ جاتا ہے، فارسی زبان تو میری راے مین بس اخبار کسرویہ اور قصص شبینہ ہی کیلئے موزون معلوم ہوتی ہے"

اب ہم اخیر مین صیدنہ او الجماہر سے کچھ مختصر انتخابات اور پیش کرنا چاہتے ہین، جن سے البیرونی کا انداز تحقیق ظاہر ہوتا ہے،

(ص ۱۱۵ کاشانی کے فارسی ترجمہ سے)

چاء، یہ ایک قسم کی نبات ہے، جس کا وطن سرزمین چین ہے، اہل عرب اُسے "صاد" سے معرب کرکے بولتے ہین (یعنی صار) یہ شراب کی مضرت کو دور کرتی ہے، اسی لئے تبت مین لیجاتے ہین، جہان کے رہنے والے بڑے شرابی ہین، تبت مین اسکی قیمت مین مشک کے سوا دوسری چیز نہین لیتے، اس کی پتیان قدرے باریک اور خوش مزہ ہوتی ہین، لیکن تھوڑی سی تلخی لئے ہوئے، جب جوش دے لیتے ہین، تو وہ تلخی بھی جاتی رہتی ہے، گیلی پتیان نیچے اوپر رکھ کر کوٹتے ہین، اور گرم پانی مین ملا کر شربت بناتے اور پیتے ہین، اُس کا شربت اندرونی حرارت کو بٹھا دیتا اور خون صاف کرتا ہے، جن لوگون نے اس نبات کو

۱؎ دیکھو اسلامک کلچر ۱۹۳۲ء جلد ۶ نمبر ۴ جس مین الصیدنہ کے نسخے پر بہترین معلومات موجود ہین،

نواحی چین میں دیکھا ہے، ان کا بیان ہے کہ بادشاہ کے دارالسلطنت شہر بخوس کے درمیان ایک وادی ہے، جس کے بیچ میں ہو کر ایک بڑا دریا گزرتا ہے، یہ دجلہ کی طرح ہے، جو کہ بغداد میں ہو کر گذرتا ہے، وادی کے دونوں طرف حمام اور خانہ دار ہیں، وہیں چائے نوشی کیجاتی ہے، جیسا کہ سرزمین ہند میں دستور ہے، کہ بھنگ مقررہ مقامات پر پی جاتی ہے، جس کا خراج بادشاہ کے خزانہ میں داخل ہوتا ہے، چائے کی خرید و فروخت بغیر شاہی حکم کے ممنوع ہے، اور جو شخص نمک اور چائے بغیر شاہی اجازت کے خرید و فروخت کرتا یا چراتا ہوا پایا جاتا ہے، تو اسی مار ڈالتے، بلکہ اس کا گوشت کھا جاتے ہیں، جو آمدنی ان مواضع کی جمع ہوتی ہے، وہ زر و نقرہ کے معادن کی آمدنیوں کی طرح خاص بادشاہ کی ملک سمجھی جاتی ہے، (ص ۱۱۵)

اہلج، یہ جزیرہ اقریطس (کریٹ) سے آتی ہے، لیکن ہمارے ملکوں میں ارضِ ہند سے کشمیر کے کوہستانوں میں میں نے درخت آملہ، ہلیلہ اکثر دیکھے، لیکن اس زمانہ میں آملے اور ہلیلے پورے طور پر نہیں بڑھنے پائے تھے، شیر آملج جزائر بحر سے لایا جاتا ہے، اور ہلیلہ سفید بھی، دوسرے لوگ اسے شاہ املج دہار الشاہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اور جو حرف "ر" سے کام لیتے ہیں، وہ سارغرشتان شیر بامیان کہتے ہیں، اور شیر املج کے معنی ہیں شاہ املج،

الجماہر میں البیرونی نے ایک طول الذیل بحث لکھی ہے، جسے حال ہی میں اس کتاب کے اصل مدیر کرنکو نے جنھیں البیرونی سے بڑی دلچسپی ہے، اسلامک کلچر میں انگریزی میں شائع کر دیا ذیل میں ہم اس بحث کا چھوٹا سا اقتباس دیتے ہیں:

اللؤلؤ (موتی) ...... موتیوں کی ایک قسم خشک آب کہلاتی ہے، جو چینی ہے، اور بلاد قتا (خطا) سے منسوب ہے، اُس کا رنگ بھدا چاک سے ملتا ہوا ہے، اس میں نہ زیادہ آب ہوتی ہے نہ رونق، وہ سنگریزوں سے ملتے ہیں، اسی لئے "خوش آب" کے مقابلے میں خشک آب کہلاتے ہیں،

دوسری قسموں سے اُن کے دام بھی کم ہوتے ہیں، بعض کا خیال ہے کہ وہ بنے ہوئے ہوتے ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ امیر شہید (سلطان) مسعود ایک شخص پر نہایت برہم ہوئے، کہ یہ بنے ہوئے موتی ہیں، اُس نے گھبرا کر چاقو سے انھیں چھیلنا شروع کر دیا، اور کہنے لگا، کیا بنے ہوئے ایسے ہی ہوتے ہیں، ؟ حالانکہ اس کا ایسا کہنا اور ایسا کرنا، اُس کے دعوے کی دلیل نہ تھی، جو شخص موتی بنا سکتا ہے، وہ اسکی تہین بھی بنا سکتا ہے،

قلزمی موتی بھی قطائی کی طرح ہوتے ہیں، بلکہ اُن میں اور بھی کچھ خرابیاں ہوتی ہیں جیسے کھُردراپن، میلاپن، .....

آگ کا موتی پر جو اثر ہوتا ہے، اس کا مشاہدہ حدود برانہ (= برن بلند شہر) کے تہکدون میں ہوا، .... لوہرا (یا دلہرا ؟) کے راجہ نے جو محمود کے ہاتھوں میں گرفتار تھا، اسکے پاس کہلا بھیجا، کہ یہ مجنون (یعنی فوجی جو مذہب کے جوش میں پاگل ہو رہے ہیں) تجھے جواہرات سے محروم کر رہے ہیں پہلے انھیں نکال لے پھر انھیں چھوڑ دے کہ جلا دے ہیں لیکن محمود ضدی مزاج کا تھا اُسنے راجہ کا کہنا نہ سنا، جب آگ بجھ گئی تو خاک میں ڈھونڈھا گیا، تو بڑے بڑے نفیس دانے ملے، جو گویا طباشیر کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے، اور یاقوت کا پگھلا ہوا پانی تھا، اور کوئی کارآمد شے نہ بچی، (ص‍ ۱۰۵)

اگرچہ البیرونی کا خاص فن ریاضیات تھا جیسے ابن سینا کا فلسفہ اور طب لیکن اُس نے ہمہ گیر حکیمانہ طبیعت پائی تھی اسلئے اسے ہر قسم کے علمی معارف سے شغف تھا، اور علم و ادب کے میدانوں میں اس نے اپنی حیرتناک جودت اور تعجب خیز تحقیقات و انکشافات و نظریات کے آثار و نتائج چھوڑے ہیں، ضرورت ہے کہ اس کی تحقیقات کو سمجھنے اور روشن کرنے کیلئے ملک و قوم میں کوئی علمی انجمن یا جماعت قائم ہو جو اسکی باقیماندہ تصانیف کو شائع کرے اور انکی معلومات و تحقیقات سے دنیا کو روشناس کرائے، اس پُرتشویش دور میں یہ چیز خواب و خیال معلوم ہوتی ہے، قوم اور ملک کو دوسری مشغولوں سے اتنی مہلت کہاں ہے کہ وہ ان چیزوں کی طرف مائل ہوں دیکھئے کبتک انتظار کرنا پڑے کہ اس اہم بالشان علمی تحریک کی بنیاد قائم ہو،

مطبوعات جدیدہ

روح اقبال از جناب ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب استاذ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ تقطیع بڑی ضخامت ۳۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، غیر مجلد ہے،

پتہ سید عبد القادر اینڈ سنس حیدرآباد دکن،

اقبال کے فلسفہ اور ان کی تعلیمات پر اردو مین مضامین بلکہ مستقل کتابون کی کمی نہین، لیکن اگر ان کا جائزہ لیا جائے، تو ان مین اقبال کے متفرق خیالات کے سوا، ان کی شاعری کی اصلی روح اور اس کے بنیادی اور بہمات مسائل پر بہت کم بحث نظر آئے گی، اس لئے اقبالیات پر مضامین کی بھرمار کے باوجود اب تک ایسی کتاب کی جگہ خالی تھی، جس مین اسلامی تعلیمات کی روشنی مین کلام اقبال کے اساسی مسائل پر بحث کی گئی ہو، اس کتاب نے بڑی حد تک اس کمی کو پورا کر دیا، اس مین تین مضامین ہین "اقبال اور آرٹ" "اقبال کا فلسفہ تمدن" اور "ان کے مابعد الطبیعی تصورات"۔ پہلے مضمون مین نفس شاعری کے نقطۂ نظر سے کلام اقبال کے مختلف پہلوؤن پر بحث کر کے فنی حیثیت سے اس کا درجہ دکھایا گیا ہے، یہ مضمون لائق مضمون نگار کے وجدان سلیم ذوق ادب اور تنقید شعری کا آئینہ دار ہے، لیکن اس کا تعلق کلام اقبال کے ظاہری آب و رنگ سے ہے، ان کے کلام کی اصلی روح اور اس کے اساسی مسائل پر آخر الذکر دونون مضامین مین بحث کی گئی ہے، مصنف ماشاء اللہ مغربی علوم مین دستگاہ رکھنے کے ساتھ دینی معلومات سے بھی بے گانہ نہین ہین، اس سے بھی بڑھکر وہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان ہین، مغربی تعلیم کے باوجود اسلامی فکر و نظر اور مشرقی خیالات رکھتے ہین، اس لئے انھون نے بڑی

سلامت فکر کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی روشنی مین اقبال کے فلسفہ تمدن و عمران، ان کے تصور حیات مابعد الطبیعی تصورات اور دوسرے فلسفیانہ خیالات کی جن کا انسانی فلاح و سعادت سے تعلق ہے، مثلاً خودی، مقاصد آفرینی، عقل اور اخلاص، قصۂ آدم، انسانی فضیلت، تاریخی استقرا، انسان کامل، حیات اجتماعی، فرد اور جماعت، مملکت اور تمدن، نظام معیشت، نظام معاشری، مابعد الطبیعی مسائل مین، حیرت خانۂ عالم، خودی اور خدا، توحید، تقدیر اور زمانہ، جبر و اختیار، خودی، عشق اور موت وغیرہ کی تشریح کی ہے، ہر بحث فلسفیانہ استدلال کے ساتھ مصنف کی دینی حرارت کی مظہر ہے، جہان کہین اقبال کے خیالات اور مغربی فلاسفہ کے تصورات مین تصادم ہوا ہے، وہان مغربی فلسفہ کی کمزوریون اسکی اخلاقی تہی مایگی، تنگ نظری، مادیت اور فریب تمدن کا پردہ چاک کر کے اس کے مقابلہ مین اقبال کے فلسفہ کی اخلاقی اور روحانی برتری اور وسعت دکھا کر ثابت کیا گیا ہے کہ افراد کی صلاحیتون کا نشو و نما، ان کی سعادت، اقوام کی اخلاقی و مادی فلاح اور بین الاقوامی مشکلات کا حل انہی تعلیمات کے ذریعہ سے ممکن ہے، گو مابعد الطبیعی مسائل مین بھی سلامت فکر کا دامن ہاتھ سے نہین چھوٹا ہے، لیکن درحقیقت اس مین فلسفہ کی آمیزش مرغ بلند آشیان پر دام ڈالنا ہے کہ فلسفہ اس حریم قدس کا محرم نہین، مجموعی حیثیت سے اقبال کے فلسفہ پر اردو مین اس سے بہتر کتاب نہین لکھی گئی، اس مین بڑی حد تک ان کی شاعری کی روح آگئی ہے، اور کتاب اس قابل ہے کہ نہ صرف کلام اقبال سے دلچسپی رکھنے والے بلکہ ہماری تعلیم یافتہ نوجوان نسل کو جو عہد حاضر کے فریب تمدن و سیاست کا شکار ہے، بطور نصاب کے پڑھائی جائے، ہم فاضل مصنف کو ان کی اس کامیاب تصنیف پر مبارکباد دیتے ہین،

قومیت اور بین الاقوامیت، از جناب قاسم حسن صاحب بی اے بی ٹی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۶۱ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عدر، مکتبہ جامعہ

ملیہ دہلی، اور اسکی شاخین لاہور، لکھنؤ، بمبئی نمبر ۳،

جامعہ نے سیاسیات اور مسائلِ حاضرہ پر چھوٹی چھوٹی مفید کتابون کا جو سلسلہ شروع کیا ہی، یہ کتاب اسی کی کڑی ہی، اس مین قومیت کے تمام عناصر و اجزا، اسکی قدیم تاریخ یورپ کے مختلف ملکون مین اس کے ارتقاء کی داستان، مشرق مین قومیت کے تصور اور مشرقی ملکون مین اسکی سرگذشت، بین الاقوامیت کے تخیل کی ابتدا، مختلف ملکون مین اسکی کوششون، انجمن بین الاقوام کی بنیاد، اسکی سرگذشت اور بین الاقوامیت کے مستقبل پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہی، کتاب موضوع کے اعتبار سے گو مختصر ہے لیکن قومیت اور بین الاقوامیت کے تصور اور اسکی تاریخ کے متعلق اختصار کے ساتھ تمام ضروری معلومات آگئے ہین، انداز بیان شگفتہ اور دلچسپ ہے، موضوع کی خشکی سے لطفِ مطالعہ مین کمی نہین آتی،

حیاتِ سجّاد، مرتبہ مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۶۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ مکتبہ امارتِ شرعیہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ،

اس سے پہلے مولانا ابو المحاسن محمد سجاد مرحوم نائب امیر شریعت بہار کی یادگار مین مولانا مسعود عالم ندوی نے محاسن ابو المحاسن کے نام سے مولانا مرحوم کے متعلق مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا، اب ان کے تلمیذ رشید اور رفیق کار مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی نے یہ دوسرا مجموعہ مرتب کیا ہی، اس مین مولٰنا مرحوم کے احباب، معاصرین، تلامذہ، رفقائے کار اور دوسرے اہلِ علم اور واقف کارون کے قلم سے مولانا مرحوم کے سوانح، سیرت و اخلاق، علمی، تعلیمی، سیاسی اور دینی کارنامون پر مضامین ہین، مضمون نگارون مین مولٰنا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا احمد سعید صاحب دہلوی، مولٰنا شاہ بدر الدین صاحب امیر شریعت بہار کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہین،

ہم اور وہ از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۸ صفحے، کاغذ کتابت

وطباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ:۔ خواجہ محمد شفیع صاحب ٹیا محل دہلی۔

یہ دلچسپ کتاب دہلی کے مشہور ادیب خواجہ محمد شفیع کی تازہ تصنیف ہی، اس مین پرانی نسل کے عیوب اور ان کی برائیون اور ان کے مقابلہ مین نئی نسل کے محاسن اور اس کی خوبیون کو دلچسپ انداز مین دکھایا گیا ہی، اسے سن کر ممکن ہی کچھ لوگ کان کھڑے کرین لیکن جن پہلوؤن سے یہ موازنہ کیا گیا ہی، وہ واقعات کی روشنی مین بالکل صحیح ہی، درحقیقت اس کا تعلق اس دورِ زوال کی نسل سے ہے، جبکہ ہماری معاشرت کا ڈھانچہ ہی بگڑ گیا تھا، اخلاق مسخ ہو چکے تھے، دینی حمیت اور دنیاوی ترقی کا ولولہ دونون سرد پڑ چکے تھے، عوام سے لیکر خواص تک عیش پرستی اور غفلت مین سرشار اور نکبت و ادبار مین گرفتار تھے، سلطنت چھن چکی تھی، ملک ہاتھون سے نکل چکا تھا، لیکن کسی کو تباہ کن مشاغل سے فرصت نہ تھی، اس تباہ شدہ نسل کے اعمال و مشاغل کے مقابلہ مین نئی نسل کا احساس اور ان کے بہتر اعمال بہرحال قابلِ ستائش ہین، گو یہ کتاب افسانہ کے رنگ مین لکھی گئی ہی لیکن درحقیقت ہماری تباہی و بربادی کے عبرت آموز واقعات ہین، خواجہ صاحب کی زبان کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہی، نئی نسل مین دلی کی پرانی زبان کے حامل وہی ہین،

ترکی افسانے، مترجمہ جناب مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۲۰ صفحے، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر قیمت:۔ عہ، پتہ مطبع ہند نمبر ۱۰، ساگر دت لین، کلکتہ،

مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے عرصہ ہوا ان افسانون کا ترجمہ اپنے اخبارِ ہند مین بالاقساط شائع کیا تھا، اب اوھون نے ان کو کتابی شکل مین شائع کیا ہی، اس مین چار افسانے ہین، "زرعلیہ السلام" "دیوانہ" "عبدالرحمٰن آفندی بیٹ سے" اور "شریف مجرم" چارون افسانے نہایت دلچسپ اور ترکی ادب کی خصوصیات کے حامل ہین، پہلے افسانہ مین ایک جاہل وہم پرست بندۂ زر کی مکروہ سیرت بے نقاب کی گئی ہے، دوسرے مین ترکی کے معاشرتی انقلاب اور جدت پسند اور قدامت پرستون

کے خیالات کو بڑے دلچسپ انداز مین دکھایا گیا ہے، تیسرا افسانہ مزاحیہ اور ایک دیوانہ بلا خویش ہشیار کی نہایت پُرلطف روداد ہے، چوتھے مین ایک قانونی مجرم لیکن قوم پرست محب وطن کا سبق آموز حال ہے، افسانے پڑھنے کے لائق ہین، مولانا نے بالواسطہ عربی سے اس کا ترجمہ کیا ہے لیکن اصل کا پورا لطف قائم رکھا ہے۔

ادبی تاثرات، ڈاکٹر محی الدین زور قادری، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۴۴ صفحے، کاغذ، کتابت، و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ سب رس کتاب گھر، خیرت آباد، حیدر آباد دکن،

ڈاکٹر محی الدین قادری نے اردو ادب کی بہت سی کتابون پر مقدمے اور تبصرے لکھے ہین جناب قدرت اللہ بیگ صاحب نے ان میں سے پنتالیس کا انتخاب کرکے ادبی تاثرات کے نام سے شائع کیا ہے، مقدمات عبد الحق کے بعد اس نوع کی یہ دوسری کتاب ہے، ڈاکٹر صاحب کی ادبی خدمات اور انکا تنقیدی ذوق مسلم ہے، جو ان تبصرون مین بھی نمایان ہے اور اس مین جا بجا زبان و ادب کے متعلق کام کی باتین ملتی ہین، لیکن اس انتخاب مین ضرورت سے زیادہ وسعت سے کام لیا گیا ہے چنانچہ اس مجموعہ مین ۱۹۲۴ء اور اس کے قریب زمانہ کی تحریرین بھی شامل ہین جبکہ ڈاکٹر صاحب کا اس میدان مین آغاز تھا، اس سے یہ فائدہ تو ضرور حاصل ہوا کہ اس سے موصوف کے ذوق ادب کے تدریجی ارتقاء و رفتار کا اندازہ ہو جاتا ہے لیکن اب وہ جس منزل پر پہنچ چکے ہین، اس کے لحاظ سے گذشتہ منزلون کے بہت سے نشانات بھلا دینے کے قابل تھے،

نغمۂ زندگی، از جناب سید فضل احمد کریم صاحب فضلی بی لٹ آکسن آئی، سی، اس، ضخامت ۱۰۳ صفحے، کاغذ نفیس، ٹائپ پاکیزہ، قیمت مرقوم نہین، پتہ :- فضلی برادران لمیٹڈ کنٹ ہاؤس مشن رو اکسٹنشن، کلکتہ،

نغمۂ زندگی جناب فضل احمد صاحب فضلی کے کلام کا مجموعہ ہے، آج کل شعراء اور دواوین کی کمی نہین

ے دن نئے نئے دیوان نکلتے رہتے ہیں، لیکن نغمۂ زندگی اپنی خصوصیات کی بنا پر خاص امتیاز رکھتا ہے، اولاً خود مصنف کی ذات آئی سی ایس اور خوش مذاقی اور انسانیت کے اجتماع اضداد کا نمونہ ہے، پھر خیالات میں مشرقیت، قلب میں وسعت اور مذہب و ملت کا احساس جسکی توقع اُن کے ہم جنسوں سے مشکل سے کیجا سکتی ہے، ورنہ خود مصنف کے بقول ہندوستان کی اس عجوبہ مخلوق کا یہ حال ہے،

وہ دیکھئے وضع و شان "نقلی" صاحب ۔۔۔ کیا ہون گے اس انداز کے "اصلی" صاحب

اس مجمع مین آپ آکے کس طرح پھنسے ۔۔۔ بہتر ہے کہ بھاگ جا یئن "فضلی" صاحب

عزت کی کلکٹری مین افزایش ہے ۔۔۔ ہر طرح کے آرام ہین، آسایش ہے،

یہ سب تو درست ہے، مگر اے فضلی ۔۔۔ کچھ وسعتِ قلب کی بھی گنجایش ہے،

شاعری کے نقطۂ نظر سے بھی نغمۂ زندگی نقائص سے پاک اور مصنف کی خوش مذاقی کا نمونہ ہے، خیالات مین بلندی و پاکیزگی، زبان مین صحت و صفائی، قومی نظمون مین دین و ملت کا درد نمایان ہے، بعض بعض اشعار تو خیالات اور برجستگی کے لحاظ سے ضرب المثل بننے کے لائق ہین، قومی نظمین اگرچہ کم ہین، لیکن بہت اچھی ہین، آکسفورڈ کی روداد بہت دلچسپ ہے، دیوان کی ترتیب مین بھی مصنف کی تصویر اور رسمی دیباچون، تقریظون اور تعارف وغیرہ کے طومار کے بجائے خود مصنف کے اشعار سے ان چیزون کی دلچسپ ترجمانی کی گئی ہے، ظاہری نفاست بھی دلفریب ہے، غرض نغمۂ زندگی ہر حیثیت سے قابلِ قدر ہے،

زہریلی مکھی اور شہر خموشان | ازجناب محمود مورخ بی اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۴۰ و ۱۱۴ صفحے، کاغذ و کتابت وطباعت معمولی، قیمت ایک ایک روپیہ، پتہ گلفروش، پبلشنگ ہاؤس، دہلی،

یہ دونون کتابین مصنف کے افسانون کا مجموعہ ہین، پہلے مین دس افسانے ہین، دوسرے مین سات، جناب مورخ کا رجحان افسانہ نگاری کے بجائے سادگی اور واقعہ نگاری کی جانب زیادہ معلوم ہوتا ہے، چنانچہ ان افسانون مین تخیل اور انشاء کی رنگ آمیزی کے بجائے سیدھی سادی زبان مین ما فی الضمیر کو ادا کر دیا گیا ہے، "م"